وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ (الآیۃ)

جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے نصف صدی کے فتاویٰ کا مجموعہ

افادات
شیخ الحدیث مولانا عبدالحق و دیگر مفتیانِ کرام
جامعہ دارالعلوم حقانیہ

نگرانی واہتمام
مولانا سمیع الحق مہتمم و استاذِ حدیث
جامعہ دارالعلوم حقانیہ

ترتیب: مفتی مختار اللہ حقانی

شائع کردہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ پاکستان

نام کتاب .... فتاویٰ حقانیہ (جلد ششم)

افادات .... شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
بانی جامعہ دارالعلوم حقانیہ ودیگر مفتیان کرام جامعہ ہذا

نگرانی واہتمام .... شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب، مہتمم جامعہ ہذا

ترتیب .... مولانا مفتی مختار اللہ حقانی استاذ شعبہ التخصص فی الفقہ والافتاء

ضخامت .... ۵۶۰ صفحات

تاریخ طبع ہفتم............../۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء

طابع .... مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک

Mob:0300-4572899

ناشر .... جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

فہرست مضامین جلد ششم

کتاب البیوع

کتاب
البیوع

يايها الذين امنوا لا
تاكلوا اموالكم بينكم
بالباطل الا ان تكون
تجارة عن تراضٍ منكم

باب شرائط البیع و ارکانہ

(بیع کے شرائط و ارکان وغیرہ)

خرید و فروخت میں طرفین کی رضامندی کا اعتبار

سوال:۔ آجکل مروّجہ طریقے کے مطابق ناپ تول میں متفاوت آلات استعمال ہوتے ہیں، کپڑے کے دوکاندار عموماً میٹر بہ کپڑا خرید کر گز پر بیچتے ہیں جو میٹر سے کم ہوتا ہے، اسی طرح عام دوکاندار پختہ سیر سے (جو سو تولہ کا ہوتا ہے) چیز خرید کر کلوگرام (جو کہ ۸۵ تولہ ہوتا ہے) سے فروخت کرتے ہیں، بائع اور مشتری دونوں اس طریقۂ ناپ تول سے آگاہ ہونے کے باوجود باہمی رضامندی سے معاملہ طے کر لیتے ہیں، کیا ناپ تول کا یہ طریقہ از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مشتری سے ناپ تول کی حقیقت کو مخفی رکھنا دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے جو کہ ناجائز ہے لیکن جہاں کہیں بائع اور مشتری دونوں کی باہمی رضامندی سے معاملہ طے ہو جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال اللہ تبارك وتعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۲۹) [۱]

مکرہ کی بیع صحیح نہیں ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کی دھمکی دیکر بجبر و اکراہ اس سے ایک ٹریکٹر خرید اجبکہ وہ بائع اس عقد پر بالکل راضی نہیں، تو کیا شرعاً یہ بیع صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے خرید و فروخت میں بائع اور مشتری کی رضامندی اور

---

[۱] قال العلامۃ الکاسانیؒ: اذا وجدت الاجازۃ من المالك فی الانتهاء وبین وجود الرضا فی التجارۃ عند العقد اوبعدہ فیجب العمل باطلاقها۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴۹ کتاب البیوع، فصل: واما الذی یرجع الی ...)
ومثلہ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۳ کتاب البیوع۔

طیبِ نفس کو ضروری قرار دیا ہے، لہٰذا اگر کسی عقد میں بائع کی رضا مفقود ہو اور جبر و اکراہ سے بائع کو مجبور کر کے بیع کی گئی ہو تو یہ بیع صحیح نہیں ۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمه الله : ومنها الرضا.......... فلا یصح بیع المکرہ اذا باع مکرھا وسلم مکرھا لعدم الرضا۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۷۶ کتاب البیوع، فصل واما شرائط الصحة فانواع) ؎۱

نابالغ کی خرید و فروخت میں اذنِ عُرفی کا اعتبار

سوال:۔ دیہاتوں میں بعض اوقات چھوٹے بچے اور بچیاں دوکان میں بیٹھ کر کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرتے ہیں، گاہک کو پتہ نہیں چلتا کہ بچوں کا والد یا سرپرست اس پر راضی ہے یا نہیں؟ جبکہ بچوں کا باپ اس خرید و فروخت پر انہیں منع نہیں کرتا، تو کیا اس طرح بچوں سے اشیاء کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو بچے اور بچیاں نفع اور نقصان کی تمیز کر سکتے ہوں تو باپ کے اذن و اجازت سے ان کی بیع و شراء شرعاً نافذ ہو گی اور اذن صراحۃً اور دلالۃً دونوں طرح درست ہے، پس بچوں کے والدین کی خاموشی اور خرید و فروخت سے انہیں منع نہ کرنا بھی اذن اور اجازت میں داخل ہے لہٰذا ان سے خرید و فروخت مرخّص ہے ۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ثم الاذن کما یثبت بالصریح یثبت بالدلالة کما اذا رأی عبدہ یبیع ویشتری فسکت یصیر ماذوناً عندنا ۔ (الھدایة ج ۳ ص۳۶۲ کتاب الماذون) ؎۲

؎۱ قال النبیّ صلی الله علیه وسلم: الا لا تظلموا الا لا یحل مال امریٔ الا بطیب نفس منه ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص۲۵۵ کتاب البیوع، باب الغصب والعاریة)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۴ ص۵۰۳ کتاب البیوع، مطلب فی بیع المکرہ والموقوف ۔

؎۲ قال فی الھندیة : اذا اذن لصبیٍ یعقل البیع والشراء یجوز یرید به انه یعقل معنی البیع والشراء بان عرف ان البیع سالب للملك والشراء جالب عرف الغبن الیسیر من الفاحش لا نفس العبارة کذا فی الصغریٰ۔ (الفتاوی الھندیة ج ۵ ص۱۱۱، الباب الثانی عشر فی الصبیّ والمعتوه.... الخ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۸۷ کتاب الماذون ۔

مجنون کی خرید وفروخت

سوال :- ایک آدمی کا دماغی توازن درست نہیں (دیوانہ اور مجنون) ہے، آیا ازروئے شریعت اس آدمی کا بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- شریعتِ مطہرہ نے بیع وشراء کی صحت اور انعقاد کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ عقل کی درستگی کو بھی ضروری اور اہم شرط قرار دیا ہے، چونکہ دیوانہ اور مجنون شخص اچھے بُرے اور نفع ونقصان کی تمیز پر قادر نہیں ہوتا اس لیے مجنون اور دیوانے کی بیع منعقد نہ ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ : واما شرائطها فمنها ان یکون حرّاً فلا تثبت ولایة العبد ومنها ان یکون عاقلاً فلا تثبت ولایة المجنون۔ (بدائع الصنائع ج ۳ ص۱۵۳ کتاب البیوع۔ فصل: واما شرائطها فانواع ۔الخ) [1]

نرخ کے تعین سے قبل مبیعہ میں تصرّف کرنا

سوال :- ہمارے علاقے میں زمیندار کپاس کی فصل تیار ہونے پر کارخانے میں بھیجدیتے ہیں، کارخانہ والے مال تول کر اپنے استعمال میں لاتے ہیں اور زمیندار کسی بھی وقت جاکر نرخ طے کر لیتے ہیں، آیا تجارت کا یہ طریقۂ کار درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگر کارخانہ والے مال وصول کرکے بطور امانت اپنے پاس رکھیں یا باقاعدہ طور پر نرخ طے کرکے اور رقم کی ادائیگی کی تاریخ مقرر کرکے اس کو استعمال میں لائیں تو اس میں شرعاً کوئی حرج یا فساد نہیں، لیکن اگر نرخ طے کرنے سے قبل ہی کارخانہ والے اس کپاس کو اپنے استعمال میں لائیں اور استعمال کے بعد نرخ مقرر کیا جائے تو یہ معاملہ (بیع) فاسد ہے، کپاس کے استعمال سے قبل نرخ مقرر کرنا لازمی ہے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ : منها ان یکون المبیع معلوماً وثمنه معلوماً علماً یمنع من المنازعة۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۵۶ کتاب البیوع، فصل: واما شرائط الصحة فانواع) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: فشرائط العاقد اثنان العقل والعدد فلا ینعقد بیع مجنون وصبی لایعقل۔ (ردّ المحتار ج ۴ ص۵۰۴ کتاب البیوع ۔مطلب شرائط البیع انواع اربعة)

ومِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۳ ص۲ کتاب البیوع، الباب الاول فی تعریف البیع ...الخ ۔

[2] قال فی الهندیة: ومنها ان یکون المبیع معلوماً والثمن معلوماً علماً یمنع من المنازعة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاول فی تعریف البیع) ومِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۵ ص۵۰۵ کتاب البیوع مطلب شرائط البیع انواع اربعة ۔

مالِ مسروقہ کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :- ایک شخص نے کسی سے کچھ مال خریدا سودا کر لینے اور خریدنے کے بعد اُسے معلوم ہُوا کہ یہ مال چوری کا ہے، تو اب اس خریدے ہوئے مال کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :- شریعتِ مقدسہ میں اس بات کی تصریح فرما دی گئی ہے کہ چوری کا مال اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، جس چیز کے متعلق قرائن سے غالب گمان ہو کہ یہ چوری کی ہے تو اس کے خریدنے سے گریز کیا جائے، لیکن اگر غلط فہمی سے خرید لی جائے اور بعد میں حقیقت واضح ہو تو وہ چیز اس کے اصل مالک کو واپس کی جائے، اور مشتری کو بائع سے اپنی رقم کے مطالبے کا حق حاصل ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللّٰہ : لو ظھر غیر حلالٍ ای مسروقًا اومغصوبًا یرجع علیہ المشتری - (ردّ المحتار ج۴ ص۱۰۶ کتاب البیوع ۔)[1]

کوئی چیز خریدنے کے لیے پیشگی رقم دینا

سوال :- جناب مفتی صاحب! میں ایک کار ڈیلر ہوں اور کاروں کا کاروبار کرتا ہوں پہلے گاہک سے رقم وصول کر لیتا ہوں بعد میں نئی کار کمپنی سے لے کر گاہک کے حوالے کرتا ہوں، اگر گاہک کو پسند آجائے تو خرید لیتا ہے ورنہ اپنی رقم واپس لے لیتا ہے اور بیع ختم ہو جاتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح معاملہ طے کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- متاخرین فقہاء نے صورتِ مذکورہ کے جواز پر تصریح کی ہے کیونکہ بیع کی نیت سے پیشگی رقم دینا بیع نہیں بلکہ بیع کا وعدہ ہے جبکہ حقیقی بیع مبیعہ وصول کرنے کے بعد متحقق ہوتی ہے، لہٰذا بیع تعاطی کی وجہ سے بیع منعقد ہو کر صحیح ہو جاتی ہے اور مشتری کو خیارِ رؤیت کا حق حاصل رہے گا۔ اس لیے کسی چیز کے خریدنے کے لیے پیشگی رقم دینا

---

[1] قال ملک العلماء العلامۃ الکاسانی رحمہ اللّٰہ : ولو باع السارق المسروق من انسان او ملکہ منہ بوجہٍ من الوجوہ فان کان قائمًا فلصاحبہ ان یاخذہ لانہ عین ملکہ وللماخوذ منہ ان یرجع بالضمان علی السارق ۔

(بدائع والصنائع ج۵ ص۸۵ کتاب البیوع)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۶۸ کتاب البیوع ، باب خیار العیب ۔

جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ولو اعطاہ الدراہم وجعل یاخذ منہ کل یوم خمسة امناء ولم یقل فی الابتداء اشتریت منك یجوز وھذا حلال وان کان نیتہ وقت الشراء لانہ بمجرد النیة لا ینعقد وانما ینعقد البیع الان بالتعاطی والان المبیع معلوم ینعقد البیع صحیحاً۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۱۶ مطلب البیع بالتعاطی) [1]

مشتری کو مبیعہ وصول کرنے پر مجبور کرنا

سوال:۔ میں نے ایک شخص کے ہاتھ کاٹنے کی شرط لگا کر کچھ درخت فروخت کئے ہیں لیکن اب وہ مجھے تنگ کرنے کی غرض سے نہ تو درخت کاٹتا ہے اور نہ ہی سودا واپس کرتا ہے ایسی صورت میں از روئے شریعت مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب:۔ باقاعدہ بیع منعقد ہو کر ثمن (قیمت) دیدینے کے بعد مشتری کو مبیعہ وصول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اسی بناء پر صورت مذکورہ میں بائع کے مطالبہ پر مشتری کو درخت کاٹنے یا دونوں کی رضامندی سے بیع فسخ کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اور اگر مشتری اس کے باوجود کسی بات کو تسلیم نہ کرے تو بائع قاضی یا اہلِ حل وعقد کے ذریعے اپنا حق وصول کر سکتا ہے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ویقال للبائع اقلعھا وسلم المبیع وکذا اذا کان فیھا زرع لان ملك المشتری مشغول بملك البائع فکان علیہ تفریغہ وتسلیمہ کما اذا کان فیہ متاع۔ (الھدایة ج۳ ص۳۱ کتاب البیوع، فصل، ومن باع داراً... الخ) [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: ویصح البیع بالتعاطی ...... وصورتہ ان یتفق علی الثمن ثم یاخذ المشتری المتاع ویذھب برضا صاحبہ من غیر ان یرفع الثمن او ان یرفع المشتری الثمن للبائع ویذھب بدون قبض المبیع فان البیع لازم علی الصحیح۔

(شرح المجلة للعلامة سلیم رستم باز تحت المادة ۱۷۵ ص۷۹)

ومثلہ فی شرح المجلة للعلامة خالد الاتاسی، تحت المادة ۱۷۵ ج۱ ص۳۶۔

[2] قال العلامة الحصکفیؒ: ویؤمر البائع بقطعھما وتسلیم البیع عند وجوب تسلیمھما فلو لم ینقد الثمن لم یؤمر بہ خانیة ـــ وقال العلامة ابن عابدینؒ: تحت قولہ: عند وجوب تسلیمھما) ای تسلیم الارض والشجر وذلك عند نقد المشتری الثمن فلو لم ینقد الثمن لم یومر بہ۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۵۴ مطلب فی بیع الثمر والزرع والشجر مقصوداً۔ ومثلہ فی البحر الرائق ج۵ ص۳۰۰ کتاب البیوع۔

ٹیلیفون کے ذریعے عقدِ بیع کا حکم

سوال:۔ عصرِ حاضر میں عام طور پہ تاجر حضرات دُور دراز کے شہروں اور بیرونِ ممالک سے ٹیلیفون کے ذریعے مال منگواتے ہیں، تو کیا خرید و فروخت کا یہ طریقہ شرعاً درست ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے خرید و فروخت کے دوران ایجاب وقبول کے لیے اتحادِ مجلس کو ضروری قرار دیا ہے لیکن اتحاد عام ہے خواہ حقیقی ہو یا حکمی، حقیقی تو ظاہر ہے اور حکمی کی صورت یہ ہے کہ ایک مجلس میں ایجاب ہو جائے اور مشتری کو کسی مناسب طریقے سے (بذریعہ خط یا پیغام رساں کی معرفت) اطلاع دی جائے ۔ موجودہ دَور میں فقہاء نے اِنسانی ضروریات اور حوائج (ٹیلیفون) کے ذریعے کیے گئے بیع و شراء اور طلاق وغیرہ کو بھی اسی زمرہ میں شمار کیا ہے ، لہٰذا ٹیلیفون کے ذریعے اگر کسی چیز کے بارے میں باقاعدہ ایجاب وقبول ہو جائے تو یہ بیع شرعاً نافذ العمل ہوگی۔

لما قال الشیخ محمد کامل ابن مصطفی الطرابلسیؒ : سئل بعد صلوٰۃ الجمعۃ حضر خبر الشام فی التلغراف لبعض الثغور بانہ ثبت فی الشام رویۃ ھلال ..... فاجاب ان السلاطین المسلمین وضعوا التلغراف لتبلیغ الاخبار من البلاد القریبۃ والبعیدۃ فی مدۃ یسیرۃ جداً واقاموا لاعمالہ اشخاصاً مسلمین وانفقوا علی ذٰلک اموالاً جسیمۃ واستغنوا بہ عن السعاۃ وارسال المکاتیب غالباً فصار قانوناً فی ذٰلک یخاطب بہ السلاطین بعضھم لبعضھم فی مھمات الامور وتبعھم الناس علی ذٰلک ۔ (فتاویٰ الکاملیۃ ص۲۸۵ مطلب ھل یثبت رمضان بالتلغراف) [1]

بالغ بیٹے کی غیر موجودگی میں اس کی جائیداد فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص کا بالغ بیٹا ہے اور وہ کسی دور جگہ میں رہتا ہے، اس کی غیر موجودگی میں اور اجازت کے بغیر والد اس کی جائیداد فروخت کر دے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے ؟

---

[1] قال الدکتور وھبۃ الزحیلی : البیع بالمراسلۃ او بواسطۃ رسول یصح اتفاقاً ویکون مجلس التعاقد ھو مجلس بلوغ الرسالۃ من العاقد الاول الی العاقد الثانی ۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۵۰۳ ثانیاً البیوع بسبب الصیغۃ)

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے ہر انسان کو اپنی ملکیت میں خود مختار قرار دیا ہے جبکہ کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرّف اصل مالک کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بالغ بیٹا حاضر نہ ہو تو والد کی طرف سے اس کی فروخت کردہ جائیداد بیع فضولی کے زمرہ میں آکر بیٹے کی اجازت پر موقوف ہوگی۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللّٰہ: یبیع الاب عرض ابنہ الکبیر الغائب لا الحاضر اجماعاً لا عقارہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۳ ص ۶۳۱ مطلب فی نفقۃ قرابۃ غیر الولاد من الرحم المحرم) [1]

جائیداد کی خرید وفروخت پر کمیشن لینے کی شرعی حیثیت

سوال: ایک آدمی نے "جائیداد کی خرید و فروخت کا با اعتماد ادارہ" کے نام سے ایک دفتر کھول رکھا ہے جہاں وہ زمین کی خرید وفروخت کا کام کرتا ہے اور اس پر وہ جانبین (یعنی خریدنے اور فروخت کرنے والے) سے دو فیصد کمیشن لیتا ہے، تو کیا اس طرح پر جانبین سے کمیشن لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے ایک ہی شخص کو بائع اور مشتری دونوں کی جانب سے وکالت کی ذمہ داری اپنانے کی اجازت نہیں دی ہے لیکن جانبین کی طرف سے دلّال بن سکتا ہے۔ وکیل اور دلّال میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وکیل کو مبیعہ میں جائز تصرّف کا حق حاصل ہوتا ہے، جبکہ دلّال کی ذمہ داری مال خریدنے کی طرف ترغیب دلانا ہوتی ہے، اور مبیعہ میں کسی قسم کے تصرّف کا اس کو حق حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں یہ شخص چونکہ دلّال کی حیثیت سے کام کرتا ہے اس لیے اس کو جانبین سے مناسب کمیشن لینا شرعاً ممنوع نہیں ہے، تاہم ایسے ادارے کو پہلے سے مناسب کمیشن کی وضاحت کر دینا ضروری ہے، تاکہ بعد میں جھگڑے اور کبیدہ خاطری کا سبب نہ بنے۔

---

[1] قال العلامۃ عبد العلی البرجندیؒ: یجوز للاب ان یبیع عروض ولد الغائب ابناً کان او بنتاً وتصرف فی ثمنہ اذا کان من جنس نفقتہٖ ولا یجوز ان یبیع عقارہ لذٰلک۔ (البرجندی ج ۲ ص ۸۹ کتاب البیوع۔

وَمِثْلُہٗ فی آداب الاوصیاء علیٰ ھامش جامع الفصولین ج ۲ ص ۱۲۳ فصل فی الاباق والکتابۃ والعتاق ...الخ

لما قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : فتجب الدلالۃ علی البائع او المشتری علیھما بحسب العرف ۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۴۶ کتاب البیوع) [1]

بیع کے نفاذ کا دار و مدار سرکاری کاغذات میں اندراج پر موقوف نہیں

سوال :- ایک شخص نے کچھ زمین خریدی لیکن لاپرواہی سے حکومتی کاغذات میں اندراج (رجسٹری اور انتقال) کیے بغیر بطورِ زراعت اُسی آدمی کے حوالہ کر دی جس سے خریدی تھی، اب کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ آدمی اس زمین پر قابض ہو گیا ہے کہ یہ زمین سرکاری کاغذات میں میری ملکیت ہے، تو کیا مشتری بغیر سرکاری کاغذات میں اندراج کے اس زمین کا مالک ہے یا نہیں ؟

الجواب :- شریعت نے بیع کے نفاذ کو سرکاری کاغذات میں اندراج پر موقوف نہیں رکھا ہے بلکہ نفاذِ بیع کے لیے جانبین کی رضامندی اور ایجاب و قبول کو ضروری قرار دیا ہے، لہٰذا سرکاری کاغذات میں اندراج نہ ہونے کے باوجود مذکورہ زمین کے جملہ حقوق مشتری کو حاصل ہوں گے اور اس پر بائع کا قبضہ غصب اور ظلم شمار ہو کر ناجائز اور حرام ہوگا ۔

لما قال فی مجلۃ الاحکام : البیع ینعقد بایجاب وقبول ۔

(مجلۃ الاحکام، المادۃ ۱۶۷، الفصل الاول فی ما یتعلق برکن البیع) [2]

حقِ مہر میں دی ہوئی زمین کا حقِ فروخت بھی زوجہ ہی کو حاصل ہے

سوال :- ایک شخص نے عقد نکاح کے وقت اپنی منکوحہ کو حقِ مہر میں کچھ زمین دیدی، اب یہ شخص حقِ مہر میں دی ہوئی زمین کو بلا اجازت زوجہ کے فروخت کرنا چاہتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع خاوند کو

---

[1] قال المفتی محمد شفیع رحمہ اللہ : اگر بائع یعنی مالک کی اجازت سے خود دلال مال کو فروخت کرے تو اس کی اجرت اولاً دلالی بائع کے ذمے ہے اور اگر محض کوشش کرنے والا ہے اور معاملہ کرنے والا ہے فروخت کرنے والا خود بائع ہے تو عرف اور رواج کا اعتبار ہوگا، رواج کے موافق جس کے ذمے دلالی ہوگی اس سے لینا جائز ہوگا ۔ (امداد المفتیین الشہیر بفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج ۲ ص ۸۲۵ کتاب الاجارۃ) ـــ ومثلہٗ فی تالیفاتِ رشیدیہ ص ۴۱۸ کتاب الاجارۃ ۔

[2] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : اما القول فالایجاب والقبول وھما رکنہ ظاھرہ ان الضمیر للایجاب والقبول ۔ (ردّ المحتار ج ۴ ص ۵۰۴ کتاب البیوع)

ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۵۸ کتاب البیع ۔

یہ حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: حقِ مہر میں دی ہوئی زمین کے تمام تر مالکانہ حقوق بیوی کو حاصل ہو جاتے ہیں، بیوی کی اجازت کے بغیر شوہر کو تصرف کا حق نہیں ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ اس زمین میں شوہر کو ملکیت یا ولایت کا حق حاصل نہیں لہٰذا بلا اجازتِ زوجہ (بیوی) کے بیع نافذ العمل نہ ہو گی۔

وفی الہندیة: واما شرائط النفاذ فنوعان الملك او الولایة والثانی ان لایکون فی المبیع حق لغیر البائع۔ (الفتاوی الهندية ج۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاوّل فی تعریف البیع.....الخ) [۱]

درخت عقدِ بیع میں زمین کے تابع ہیں

سوال: ایک شخص نے کسی سے ایک قطعہ اراضی خریدا لیکن زمین کے کنارے پر واقع درختوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا بعد میں دونوں کے درمیان ان درختوں پر اختلاف پیدا ہو گیا، تو کیا یہ درخت از روئے شرع بائع کا حق ہے یا مشتری کا؟

الجواب: زمین کے فروخت کرتے وقت اس میں مذکورہ اشیاء مثلاً درخت یا آبادی وغیرہ خود بخود عقدِ بیع میں شامل ہوں گے پس اس بناء پر صورتِ مسئولہ میں درخت بھی مشتری کا حق ہیں، البتہ اگر ان مذکورہ اشیاء کو عقدِ بیع کے وقت مستثنےٰ کر کے عقد کیا جائے تو اس وقت یہ اشیاء عقد میں شامل نہیں ہوں گی۔

لما قال العلامہ ابن نجیم رحمہ اللہ: ویدخل البناء والشجر فی بیع الارض بلا ذکر لکونہ متصلاً بها للقرار فیدخل تبعاً۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۹۴ کتاب البیع، فصل: یدخل البناء والمفاتیح فی بیع الدار) [۲]

---

[۱] قال العلامة الكاسانی ؒ: ومنها وهو شرط انعقاد البیع للبایع ان یکون مملوکاً للبائع عند البیع فان لم یکن لاینعقد۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴۷ کتاب البیوع، فصل: واما الذی یرجع الی المعقود علیہ۔الخ)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۵۵ کتاب البیوع

[۲] قال علی بن ابی بکر المرغینانی ؒ: ومن باع ارضاً دخل ما فیها من النخل والشجر وان لم یسمه لانه متصل بها للقرار فاشبه البناء۔ (الهدایة ج۳ ص۲۰۵ کتاب البیوع)
وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۸۵ کتاب البیوع،

مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا

سوال:- ایک مسجد کی آمدنی اور فنڈ فی الحال مسجد کی ضروریات سے زیادہ ہے، اس سے تجارت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- مسجد کی آمدنی اور فنڈ دراصل مسجد کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ہوتی ہے لیکن اگر فنڈ مسجد کی ضروریات اور استعمال سے زائد ہو تو اس رقم کو کسی قابل نفع تجارت میں لگا کر اس سے حاصل ہونے والے منافع کو مسجد کے فنڈ میں جمع کرنا ہوگا، اس طریقہ سے مسجد کی رقم سے تجارت کرنا جائز ہے بشرطیکہ چندہ دہندگان کی طرف سے اس کی تجارت کی اجازت ہو۔

لما قال فی الھندیۃ: متولی المسجد اذا اشتری بمال المسجد حانوتاً او داراً ثم باعھا جاز اذا کانت لہ ولایۃ الشراء۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۲ ص۴۱۷ الباب الخامس فی ولایۃ الوقف وتصرف القیم) لہ

رشوت کی رقم سے مقبرہ (قبرستان) کے لیے جگہ خریدنا

سوال:- رشوت کے ذریعہ حاصل شدہ مال سے مقبرہ کے لیے جگہ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- حصولِ مال کے لیے جائز طریقہ اور مخاطب کی رضا کو شریعتِ مقدسہ نے ضروری قرار دیا ہے، رشوت چونکہ ناجائز ذرائع سے حاصل کی جاتی ہے، لہٰذا اس کو اصل مالک یا ورثاء کو واپس کرنا ضروری ہے، رشوت کا مال چونکہ اصل مالک کی ملک سے نہیں نکلتا، اس بناء پر رشوت کی رقم سے مقبرہ (قبرستان) کے لیے جگہ خریدنا اور اس میں مسلمان میتوں کو دفنانا جائز نہیں، لہٰذا ایسے مال کے ورثاء یا اصل مالکوں کی موجودگی میں بغیر اُن کی رضامندی کے اس رقم کو رفاہِ عامہ کے کاموں میں خرچ کرنے سے ذمہ داری فارغ

لہ قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ: متولی المسجد اذا اشتری بمال المسجد حانوتاً او داراً ثم باعھا جاز اذا کانت لہ ولایۃ الشراء وفی التجنیس فی الفتاوی قال الامام حسام الدین ھذا ھو المختار وفی الخانیۃ ھو الصحیح۔

(التاتارخانیۃ ج۵ ص۸۶۲ کتاب الوقف، مسائل وقف المسجد وقیم المسجد)

وَمِثْلُہٗ فی السراجیۃ علی ھامش الخانیۃ ج۳ ص۱۴۲ کتاب الوقف۔

نہیں ہوگی ۔

لما قال العلامہ ابن نجیم المصریؒ : لومات رجل وکسبہ من ثمن البازق والظلم واخذ الرشوۃ تعود الورثۃ ولا یأخذون منہ شیئاً وھوالاولیٰ لھم ویردونہ علیٰ اربابہ ان عرفوھم والایتصدق لان سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذر الرد ۔ (البحرالرائق ج ۸ ص ۲۰۱ فصل فی البیع) [1]

کرایہ کی دوکان یا مکان پر پیشگی رقم (پگڑی) لینے کی شرعی حیثیت

سوال :۔ بعض علاقوں میں دوکان یا مکان کرایہ پر لیتے وقت پیشگی رقم دینا ضروری ہوتا ہے اور یہ رقم کرایہ کے علاوہ ہوتی ہے جو کہ عرف میں پگڑی کہلاتی ہے، کیا یہ رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ بسا اوقات ایک آدمی اپنا مکان یا دوکان ایک طویل مدت کے لیے کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ دار سے کرایہ کے علاوہ کچھ رقم یکمشت بھی وصول کرتا ہے جو پگڑی کہلاتی ہے کرایہ دار یکمشت رقم دے کر اس بات کا حق دار ہو جاتا ہے کہ ایک طویل مدت یا تاحیات کرایہ داری کو جاری رکھے، بعض حالات میں وہ اپنا یہ حق کسی دوسرے کرایہ دار کو منتقل کر کے اُس سے یہ رقم لے سکتا ہے، اور اگر اصلی مالک دوکان یا مکان واپس لینا چاہے تو اُسے یہ رقم واپس کرنا ہوگی ۔

اس مروجہ پگڑی کے بارے میں علماء کرام نے عدم جواز کا قول فرمایا ہے، کیونکہ یہ نہ تو نزول عن الحق ہے اور نہ اُجرتِ معجلہ ہے بلکہ یہ حقِ مجرد کی فروخت ہے جو کہ ناجائز ہے اور یہ پیشگی کی رقم رشوت ہے جو کہ نصِ قطعی کی رُو سے حرام ہے، لہٰذا مروجہ پگڑی کی رسم شرع کے خلاف ہے ۔

البتہ اس یکمشت رقم کو ایک متعینہ مدت کی پیشگی اُجرت قرار دیا جائے اور متعینہ مدت تک

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : فی البزازیۃ اخذ مورثہ رشوۃً اوظلماً ان علم ذٰلک بعینہٖ لا یحل لہ اخذہ والافلہ اخذہ حکماً امافی الدیانۃ فیتصدق بہٖ بنیۃ ارضاء الخصماء ۔ (ردّ المحتار ج ۵ ص ۹۹ مطلب فی من ورث مالاحراماً ۔

وَمِثلُہٗ فی غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر ج ۲ ص ۵۰۴ کتاب الکراھیۃ ۔

کرایہ بھی ختم ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ اجارہ میں شمار ہوگا اور اجارہ کے تمام احکام اس پر جاری ہو کر اس قسم کی رقم کا لینا جائز ہے اور مروجہ رسم پگڑی ناجائز ہے۔

قال الدکتور وھبۃ الزحیلی: الحق المجرد او المحض ھو الذی لا یترك اثرًا بالتنازل عنه صلحًا او ابراءً فلا یجوز الاعتیاض عنه کحق الولایۃ علی النفس والمال وحق الشفعۃ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۴ ص۲۱ الحقوق المجردۃ وغیر المجردۃ۔) [1]

دوسرے کے سودے پر سودا کرنا

سوال: ایک آدمی کی کسی سے گھر خریدنے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ اسی دوران ایک تیسرے آدمی نے مداخلت کر کے زیادہ قیمت پر وہ مکان خرید لیا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بائع اور مشتری کی بات چیت کے دوران کسی اور کے لیے درمیان میں آکر قیمت بڑھانا مناسب نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے تاہم باقاعدہ ایجاب و قبول کی صورت میں بیع تام اور صحیح ہے اگرچہ ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما ورد فی الحدیث: عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال لا یبیع الرجل علی بیع اخیه ولا یخطب علی خطبۃ اخیه الا ان یاذن له وایضاً: عن ابی ھریرۃ ان نبی علیه السلام نھی ان یستام علی سوم اخیه۔ (الصحیح لمسلم ج۲ ص۳ باب: تحریم بیع الرجل علی بیع اخیه وسومه علی سومه) [2]

حرام مال سے خرید و فروخت کرنا

سوال: رشوت، سود، جُوا اور دیگر حرام طریقوں سے حاصل کی ہوئی رقم سے خرید و فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامۃ الحصکفی رحمه اللہ: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۱۹ کتاب البیوع)

[2] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: نھی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن النجش وعن السوم علی سوم غیرہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۶۹ فصل فیما یکرہ)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۹۹ فصل فیما یکرہ۔

الجواب:۔ رشوت، سود، جوا اور دیگر حرام ذرائع سے حاصل شدہ رقم کا ذاتی ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اس سے فراغتِ ذمّہ کے لیے ضروری ہے کہ اگر اصل مالک زندہ ہوں تو ان کو واپس کرکے ذمہ فارغ کرے ورنہ فقراء اور محتاجوں پر اصل مالکان کی طرف سے صدقہ کردے۔ اس بناء پر علم کے باوجود ان اشیاء کے عوض خرید و فروخت سے اجتناب ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والحاصل ان علم ارباب الاموال وجب ردہ علیہم والا فان علم عین الحرام لا یحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ وان کان مالاً مختلطاً مجتمعاً من الحرام ولا یعلم اربابہ ولا شیٔ منہ بعینہ حل لہٗ حکماً والاحسن دیانۃ التنزہ عنہ۔

(ردالمحتار ج۵/۹۹ مطلب فی من ورث مالاً حراماً)[1]

حکومت کی طرف سے روزمرہ استعمال کی اشیاء کے نرخ مقرر کرنا

سوال: بسا اوقات کسی چیز کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے جبکہ حکومت ایک حد مقرر کرکے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا دیتی ہے، کیا حکومت کے لیے اس قسم کی پابندی لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت کی رُو سے کسی چیز کی خرید و فروخت بائع اور مشتری کی آپس میں رضامندی پر موقوف ہے خواہ وہ قیمت زیادہ ہو یا کم، بعض اشیاء کی کوالٹی میں تفاوت کی وجہ سے اُن کے نرخوں میں بھی تفاوت آجاتا ہے، اسلئے حکومت کو شرعاً یہ حق نہیں کہ کسی چیز کے نرخ متعین کرکے پابندی لگائے کیونکہ اس قسم کی پابندیوں سے عوام پر تکلیف کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں بھی لوگ اشیاء ضروریہ کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کرکے عوام کو پریشان کرتے ہیں اور لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: لو مات رجل وکسبہ من ثمن الباذق والظلم او اخذ الرشوۃ تعود الورثۃ ولا یاخذون منہ شیئاً وھو الاولیٰ لھم ویردونہ علیٰ اربابہ ان عرفوھم والّا یتصدق بہ لان سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذّر الرّد۔

(البحرالرائق ج ۸ ص۲۰۱ فصل فی البیع۔ کتاب الکراھیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاشباہ والنظائر ج۴ ص۵۰۴ کتاب الکراھیۃ۔

کم قیمت اشیاء مجبوراً مہنگے داموں خریدنا پڑتی ہیں جس سے ملک کی معیشت متاثر ہوسکتی ہے۔ تو اس صورتِ حال میں حکومت معاشیات اور اقتصادیات کے ماہرین، سمجھدار لوگوں اور تاجروں کے مشورے سے اشیاءِ ضروریہ کی قیمتوں کا تعین کرکے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا سکتی ہے تاکہ عوام الناس پریشان نہ ہوں اور ملک کا سرمایہ دار طبقہ غریب لوگوں کی مجبوریوں ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔

قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: ولا يسعر حاكم الا اذا تعدى الارباب عن القيمة تعدياً فاحشاً بمشورة اهل الرأي - (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۴۰۰ کتاب الکراہیۃ، فصل فی البیع)[1]

ڈالڈا گھی کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنا

سوال:۔ اگر ڈالڈا گھی میں اس طرح صفائی پیدا کر دی جائے کہ وہ بالکل دیسی گھی کی طرح نظر آتا ہو تو کیا اس کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اصل میں دیسی اور ڈالڈا گھی کی قیمتوں میں کافی فرق ہوتا ہے؟

الجواب:۔ بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی سے ایسے گھی کو دیسی گھی کی قیمت پر فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر ڈالڈا گھی کو دھوکہ اور فریب سے دیسی گھی ظاہر کرکے فروخت کیا جائے تو یہ تذویر اور تلبیس کے مترادف ہو کر ناجائز رہے گا۔

لما جاء في الحديث: عن ابي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر۔
(صحیح مسلم ج۲ ص۲ کتاب البیوع، باب بطلان الحصاۃ الخ)[2]

---

[1] قال العلامة عبد الله بن محمود الموصلي: ولا ينبغي للسلطان ان يسعر على الناس لما بينا الا ان يتعدى ارباب الطعام تعدياً فاحشاً في القيمة فلا بأس بذلك بمشورة اهل الخبرة به لأن فيه صيانة حقوق المسلمين عن الضياع - (الاختيار لتعليل المختار ج۴ ص۱۶۱ كتاب الكراهية، فصل في الاحتكار)

[2] وفي الهندية: رجل اراد ان يبيع السلعة المعيبة وهو يعلم يجب ان يبينها۔
(الفتاوى الهندية ج۳ ص۲۱۰ الباب العشرون في البياعات المكروهة والارباح الفاسدة)
ومثله في ردّ المحتار ج۵ ص۱۰۲ مطلب احكام نقصان المبيع فاسداً۔

زیادہ منافع کیلئے ذخیرہ اندوزی کرنا

سوال:۔ گاؤں یا شہر کی ضرورت کے باوجود ایک شخص غلہ خرید کر ذخیرہ کر لیتا ہے تاکہ مناسب وقت پر فروخت کر کے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکے، تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ تنگی اور عسرت کے دنوں میں غلہ خرید کر مصنوعی گرانی پیدا کرنے کے لیے ذخیرہ کرنا احتکار ہے جو شرعاً حرام ہے، تاہم اگر عوام الناس کی ضروریات کھلی منڈی میں آسانی سے پوری ہوتی ہوں تو پھر کسی چیز کو زیادہ منافع کی خاطر مؤخر کرنا جائز ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجالب مرزوق والمحتکر ملعون۔ (ابن ماجہ ص۱۵۶ باب الحکرہ)[1]

پنشن کی خرید و فروخت کا شرعی حکم

سوال:۔ آجکل ملازمت کے اختتام (ریٹائرمنٹ) پر سرکاری ملازمین کو حکومت کی طرف سے پنشن کے نام پر کچھ وظیفہ دیا جاتا ہے، اس وظیفے کا کچھ حصہ دورانِ ملازمت ملازم کی تنخواہ سے کاٹا جاتا ہے اور کچھ گورنمنٹ اپنی طرف سے ملاتی ہے، اس طرح یہ وظیفہ ریٹائر ہونے والے کو حکومت سے رفتہ رفتہ ملتا رہتا ہے، تو اگر اس وظیفہ کو فروخت کر کے یکمشت نقد رقم لے لی جائے تو کیا یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ وظیفہ درحقیقت دورانِ ملازمت محنت اور خدمت کے صلہ میں بطور اعزاز و اکرام کے ملازمت سے ریٹائر ہونے والے کو حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے جس میں بعض حصہ عطاءِ سلطانی اور بعض اپنی محنت کا حصہ ہوتا ہے، اس کی فروخت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو گورنمنٹ کے ہاتھ فروخت کرنا ہے اور ایک اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا ہے، تو حکومت کے علاوہ کسی اور پر فروخت کرنا چند خرابیوں کی وجہ سے مشروع نہیں کیونکہ اس میں اس رقم کو فروخت کیا جاتا ہے جو کہ ابھی اس کے قبضے میں آئی ہی نہیں اسلئے

---

[1] قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: ویکرہ الاحتکار فی اقوات الآدمیین والبھائم اذا کان ذٰلک فی بلدٍ یضر الاحتکار باھلہ وکذٰلک التلقی فاما اذا کان لا یضر فلا بأس بہٖ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۲۷ کتاب الکراھیۃ، فصل فی البیع)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۹ کتاب الاستحسان۔

غیر مقدور التسلیم ہونے کی بناء پر جائز نہیں، اسی لیے فقہاء کی عبارات اور احادیثِ نبوی میں اِس قسم کی بیع سے منع کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ثمنین کا آپس میں بیع کی وجہ سے دست بدست اور مثل بمثل ہونا ضروری ہے، جو کہ یہاں مفقود ہے۔ لہٰذا ان نقصانات اور خرابیوں کی وجہ سے اس (پنشن) کی بیع جائز نہیں۔ یہاں تک گورنمنٹ پر فروخت کرتا ہے تو یہ درحقیقت بیع نہیں بلکہ عطاءِ مؤجل کو معجل بنانا ہے اور وہ اس طرح کہ حکومت نے جو وظیفہ قسط وار حیثیت سے مقرر کیا تھا اب اس زیادہ وظیفہ کو نسبتاً کر کے یکمشت لیا جا رہا ہے۔ یعنی پہلی صورت میں تاجیل تھی اور اس میں یکبارگی حاصل کرنا ہے جس میں شرعی طور پر کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وبیع الدّین لایجوز ولو باعہ من المدیون او وھبہ جاز۔ (الاشباہ والنظائر ج۴ ص۱۴۔ القول فی الدّین) [1]

بیع میں اجل مجہول سے بیع فاسد ہو جاتی ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کے ساتھ معاملہ طے کیا کہ مجھ سے کچھ رقم لے لے اور اس کے بدلے آئندہ گندم کے موسم میں جو نرخ ہوگا اس کے مطابق مجھے گندم دے دینا، تو کیا یہ معاملہ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی معاملہ میں وقت کا تعین کرنا ضروری ہے، وقت کا تعین کیے بغیر معاملہ طے کرنا مفضی الی النزاع ہوتا ہے اس لیے شرعاً ایسے معاملات فاسد قرار دیئے جاتے ہیں۔ مذکورہ معاملہ بھی اسی قسم کا ہے، خواہ اسے بیع مطلق قرار دیا جائے یا بیع سلم، البتہ اگر یہ معاملہ قرض کا ہو تو پھر شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامۃ ظفر احمد عثمانیؒ: وقد اجمعوا علیٰ فساد السلم الی اجل مجھول ففساد البیع کذلک اوّل کما مر۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۵ ابواب البیع۔ دلیل فساد البیع الی اجل مجہول) [2]

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: واما بیع ھٰذہ الدیون من غیر من علیہ والشراء بھا من غیر من علیہ فینظر ان اضاف البیع والشراء الی الدین لم یجز۔ اھ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۸۲ کتاب البیوع، فصل واما شرائط الصحۃ فانواع)

[2] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: رجل باع شیئاً بیعاً جائزاً او اخرج الثمن الی الحصاد والدیاس قال مفید البیع فی قول ابی حنیفۃ۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۶ کتاب البیوع) ومثلہٗ فی شرح الوقایۃ ج۳ ص۶ کتاب البیوع۔

بغیر قیمت طے کی ہوئی بیع وشراء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے بغیر قیمت طے کئے مکئی کی کچھ گڈریاں کسی پر فروخت کر دیں اور یہ کہا کہ ان کا سائز عام گڈی سے زیادہ ہے، لیکن چار مہینے کے بعد خریدار نے لینے سے انکار کر دیا، شریعت کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بیع وشراء کرتے وقت قیمت مقرر کرنا ضروری ہے، قیمت کا تعین کئے بغیر معاملہ فاسد ہو جاتا ہے لہٰذا مذکورہ معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے اس لیے یہ بیع فاسد ہے، دونوں کو چاہیئے کہ اس معاملے کو دوبارہ طے کریں۔

کمافی السنن الکبریٰ مع الجوھر النقی ج ۶ ص۲۴ تحت لا یجوز السلف حتیٰ یکون بثمن معلوم الخ ۔[1]

قبول کا ایجاب کے مطابق ہونا ضروری ہے

سوال:۔ ایک آدمی اپنے جملہ مال کو یکمشت فروخت کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرا آدمی وہ مال ادھار لینے کا خواہشمند ہے اور مشتری بائع سے بات بھی کر جاتا ہے مگر بائع اس پر راضی نہیں، تو کیا اس سے بیع تام ہو گی یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ مشتری بائع کے ایجاب کے مطابق جواب دے یعنی بائع جتنا مال فروخت کرنا چاہتا ہو اتنے مال کے مطابق جواب دے، اگر مشتری بائع کے ایجاب سے زیادہ یا کم لینا چاہتا ہو تو وہ بائع کی رضامندی پر موقوف ہے، اگر وہ اجازت دے تو ٹھیک ورنہ بیع تام نہیں ہو گی۔

لمافی مجلۃ الاحکام: اذا اوجب احد العاقدین ببیع شیٔ بشیٔ یلزم لصحۃ العقد قبول العاقد الآخر علی الوجہ المطابق للایجاب ولیس لہٗ تبعیض الثمن او الثمن وتفریقھما۔ (شرح المجلۃ الاحکام لرستم باز ص۸۱ المادۃ ۱۷۷ الفصل الثانی فی بیان لزوم موافقۃ القبول والایجاب)

---

[1] قال ابن الھمام رحمہ اللہ: لقولہ علیہ السلام فی کیل معلوم ووزن معلوم الیٰ اجل معلوم الخ۔ (فتح القدیر ج ۶ ص۲۶۲ باب السلم۔)

ومِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص۵۸ کتاب البیوع۔

باب مایجوز بیعه وما لا یجوز

(جائز اور ناجائز بیع کے مسائل و احکام)

شراب کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ اسلام میں شراب کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اسلام میں شراب بنصِ قطعی ناجائز اور حرام ہے۔ بلکہ اس عمل کو شیطانی عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ قال اللہ تبارک وتعالیٰ: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ۔ (سورۃ المائدہ آیت ۹۰) اس لیے شراب کی خرید و فروخت حرام بلکہ بیع باطل ہے، لہٰذا مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

وفی الھندیۃ: فالباطل مالم یکن محلہ مالاً متقوماً کما لو اشتری خمراً او خنزیراً او صیدًا الحرم... الخ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج ۳ ص ۱۴۶ کتاب البیوع، الباب الحادی عشر فی احکام البیع لغیر الجائز) لہ

شراب کی آمدنی کے عوض اشیاء فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص جو کپڑے کا کاروبار کرتا ہے، اگر اس کو کسی گاہک کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ شراب کی آمدنی کے عوض کپڑا خرید رہا ہے تو اس گاہک پر کپڑا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسلمان کے لیے شراب فروشی کو ذریعۂ آمدن بنانا حرام اور ناجائز ہے اور نہ ہی اس آمدنی کے عوض دیگر اشیاء فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ شراب کی فروخت کے عوض آیا ہوا مال، مالِ غیر ہے مسلمان اُس کا مالک نہیں بن سکتا۔

لِمَا جَاءَ فِی الْحَدِیْثِ: ابو حنیفۃ عن محمد بن قیس الھمدانی عن ابی عامر الثقفی انہ

لہ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: الباطل مالا یجوز بحال ولہ صور منھا بیع الدم والخمر والخنزیر (خلاصۃ الفتاوٰی ج ۳ ص ۳۹ کتاب البیوع، الفصل الرابع فی البیع الفاسد واحکامہ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص ۵۳ کتاب البیوع باب البیع الفاسد۔

كان يهدى للنبي صلى الله عليه وسلم رواية من خمر..... فقال رسول عليه السلام يا ابا عامر ان الله تعالىٰ قد حرم الخمر فلا حاجة لنا فى خمرك قال خذها فبعها فاستعن بثمنها على حاجتك فقال يا ابا عامر ان الله تعالىٰ قد حرم شربها وبيعها واكل ثمنها

(المسند للامام الاعظم ص۳۷۳ باب حرمة اكل ثمن خمر) سلہ

دارالحرب میں شراب فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ دارالحرب میں مسلمان کے لیے کفار پر شراب فروختی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دارالحرب میں غیر مسلموں کا مال بلاغدر دھوکہ ان کی خوشی سے جس طرح بھی لیا جائے اس میں کوئی حرج نہیں، لہٰذا ان کا مال مباح ہو کر عقودِ فاسدہ سے حاصل کرنا اور شراب کے عوض لینا جائز رہے گا، تاہم نصوص کی اطلاق کو دیکھ کر عقودِ فاسدہ اور شراب فروشی سے اجتناب افضل ہے۔

لما قال ابن نجیم المصری رحمہ اللہ:۔ ولا بین الحربی والمسلم ثمۃ ای لا ربوا بینهما فی دار الحرب عندهما خلافا لابی یوسفؒ وفی البنایة وكذا اذا باع خمرًا او خنزيرًا او ميتةً او قامرهم واخذ المال كل ذٰلك يحل له۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۳۵ باب الربا) ۲ہ

شراب ملی ہوئی اشیاء کی خرید و فروخت

سوال: شراب ملی ہوئی اشیاء مثلاً ادویات وغیرہ کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں شراب چونکہ حرام اور نجس ہے اس لیے اس سے کسی قسم کا فائدہ لینا جائز نہیں، جس چیز میں شراب شامل ہو جائے وہ چیز حرام اور ناپاک ہو جاتی ہے اگرچہ قلیل مقدار میں کیوں

لہ قال المرغينانى رحمہ اللہ:۔ واذا باع المسلم خمرًا واخذ ثمنها وعليه دين فانه يكره لصاحب الدين ان ياخذ منه وان كان البائع نصرانيا لا بأس به۔ (الهداية ج۴ ص۴۶۸ كتاب الكراهية)

وَمِثْلُهٗ فى بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۸ كتاب الاستحسان۔

۲ہ وفى الهندية: دخل مسلم او ذمى دار الحرب بامان او لغيره وعقد مع الحربى عقد الربوا..... او باع منهم خمرًا او خنزيرًا او ميتةً او دمًا بمال فذٰلك كله جائز عند الطرفين۔

(الفتاوى الهندية ج۳ ص۲۴۸ الفصل السادس فى الصرف فى دار الحرب)

وَمِثْلُهٗ فى الدر المختار على صدر رد المحتار ج۵ ص۱۸۶ باب الربوٰ۔

نہ ہو، اس بناء پر جن ادویات اور دیگر اشیاء میں یقیناً یا ظنِ غالب سے معلوم ہو کہ ان میں شراب کی آمیزش ہے اور علاج کسی متبادل دوائی سے ممکن ہو تو ان کی خرید و فروخت اور استعمال سے اجتناب کرنا چاہیئے ۔

لما ورد فی الحدیث : فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یا ابا عامر ان اللہ تعالیٰ قد حرم الخمر فلا حاجة لنا فی خمرك قال خذها فبعها فاستعن بثمنها علی حاجتك فقال یا ابا عامر ان اللہ تعالیٰ قد حرم شربها وبیعها واکل ثمنها ۔ (المسند للامام اعظم ص۳۲۳ کتاب البیوع) [1]

الکحل ملی ادویات کی تجارت کی شرعی حیثیت

سوال :۔ الکحل ملی ہوئی ادویات کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر ادویات میں ملایا گیا الکحل انگور اور کھجور کے علاوہ دوسری اشیاء سے کشید کیا گیا ہو تو امام ابو حنیفہ ؒ اور امام ابو یوسف ؒ کے نزدیک اس دوا کا استعمال ضرورتاً جائز ہے گا بشرطیکہ حد سکر تک نہ پہنچا ہو، اور علاج کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے شیخین ؒ کے مسلک پر عمل کرنا مرخص ہو گا، تاہم اگر الکحل انگور یا کھجور سے حاصل کیا گیا ہو تو ان دواؤں کا استعمال شدید ضرورت اور اضطرار کے علاوہ جائز نہیں ۔ البتہ اگر یہ معلوم ہو کہ الکحل دواؤں میں ملانے کے بعد اس کی حقیقت اور ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں اس کی حقیقت ختم ہو کر ان ادویات کا استعمال بالاتفاق جائز ہو گا، لیکن یہ مسئلہ ماہرینِ فنِ طب کی مدد سے ہی حل ہو سکتا ہے ۔

لما قال العلامة المفتی تقی عثمانی :۔ وبهذا یتبین حکم الکحول المسکرة التی عمت بها البلوی الیوم فانها تستعمل فی کثیر من الادویة والعطور والمرکبات الاخری فانها ان اتخذت من العنب او التمر فلا سبیل الی حلتها او طهارتها وان اتخذت من غیرهما فالامر فیها سهل علی مذهب ابی حنیفة ولا یحرم استعمالها للتداوی او لاغراض مباحة اخری ما لم تبلغ حد الاسکار لانها انما تستعمل مرکبة مع المواد الاخری ولا یحکم بنجاستها اخذا بقول ابی حنیفة وان معظم الکحول التی تستعمل الیوم فی الادویة والعطور وغیرها لا تتخذ من العنب او التمر انما تتخذ من الحبوب او القشور او البترول وغیره ۔ (تکملة فتح الملهم ۳/۶۰۸ کتاب الاشربة ۴۴/۶)

---

[1] قال محمد بن الحسن الشیبانی ؒ : محمد عن یعقوب عن ابی حنیفة رحمه اللہ قال الخمر حرام قلیلها وکثیرها ۔ (الجامع الصغیر ص۳۹۸ کتاب الاشربة ۔

منشیات کی خرید و فروخت

سوال: افیون، چرس، بھنگ اور ہیروئن وغیرہ کی تجارت کا شریعتِ مقدسہ میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ افیون، چرس، بھنگ اور ہیروئن نشہ آور ہونے کی وجہ سے حرام ہیں لہٰذا حرام شے کی قیمت اور گناہ پر اعانت کی وجہ سے ان کی خرید و فروخت سے اجتناب کرنا چاہیئے کیونکہ ان اشیاء سے انسان کی دینی اور دنیوی بربادی لازم آتی ہے۔

لما قال علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ: وصح بیع غیر الخمر لما مر ومفادہ صحۃ بیع الحشیشۃ والافیون قلت وقد سئل عن بیع الحشیشۃ ھل یجوز فکتب لا یجوز فیحمل علیٰ انہ مرادہ بعدم الجواز عدم الحل قالہ المصنف۔
(الدر المختار مع رد المحتار ج۶ ص۴۵۴ کتاب الاشربۃ)[1]

تمباکو کی خرید و فروخت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! تمباکو کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ تمباکو کا استعمال از روئے شرع ممنوع نہیں لہٰذا استعمال کے مرخص ہونے کی بنا پر اس کی خرید و فروخت میں بھی کوئی قباحت نہیں جبکہ آجکل تمباکو فروشی ایک بہت بڑا ذریعہ معاش بن گیا ہے، غربت اور تنگی کے اس دور میں اس کا کاروبار کرنے میں کوئی شرعی جرم نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وبالجملۃ ان تثبت فی ھٰذا الدخان اضرارٌ صرف خالٍ من المنافع فیجوز الافتاء بتحریمہ ان لم یثبت انتفاعہ فالاصل حلہ مع ان فی الافتاء بحلہ دفع الحرج عن المسلمین فان اکثرھم مبتلون بتناولہ مع ان تحلیلہ ایسر من تحریمہ وما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما (تنقیح الفتاوی الحامدیہ ج۲ ص۳۶۶ مسائل وفوائد شتی الخ)[2]

---

[1] قال العلامۃ الحدادی الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشۃ والافیون وذٰلک کلہٗ حرام۔ (الجوہرۃ النیرۃ ج۲ ص۲۷۰ کتاب الاشربۃ۔

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۲۰۵ کتاب الاشربہ۔

[2] قال العلامۃ ابوالحسنات عبدالحی لکھنویؒ: فی رسالۃ رفع الالتباک فی حکم تعاطی بشجرۃ التمباک اما بیعھا وشرائھا فیجوز لامکان الانتفاع بھا۔ (مجموعۃ الفتاویٰ ج۲ ص۱۲۷ کتاب البیع)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۶ ص۴۵۹ کتاب الاشربۃ۔

ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کی خرید و فروخت

سوال:۔ تلاوتِ قرآنِ مجید، دینی پروگرام اور خبریں وغیرہ سننے کی غرض سے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ کا استعمال جائز امور میں ممکن ہے اس لیے ان کی خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں، تاہم یہ چیزیں کسی ایسے شخص کو دینا جس سے کسی خیر کی توقع نہ ہو بلکہ محض بے دینی کے امور میں استعمال کا یقین ہو تو تعاون علی المعصیت کے شبہ سے خالی نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: قلت وافاد کلامھم ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه تحریماً والا فتنزیهاً (قوله نھر) وعبارته وعرف بھذا انه لا یکره بیع ما لم تقم المعصیة به کبیع الجاریة المغنیة به والکبش النطوح۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۶۸ باب البغاۃ ... الخ)[1]

آلاتِ موسیقی کی خرید و فروخت

سوال:۔ باجا، ستار اور دیگر آلاتِ موسیقی کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ موسیقی چونکہ اسلام میں ناجائز اور حرام ہے، اس لیے وہ آلات جو محض موسیقی کے لیے استعمال ہوتے ہوں اور بغیر کسی تغیّر و تبدیلی کے ان سے موسیقی کا کام لیا جاتا ہو آلاتِ معاصی ہونے کی وجہ سے ان کی خرید و فروخت جائز نہیں ہوگی کیونکہ اس میں اعانت علی المعصیت ہونے کی وجہ سے جواز کی گنجائش نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: ویکره تحریماً بیع السلاح من اھل الفتنة لانه اعانة علی المعصیة..... قلت وافاد کلامھم ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه تحریماً والا فتنزیهاً نھر ونظیره کراھة بیع المعازف لان المعصیة تقام بھا۔ (رد المحتار ج۴ ص۲۶۸ کتاب السیر)[2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه وما لا فلا ولذا قال انه لا یکره بیع الجاریة المغنیة والکبش النطوح۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۴۳ باب البغاۃ)
ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۵۳ کتاب الاجارۃ۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: نظیره بیع المزامیر یکره ھنا ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه والا فلا۔ (البحر الرائق ج۵ ص۱۴۳ تبغییرٍ یسیر۔ آخر کتاب البغاۃ)
ومثله فی تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۲ ص۱۵۳ کتاب الاجارۃ۔

گمراہ کن کتابوں کی تجارت کرنا

سوال :۔ آجکل بعض لوگ بے دینی، فحش گوئی، فرضی ناول شرک و بدعات اور دیگر جرائم پیشہ لوگوں کے حالات اور سوانح پر مشتمل کتابوں کی تجارت کرتے ہیں، کیا یہ تجارت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ شریعتِ مقدسہ نے مسلمانوں کو شرک و بدعت، فحش ناول اور لادینیت پھیلانے والی کتابوں کے مطالعہ سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دین سے دوری اور گمراہی کا سبب بنتی ہیں، لہٰذا ایسی کتابوں کے مطالعہ اور تجارت سے اجتناب ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ یہی تاجر لادینیت کا آلۂ کار اور معاون بن جاویں تاہم راسخ العلم علماء کے لیے جواب دہی کی نیت سے ایسی کتابوں کے مطالعہ کی گنجائش ہے تاکہ لوگوں کو ان کے مطالعہ سے منع کریں۔

لما قال العلامة محمود آلوسیؒ : واستدل بعضهم على القول بان لهو الحديث الكتب التى اشتريها النضر بن الحارث على حرمة مطالعة التواريخ الفرس القديمة وسماع ما فيها وقرأته وفيه بحث ولا يخفىٰ ان فيها من الكذب ما فيها فالاشتغال بها لغير غرض دينى حوض فى الباطل ۔ (روح المعانی ج۷ ص۲۹ سورة المائدة) [1]

تعویذات کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال :۔ بعض لوگ تعویذات کی خرید و فروخت کا دھندہ اپنائے ہوتے ہیں اور لوگوں سے تعویذات کے پیسے وصول کرتے ہیں، کیا تعویذات کے عوض پیسے لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ تعویذ چونکہ علاج و معالجہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اس بناء پر جائز معاملات میں مشروع تعویذ کے عوض پیسے لینا اور دینا دونوں جائز ہیں۔ تاہم تعویذ فروشی کو اپنا ذریعۂ معاش بنانا مناسب نہیں۔

لما اخرج الامام محمد بن اسماعيل البخاریؒ : عن ابى سعيد الخدرى ان ناسًا من اصحاب النبىّ صلى الله عليه وسلم اتوا على حى من احياء العرب فلم يقروهم فبينما هم اذ لدغ

---

[1] قال العلامة عالم بن العلاء الانصاریؒ : اذا اصاب المسلمون الغنائم وكان فيما اصابوا مصحف فيه شئ من كتب اليهود والنصارىٰ ۔۔۔۔ فانه لا ينبغى للامام ان يقسم ذلك فى غنائم المسلمين مخافة ان يقع فى سهم رجل من المسلمين ۔۔۔۔ وبيعه من المشركين مكروه ۔ (الفتاوىٰ التاتارخانية ج ۵ ص ۳۱۳ كتاب السير۔ مسائل قسمة الغنائم)

سید اولئک ھل معکم دواءٌ اوراق فقالوانعم انکم لا تقرون ولا نفعل حتی تجعلوالنا جعلاً فجعلوالھم قطیعاً من الشاۃ فجعلوا یقرء بام القرآن و یجمع بزاقہ ویتفل فبرأ فاتوابالشاۃ فقالوالا ناخذہ حتی نسئال النبی علیہ السلام فسئالوہ فضحک وقال ما ادراک انھا رقیۃ خذوھاواضربوالی بسھم۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص۸۵۴ باب الرقی بفاتحۃ الکتاب ویذکر عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم) [1]

اخبارات کی خرید وفروخت

سوال :۔ اخبارات میں اکثر تصاویر ہوتی ہیں نیز ایسی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا ، کیا ایسے اخبارات کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اخبارات کی خرید وفروخت کا بنیادی مقصد ملکی اور غیر ملکی حالات وواقعات سے آگاہی حاصل کرنا ہوتا ہے ، باقی رہا تصاویر کا مسئلہ تو اس کا گناہ بنانے والے پر بہرحال میں رہے گا۔ البتہ اگر اخبارات ورسائل وغیرہ شائع کرنے کا مقصد صرف فحاشی اور عریانی کو فروغ دینا ہو اور اس سے معاشرہ کے افراد کی عادات اور اخلاق متاثر ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں ان کی خرید وفروخت سے اجتناب ضروری ہوگا ۔

لما قال علی بن سلطان القاری رحمۃ اللہ : قال اصحابنا وغیرھم من العلماء تصویر صورۃ الحیوان حرام شدید التحریم .... واما اتخاذ المصور بحیوان فان کان معلقاً علی حائطٍ سواء کان لہٗ ظل ام لا اوثوباً ملبوساً اوحمامۃ اونحوذٰلک فھو حرام واماالوسادۃ ونحوھا مما

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : ولا بأس بالمعاوضات اذاکتب فیھا القرآن .... اختلف فی الاستشفار بالقرآن بان یقرأ علی المریض والملدوغ الفاتحۃ اویکتب فی ورق ویعلق علیہ اوطستٍ ویغسل ویسقی وعن النبیؐ علیہ السلام انہ کان یعوذ نفسہ قال رضی اللہ عنہ وعلی الجواز عمل الناس الیوم وبہ وردت الآثار۔

(ردالمحتار ج ۶ ص۳۶۴ فصلٌ فی اللبس)

وَمِثْلُہٗ فی شرح المسلم للامام النوویؒ ج ۲ ص۲۲۴ باب جواز اخذ الاجرۃ علی الرقیۃ۔

یمتھن فلیس بحرام ۔ (المرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۸ ص۲۶۶ باب التصاویر) [1]

دوسرے ممالک سے مال خرید کر پہنچنے سے پہلے فروخت کرنا

سوال:۔ آجکل بڑے بڑے کاروباری لوگ دوسرے ممالک سے مال منگوا کر پہنچنے سے قبل ہی فروخت کر دیتے ہیں کیونکہ وہ مشتری کے نام پر خریدا ہوا مالِ تجارت مشتری کی ملک تصوّر کرتے ہیں، لہٰذا قبل القبض ان اشیاء کی فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: باقاعدہ طور پر قبضہ سے قبل مال فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں لیکن آجکل بڑے بڑے کاروباری لوگ دوسرے ممالک سے جو اشیاء منگواتے ہیں تو ان کے پہنچنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے جس میں بازار کی مندی کا اندیشہ ہوتا ہے اور گاہک کم ہونے کا بھی خطرہ رہتا ہے، لہٰذا ایسے مال کو فروخت کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) مال منگوانے والا گاہک کے ساتھ بیع کرنے کی بجائے بیع کا وعدہ کرلے کہ مال پہنچتے ہی آپ کے ہاتھوں اتنے داموں کے عوض فروخت کروں گا لہٰذا مال پہنچنے پر بیع درست ہوگی، البتہ اس صورت میں خلاف ورزی اگرچہ وعدہ خلافی ضرور ہے لیکن جانبین میں سے کسی ایک کے انکار کی صورت میں دوسرے کو بیع پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی کو یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنالیا جائے جو مال پہنچانے کا کاروبار کرتی ہو، اور مال پہنچانے کا کرایہ چونکہ خریدار پر ہوتا ہے اس لیے اس خریدار کے اِذن اور اجازت سے بایع جس کو بھی حوالہ کر دے وہ مشتری کی ملک اور قبضہ تصور ہوگا، اگرچہ خریدار اور مشتری اس شخص یا مال بردار کمپنی کا تعین بھی نہ کرے، اس بنا پر جب بھی مال اُس شخص یا مال بردار کمپنی کی تحویل میں آجائے تو یہ خریدار اور مُشتری کی ملک تصوّر ہو کر بیع

---

[1] قال العلامة فخر الدين الشهير بقاضي خان: واذا سأل الرجل غيره الاخبار المحدثة في البلد قال بعضهم يكره الاخبار والاستخبار وقال بعضهم لا يكره الاستخبار ويكره الاخبار والصحيح انه لا بأس بالاخبار ايضاً ليكون عالماً بالمصالح ۔ (خانیہ علی ہامش الہندیہ ج۳ ص۴۲۵)
وَمِثْلُهُ في الصحيح البخاري ج۱ ص۲۸۳ باب کم یجوز الخیار ۔

جائز رہے گی۔

مندرجہ بالا دو صورتوں کے علاوہ قبل القبض مال فروخت کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم رحمه الله : رجل اشترٰی عبداً و لم یقبضه فامره ان یهبه من فلان ففعل البائع ذٰلك و دفعه الی الموهوب له جازت الهبة و صار المشتری قابضاً و کذا لو امر البایع ان یواجره فلاناً معیّناً او غیر معینٍ ففعل جاز وصار المستاجر قابضاً للمشتری اولاً ثم یصیر قابضاً لنفسه والاجر الذی یاخذه البایع من المستاجر یحسبه من الثمن ان کان من جنسه۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۷ باب المرابحة والتولیة) [۱]

کُتّے کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ کُتّے کی خرید و فروخت ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جائز فائدے اور نفع کے لیے کُتّے کی خرید و فروخت کی اجازت دی ہے مثلاً شکار یا چوکیداری یا فصل وغیرہ کی حفاظت کی خاطر کُتّا خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً مرخّص ہے۔

لما قال النبیّ صلی الله علیه وسلم : ابوحنیفة عن الهیثم عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال رخّص رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ثمن کلب الصید۔

(المسند للامام الاعظم ص۳۱۹ باب الرخصة فی ثمن کلب الصید) [۲]

---

[۱] لما قال فی الهندیة : اذا قال المشتری للبایع ابعث الی ابنی و استاجر البایع رجلاً یحمله الی ابنه فهٰذا لیس بقبضٍ و الاجر علی البایع الا ان یقول استاجر علیّ من یحمله فقبض الاجیر یکون قبض المشتری ان صدّقه انه استاجر ودفع الیه وان انکر استئجاره والدفع الیه فالقول قوله کذا فی التاتارخانیة۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۹ الباب الرابع فی حبس المبیع بالثمن)

ومثله فی ردّ المحتار ج۵ ص۱۴۹ مطلب فی تصرف البائع فی المبیع قبل القبض۔

[۲] قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمه الله :۔ یجوز بیع الکلب ...... ولانه ینتفع به حراسةً واصطیاداً فکان مالاً فیجوز بیعه۔ (الهدایة ج۳ ص۱۰۳ مسائل منثورة، کتاب البیوع)

ومثله فی ردّ المحتار ج۵ ص۲۲۷ باب المتفرقات، کتاب البیوع۔

پرندوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ پرندوں کو پکڑ کر فروخت کرتے ہیں، مثلاً چیل، باز، تیتر اور بٹیر وغیرہ پرندوں کو پکڑ کر خوب نفع کماتے ہیں، تو کیا از روئے شریعت یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت مقدسہ نے پرندوں کے شکار اور پکڑنے کو جائز قرار دیا ہے اور ان کی خرید وفروخت کی بھی اجازت دی ہے، اس معاملہ میں فریقین کی رضامندی سے جو بھی قیمت متعین کی جائے شرعاً مرخص ہوگی، تاہم آپس میں لڑانے کے لیے خرید وفروخت سے اجتناب کیا جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: وصح بيع الكلب..... وكذا الطيور اى الجوارح والفهد والبازى يقبلان التعليم فيجوز بيعها على كل حالٍ۔

(رد المحتار ج۵ ص۲۲۷ باب المتفرقات، كتاب البيوع) [1]

خنزیر کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا اسلام میں خنزیر کی خرید وفروخت کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے چونکہ خنزیر کو نجس العین اور حرام قرار دیا ہے اور خنزیر سے ہر قسم کے انتفاع اور اس کی خرید وفروخت کو بھی ناجائز اور حرام قرار دیا ہے، اس لیے کسی مسلمان کیلئے اسلامی نقطۂ نظر سے خنزیر کو ذریعۂ آمدن بنانا قطعاً زیبا نہیں، یہی وجہ ہے کہ شرعاً خنزیر جب عقد میں خواہ مبیعہ ہو یا ثمن ہو تو عقد باطل ہے لہٰذا خنزیر کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ تاہم جب اسلامی ملک میں ذمی رہائش پذیر ہوں تو اُن کو آپس میں اس کی خرید وفروخت کی گنجائش موجود ہے۔

لما قال العلامة مرغينانى رحمه الله: اذا كان احد العوضين او كلاهما محرّمًا فالبيع فاسد كالبيع بالميتة والدم والخمر والخنزير۔ (الهداية ج۳ ص۵۳ باب البيع الفاسد) [2]

---

[1] قال فى الهندية: وكذا بيع السنور وسباع الوحش والطير جائز عندنا معلمًا كان اولم يكن كذا فى الفتاوىٰ قاضيخان۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۳ ص۱۱۴ الفصل الرابع فى بيع الحيوانات)

وَمِثْلُهٗ فى البرجندى ج۳ ص۱۲ كتاب البيوع۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيدؒ: ولو باع الخمر والخنزير كان باطلاً باعها من مسلم اولمسلم۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۳ ص۱۱ كتاب البيوع الباب الرابع فى البيع الفاسد واحكامه)

وَمِثْلُهٗ فى الهندية ج۳ ص۱۲۶ كتاب البيوع الباب الحادى عشر فى احكام البيع الغير الجائز۔

مردار جانور کی کھال رنگنے کے بعد فروخت کرنا

سوال: مرے ہوئے غیر مذبوح جانور کی کھال نکال کر باقاعدہ طور پر رنگنے کے بعد فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے غیر مذبوح جانور سے انتفاع ممنوع قرار دیا ہے لیکن اس کی کھال کو باقاعدہ رنگنے یا خشک کرنے کے بعد فروخت کرنا جائز قرار دیا ہے۔

لما ورد فی الحدیث: عن عبداللہ بن عباسؓ اخبرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر بشاۃٍ فقال ھلا استمتعتم باھابھا قالوا انھا میتۃ قال انما حرّم اکلھا۔

(رواہ البخاری ج۱ ص۲۹۶ باب جلود المیتۃ قبل ان تدبغ) ۲؎

مُردار جانور کی ہڈیاں فروخت کرنا

سوال:۔ مردار جانور جس کے کھانے سے شریعت نے منع فرمایا ہے، تو کیا ان کی ہڈیوں کو جمع کرکے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں جبکہ اس جانور کو باقاعدہ طور پر ذبح نہیں کیا گیا ہو؟

الجواب:۔ خنزیر کے علاوہ دیگر مردار جانوروں کی کھال رنگنے سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں لیکن ہڈی، بال اور اُون کی خرید و فروخت شرعاً مرخص ہے کیونکہ کسی جانور کی موت کی وجہ سے اس کی یہ اشیاء ناپاک نہیں ہوتیں۔ لہٰذا اگر جانور باقاعدہ مذبوح نہ بھی ہو تو اس کی ہڈی، بال اور اُون کی فروخت جائز اور مرخص ہے۔

لما قال المرغینانیؒ: ولا بأس ببیع عظام المیتۃ وعصبھا وصوفھا وقرنھا وشعرھا ووبرھا والانتفاع بذٰلک کلہ لانھا طاھرۃ لایحلھا الموت لعدم الحیاۃ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۵۸ باب البیع الفاسد) ۲؎

۱؎ قال العلامۃ الزیلعیؒ: وجلد المیتۃ قبل ان تدبغ یعنی لایجوز بیعہ وبعدہ یباع وینتفع بہ ------ یعنی بعد الدباغ یجوز بیعہ۔ (تبیین الحقائق ج۴ ص۵۱ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۵۵ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد۔

۲؎ قال العلامۃ الزیلعیؒ: وجلد المیتۃ قبل الدباغ وبعدہ یباع وینتفع بہ کعظم المیتۃ وعصبھا وصوفھا وقرنھا ووبرھا یعنی بعد الدباغ یجوز بیعہ کما یجوز بیع عظم المیتۃ۔

(تبیین الحقائق ج۴ ص۵۱ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۲ ص۱۳۳ کتاب البیع فصل فی البیع الباطل۔

گندگی کھانے والے جانوروں کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض جانور مثلاً مرغی اور بکری وغیرہ گندگی اور بدبودار اشیاء کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر ایسی اشیاء کھانے کی وجہ سے ان سے بدبو محسوس ہوتی ہو تو ایسی حالت میں ان کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ جانور گندگی کھانے کی وجہ سے بدبودار ہو گئے ہوں تو ایسی صورت میں ان کا کھانا اور خرید و فروخت مکروہ ہے تاہم اگر ان کو گندگی کھانے سے روک لیا جائے اور بدبو زائل ہونے تک بند رکھا جائے تو پھر ان کے کھانے اور خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: الجلالۃ التی تأکل العذرۃ کرہ لحمہا وتحبس الجلالۃ حتی یذھب نتن لحمہا وفی المنتقی الجلالۃ المکروھۃ التی اذا قربت وجدت منہا رائحۃ فلا تؤکل ولا یشرب لبنہا ولا یعمل علیہا وتلک حالہا ویکرہ بیعہا وھبتہا وتلک حالہا۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۳۴۰ کتاب الحظر والاباحۃ)[1]

ریچھ کو ذبح کر کے روغن نکال کر فروخت کرنا

سوال:۔ ریچھ کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنے کے بعد اس کے گوشت سے روغن اور تیل نکالا جاتا ہے تاکہ جانوروں کو کھلا کر اُن کی قوت بڑھائی جا سکے، تو کیا اس طریقہ سے روغن نکال کر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باقاعدہ ذبح شرعی سے حرام جانور کا گوشت اور کھال وغیرہ پاک ہو جاتے ہیں، اس بناء پر اس کے گوشت وغیرہ سے روغن یا تیل نکال کر انسانوں کی خوراک کے علاوہ مویشیوں اور دیگر ضروریات کے لیے استعمال کرنا جائز ہے، ایسی خرید و فروخت بھی جائز ہے

لما قال فی الھندیۃ: واما حکمہا فطہارۃ المذبوح وحل اکلہ من الماکول

---

[1] قال ابن نجیمؒ: ولا تؤکل الجلالۃ ولا یشرب لبنہا لانہ علیہ السلام نہی عن اکلہا وشرب لبنہا والجلالۃ التی تعتاد اکل الجیف ولا تخلط فیکون لحمہا منتنا ولو حبست حتی یزول النتن حلت۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۸۲ فصل فی الاکل والشرب)

ومثلہ فی الھندیۃ ج۶ ص۳۰۸ الفصل الثانی عشر فی الاجارات والمزارعات۔

وطهارة غير المأكول للانتفاع لا لجهة الاكل كذا في محيط السرخسي ۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۸۲ کتاب المعاملة ۔الباب الثانی فی المتفرقات) ؎۱

قبل الدباغ مردار جانور کی کھال کی فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں مردار جانوروں کی کھال اتار کر رنگنے سے قبل ہی فروخت کر دی جاتی ہے، کیا ایسی کھال کا استعمال و فروخت جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مردار جانور کے اجزاء سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا شرعاً ممنوع ہے، لہٰذا اُس کی کھال اتار کر دباغت (رنگنے) سے قبل فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے، تاہم کھال کو باقاعدہ دباغت کے بعد استعمال کرنے اور فروخت کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ : ولا بیع جلود المیتة قبل ان تدبغ لانه غیر منتفع به ولا بأس ببیعها والانتفاع بها بعد الدباغ ۔ (الهدایه ج۳ ص۵۸ باب البیع الفاسد) ؎۲

جاندار اشیاء کے مجسموں کی خرید و فروخت

سوال:۔ اگر کھلونوں کو مُرغ، بطخ، کبوتر اور دیگر جانوروں اور پرندوں کی شکل پر بنایا جائے تو کیا ایسے کھلونوں کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بلاضرورت تصویرکشی ازروئے شرع ممنوع عمل ہے اس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانوروں اور پرندوں کی اشکال والے کھلونوں کی خرید و فروخت سے اجتناب کرے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک موقع پر اس سے منع کرتے ہوئے یوں فرمایا۔

لما ورد فی الحدیث : فقال ابن عباسؓ لا احدثك الا ما سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم

؎۱ قال فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ : فجاز بیعه ولحوم السباع وشحومها وجلودها بعد الزکاة کجلود المیتة بعد الدباغ حتی یجوز بیعها والانتفاع بها فی غیر الاکل لطهارته بالزکاة ۔

(تبیین الحقائق ج۴ ص۵ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۴۲ کتاب الاضحیة ۔

؎۲ قال ابن نجیم رحمه الله : (وجلد المیتة قبل الدبغ) ای لم یجز بیعه لانه غیر منتفع به ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۸۱ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۱۱۵ کتاب البیوع، الفصل الخامس فی بیع المحرم الصید... الخ

يقول سمعته يقول من صوّر صورة فان الله معذبه حتى ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها ابداً فربا الرجل ربوة شديدة واصفر وجهه فقال ويحك ان ابيت الا ان تصنع فعليك بهذا الشجر كل شئ ليس فيه روح۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص۲۹۶ باب بیع التصاویر التی لیس فیها روح وما یکرہ من ذٰلک)[۱]

مُرغیوں کو وزن کر کے فروخت کرنا

سوال:۔ زندہ مُرغیوں کو تول کر (وزن کر کے) فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جاندار اشیاء عددی متفاوت ہونے کی وجہ سے وزناً یا پیمانے کے ذریعے فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ سانس لینے کی وجہ سے ان کے وزن میں گھٹنے بڑھنے کا احتمال ہوتا ہے جو کہ مفضی الی المنازعہ ہے، البتہ دورِ حاضر میں لوگ اس معمولی گھٹنے بڑھنے کو کوئی وقعت نہیں دیتے تو نزاع نہ ہونے کی صورت میں ایسی بیع جائز ہونی چاہیئے کیونکہ فی زمانہ عادات اس پر مبنی ہیں جبکہ ایامِ ماضیہ میں عادت کی وجہ سے ایسی بیع کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

لما قال المرغینانیؒ: لان الحیوان لا یوزن عادتاً ولا یمکن معرفة ثقله بالوزن لان یخفف نفسه مرة ویثقل اخریٰ۔ (الہدایۃ ج ۳ ص۸۴ کتاب البیوع۔ باب الربوٰ)[۲]

آزاد عورت کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ بہن یا بیٹی کی شادی کے وقت والد یا سرپرست مہر کے نام سے بہت سی رقم وصول کر کے خود استعمال کرتے ہیں جبکہ اس میں سے تھوڑا بہت جہیز میں بھی لگاتے ہیں، کیا اس طریقہ سے لیے ہوئے مال کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ مہر میں مبالغہ بہتر نہیں بلکہ

---

[۱] قال العلامة الحصکفیؒ: اذا ثبت کراهية کسبهما للتختم ثبت کراهية بيعها وضعها لما فيه من الاعانة على ما يجوز وکل ما ادى الى ما لا يجوز لا يجوز۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص۳۶۰ فصل فی اللبس)

وَمِثْلُهٗ فی عمدة القاری ج ۲ ص۳۸ باب بیع التصاویر، الخ

[۲] قال ابن الھمامؒ: وانما قلنا ان الحیوان لیس بموزون لانه لا یوزن عادةً فلیس فیه احد المقدرین الشرعیین الوزن او الکیل۔ (فتح القدیر ج ۶ ص۱۶۷ باب الربا۔ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی العنایة علی هامش فتح القدیر ج ۶ ص۱۶۷ باب الربا۔

متوسط درجہ کا ہونا چاہیئے اور مہر جس کے حق میں رکھا جائے تو وہ اسی کا حق ہوگا اُس کی اجازت کے بغیر کسی اور کو اس کے استعمال کا حق نہیں ۔ اور بعض علاقوں کا مذکورہ رواج آزاد عورت کی خرید و فروخت کے مترادف ہے جبکہ ظاہری طور پر اسے مہر کا نام دیا جاتا ہے، لہٰذا یہ ناجائز و حرام ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله : وبطل بیع مالیس بمال کا لدم والمیتة والحر
(تنویر الابصار علی صدر ردالمحتار ج ۵ ص۵۲ باب البیع الفاسد) [1]

خون کے جل کر راکھ ہو جانے پر اسکی تجارت کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! آجکل اکثر بڑے شہروں بلکہ بعض دیہاتوں میں بھی جانوروں کے خون کی تجارت عام ہے کہ مذبح خانوں سے خون جمع کر کے جلا لیا جاتا ہے اور اس کی راکھ کو فارمی مرغیوں کی خوراک تیار کرنے والی فیکٹریوں پر فروخت کر دیا جاتا ہے، کیا اس طرح جانوروں کے خون کی تجارت کرنا شرعاً جائز ہے ؟

الجواب :- کسی جانور کا خون اگرچہ مال متقوم نہیں کہ اس کو فروخت کیا جائے لیکن بسا اوقات عرف کی وجہ سے ضرورت کے تحت ایک غیر مال بھی مال بن جاتا ہے اور فقہاء اسلام نے اس کی بیع کو جائز قرار دیا ہے، مثلاً گوبر وغیرہ ۔ تو صورتِ مسئولہ کے مطابق آجکل جانوروں کے خون سے چونکہ فارمی مرغیوں کی خوراک بنتی ہے اور ضرورت کے تحت عموماً اس کا کاروبار ہوتا ہے اسلئے بناء بر عرف اس کو مال سمجھا جائے گا۔ اور مذکورہ صورت میں تو وہ خون خون ہی نہیں رہتا بلکہ جل کر راکھ بن جاتا ہے، اس لیے جلے ہوئے خون کی تجارت بلاشک و شبہ جائز ہے۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانی رح : یہ بیوپار جائز ہے ..... ان اقوال کا مقتضاء یہ ہے کہ اگر کسی وقت خون کی قیمت بھی عرفاً ہو جائے تو اسکی بیع و شراء صحیح ہے اور خون کی راکھ تو پاک ہے اس کی بیع صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ (امداد الاحکام جلد ۳ ص۳۵۴، ۳۵۵ کتاب البیوع)

خون کی خرید و فروخت کے احکام

سوال :- خون کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- خون چونکہ مالِ متقوم نہیں اسلئے شرعاً اس کے

---

[1] قال علی بن ابی بکر المرغینانی رح : اذا کان احد العوضین او کلاهما محرماً فالبیع فاسد وکذا اذا کان غیر مملوک کالحر ۔ (الهدایة ج ۳ ص۵۳ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد)
وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام المادة ص۲۱۱ الفصل الثانی فیما یجوز بیعه ومالا یجوز)

خرید وفروخت جائز نہیں، تاہم اگر کسی مریض کے لیے شدید ضرورت کے وقت بلاقیمت خون نہ ملتا ہو تو قیمت دے کر اس کے لیے خون خریدنا تداوی بالمحرم کی وجہ سے مرخص ہوگا لیکن خون دینے والے کیلئے قیمت لینا جائز نہیں تاکہ خون متاع بازار نہ بن جائے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: یطل بیع ما لیس بمالٍ ای لیس بمال فی سائر الادیان کالدم۔ (ردّ المحتار ج۵ ص۵۱ مطلب لبیع الموقوف من قسم الصحیح) [۱]

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ بعض حالات میں کسی مریض کو آنکھ، گردہ یا اور کسی انسانی عضو کی ضرورت ہوتی ہے، تو کیا ان اعضاء کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ انسان کو مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ نے مکرم اور مشرف پیدا فرمایا ہے، اسی تکریم اور شرافت کے پیش نظر انسانی اعضاء کی خرید وفروخت جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں انسانی اعضاء متاعِ بازار بن کر اُن کی عظمت متاثر ہو کر اہانت لازم آئے گی، تاہم بامر مجبوری مرخص ہوسکتا ہے۔

لما قال العلامة کمال الدین ابن الھمامؒ: والانتفاع بہ لان الآدمی مکرم غیر مبتذل فلا یجوز ان یکون شئ من اجزائہ مھانا ومبتذلا وفی بیعہ اھانۃ لہٗ وکذا فی امتھانہ بالانتفاع۔ (فتح القدیر ج۶ ص۶۳ باب البیع الفاسد) [۲]

جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرنا

سوال: جنگل سے لکڑیوں کو کاٹ کر فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جنگل اگر کسی قوم، قبیلے یا حکومت کی باقاعدہ مملوک اور ملکیت نہ ہو تو اس سے لکڑیاں وغیرہ جمع کر کے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے لیکن اگر جنگل کسی کی ملکیت ہو تو چونکہ اس میں

---

[۱] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: لم یجز بیع المیتة والدم لانعدام المالیة التی ھی رکن البیع۔ (البحر الرائق ج۶ ص۷ باب البیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۴۴ باب البیع الفاسد۔

[۲] قال العلامة الکاسانیؒ: والآدمی بجمیع اجزائہ محترم مکرم ولیس من الکرامة والاحترام ابتذالہ بالبیع والشراء۔ (البدائع والصنائع ج۵ ص۱۴۵ کتاب البیوع، فصل واما الذی یرجع الی المقصود.....الخ)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۳۷۲ فصل فی النظر والمس۔ کتاب الحظر والاباحة۔

دیگر شرکاء کی حق تلفی کا اندیشہ ہے لہٰذا ان کی رضامندی کے بغیر فروخت کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: والحطب فی ملك رجل لیس لاحدٍ ان یحتطبه بغیر اذنه وان كان غیر ملكٍ فلا باس به ولا یضر نسبة الیٰ قریةٍ او جماعةٍ مالم یعلم ان ذٰلك ملك لهم وكذٰلك الذرنبخ والكبریت والثمار فی المروج والاودیة۔

(رد المحتار ج۶ ص۴۴۰ فصل الشرب)[1]

قبرستان کے درخت کاٹنے سے قبل فروخت کرنا

سوال:۔ قبرستان کے درختوں کو کاٹنے سے قبل فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قبرستان کی زمین اگر باضابطہ طور پر وقف کی گئی ہو تو اس زمین کے درخت ذاتی استعمال میں نہیں لائے جا سکتے البتہ ان درختوں میں سے غیر پھلدار درخت قبل القلع فروخت کرنا جائز ہے اور پھلدار درختوں کو قبل القلع فروخت کرنا جائز نہیں، اور ان درختوں کو فروخت کرکے حاصل ہونے والی رقم کو قبرستان کی ضروریات میں خرچ کیا جائے گا، کسی شخص کو یہ رقم خود اپنی ضروریات میں خرچ کرنے کا اختیار نہیں۔

لما قال العلامة عالم بن العلاء الانصاری رحمه الله: وفی الجامع وفی فتاویٰ ابن الفضل سئل عن اشجار موقوفة مع الارض ایجوز بیعها قال لا یجوز قبل القلع كبیع الارض وبعد القلع یجوز۔ وقال ایضاً الاشجار الموقوفة اذا كانت غیر مثمرة یجوز بیعها قبل القلع لانها هی الغلة بعینها والمثمرة لم یجز بیعها الا بعد القلع

---

[1] قال العلّامة سلیم رستم باز رحمه الله: الاشجار التی تنبت بلا غرس فی الجبال المباحة غیر المملوكة (بعد فی یسیر) والقبر والزرنیخ والفیروزج كالشجر فمن اخذ من هٰذه الاشیاء ضمن والحطب فی ملكٍ رجلٍ لیس لاحدٍ ان یحتطبه بغیر اذنه وان كان فی غیر ملكٍ فلا باس به ولا تضر نسبته الیٰ قریة او جماعة مالم یعلم ان ذٰلك ملك لهم۔

{شرح المجلة تحت المادة ج۲ ص۱۲۴۳
الفصل الاوّل فی الاشیاء المباحة۔}

ومثلهُ فی الجامع الفصولین ج۲ ص۲۶۶، ۲۶۷، الفصل الخامس والثلاثون فیما یمنع عنه مالا یمنع

کبناء الوقف والباب لا یجوز بیعه قبل الدفع - (التاتارخانیة ج۵ ص۸۷۵ کتاب الوقف ، مسائل وقف الاشجار) [۱]

خودرو گھاس کی خرید و فروخت کرنا

سوال:- اگر کسی کی مملوکہ زمین میں خودرو گھاس ہو تو اس کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- خودرو گھاس چاہے مملوکہ زمین میں کیوں نہ ہو کاٹنے سے قبل اس کی خرید و فروخت جائز نہیں، تاہم اگر خودرو گھاس کے لگانے اور حفاظت کرنے میں مالکِ زمین کی محنت بھی شامل ہو مثلاً اس کے اردگرد خندق یا کانٹے دار تار وغیرہ سے حفاظت کرے اور اس کو پانی وغیرہ دے تو اِس محنت کی وجہ سے مالکِ زمین کے لیے اس خودرو گھاس کی خرید و فروخت جائز ہو گی۔ بشرطیکہ اس گھاس کو کاٹ کر فروخت کی جائے۔

لما قال النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم : عن رجلٍ من مهاجرین من اصحاب النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم قال غزوت مع النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثاً اسمعه یقول المسلمین شرکاء فی ثلاث الماء والکلاء والنار۔ (ابوداؤد ج۲ ص۱۲۶) [۲]

اپنے مملوکہ درخت سے شہد فروخت کرنا

سوال:- اگر کسی شخص کی اپنی مملوکہ زمین میں درخت ہو اور اس میں شہد کی

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ ، وفی البزازیة وقال الفضلی و بیع الاشجار الموقوفة مع الارض لا یجوز قبل القلع کبیع الارض۔ وقال ایضاً اذا لم تکن مثمرة یجوز بیعها قبل القلع۔ ایضاً لانه غلتها والمثمرة لاتباع الا بعد القلع کبیع البناء الوقف بحر۔

(تنقیح الفتاویٰ حامدیة ج۱ ص۱۱۵ فی مطلب بیع الاشجار الوقف)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۴۱۷ الباب الخامس فی ولایة الوقف وتصرف القیم۔

[۲] قال فی الهندیة : ولا یجوز بیع الکلاء واجارته وان کان فی ارض مملوکة غیر ان لصاحبها ان یمنع الدخول فی ارضه ..... هٰذا اذا نبت بنفسه فاما اذا کان سقی الارض واعدها للانبات فنبت ففی الذخیرة والمحیط والنوازل یجوز بیعه لانه ملکه وهو مختار الشهید ۔

(الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۱۰۹ الفصل الثانی فی بیع الثمار وانزال الکروم والاوراق الخ)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۷۷ باب البیع الفاسد۔

مکھیاں شہد بنالیں تو اس شہد کی فروخت کا اختیار اس مالکِ زمین کو ہوگا یا ہر شخص اس کو کاٹ کر فروخت کر سکتا ہے ؟

الجواب:۔ اپنی مملوکہ زمین میں شہد کی فروخت اور دیگر مالکانہ تصرفات کا حق صرف زمین کے مالک کو حاصل ہے، کیونکہ شہد درخت کے تابع ہوکر درخت کے حکم میں ہے ۔ اس بناء پر چونکہ درخت میں تصرف کا حق صرف مالکِ زمین کو حاصل ہے اس لیے شہد پر اختیار بھی اسی کو حاصل ہوگا لہٰذا کسی دوسرے شخص کو اس کی فروخت وغیرہ کا کوئی اختیار حاصل نہیں ۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: بخلاف ما اذا عسل النخل فی ارضه لانه عد من انزاله فیملکه تبعاً لارضه کالشجر النابت فیه والتراب المجتمع فی ارضه بجریان الماء ۔
(الهداية ج ٣ ص١٠٦ مسائل منثورة ۔ كتاب البيوع) [1]

خریدکردہ درخت کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا حکم

سوال: ایک شخص نے کسی سے چند درخت خریدے، کاٹتے وقت دونوں میں کچھ تیز گفتگو ہوئی کہ درختوں کو کہاں سے کاٹا جائے، مالکِ زمین اوپر سے کاٹنے پر مصر ہے جبکہ مشتری جڑ سے اکھاڑنا چاہتا ہے ، کیا از روئے شریعت اس میں کوئی حد مقرر ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بیع و شراء کے وقت اگر درختوں کا سودا بلاکسی شرط کے ہُوا ہو تو مشتری کیلئے درختوں کا جڑ سے اکھاڑنا جائز ہے ، لیکن اگر سودا طے کرتے وقت سطحِ زمین سے کاٹنے کی شرط لگائی گئی ہو تو سطحِ زمین سے ہی کاٹنا ہوگا، اور اگر جڑ سے اکھاڑنے کی صورت میں قریبی کنوئیں یا دیوار وغیرہ کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو پھر جڑ سے اکھاڑنے کی بجائے سطحِ زمین سے کاٹنا ہوگا ۔

لما قال ابن نجیم المصری رحمه الله : وفیها اذا اشتری شجرة للقلع فانه یومر بقلعها بعروقها ولیس له حفر الارض الی انتهاء العروق بل یقلعها علی العادة الا ان شرط

---

[1] قال ابن نجیم المصری رحمه الله : بخلاف معسل النحل فی ارضه حیث یملکه وان لم تکن ارضه معدة لذلك من انزال الارض حتی یملکه تبعاً لها کالاشجار النابتة ۔ (البحر الرائق ج ٦ ص١٧٨ باب المتفرقات ۔ كتاب البيوع)
ومثله فی رد المحتار ج ٥ ص٣٥١ كتاب البيوع ۔

للبایع القلع علیٰ وجہ الارض اویکون فی القلع من الاصل مضرۃ علی البایع کما اذا کانت بقرب حائطٍ او بئرٍ لانہ یقطعہا علیٰ وجہ الارض۔ (البحر الرائق ج۵ ص۲۹۴ کتاب البیع، فصل یدخل البناء والمفاتیح فی بیع الدار) [1]

باغ کے بعض پھل ظاہر ہوں جبکہ بعض ظاہر نہ ہوں ایسی حالت میں باغ کی فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ باغ کے صرف بعض پھل ظاہر ہونے پر خریدار پر بیچ دیتے ہیں، جبکہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ پھل کی مقدار کیا ہوگی یا مستقبل میں اس کی کیفیت کیا ہوسکتی ہے، اسی حالت میں اگر باغ فروخت کیا جائے تو شرعی نقطۂ نظر سے اس کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ ایسی حالت میں درخت میں ایسے پھل بھی ہوسکتے ہیں جن کا ابھی وجود نہیں ہوتا ہے؟

الجواب:۔ شرعی نقطۂ نظر سے کسی چیز کی فروخت کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ مبیعہ عقد کے وقت موجود ہو تاکہ بائع مشتری کو سپرد کر کے اپنی ذمہ داری فارغ کرے۔ صورتِ مذکورہ میں جو پھل ظاہر ہو خواہ انسان کے کھانے کی صلاحیت رکھتا ہو یا حیوانات کی، اس کی خرید و فروخت جائز ہے، لیکن اگر باغ فروخت کرتے وقت پھل ظاہر نہ ہو تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ ہے کہ پھل ابھی بالکل ظاہر نہ ہو تو یہ عقد بیع معدوم ہوکر ناجائز ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بعض پھل ظاہر ہو لیکن روز بروز باغ میں مزید پھل ظاہر ہوتا رہتا ہو، ایسی حالت میں اگر مالک موجودہ پھل فروخت کرے لیکن جو پھل ابھی ظاہر نہیں ہوئے تو ظاہر المذہب کی رُو سے اس کی بیع فاسد رہے گی۔

لیکن عمومِ بلویٰ اور ضرورت کو دیکھ کر علماء کرام نے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اور جو پھل ابھی پیدا ہو رہے ہوں تو اس کے لیے باغ کے اجارہ کے عوض مشتری کے لیے

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اشتریٰ شجرۃ للقلع یؤمر بقلعہا بعروقہا ولیس لہٗ حفر الارض الیٰ انتہاء العروق بل یقلعہا علی العادۃ الا ان شرط البائع القطع علیٰ وجہ الارض اویکون فی القلع من الاصل مضرۃ للبایع لکونہا بقرب حائطٍ او بئرٍ فیقطعہا علیٰ وجہ الارض۔

(رد المحتار ج۴ ص۵۵۵ مطلب فی بیع الثمر والزرع والشجر مقصوداً)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۳ ص۳۵ کتاب البیوع، الفصل الثانی۔

بھاری حصہ مقرر کر کے بائع کو مثلاً ہزارواں حصہ دینے کے حیلہ کا سہارا لے کر معاملہ جائز رہے گا۔

لما قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ: والحیلة ان یأخذ الشجرة معاملةً علیٰ ان لہ جزءً من الف جزءٍ وفی الزرع والحشیش یشتری الموجود ببعض الثمن ویستاجر الارض مُدّةً معلومة یعلم فیھا الادراك بباقی الثمن وفی الاشجار الموجود ویحل لہ البائع مایوجد فان خاف ان یرجع یقول علیٰ انی متی رجعت فی الاذن تکون ماذوناً فی الترك بمثلی ملخصاً۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج۴ ص۵۵۸ کتاب البیوع) لہ

پکنے تک کی شرط لگا کر کچی فصل خریدنا

سوال:۔ گندم یا جو کی کچی فصل پکنے تک چھوڑنے کی شرط سے خریدی جائے اور پکنے پر کاٹی جائے تو کیا یہ بیع شرعاً درست ہوگی یا نہیں؟ اور جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ گندم، جو یا دیگر فصلوں کو اس شرط سے خریدنا کہ پکنے پر کاٹوں گا تو یہ صورت ناجائز ہے، البتہ فقہاء نے جواز کی ایک صورت ذکر کی ہے کہ فصل کو مستقل طور پر قیمتاً خرید کر ایک خاص مدت کے لیے زمین اجارہ پر لی جائے اور معینہ مدت کے اندر فصل کو کاٹ لیا جائے تو اس صورت میں مذکورہ بیع اور پکنے تک فصل کا باقی رکھنا صحیح ہوگا۔

لما قال طاھر بن عبدالرشید البخاری رحمہ اللہ: وان کان البیع بشرط الترك لایجوز۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع۔ الفصل الثانی فیما یجوز بیعہ... الخ) ۲ھ

لہ قال العلامة ابن الھمامؒ: وفی ثمار الاشجار یشتری الموجود ویحل لہ البائع مایوجد فان خاف ان یرجع یفعل فی الاذن فی ترك الثمر علی الشجر وھو ان یأذن المشتری علیٰ انہ متی رجع من الاذن کان ماذوناً فی الترك باذنٍ جدیدٍ فیجعلہ علیٰ مثل ھٰذا الشرط۔

(فتح القدیر ج۵ ص۴۹۲ کتاب البیوع)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع الفصل الثالث فیما یجوز بیعہ... الخ۔

۲ھ قال طاھر بن عبدالرشید البخاریؒ: ولو اراد ان یترك فی الارض ویکون لہ الولایة الشرعیة فالحیلة ان یشتری الحشیش واشجار البطیخ ببعض الثمن ویستاجر الارض ببعض الثمن من صاحب الارض ایاماً معلوماً۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۲۹ کتاب البیوع الفصل الثانی فیما یجوز بیعہ ومالا یجوز)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیة ج۳ ص۳۳ کتاب البیوع۔ الفصل الثانی فیما یدخل فی بیع الاراضی، الخ۔

قرعہ اندازی کے ذریعے خرید وفروخت کرنا

سوال:۔ایک چیز کی قیمت ایک ہزار روپے ہے، بیس آدمیوں نے آپس میں ۵۰/۵۰ روپے جمع کرکے یہ فیصلہ کیا کہ قرعہ اندازی کرکے جس کے نام پر یہ چیز نکل آئے تو یہ اس کو دی جائے گی اور باقیماندہ افراد محروم رہ جائیں گے، کیا یہ طریقہ تجارت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔شریعتِ مطہرہ میں خرید وفروخت کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں اُن کے فقدان کی وجہ سے ایسی بیع جائز نہیں، صورتِ مذکورہ میں ایک ممنوع امر یہ ہے کہ اگر نام نکل آئے تو اس کو مبیعہ دیا جائے گا ورنہ نہیں جو کہ شرط فاسد ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ہر ایک ممبر اپنا نام نکلنے کا متمنی ہوتا ہے لیکن پتہ نہیں کہ نکلے یا نہیں، تو گویا بیع علی خطر الوجود ہونے کی وجہ سے قمار لازم آتا ہے جو کہ بنصِ قرآنی ممنوع ہے اس بناء پر مذکورہ معاملہ شرط فاسد اور قمار کی وجہ سے جائز نہیں۔

لما قال اللہ تعالیٰ : یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (سورۃ المائدۃ آیت ۹۰) [۱]

تجارتی لائسنس (پرمٹ) کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ایک شخص کے پاس حکومت کی طرف سے جاری کردہ تحریری سرٹیفکیٹ کی صورت میں ایک تجارتی لائسنس (پرمٹ) ہے تاکہ درآمد برآمد کے وقت کوئی اعتراض نہ کرے، اب وہ شخص اس اجازت نامہ کو فروخت کرنا چاہتا ہے، یہ لائسنس چونکہ کاغذ کی شکل میں ہوتا ہے تو کیا اس کی فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔عصرِ حاضر میں اکثر ممالک نے تاجروں پر لائسنس کے بغیر درآمد برآمد کی پابندی لگائی ہوئی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ لائسنس ایک مادی چیز نہیں بلکہ دوسرے ممالک کو مال دینے یا لینے کا دوسرا نام ہے اور اس لائسنس کے حصول کیلئے چونکہ وقت، کوشش اور

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : ماکان مبادلۃ مالٍ بمال یفسد بالشرائط الفاسد ویبطل تعلیقہ۔ ایضاً لدخولہ فی التملیکات لانہا اعم۔

(ردالمحتار ج۵ ص۲۴۰ مایبطل بالشرط الفاسد ولا یصح تعلیقہ بہ)

ومثلہٗ فی البحرالرائق ج۶ ص۱۷۹ باب المتفرقات۔ کتاب البیوع۔

مال صرف کرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر حاملِ لائسنس کو تحریری سرٹیفکیٹ کے ذریعے قانونی پوزیشن حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ مختلف قسم کی سہولیات کا حقدار ہو جاتا ہے اور بغیر لائسنس کے مال درآمد برآمد کرنا قانوناً جرم ہوتا ہے اور اس کے مرتکب شخص کو سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے، اس لیے یہ لائسنس بڑا قیمتی ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے کروڑوں روپے کی تجارت ممکن ہوتی ہے۔ تو اس طرح تجارتی لائسنس کے ساتھ اموال والا معاملہ کیا جا سکتا ہے چونکہ حاملِ لائسنس کو یہ حق اصالتاً ثابت ہے تو اگر وہ عوض لے کر اپنے حق سے دستبردار ہو کر کسی دوسرے کے نام منتقل کر دے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ مال کے بدلے اپنے وظائف اور حقوق سے دستبرداری شرعاً مرخّص ہے، البتہ اگر لائسنس کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کا ہو جس کی کسی دوسرے فرد یا کمپنی کو انتقال کی بالکل قانوناً اجازت نہ ہو، تو چونکہ ایسے لائسنس کو کسی دوسرے کے نام منتقل کرنے کی صورت میں جھوٹ، دھوکہ اور فریب لازم آتا ہے لہٰذا یہ بیع ناجائز ہوگی۔

قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: ولا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة وعلى هذا لا يجوز الاعتياض عن الوظائف بالاوقاف وفيها في آخر بحث تعارض العرف مع اللغة المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لكن افتى كثير باعتباره وعليه فيفتى بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ۔ (الدر المختار ج۴ ص۵۱۹ كتاب البيوع) [1]

اِنعامی بانڈز کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:- آجکل حکومت نے انعامی بانڈز کے نام سے ایک کاروبار شروع کیا ہوا ہے جو کہ مختلف مالیت کے بانڈز کی شکل میں ہے، طریقۂ کار اس کا یہ ہوتا ہے کہ بانڈ حاصل کرنے کے ہر ماہ بعد قرعہ اندازی کی جاتی ہے، قرعہ اندازی میں جو نمبر نکلتے ہیں اُن کے حاملین کو زیادہ رقم دیدی جاتی

---

[1] قال العلامة خالد الاتاسي: اقول وعلى ما ذكره من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال ينبغي ان يجوز الاعتياض عن التعلي وعن حق الشرب وعن حق المسيل بمال.... كما جاز النزول عن الوظائف ونحوها لا سيما اذا كان صاحب حق العلو فقيراً قد عجز عن اعادة علوه فلو لم يجز ذلك له على لو الذي ذكرناه يتضرر فليتامل و ليحرر۔ (شرح مجلة الاحكام۔ المادة ۲ ج۲ ص۱۲۱ الفصل الثاني في بيع ما يجوز وما لا يجوز۔
ومثله في فقهي مقالات ج ا ص۱۹ بيع حقوق المجردة۔

ہے اور باقی تمام ممبران زیادہ رقم سے محروم ہو کر اپنی جمع شدہ رقم چھوڑنے یا واپس لینے کے مجاز ہوتے ہیں، تو کیا اس طرح انعامی بانڈز کی خرید و فروخت اور اس کے ذریعے حاصل شدہ رقم کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: مذکورہ کاروبار دو وجوہات کی بناء پر مشروع نہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس میں ربوا پائی جاتی ہے اور اعانت علی الربوا بھی ہے کیونکہ حکومت ان ممبروں سے حاصل ہونے والی رقم کو اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک مختلف قسم کے سودی معاملات میں استعمال کرتی ہے جو کہ حکومت کے ساتھ سودی معاملات میں تعاون ہے اور مختلف افراد سے جمع ہونے والی رقم کا فائدہ صرف مخصوص افراد حاصل کرتے اور باقیماندہ ممبران محروم ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ تمام ممبر اپنی اپنی رقم کے عوض میں زیادہ رقم کے متمنی ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے ہر ایک کا حصہ علیٰ خطرالوجود ہوتا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انعام حاصل ہوتا ہے یا نہیں، لہٰذا یہ قمار کی صورت ہے۔

اس لیے ان وجوہات کی بناء پر مذکورہ کاروبار سود اور قمار کی وجہ سے ناجائز ہے اور چونکہ یہ دونوں نصِ قرآنی کی رُو سے ناجائز اور حرام ہیں، لہٰذا یہ کاروبار اور اس کے ذریعے ملنے والی رقم کسی بھی مسلمان کی شایانِ شان نہیں۔

لما قال الله تبارك وتعالىٰ: إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ۔ (سورة المائدة آیت ۹۰) [۱]

غیر ملکی ویزا کی خرید و فروخت کا حکم

سوال: ایک شخص کو اس کے بھائی نے سعودی عرب کا ویزا بھیجا ہے، بعض وجوہات کی بناء پر وہ خود سعودی عرب نہیں جا سکتا اور ویزہ کسی دوسرے شخص پر پچاس ہزار روپے کے عوض فروخت کرنا چاہتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس شخص کے لیے ویزا فروخت کر کے رقم حاصل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: موجودہ دور میں بیشتر ممالک اپنے ملک میں کسی غیر ملکی کو بغیر ویزا کے داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ ایک قانونی جرم قرار دیا ہے، جبکہ ویزہ ابذاتِ خود کوئی مادی چیز تو نہیں

---

[۱] لما ورد في الحديث: عن جابرٍ قال لعن النبيّ صلى الله عليه وسلم آكلَ الرِّبوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء۔ (مشكوٰة ج ۱ ص ۲۴۴ كتاب الربوا)

بلکہ کسی دوسرے ملک میں داخل ہونے اور وہاں ایک متعین وقت تک رہنے کا تحریری اجازت نامہ ہے جس کی رُو سے حاملِ ویزا کو مناسب سہولیات بھی حاصل ہوتی ہیں جبکہ بغیر ویزہ کے داخلہ ممنوع ہوتا ہے، چونکہ کسی ملک کے ویزا کے حصول کے لیے کافی وقت اور مال لگایا جاتا ہے اور حاملِ ویزہ کو چونکہ وہاں داخلے اور رہنے کا حق اصالتاً حاصل ہو جاتا ہے لہٰذا اگر وہ اپنے حق اور وظیفہ سے دستبردار ہو کر ویزہ کسی دوسرے کے نام فروخت کرے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ مناسب عوض لے کر کسی کو اپنا حق اور وظیفہ چھوڑنا فقہاء نے مرخص قرار دیا ہے لہٰذا ویزہ فروخت کر کے رقم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردة كحق شفعة وعلى هذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف وفیها فی اخر بحث تعارض العرف مع اللغة المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لكن افتی كثیر باعتباره وعلیه فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمالٍ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۱۹ کتاب البیوع) [1]

انتخابات کے دوران ووٹ کی خرید و فروخت کا مسئلہ

سوال:۔ بعض علاقوں میں انتخابات کے وقت لوگ اُمیدواروں سے بھاری رقم لے کر اپنا ووٹ اس کے حق میں استعمال کرتے ہیں، تو کیا ووٹ کے عوض رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ووٹ جس کے حق میں استعمال کیا جاتا ہے وہ اس کے حق میں ملک و ملت کی خیر خواہی کی شہادت ہے، اور ووٹ ایک قسم کی سفارش ہے کہ امیدوار کے لیے متعلقہ عہدے کی سفارش کر رہا ہے، ووٹ ایک قسم کا مشورہ ہے کہ یہی امیدوار اس عہدے کا مستحق ہے، لہٰذا ووٹ کی مذکورہ بالا حیثیتوں سے یہ بات عیاں ہے کہ ووٹ مالِ متقوم نہیں، اور کسی بھی چیز کی

---

[1] قال العلامة خالد الاتاسیؒ: اقول وعلى ما ذكروه من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردة بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال.... كما جاز النزول عن الوظائف ونحوها لا سیما اذا كان صاحب حق التعلی فقیراً قد عجز عن اعادة علوه فلولم یجز ذلك له على الوجه الذی ذكرناه یتضرر فلیتامل ولیحرر۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۱۲۱ ص۱۲ الفصل الثانی فی بیع ما یجوز وما لا یجوز۔ ومثله فی فقهی مقالات ج۱ ص۱۹ بیع حقوق المجردة۔

خرید وفروخت کے لیے اُسی چیز کا مالِ متقوم ہونا ضروری ہے، لہٰذا ووٹ کے بدلے رقم حاصل کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں۔

لما قال الدکتور وهبة الزحیلی: اتفق الفقهاء علی صحة البیع اذ اکان المعقود علیه مالاً متقوماً محرزاً موجوداً مقدوراً علی تسلیمه معلوماً للعاقدین لم یتعلق به حق الغیر۔ (الفقه الاسلامی ادلته ج۴ ص۵۰۴ کتاب البیوع ثالثاً البیوع المنهی عنه بسبب المعقود علیه الخ)[1]

ٹریڈ مارک کی خرید وفروخت

سوال: بعض کمپنیوں اور اداروں کی اپنی تجارتی علامت ہوتی ہے جو کہ حکومت کی طرف سے رجسٹرڈ ہوتی ہے اور اُسے گاہک کو رغبت اور تیزی دلانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیا اس کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی کمپنی کی مصنوعات پر تجارتی علامت یا ٹریڈ مارک رغبت یا بے رغبتی کا سبب ہوتی ہے اس لیے تاجروں کی نظر میں اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے چونکہ موجودہ دور میں التباس اور دھوکہ بازی عام ہونے کی وجہ سے حکومتوں کی جانب سے ان ٹریڈ مارکوں کی رجسٹریشن ہونے لگی اور ایک تاجر کے لیے دوسرے تاجر کا ٹریڈ مارک کا استعمال قانونی طور پر جرم قرار دیا گیا ہے اس لیے تاجروں کی نظر میں اس کی قیمت گویا مادی بن گئی ہے اور تاجر اسے مہنگے داموں بیچنے اور خریدنے لگے ہیں اور ٹریڈ مارک کو تحریری سرٹیفکیٹ کی شکل دی گئی ہے۔ یہ تو ایک حق مجرد ہے لیکن اس کے حصول کے لیے چونکہ بے تحاشا مال صرف کیا جاتا ہے، گویا کہ وہ تاجر کے لیے ایک ثابت حق بن جاتی ہے جو کہ اس کے لیے اصالتاً ثابت ہے۔ تو فقہاء کی تصریحات کے مطابق عوض لے کر اپنا حق اور وظیفہ چھوڑنا مرخص ہے، لہٰذا ٹریڈ مارک کی فروخت میں کوئی حرج نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ ٹریڈ مارک رجسٹرڈ ہو کیونکہ رجسٹریشن کے بغیر یہ علامت قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اور دوسرا یہ کہ عوام پر دھوکہ اور التباس نہ ہو کہ خود

---

[1] قال العلامة الشیخ عبدالرحمن الجزائریؒ: ومنها ان یکون المبیع مملوکاً للبائع حال البیع ..... وان یکون مقدوراً علی تسلیمه فلا ینعقد بیع المغصوب...... ومنها ان یکون المبیع معلوماً والثمن معلوماً علماً یمنع من المنازعة فبیع المجهول جهالة تفضی الی المنازعة غیر صحیح۔ (کتاب الفقه علی مذاهب الاربعة ج۲ ص۱۶۴ کتاب البیع الرکن الثالث۔ المعقود علیه)۔

استعمال کرتا ہے اور اس سے بھی رقم حاصل کرے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: فی الاشباہ لا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ وعلی ھذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف وفیھا فی آخر بحث تعارض العرف مع اللغۃ المذھب عدم الاعتبار العرف الخاص لکن افتی کثیر باعتبارہ وعلیہ فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵۱۸، ۵۱۹ کتاب البیوع) [۱]

بیع بذریعہ نیلام عام

سوال: آجکل بیع وشراء کا یہ طریقہ رائج ہے کہ کسی چیز کو منڈی اور مارکیٹ میں رکھ کر لوگوں میں خریدنے کا اعلان ہوتا ہے، خریدار اپنا اپنا نرخ لگا کر مبیعہ خریدنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں لیکن جو خریدار زیادہ قیمت بتائے تو وہ مبیعہ اس کے حوالے کیا جاتا ہے، کیا خرید وفروخت کا یہ طریقہ اپنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی ایک خریدار سے باقاعدہ معاہدہ ہوئے بغیر یونہی متعدد خریداروں کی رائے معلوم کر کے سب سے زیادہ قیمت دینے والے سے ایجاب وقبول کرنا جائز ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بیع من یزید کہا جاتا ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے لیے چند اشیاء فروخت کرنے میں یہ طریقہ اپنایا تھا۔

لما جاء فی الحدیث: عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باع حلساً وقدحا وقال من یشتری ھذا الحلس والقدح فقال رجل اخذتھما بدرھم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من یزید علی درھم فاعطاہ رجلٌ درھمین فباعھما منہ۔
(ترمذی ج۱ ص۲۳۱ باب ما جاء فی بیع من یزید۔ کتاب البیوع) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ خالد الاتاسیؒ: اقول وعلی ما ذکرہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال.... کما جاز النزول عن الوظائف ونحوھا لا سیما اذا کان صاحب حق العلو فقیراً قد عجز عن اعادۃ علوہ فلو لم یجز ذلک لہ علی الوجہ الذی ذکرناہ یتضرر فلیتامل و لیحرر۔ (شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۲ ج۱ ص۱۲۱ الفصل الثانی فی بیع ما یجوز وما لا یجوز۔

وَمِثْلُہٗ فی فقھی مقالات ج۱ ص۱۹ بیع حقوق المجردۃ۔

[۲] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا بأس ببیع من یزید (..........) لانہ بیع الفقراء والحاجۃ ماسۃ الیہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۶۹ کتاب البیوع۔ فصل فیما یکرہ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج۵ ص۱۰۲ مطلب احکام نقصان المبیع فاسداً۔

سرکاری کاغذات میں جعلسازی سے خودکو مالک ظاہر کرکے کسی کی زمین فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی زمین دوسرے شخص کے پاس بطور رہن رکھی تھی لیکن اُس نے سرکاری کاغذات میں دھوکہ اور جعلسازی سے اس زمین کا انتقال اپنے نام پر کرالیا، سرکاری کاغذات میں ردوبدل کی وجہ سے اب یہ شخص اس زمین کو فروخت کرے تو کیا یہ بیع شرعاً جائز ہوگی؟

الجواب:۔ بشرطِ صدق وثبوت اگر یہ زمین کسی کے لیے تسلیم شدہ یا بذریعہ گواہ ثابت شدہ ہو تو کسی کے غاصبانہ اور ظالمانہ قبضہ سے اس زمین میں شرعاً اُس کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس زمین کے تمام تر حقوق بیع حقِ فروخت اصل مالک کو حاصل ہیں، البتہ اس زمین کی فروخت موقوف علیٰ شرط التسلیم ہوگی یعنی جب تک زمین مشتری کے حوالے نہیں کی گئی ہو تو بیع موقوف ہوگی۔

لما قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ:۔ منها ان یکون مقدور التسلیم عند العقد فان کان معجوز التسلیم عندہ لا ینعقد۔ (البدائع والصنائع ج ۵ ص ۱۴۷ کتاب البیوع۔ فصل واما الذی یرجع الی المعقود علیه) [1]

حکومت کی اجازت کے بغیر غیرملکی اشیاء کی تجارت کرنا

سوال:۔ وہ غیرملکی اشیاء جن کی خرید وفروخت پر حکومت کی طرف سے پابندی ہو اُس کے کاروبار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ جو اشیاء بیرونِ ممالک سے درآمد کی جاتی ہیں اُن پر حکومت تاجروں سے ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی وغیرہ کے نام سے کچھ رقم وصول کرتی ہے، بسا اوقات ان ٹیکسوں میں ناقابلِ برداشت حد تک اضافہ کردیا جاتا ہے، اگر یہ ٹیکس مناسب اور جائز انداز میں لیا جاتا ہو اور قومی خزانہ میں

---

[1] قال طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: واما بیع المغصوب فقد ذکر محمدؒ انهٗ موقوف ان اقر به الغاصب ثم البیع وان جحد وللمغصوب منه بینة فکذلك وان لم یکن ولم یسلمه حتی هلك ینقض البیع۔

(خلاصة الفتاوی ج ۳ ص ۴۰ الباب الرابع فی بیع الفاسد واحکامه)

وَمِثْلُهٗ فی الجامع الفصولین ج ۲ ص ۹ الفصل الثانی والثلاثون فی بیع الغصب۔

جمع ہو کر قومی مفاد میں استعمال کیا جاتا ہو تو پھر سامانِ تجارت چوری چھپے لانا مناسب نہیں کیونکہ حکومتِ وقت درآمد کردہ اشیاء پر ضروری ٹیکس لگانے کی مجاز ہے، البتہ اگر حکومت ان ٹیکسوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ کرکے تاجروں کو تنگ کرتی ہو اور ٹیکس کے نام سے وصول کی گئی رقم قومی خزانہ کی بجائے ذاتی خواہشات اور ضروریات میں صرف کی جاتی ہو تو ایسی صورت میں مال لانے والا ٹیکس سے بچنے کی مناسب تدابیر اختیار کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ دروغگوئی، خیانت اور دھوکہ بازی سے بہرحال اجتناب ضروری ہے۔

قال القاضی ابو یعلیٰ محمد بن الحسین الفراءؒ: ان کان الیسلں ثغراً یتاخم دار الحرب وکانت اموالھم اذا دخلت دار الاسلام معشورۃ من صلحٍ استقر معھم اثبت فی الدیوان عقد صلحھم وقدر المأخوذ منھم من عشر او خمس او زیادۃ او نقصان منہ وان کان یختلف باختلاف الازمنۃ والاموال فصلت فیہ وکان الدیوان موضوعاً لاخراج رسومہ والاستغناء ما یرفع الیہ من مقادیر الامتعۃ المحمولۃ الیہ۔ (الاحکام السلطانیۃ ص۲۴۶) [1]

حکومت کی اجازت کے بغیر سرکاری درختوں کی خرید و فروخت کا حکم

سوال: سرکاری ملازمین کے ذریعے سرکاری زمین پر اُگے ہوئے درختوں کی خرید و فروخت کا حکم کیا ہے؟

الجواب: حکومت کی طرف سے اگر ان ملازمین کو سرکاری درختوں کی فروخت کی اجازت ہو اور رقم حاصل کرکے قومی خزانہ میں پہنچتی ہو تو ملازمین کے لیے درختوں کو فروخت کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، البتہ اگر ملازم خیانت، بددیانتی اور مار دھاڑ سے فروخت کرتے ہوں تو علم ہونے کے باوجود اُن سے خریدنا ناجائز ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے، کیونکہ قومی ملکیت ہونے کی وجہ سے ان درختوں میں پوری قوم کا حصہ ہے۔

---

[1] قال فخر الدین الزیلعیؒ: والاصل ان متی عرفنا ما یأخذون منا اخذنا منھم مثلہ بذلک امر عمر رضی اللہ عنہ وان لم نعرف اخذنا منھم العشر لقول عمرؓ فان اعیاکم فالعشر وان کان یأخذون الکل نأخذ منھم الجمیع الا قدر ما یوصلہ الیٰ مأمنہ فی الصحیح۔

(تبیین الحقائق ج۱ ص۲۸۵ باب العاشر)

ومثلہ فی الجامع الصغیر ص۱۰۱ باب فیمن یمر علی العاشر بمال۔

لما فی مجلۃ الاحکام :۔ لیس بلوکیل ان یبیع بانقص مما عینہ الموکل یعنی اذا کان
الموکل قد عین ثمنا فلیس للوکیل ان یبیع بانقص من ذلک و اذا باع ینعقد البیع
موقوفا علی اجازۃ موکلہ ھ اوقال العلامۃ خالد اتاسی: ثم لو خالف الوکیل بالبیع
وباع وسلم المبیع للمشتری ثم ھلک فی ید المشتری یکون الوکیل ضامنا لقیمتہ
لانہ بالمخالفۃ صار غاصبا اھ ۔ شرح المجلۃ لخالد اتاسی ۴/۴۸۵/۴۸۶ مادۃ ۱۴۹۵

حکومت کا ضبط کردہ مال خریدنا

سوال : بعض لوگ اندرونِ ملک مخصوص علاقوں سے دیگر علاقوں تک کپڑا، برتن اور دیگر سامان خفیہ طریقے سے لے جاتے ہیں جبکہ بعض اوقات حکومت کے کارندے ان کو پکڑ کر ان کا سامان ضبط کر کے نیلام کر دیتے ہیں، کیا ان ضبط شدہ اشیاء کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ چونکہ شرعی نقطۂ نظر سے یہ سامان اصل مالک کی ملک سے نہیں نکلتا ہے کیونکہ حکومت کیلئے رعایا کے اموال ضبط کرنا مناسب نہیں، لہٰذا ایسا سامان اصل مالک کی ملک سے خارج نہ ہونے کی وجہ سے واجب الرد ہے، اس بناء پر ضبط شدہ مال کی خرید و فروخت جائز نہیں اور حکومت کی اندرونِ ملک انتقالِ اشیاء پر پابندی لگانا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ولیس للامام ان یخرج شیئاً من ید احدٍ الابحق ثابت معروف ۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۱۸۰ مطلب القول الذی لیدان الارض ملکہ وان کانت خراجیۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ القاضی ابو یعلی الحنبلی رحمہ اللہ : فاما اعشار الاموال المنتقلۃ فی دار الاسلام من بلدٍ الی بلدٍ فمحرمۃ لایبیحھا شرع ولا یسوغھا اجتھاد ولا ھی من سیاسات العدل وقلما تکون الا فی البلاد الجائرۃ ولذلک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنۃ صاحب مکس۔
(الاحکام السلطانیۃ ص ۲۴۶ فصل فی وضع الیلون۔ القسم الثانی اعشار الاموال)
ومثلہ محمد حامد الفقی علی ھامش الاحکام السلطانیۃ ص ۲۴۶

غیر محفوظ سرکاری کاغذات کے ذریعے جائیداد وغیرہ کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت

سوال:۔ ملکی قانون کے تحت ایک شخص سرکاری کاغذات (رجسٹری و انتقال) کے ذریعے اپنی جائیداد وغیرہ فروخت کرسکتا ہے، ان کاغذات کے اعتبار اور عدم اعتبار کے متعلق شریعتِ مقدسہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ ازروئے شرع جو سرکاری کاغذات تغیّر و تبدّل سے محفوظ ہوں تو اُن کو قابلِ اعتبار قرار دے کر ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا، موجودہ حالات میں چونکہ رشوت، جھوٹ، دھوکہ اور فریب ہر جگہ غالب ہو چکا ہے اس بناء پر دورِ حاضر میں صرف کاغذات کے ذریعے خرید و فروخت مناسب نہیں۔

لما فی مجلة الاحکام: لا یعمل بالخط والختم واحدهما الا اذا کان سالمًا من شبهة التزویر والتضنیع فیعمل به یعنی انه یکون مدارًا للحکم ولا یحتاج الی الثبوت بوجه آخر۔ (المجلة المادة ۱۷۳۶ الباب الثانی۔ الفصل الاوّل فی الحجج الخطیة) [1]

وقف شدہ زمین کو فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی مملوکہ زمین کو مسجد یا قبرستان کے لیے وقف کیا، وقف کے بعد اُس زمین کو وہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کیا اِس واقف کو موقوفہ زمین کی فروخت کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زمین کو وقف کردینے کے بعد شرعاً زمین واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے بشرطیکہ وقف کی شرائط کا لحاظ کرکے وقف تام ہو۔ وقف کر دینے کے بعد زمین میں واقف کو کسی قسم کے ذاتی یا مالکانہ تصرفات کا حق حاصل نہیں رہتا، لہٰذا اس زمین کے

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فالحاصل ان المدار علی انتفاء الشبهة ظاهرًا وعلیه فما یوجد فی دفتر التجار فی زماننا اذا مات احدهم وقد حرر بخطه ما علیه فی دفتره الذی یقرب من الیقین انه لا یکتب فیه سبیل التجرید والهزل یعمل به۔
(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۲۱ مطلب فی دفاتر التجار حادثة فی تاجر له دفتر)

خرید وفروخت یا ہبہ کا مجاز نہیں ہے اور نہ اس زمین میں وراثت جاری ہوسکتی ہے۔
لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ : واذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه۔ (الھدایة ج۲ ص۶۱۶ کتاب الوقف) [1]

مسجد کا ضرورت سے زائد سامان فروخت کرنا

سوال :۔ اگر کسی قصبہ کے لوگ اپنے قصبہ سے مکمل طور پر کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہوں اور اس قصبہ میں مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو کیا ایسی حالت میں مسجد کا سامان فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر حقیقتاً قصبہ والے مکمل طور پر اپنے قصبہ سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہوں اور وہاں مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو اس صورت میں چونکہ مسجد کو ایسے ہی چھوڑنے پر اسکے سامان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے لہٰذا ایسی کسی بھی مسجد کی اشیاء فروخت کرنا جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں صرف کیا جائے گا ، البتہ مسجد کی زمین کسی بھی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں ہوسکتی۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : قلت لکن الفرق غیر ظاهر فلیتأمل والذی ینبغی متابعة المشائخ المذکورین فی جواز النقل بلا فرق بین مسجد او حوض کما افتی به الامام ابو شجاع والامام الحلوانی وکفی بهم قدوة ولا سیما فی زماننا فان المسجد او غیره من رباط او حوض اذا لم ینقل یأخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون کما هو مشاهد وکذلك اوقافه یأکلها النظار او غیرهم وفی فتاوی النسفی سئل شیخ عن اهل قریة رحلوا وتداعی مسجدها الی الخراب وبعض المتغلبة یستولون علی خشبة و ینقلونه الی دورهم هل لواحد لاهل المحلة ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسك

---

[1] قال العلامة التمرتاشی رحمه الله : فاذا تم ای الوقف فلا یملك ولا یعار ولا یرهن۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۵۲ کتاب الوقف)
ومثله فی بدائع الصنائع ج۶ ص۲۲۱ ۔۔۔ الصدقة۔ فصل واما حکم الوقف الجائز الخ۔

الثمن يصرفه الى بعض المساجد او الى هذا المسجد قال نعم۔

(ردّالمحتار ج ۴ ص۳۶۱ مطلب فی نقل انقاض المسجد ونحوہ) [1]

غیر موقوف قبرستان کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے ایک قطعہ زمین خرید اجبکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جگہ قبرستان کی ہے لیکن تقریباً ساٹھ سال سے اس میں کسی بھی میت کو دفن نہیں کیا گیا ہے اور اس قطعۂ زمین کو مالک نے قبرستان کے لیے وقف بھی نہیں کیا تھا، کیا اب مالکِ زمین کو اس کی فروخت کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر موقوف قبرستان میں اگر یہ یقین ہو کہ اموات کی لاشیں ختم ہو کر خاک بن گئی ہیں تو ایسی صورت میں اس کا مالک، اس زمین میں ہر قسم کے مالکانہ تصرفات کا مجاز ہوگا، البتہ اگر وقف کا شائبہ بھی موجود ہو تو موقوفہ قبرستان کی خرید و فروخت یا دیگر مالکانہ تصرفات کا حق اس کو حاصل نہیں۔

لما قال الشیخ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی رحمہ اللہ:۔ ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔ (التبیین الحقائق ج ۱ ص۲۴۶ باب الجنائز) [2]

وصولِ حق کے لیے غاصب کی جائیداد فروخت کرنا جائز ہے

سوال: میرے ایک رشتہ دار نے میری ملکیتی زمین سرکاری کاغذات (رجسٹری و انتقال وغیرہ) میں جعلسازی سے ردوبدل کر کے فروخت

---

[1] قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاری رحمہ اللہ:۔ حشیش المسجد اذا کان لہ قیمۃ فلا ھل المسجد ان یبیعوھا وان رفعوا الی الحاکم فھو احب وکذا الحباب والنعش اذا افسدا فلا ھل المسجد ان یبیعوھا وان رفعوا الی الحاکم فھو احب۔

(الفتاوٰی التاتارخانیۃ ج ۵ ص۸۵۱ کتاب الوقف ـ مسائل وقف المساجد)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص۴۵۸ الباب الحادی عشر فی المسجد ومایتعلق بہٖ ۔

[2] قال العلامہ ابن عابدینؒ:۔ ولو بلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔ (ردّالمحتار ج ۲ ص۲۳۳ مطلب فی دفن المیّت)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۶۷ الفصل السادس فی القبر والدفن والنقل من مکان الی مکان اٰخر۔

کر دی ہے، میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ اس زمین کو مجھے واپس کر دے لیکن وہ کسی طرح بھی زمین واپس کرنے کو تیار نہیں ہے، اب میرے اس رشتہ دار کو چند وجوہات کی بناء پر ملک چھوڑنا پڑ گیا ہے جبکہ اس کا دو کنال رقبہ میرے قبضے میں ہے، تو کیا میرے لیے اس دو کنال رقبہ کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ہے؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال کسی کے غاصبانہ قبضہ کرنے سے آپ کی زمین اُسکی ملکیت نہیں بن سکتی اور نہ ہی ناجائز طور پر سرکاری کاغذات میں تبدیلی کر کے فروخت کر دینے سے شرعاً ملکیت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا مذکورہ زمین میں مالک کو باقاعدہ طور پر ہر قسم کے تصرّفات کا حق حاصل ہے اپنے حق کے حصول کے لیے غاصب کی منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کی فروخت کر کے اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: قال ونقل جد والدی لامه الجمال الاشقر فی شرحه للقدوری ان عدم جواز الاخذ من خلاف الجنس کان فی زمانهم لمطاوعتهم فی الحقوق والفتوٰی الیوم علی جواز الاخذ عند القدرة من ای مالٍ کان لاسیما فی دیارنا لمداومتهم للعقوق۔ (رد المحتار ج۴ ص۹۵ مطلب یعذر بالعمل بمذهب الغیر عند الضرورة) [1]

بُت فروشی کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ بُتوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے ہیں، از روئے شرع یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بُت چونکہ آلۂ معاصی اور شرک پرستی میں معین ہیں، لہٰذا اعانت علی المعصیت کی بناء پر ان کی خرید و فروخت جائز نہیں، علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بُت فروشی سے منع فرمایا ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله: وفیه ان ابن ابی لیلیٰ والشافعی یطلقان اخذ خلاف جنس حقه للمجانسة فی المالیة وقالا هو الاوسع ویجوز الاخذ به وان لم یکن من هینا فان الانسان یعذر فی العمل به عند الضرورة۔

(البحر الرائق ج۵ ص۵۶ کتاب السرقة)

ومثله فی المنحة الخالق علی صدر رد المحتار ج۴ ص۹۵ مطلب یعذر بالعمل بمذهب الغیر عند الضرورة۔

اخرج الامام البخاری رحمہ اللہ: عن جابر بن عبد اللہ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول عام الفتح وھو بمکۃ ان اللہ ورسولہ حرّم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام۔ (الصحیح البخاری ج ۱ ص ۲۹۸ باب البیع المیتۃ والاصنام) [۱]

غصب شدہ املاک کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال: بعض اوقات علاقائی جھگڑوں میں ایک قوم دوسری قوم کو مغلوب کرکے اس کی تمام جائیداد مال مولیشی وغیرہ پر غاصبانہ اور ظالمانہ قبضہ کرکے ضبط کرلیتی ہے، تو کیا اس غاصب قوم سے مغلوب قوم کی غصب شدہ جائیداد خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسلمانوں کا آپس میں ایک دوسرے کے مال وجان پر غاصبانہ قبضہ کرنا جائز نہیں اور نہ ہی اس طرح قبضہ شدہ جائیداد وغیرہ کسی فریق کی ملکیت بن سکتی ہے بلکہ ان غصب شدہ املاک کی واپسی شریعت مقدسہ نے واجب قرار دی ہے، اس بناء پر یہ قبضہ غصب شمار ہوکر اصل مالکوں یا ورثاء کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر اصل مالک یا ورثاء معلوم نہ ہوں تو اُن کی طرف سے فقراء ومساکین پر صدقہ کرکے اپنا ذمہ فارغ کریں، لہٰذا مشتری کو اگر یہ علم ہو کہ جو جائیداد وہ خرید رہا ہے وہ غصب کردہ اور ظلم وجبر سے ہتھیائی گئی ہے تو پھر اس کے لیے وہ جائیداد اور مال مولیشی وغیرہ خریدنا جائز نہیں، اور جو بیع ہو جائے وہ بیع فضولی کے حکم میں ہو کر موقوف رہے گی۔

لما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفسہ منہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۵۰۳ کتاب الغصب) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ علی بن سلطان محمد القاری رحمہ اللہ: حرّم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام وان کانت من ذھب او فضۃ۔ (المرقاۃ ج ۶ ص ۴۹ باب الکسب وطلب الحلال۔ الفصل الاول)

وَمِثْلُہٗ فی عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۵۴ باب بیع المیتۃ والاصنام۔

[۲] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: الغصب فی الشریعۃ اخذ مال متقوم محترم بغیر اذن المالک علی وجہ یزیل یدہ..... وعلی الغاصب ردّ العین المغصوبۃ۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۳۷۰ کتاب الغصب)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۰۸ کتاب الغصب۔

بیٹے پر زمین فروخت کرنا

سوال:۔ کیا شریعتِ اسلامیہ میں والد اپنی مملوکہ زمین بیٹے پر فروخت کر سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ والد اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر قسم کے تصرّفات کا حق رکھنے کے علاوہ جس پر بھی چاہے فروخت کر سکتا ہے، لہٰذا بیٹے پر زمین فروخت کرنے میں کوئی قباحت نہیں اور نہ ہی یہ شرعاً ممنوع ہے۔

لما قال حافظ الدین محمد بن البزازؒ:۔ دارٌ لرجل اومشترك بين الاب والرجل وللاب ابن صغير له ام فقالت اشتريت هٰذه الدار لابني بماله والاب حاضر اواشتريت منكما لابني بماله فقال بعنا وقع الملك للابن ۔

(البزازية على هامش الهندية ج۴ ص۲۶۷ باب الثامن فی بيع الاب والام والوصی)[1]

باریک کپڑے کی تجارت کرنا

سوال: باریک کپڑے پہننے سے عموماً بدن صاف نظر آتا ہے، کیا ایسے باریک کپڑے کی تجارت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ ایسا باریک کپڑا جو دوہرا کر کے زیب تن کرنے کے باوجود بدن نظر آتا ہو تو ایسا کپڑا بے حیائی اور عریانی کا پیش خیمہ بنتے اور پردہ متاثر ہونے کے باوجود فروخت کرنا درحقیقت اعانت علی المعصیۃ کے مترادف ہے، اس لیے ایسے کپڑوں کی تجارت سے اجتناب کرنا چاہیئے تاہم ایجاب وقبول سے بیع تام ہو گی۔

لما قال العلامة محمد بن محمد ابن البزاز الكردويؒ: وبيع المكعب المفضض للرجال اذا علم انه يشتريه للبسه يكره ۔ (البزازية على هامش الهندية ج۴ ص۵۲ الثالث فی المتفرقات)[2]

---

[1] لما قال العلامة فخر الدين الشهير بقاضيخانؒ: امرأة قالت لزوجها وبينهما ولد صغير اشتريت منك دارك هٰذه لابننا بكذا وقال الاب بعتها جاز لان الاب لما قبل البيع فقد جاز شرائها للصغير فيجوز۔ (الخانية على هامش الهندية ج۲ ص۲۸۲ باب فی بيع غير المالك)

وَمِثْلُهٗ فی شرح مجلة الاحكام لسليم رستم باز تحت المادة نمبر۱۶۷ ص۷۵ ۔

[2] قال العلامة ابن عابدينؒ:۔ ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً والا فتنزيهاً وبيع المكعب المفضض للرجل انه يلبسه يكره لانه اعانة على لبس الحرام (رد المحتار ج۶ ص۳۹۲ كتاب الحظر والاباحة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۴۳ نعيم بتغيرٍ يسيرٍ، فی آخر باب البغاة ۔

کفار کے ملبوسات کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ غیر مسلم اقوام کے بیجائی کے ملبوسات مثلاً پتلون اور ٹائی وغیرہ کی خرید و فروخت کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ وہ اشیاء جو بلا تغیر و تبدیل بے دینی اور معصیت کا آلہ ہوں یا کسی غیر مسلم قوم کا شعار ہوں ایسی اشیاء کی خرید و فروخت سے اجتناب کرنا ضروری ہے کیونکہ استعمال کی ممانعت خرید و فروخت کی ممانعت کی دلیل ہے تاکہ اعانت علی المعصیت کے زمرہ میں داخل نہ ہو۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: ماقامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً والا فتنزيهاً وبيع المكعب المفضض للرجل انه يلبسه يكره لانه اعانة على لبس الحرام خياطاً امره ان يخذ له ثوباً على ذى الفساق يكره له ان يفعل لانه سبب التشبه بالمجوس والفسقة۔
(رد المحتار ج ۶ ص ۳۹۲ فصل فی البیع۔ کتاب الکراهية)[1]

غیر مسلموں کی متروکہ جائیداد فروخت کا حکم

سوال:۔ تقسیم ملک کے نتیجہ میں ہندوؤں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ان کی جائیدادیں وغیرہ رہ گئی ہیں ایک شخص نے کچھ حصہ پر قبضہ کر کے اُسے اپنی ملکیت میں لے لیا ہے، کیا اُس کے لیے اِس جائیداد کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ غیر مسلم اقوام کی متروکہ جائیداد اور دیگر اشیاء چونکہ بیت المال اور قومی خزانہ کا حق بنتا ہے، اِس بناء پر ذاتی مفاد کے لیے اس پر قبضہ کرنا اور اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر حکومت کی باضابطہ اجازت سے فروخت کی جائے اور رقم قومی خزانہ میں جمع ہو تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: وما اوجف المسلمون عليه من اموال اهل الحرب بغير قتال يصرف فى مصالح المسلمين كما يصرف الخراج قالوا هو مثل الاراضى التى اجلوا اهلها عنها۔ (الهداية ج ۲ ص ۵۶۴ باب المستامن)[2]

---

[1] قال النبی صلی الله علیه وسلم: عن ابن عمرؓ قال قال عليه الصلوٰة والسلام من تشبه بقوم فهو منهم۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۳ کتاب اللباس) ۔ ومثله فی البحر الرائق ج ۸ ص ۲۰۱ کتاب الکراهية۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: وما اخذ منهم بلا حرب ولا قهر كالهدية والصلح فهو لا غنيمة ولا فيئ وحكمه حكم الفيئ لا يخمس ويوضع فى بيت المال۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۱۳۸ مطلب فی بیان معنى الغنيمة والفيئ)
ومثله فی فتح القدیر ج ۵ ص ۲۷۲ کتاب البیوع۔

بلا اجازت کسی کی زمین فروخت کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو ترکہ میں سے ان کے حصہ سے محروم کر دیتے ہیں، تو کیا ان لوگوں سے ایسی اراضی یا دیگر جائیداد خریدنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بہنوں اور بیٹیوں کو جائیداد میں ان کے مقررہ حصے سے محروم کرنا اسلامی تعلیمات کو پامال کرنے کے مترادف ہے اور ان کے حصہ پر اُن کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے فروخت کرنا مغصوبہ زمین کی فروخت کے حکم میں ہے، لہٰذا اُن کی اجازت کے بغیر فروخت کردہ زمین بیع فضولی کے حکم میں شمار ہو کر حصہ داروں (بیٹیوں اور بہنوں) کی اجازت پر موقوف ہوگی، اگر وہ اجازت دیں تو بیع نافذ ہوگی ورنہ نہیں۔

قال العلامة سليم رستم باز: كلٌّ واحد من الشركاء في شركة الملك اجنبي في حصة سائرهم فليس احدهم وكيلاً عن الآخر ولا يجوز لهمن ثم ان يتصرف في حصة شريكه بدون اذنه۔ (شرح مجلة الاحكام المادة ۱۰۷۵ ص۶۰۱ الفصل الثاني في بيان كيفية التصرف في الاعيان المشتركة) [1]

حقِ تعلّی کی فروخت کا حکم

سوال:۔ موجودہ دور میں بعض مقامات میں لوگوں کی مجبوری سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے زمین فروخت کرتے وقت یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ آپ کو دس فٹ کے اندر اندر ایک چھت بنانے کی اجازت ہو گی، اگر دس فٹ سے مکان اونچا کرنا ہو تو اس کی بھی قیمت ادا کرنا ہوگی، البتہ اس کی قیمت نیچے والے حصہ سے کم ہوگی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ زمین فروخت کرتے وقت اس قسم کی شرط عائد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ فضا مال نہیں کیونکہ اس کا احراز ممکن نہیں، اور حقوقِ مجردہ کی فروخت شرعاً ممنوع ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ نیچے والی منزل

---

[1] قال في الهندية: ولا يجوز لاحدهما ان يتصرف في نصيب الآخر الا بامره وكل واحدٍ منهما كالاجنبي في نصيب صاحبه۔ (الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۰۱ الفصل الاول في بيان انواع الشركة)
ومِثْلُهٗ في البرجندي ج۳ ص۱۴۲ كتاب الشركة۔

ایک آدمی کی ہوا اور اوپر والی منزل کسی دوسرے کی ہوا ور خدانخواستہ دونوں گر جائیں تو اوپر والا اپنا حق نیچے والے پر فروخت کردے تو یہ بیع ناجائز ہوگی کیونکہ یہ حق تعلی ہے اور حق تعلی کی فروخت سے فقہاء نے منع فرمایا ہے۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: سفل وعلو بین رجلین انہدما فباع صاحب العلو علوہ لم یجز لان الہواء لیس بمال۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴۵ کتاب البیوع، فصل واما الذی یرجع الی المعقود علیہ فانواعٌ) [1]

شرط لگاکر کوئی چیز فروخت کرنا

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی پر اپنا گھر فروخت کرتے وقت یہ شرط لگادی کہ میں آٹھ مہینے تک اس گھر میں رہوں گا، کیا اس شرط کے ساتھ یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر گھر کی بیع کو اس شرط پر موقوف رکھا گیا کہ اگر مشتری اس شرط کو قبول نہ کرتا تو بائع اس پر راضی نہ ہوتا تو یہ بیع فاسد ہوگی کیونکہ شریعتِ مقدسہ نے بیع وشرائع کے دوران ہر اُس شرط کو ممنوع قرار دیا ہے جس میں کسی ایک جانب یا مبیعہ کو فائدہ ہو، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں بیع فاسد تصور ہوگی۔ تاہم اگر بیع کو اس شرط پر موقوف نہیں کیا گیا بلکہ مشورے کی حیثیت سے رکھا گیا تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں جس کے نتیجے میں اس کی رعایت ضروری نہیں بلکہ شرط کی رعایت احسان کے مترادف ہوگی۔

لما قال العلامۃ التمرتاشی رحمہ اللہ: ولا بیع بشرط لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ وفیہ نفع لاحدھما او لمبیع۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۸۵ باب البیع الفاسد) [2]

کسی چیز پر قبضہ کرلینے کے بعد زائد قیمت پر فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے ایک گاڑی ایک لاکھ روپے میں

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: لان حق التعلی لیس بمال لان المال ما یمکن احرازہ۔
(الہدایۃ علیٰ صدر فتح القدیر ج۶ ص۶۴ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: لو کان فی الشرط منفعۃ لاحد المتعاقدین بان شرط البایع ان یقرض المشتری او علی القلب یفسد العقد۔
(خلاصۃ الفتاویٰ ج۳ ص۵ کتاب البیوع، الفصل الخامس فی البیع)
ومِثلُہٗ فی الہندیۃ ج۳ ص۳ کتاب البیوع، الباب الاول فی تعریف البیع الخ۔

خریدی اور قبضہ کر کے دوسرے شخص پر دو لاکھ روپے میں فروخت کر دی، دوسرے شخص نے خرید کر تیسرے آدمی پر دو لاکھ دس ہزار روپے میں فروخت کر دی، تو کیا یہ معاملہ سُود در سُود ہے یا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: شریعت نے قبل القبض کسی چیز میں تصرف کی اجازت نہیں دی ہے لیکن باقاعدہ طور پر کسی چیز کو قبضہ کر کے فروخت کرنے کو مشروع رکھا ہے، لہٰذا بائع اور مشتری کے درمیان جو بھی قیمت مقرر ہو جائے وہی صحیح اور مشروع ہے۔

قال العلامۃ ابن الھمام رحمہ اللہ: ھو مبادلۃ المال بالمال بالتراضی۔
(فتح القدیر ج۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)[1]

بغیر زمین کے پانی فروخت کرنا

سوال: اگر کسی زمین کا حقِ شرب بغیر زمین کے فروخت کیا جائے تو کیا یہ بیع شرعاً درست ہو گی یا نہیں؟

الجواب: شریعت نے ماءِ محرز (یعنی وہ پانی جو کسی برتن میں محفوظ ہو) کے علاوہ عام پانی کو مباح الاصل قرار دیا ہے اور زمین کا حقِ شرب زمین کے توابع میں شمار کیا ہے۔ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر بلا تذکرہ شرب زمین فروخت کی جائے تو زمین کے ساتھ حقِ شرب خود بخود شامل ہو گا۔ لہٰذا مفتی بہ اور ظاہر الروایۃ قول کے مطابق مستقل طور پر حقِ شرب کی خرید و فروخت، ہبہ یا تصدق وغیرہ جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولا یباع الشرب ولا یوھب ولا یؤجر ولا یتصدق بہ لانہ لیس بمال متقوم فی ظاھر الروایۃ وعلیہ الفتوٰی۔ (رد المحتار ج۵ ص۸۰ باب البیع الفاسد)[2]

---

[1] قال العلامۃ جلال الدین رحمہ اللہ: البیع مبادلۃ المال بالمال بالتراضی۔
(کفایۃ شرح الھدایۃ فی ذیل فتح القدیر ج۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)
وَمِثْلُہٗ فی العنایۃ علی ھامش فتح القدیر ج۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامۃ قاضیخانؒ: ولا یجوز بیع مسیل الماء وھبتہ ولا بیع الطریق بدون الارض وکذالک بیع الشرب
(فتاوٰی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج۲ ص۱۵۴ کتاب البیوع، باب البیع الفاسد)
وَمِثْلُہٗ فی شرح المجلۃ تحت المادۃ ۲۱۶ ص۱۰۵، الفصل الثانی، فیما یجوز بیعہ ومالا یجوز۔

کسی گاڑی کی متوقع آمدنی فروخت کرنا

سوال: دو آدمیوں نے آپس میں مشترکہ طور پر ایک بس خریدی، اب دونوں میں سے ایک نے کہا کہ بس کا تمام تر سالانہ منافع مجھے اتنی رقم پر فروخت کرو، تو کیا یہ عقد شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: خرید و فروخت کے لیے شریعت نے مبیعہ کی موجودگی ضروری قرار دی ہے، صورتِ مذکورہ میں چونکہ سالانہ منافع یا اصل نامعلوم اور معدوم ہے، لہٰذا یہ بیع معدوم کے زمرہ میں شمار ہو کر باطل ہوگی۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه الله: منها ان يكون موجودًا فلا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۳۸ کتاب البیوع فصل واما الذی یرجع الی المعقود۔ الخ)[1]

مقررہ نرخوں سے زیادہ قیمت پر مال فروخت کرنا

سوال: ایک آدمی نے کھاد کی ایجنسی کھول رکھی ہے اور وہ گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کردہ نرخوں پر کھاد فروخت کرتا ہے، بعض اوقات کھاد شارٹ ہونے کی وجہ سے مارکیٹ میں کم ملتی ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہی ڈیلر کھاد زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مذکورہ میں یہ کھاد ڈیلر گورنمنٹ کا وکیل نہیں کیونکہ کاروبار کا تمام تر منافع مالک ہی کو ملتا ہے لیکن اس نے گورنمنٹ سے کھاد مقررہ نرخوں پر فروخت کرنے کا عہد و پیمان کر رکھا ہے اور گورنمنٹ اُسے نرخ بتا کر کھاد دیتی ہے، لہٰذا اس سے زائد نرخ پر فروخت کرنے میں بدعہدی لازم آتی ہے اور زائد نرخوں پر فروخت کرنے سے جھوٹ، مخلوقِ خدا پر ظلم و زیادتی، بے رحمی اور بے جا سختی لازم آتی ہے، اس لیے اس سے اجتناب اور پرہیز ضروری ہے۔

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: وبيع ما ليس في ملكه لبطلان المعدوم اذ من شرط المعقود عليه ان يكون موجودًا مالًا متقومًا في نفسه۔
(ردّ المحتار ج۵ ص۵۸ کتاب البیوع مطلب الآدمی مکرم شرعًا ولو کافرًا)
ومثله في البحر الرائق ج۶ ص۱۱۶ کتاب البیوع۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۳۴) [1]

بیع میں اجنبی کے فعل کی شرط لگانا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی پر اس شرط سے زمین فروخت کی کہ فلاں شخص مجھ پر معینہ قطعہ اراضی فروخت کرے گا اور اگر اس نے فروخت نہ کی تو میں بیع واپس کرنے کا مجاز ہوں گا، باقاعدہ بیع کے بعد اُس شخص نے اس پر معینہ قطعۂ اراضی فروخت کرنے سے انکار کر دیا، تو اب بائع کہتا ہے کہ چونکہ میں نے اپنی زمین کی واپسی کی شرط لگائی تھی لہٰذا میں اپنی بیع کو منسوخ کرتا ہوں، تو کیا اس کو اپنی زمین واپس لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع میں وہ شروط پورے کرنے ہوتے ہیں جو کہ بیع کے مقتضیات یا لوازماتِ عقد میں سے ہوں، تو شرط مذکورہ چونکہ ملازمات اور مقتضیات میں سے نہیں اور نہ ہی مفسد للعقد ہے کیونکہ اسے اجنبی کے فعل سے معلق کیا گیا ہے، اس بناء پر یہ عقد صحیح ہو کر شرط فاسد شمار ہوگی، پس بائع کو زمین واپس لینے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وفی المنتقی قال محمد کل شئ یشترطه المشتری علی البائع یفسد به البیع فاذا شرطه علی اجنبی فهو باطل (ای فالشرط باطل منحة الخالق) کما اذا اشتری دابة علی ان یهبه فلان الاجنبی کذا فهو باطل۔

(البحر الرائق ج ۶ ص ۸۶ باب البیع الفاسد) [2]

ایجاب وقبول کے وقت مبیعہ کو مشتری کے حوالہ کرنے کے لیے چند دن کی مہلت کی شرط لگانا

سوال:۔ عقد بیع کے دوران یہ شرط لگانا کہ مبیعہ ابھی نہیں بلکہ چند دن حوالہ کروں گا، تو کیا بائع کے لیے یہ شرط لگانا شرعاً

---

[1] قال العلامة التمرتاشیؒ: ولا یسعر حاکم الا اذا تعدی الارباب عن القیمة تعدیا فاحشا فیسعر بمشورة اهل الرای۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۰۰ کتاب الکراهیة۔ فصل فی البیع)

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: المراد بالنفع ما شرط من احد العاقدین علی الآخر فلو علی اجنبی لایفسد ویبطل الشرط لما فی الفتح عن الولوالجیة بعتك الدار بالف علی ان یقرضنی فلان الاجنبی عشرة دراهم فقبل المشتری لایفسد البیع لانه لایلزم الاجنبی ولا خیار للبائع۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۸۵ مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر بعد العقد او قبله)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة لسلیم رستم باز تحت المادة ۱۸۹ ص ۸۹

جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔شرط مذکورہ نہ تو بیع کے مقتضیات میں سے ہے اور نہ ملازمات میں سے ہے بلکہ بائع کے فائدہ کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے بیع کیا گیا ہے اور مبیعہ حوالہ کرنے میں مہلت کی شرط لگانا فقہاء نے شرطِ فاسد قرار دیا ہے، اسی بناء پر مذکورہ شرط بھی ناجائز ہے، البتہ اگر رقم دے کر بطورِ وعدہ چند دن بعد مبیعہ حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو بیع استجرار کی رُو سے یہ پیشگی رقم وعدۂ بیع شمار ہو کر مبیعہ حوالہ کرتے وقت بیع منعقد ہو جائے گی۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ومن باع عیناً علیٰ ان لا یسلمه الیٰ رأس الشهر فالبیع فاسد لان الاجل فی المبیع العین باطل فیکون شرطاً فاسداً وهذا لان الاجل شرع ترفیهاً فیلیق بالدیون دون الاعیان ۔(الهدایة ج۳ ص۶۳ باب البیع الفاسد) [1]

نفع کی خاطر گاہک کو دوسری دوکان سے سودا لینے کیلئے قرض پر رقم دینا

سوال: ایک شخص کسی دوکاندار سے کوئی چیز قرض پر خریدنا چاہتا ہے لیکن وہ چیز دوکاندار کے پاس نہیں ہے اور دوکاندار اس شرط پر گاہک کو قرض رقم دیتا ہے کہ مجھے اتنا منافع دو گے، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ۔صورتِ مسئولہ میں چونکہ دوکاندار گاہک کو قرض رقم دے کر منافع کا مطالبہ کرتا ہے قرض دینے کی صورت میں کسی قسم کا منافع حاصل کرنا شرعاً ممنوع ہے اسلئے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ شرط لگا کر قرض دینے سے شرط پر عمل لازم نہیں ہے، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں قرض لینے کے بعد نہ تو گاہک کو منافع دینا ضروری ہے اور نہ دوکاندار کو لینا جائز ہے۔

لما قال النبی صلی الله علیه وسلم: کل قرض جرّ نفعاً فهو ربوا ۔(نصب الرایة ج۴ ص۶۰ کتاب الحوالة) [2]

---

[1] قال فی الهندیة: اذا شرط الاجل فی المبیع العین فسد العقد وان شرط الاجل فی الثمن والثمن دین فان کان الاجل معلوماً جاز البیع وان کان مجهولاً فسد البیع۔

(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۳۲ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد البیع الخ)

ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۸۵ باب البیع الفاسد۔

[2] قال الحصکفیؒ: القرض بالشرط حرام والشرط لغو۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۱۶۶ فصل فی القرض)

ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۸۷ کتاب البیوع، باب المتفرقات۔

عیب دار اشیاء کی خرید و فروخت کرنا

سوال :- ایک دوکاندار کے پاس مختلف اقسام کی گندم ہے جسے وہ مختلف نرخوں میں فروخت کرتا ہے، اگر دوکاندار ان مختلف اقسام کی گندم کو ملا کر ایک علیحدہ قسم نکالے جس میں ادنیٰ اور اعلیٰ ہر قسم کی گندم شامل ہو، تو کیا یہ طریقۂ تجارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگر دوکاندار گندم کی حقیقت چھپا کر خریدار پر اعلیٰ قیمت پر فروخت کرے تو یہ ناجائز ہے، لیکن اگر گاہک کو بتا کر فروخت کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ بائع کی نشاندہی کے بعد عیب دار چیز کی فروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، کسی چیز کے عیب کو چھپا کر فروخت کرنا گناہ ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : لایحل کتمان العیب فی مبیع او ثمن لان الغش حرام۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۵ ص۴۷ کتاب البیوع، باب خیار العیب)[۱]

نقد رقم قرض دینے کی بجائے کوئی چیز مہنگی دینا

سوال :- ایک آدمی نے کسی سے تین ہزار روپے قرض لینا چاہا، بجائے قرض رقم کے اس نے ایک کپڑا ساڑھے تین ہزار روپے میں اس کے ہاتھ فروخت کیا جبکہ بازار میں اس کپڑے کی قیمت تین ہزار روپے ہے، ضرورت مند نے کپڑا لیکر بازار میں اسکو تین ہزار روپے میں فروخت کر دیا، اس صورت میں قرض دینے والے کو پانچسو روپے منافع ملا اور ضرورتمند کو تین ہزار روپے ملے، جبکہ بعد میں کپڑا لینے والا شخص کپڑا دینے والے کو تین ہزار روپے کی بجائے تین ہزار پانچسو روپے ادا کرے گا، تو کیا از روئے شرع یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ اس صورت میں قرض دے کر ضرورتمند کی خیر خواہی کی بجائے مفاد پرستی نمایاں نظر آتی ہے لیکن بیع کی جملہ شرائط کی رعایت کی وجہ سے یہ عقد جائز ہے، اس صورت میں مشتری کا مقصد اور ضروریات پوری ہو جاتی ہیں جبکہ بائع کو بوجہ نسیئہ مروجہ قیمت سے زیادہ

---

[۱] قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ : اذا اطلع المشتری علیٰ عیب المبیع فھو بالخیار ان شاء اخذہٗ بجمیع الثمن وان شاء ردّہٗ ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۴۴ باب خیار العیب، کتاب البیوع)
ومِثلُہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص۲۵ باب خیار العیب۔ کتاب البیوع۔

رقم ملتی ہے جس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ نقد کی نسبت اُدھار میں زیادہ قیمت لگانا جائز ہے۔

لما قال العلامۃ کمال الدین ابن الہمام رحمہ اللہ: کان یحتاج المدیون فیأبی المسئول ان یقرض بل ان یبیع مایساوی عشرۃ بخمسۃ عشر الی اجلٍ فیشتریہ المدیون و یبیعہ فی السوق بعشرۃ حالۃً ولا بأس فی ھٰذا فان الاجل قابلہ قسط من الثمن والقرض غیر واجب علیہ دائمًا بل ھو مندوب فان ترکہ بمجرد رغبۃٍ منہ الی زیادۃ الدنیا فمکروہ او لعارضٍ یعذر بہ فلا۔۔۔۔۔۔۔ ومالم ترجع الیہ العین التی خرجت منہ لا یسمّٰی بیع العینۃ لانہ من العین المسترجعۃ لا العین مطلقاً والا فکلُّ بیعٍ بیع العینۃِ۔ (فتح القدیر ج۶ ص۳۲۴ الکفالۃ) [۱]

آٹا پیسنے کے عوض اناج جمع کر کے فروخت کرنا

سوال:- آجکل بعض علاقوں میں مشین سے آٹا پیسنے کے عوض مکئی وغیرہ لی جاتی ہے، تو کیا آٹا پیسنے کے عوض مکئی لینا اور اسے جمع کر کے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- آٹا پیسنے کے عوض مکئی لینا جائز ہے لہٰذا آٹا پیسنے کے عوض مکئی وغیرہ جمع کر کے اپنے لیے استعمال کرنا یا فروخت کرنا دونوں طرح جائز ہے، البتہ پسے ہوئے آٹا سے خصوصی طور پر مزدوری مقرر کر کے لینا قفیز الطحان کے حکم میں ہو کر اجارہ فاسد رہے گا۔

لما قال ابن عابدین رحمہ اللہ: استاجر بغلاً لیحمل طعامًا ببعضہ او ثوراً لیطحن بُرّہ

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: فان لم یعد کما اذا باعہ المدیون فی السوق فلا کراھۃ فیہ بل خلاف الاولیٰ لان الاجل قابلہ قسط من الثمن والقرض غیر واجب علیہ دائمًا بل ھو مندوب ومالم ترجع الیہ العین التی خرجت منہ لا یسمّٰی بیع العینۃ لانہ من العین المسترجعۃ لا العین مطلقاً والا فکلٌّ بیعٍ بیع العینۃ واقرہ فی البحر والنھر والشرنبلالی وھو ظاہر وجعلہ السیّد ابو السعود محمل قول ابی یوسفؒ وحمل قول محمدؒ والحدیث علی صورۃ العود۔ (رد المحتار ج۵ ص۳۲۶ کتاب البیوع، باب المتفرقات، مطلب بیع العینۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۳۵ کتاب الکفالۃ۔

ببعض دقیقه فسدت .... والحیلة ان یفرز الاجر اوّلاً او یسمّی قفیزاً بلا تعیین ثم یعطیه قفیزاً منه فیجوز قال الرملی وبه علم بالاولیٰ الجواز ما یفعل فی دیارنا من اخذ الاجرة من الحنطة والدراهم معًا ولا شك فی جوازه۔

(ردّ المحتار ج ۶ ص۵۷ کتاب الحظر والاباحة۔فصل فی البیع) [۱]

مشترکہ زمین سے اپنا حصّہ فروخت کرنا

سوال:۔ چند آدمیوں کے درمیان دس کنال مشترکہ زمین ہے، ان میں سے ایک حصہ دار اپنا حصّہ فروخت کرنا چاہتا ہے، تو کیا شریعتِ مقدسہ میں مشترکہ زمین سے کسی حصہ دار کو اپنا حصّہ فروخت کرنے کی اجازت ہے یا نہیں ؟

الجواب: مشترکہ زمین سے اپنا معلوم حصّہ فروخت کرنا از روئے شرع جائز ہے اگرچہ تقسیم نہ ہوئی ہو، تاہم اگر اپنا حصّہ فروخت کرتے وقت معلوم نہ ہو کہ مثلاً ثلث ہے یا ربع، ایک کنال ہے یا دو کنال، تو ایسی صورت میں یہ بیع جہالت کی وجہ سے باطل شمار ہو کر ناجائز ہوگی۔

لما قال محمد خالد الاتاسیؒ: بیع حصة شائعةٍ معلومة کالنصف والثلث والعشر من عقار مملوك قبل الافراز صحیح لانه لا یشترط فی صحة البیع الافراز عند التسلیم لا تفاقهم علی صحة بیع مشاع لا یمکن افرازه۔ (شرح مجلّة الاحکام تحت المادة ۲۱۴/۲۱۵ ص۱۰۳) [۲]

---

[۱] قال فی الهندیة: والحیلة فی ذٰلك لمن اراد الجواز ان یشترط صاحب الحنطة قفیزاً من الدقیق الجید ولم یقل من هٰذه الحنطة۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۴۴، کتاب الاجارة، الفصل فی قفیز الطحان وماهو فی معناه)۔

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلّة لسلیم رستم باز تحت المادة ص۲۶۔

[۲] قال محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوةؒ: اما بیعه فقسمان یحتمل القسمة اولا وکل قسم علی وجهین اما ان باع من اجنبی او من شریکه فالوجه الاوّل وهو البیع من اجنبی علی صنفین واما ان کان الکل له فباع نصفه او کان بین اثنین فباع احدهما نصیبه فالبیع جائز فی المواضع کلها۔ (جامع الفصولین ج۲ ص۸۲ الفصل الحادی والثلاثون فی مسائل الشیوع)

وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۲۴۶ کتاب البیوع۔

مشترکہ طور پر خریدی ہوئی چیز سے اپنا حصّہ نکالنے کا طریقہ

سوال:۔ چند ساتھیوں نے آپس میں رقم جمع کر کے ایک چیز خریدی، چند ماہ کے استعمال کے بعد ان میں سے ایک نے اپنا حصّہ واپس لینا چاہا تو کیا اُس ساتھی کو اس چیز کی موجودہ قیمت کے لحاظ سے رقم واپس کی جائے گی یا قیمتِ خرید کے حساب سے؟ جبکہ استعمال کی وجہ سے اُس چیز کی قیمت کافی کم ہوگئی ہو؟

الجواب:۔ کوئی چیز مشترکہ طور پر خرید کر استعمال کرنے کے بعد جب کوئی حصہ دار اپنا حصّہ واپس لینا چاہے تو اس کو موجودہ وقت کی قیمت کے اعتبار سے رقم واپس کی جائے گی نہ کہ قیمتِ خرید کے مطابق، کیونکہ کسی چیز کے استعمال کرنے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اسکی قیمت میں بھی ضرور اُتار چڑھاؤ پیدا ہوتا رہتا ہے ۔

لما قال علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : ولو تراضیا ان تقوم الکتب ویأخذ کل بعضها بالقیمة لو کان بالتراضی جاز والا لا۔ (الدر المختار مع رد المختار ج۶ ص۲۶۱ کتاب الحظر والاباحة)[1]

زیادہ منافع کی اُمید پر کسی چیز کی فروخت میں تاخیر کرنا

سوال:۔ کاروبار کے سلسلے میں اگر کوئی شخص کسی دوسرے شہر سے حیوانات کی خوراک یا غلہ وغیرہ لائے اور اس وقت مارکیٹ میں مندی ہو، اب یہ شخص اس امید پر مال کی فروخت چند ماہ کے لیے مؤخر کردے تاکہ بعد میں منافع زیادہ ملے۔ کیا اس شخص کا یہ اقدام ذخیرہ اندوزی کے دائرہ میں آکر حرام ہے یا جواز کی گنجائش ہے؟

الجواب:۔ ذخیرہ اندوزی میں بنیادی طور پر مقامی لوگوں کی حق تلفی کر کے اپنے منافع و فوائد پیشِ نظر ہوتے ہیں لیکن کسی دوسرے شہر سے اجناس وغیرہ اپنے شہر یا گاؤں کو منتقل کرنے سے اس گاؤں والوں کا حق نہیں رہتا، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا یہ اقدام جائز ہے کیونکہ اس میں مقامی لوگوں کی حق تلفی نہیں ہوتی، تاہم مسلمانوں کو تکلیف میں دیکھتے ہوئے

---

[1] قال فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی رحمہ اللہ : والعبد الواحد والدابة الواحدة یباع ویقسم ثمنها لانها لاتحتمل القسمة وکذلك کل مایکون فی تبعیضه ضرر۔

(الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۱۵۰ کتاب القسمة)

ومثلهٗ فی شرح المجلة لسلیم رستم باز تحت المادة ۱۱۴۲ ص۶۳۳۔

ذاتی مفادات کو ترجیح دینا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ومن احتکر غلّة ضیعته او ما جلبه من بلدٍ اٰخر فلیس بمحتکر۔ (الھدایة ج۴ ص۴۷۱ کتاب الکراھیة فصل فی البیع) [۱]

بیع قطعی سے انحراف درست نہیں

سوال: ایک شخص نے کسی پر بخوشی ورضا اپنی دوکان پچاس ہزار روپے کے عوض فروخت کی اور مشتری نے کچھ رقم ادا کر کے باقی کا وعدہ کیا، چند دنوں کے بعد یہی بائع کسی اور آدمی کے ساتھ دوکان کا سودا کرنا چاہتا ہے، کیا بائع کے لیے اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: باضابطہ طور پر ایجاب وقبول کے بعد بائع بیع فسخ کر کے مبیعہ کو کسی دوسرے پر فروخت کرنے کا شرعاً حق نہیں رکھتا، البتہ اگر بائع اور مشتری نے آپس میں باہمی رضامندی سے بیع فسخ کر لی تو بائع کے لیے مبیعہ کسی دوسرے کو دینے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحدٍ منهما من عیبٍ او عدم رؤیةٍ۔ (الھدایة ج۳ ص۲۵ کتاب البیوع) [۲]

بائع اور مشتری کا ایک بار تولنے پر اکتفاء کرنا

سوال: جب موزونی یا مکیلی اشیاء ناپ تول کے حساب سے خریدی جائیں، اگر مشتری کے سامنے ایک دفعہ جب چیز تولی جائے تو کیا مشتری کے لیے دوبارہ تولنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی چیز کو ناپ تول کے حساب سے خرید کر جب طرفین کی موجودگی میں اس

---

[۱] قال فی الھندیة: ومن اشترٰی طعامًا فی مصرٍ وجلبه الی مصرٍ اٰخر واحتکرہ فیه فانهٗ لا یکرہ ھٰکذا فی المحیط۔ (الفتاوٰی الھندیة ج۳ ص۲۱۳ فصل فی الاحتکار کتاب البیوع)
وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲۹ کتاب الاستحسان۔

[۲] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: البیع یلزم بایجاب وقبول ای حکم البیع یلزم بهما لانهٗ جعلهما غیرہ وانه یلزم بهما مع ان البیع لیس الا هما لانهما اکناہ۔
(البحر الرائق ج۵ ص۲۶۲ کتاب البیوع)
وَمِثْلُهٗ فی التبیین الحقائق ج۴ ص۳ کتاب البیوع۔

مطلوبہ چیز کو ناپ تول لیا جائے تو مشتری کو دوبارہ ناپ تول کی ضرورت نہیں بلکہ خریدنے کے بعد دونوں کی موجودگی میں ہی تولنا کافی ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : قال فی الخانیة لو اشتری کیلیًا مکایلةً او موزونًا موازنةً فکال البائع بحضرة المشتری۔ قال الامام ابن الفضل یکفیه کیل البائع ویجوز له ان یتصرف فیه قبل ان یکیله۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۵۱ مطلب فی تصرف البائع فی المبیع قبل القبض) [1]

شرکاء کا اپنے حصص کا کسی ایک شریک کے ہاتھ فروخت کرنا

سوال:۔ چند شرکاء آپس میں مشترکہ طور پر کوئی چیز خریدتے ہیں، خریدنے کے بعد آپس میں یہ شرکاء بولی کرکے جو زیادہ قیمت پر آمادہ ہو تو وہ مبیعہ لیکر ہر ایک شریک کو اپنی رقم بمع منافع واپس کرتا ہے، تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ تمام شرکاء مشترکہ طور پر کوئی چیز لے کر آپس میں نیلام کرتے ہیں اور جو زیادہ رقم دینے والا ہو تو مبیعہ اس کے حوالے کیا جاتا ہے، پس اس میں اگر نیلام سے طے شدہ رقم اپنے حصہ کے علاوہ دیگر شرکاء کے حصص کا عوض ہو تو یہ جائز رہے گا ورنہ مجموعہ کو خریدنا جس میں اپنا حصہ بھی شامل ہو جائز نہیں۔

لما قال فی مجلة الاحکام : الشریك مخیر ان شاء باع حصته من شریکه وان شاء باعها عن اجنبی بدون اذن شریکه۔ لکن فی صور خلط الاموال واختلاطها التی بیناها فی الفصل الاول۔ (مجلة الاحکام المادة ۱۰۸۸ ص ۶۰۸) [2]

---

[1] قال ابن نجیمؒ : اما اذا کاله فی حضرته فانه یغنی عن کیله وهو الصحیح لان المبیع صار معلومًا بکیل واحد۔ (البحر الرائق ج ۶ ص ۱۱۸، فصل فی بیان التصرف فی المبیع والثمن قبل قبضه)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص ۸۵ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامة علاء الدین الحصکفیؒ : وکل من شرکاء الملك اجنبی فی مال صاحبه. فصح له بیع حصته ولو من غیر شریکه بلا اذن الا فی صورة الخلط۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۳۰۰ کتاب الشرکة۔ مطلب الحق ان الدین یملك)
وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة لسلیم رستم باز تحت المادة ۱۰۸۸ ص ۶۰۸۔

قرض کو فروخت کرنا

سوال: میں سعودی عرب میں کاروبار کرتا تھا وہاں میرا کسی کے ذمے دس ہزار روپے قرضہ ہے لیکن اب وہاں جانا اور اپنا قرض وصول کرنا بہت ہی مشکل ہے اس لیے میں یہ قرض کسی پر نو (۹) ہزار روپے پر فروخت کرنا چاہتا ہوں، کیا قرض کی رقم اس طرح فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مقروض کے علاوہ کسی اور پر قرض فروخت کرنا فقہاء نے ممنوع قرار دیا ہے صورتِ مذکورہ میں چونکہ نقد نو ہزار روپے کے بدلے قرض کے دس ہزار روپے لیے جاتے ہیں جو کہ ربٰوا نسیئہ کی وجہ سے اس کا خریدنا حرام ہوگا۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: وبیع الدّین لا یجوز ولو باعہ من المدیون او وھبہ جاز۔ (الاشباہ والنظائر ج۲ ص۱۴۱ المادۃ ۱۶ کتاب البیوع)

غیر مسلموں کی متروکہ اشیاء فروخت کرنا

سوال: کسی ملک میں غیر مسلم کچھ عرصہ تک آباد رہنے کے بعد وہاں سے چلے جائیں تو ان کی باقیماندہ اشیاء کا کیا حکم ہے؟ کیا ان کو فروخت کرکے حاصل ہونے والی قیمت کو ذاتی استعمال میں لانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی مسلم ملک سے غیر مسلم اقوام کے چلے جانے کے بعد ان کی رہ جانے والی جائیداد یا دیگر اشیاء ذاتی مفاد کے لیے فروخت کرنا شرعاً ممنوع ہے بلکہ ان اشیاء کو یا ان کی قیمت کو بیت المال کے حوالہ کرنا ہوگا، اور اگر بیت المال کا کوئی قابلِ اعتماد انتظام نہ ہو بلکہ اس میں ان اشیاء کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو پھر کسی ایسی جگہ میں خرچ کرنا مناسب ہے جہاں سے عمومی مفادات وابستہ ہوں، ایسے اموال کے لیے دینی مدارس اور درسگاہیں بہترین مقاماتِ مصرف ہیں۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: وما اوجف المسلمون علیہم من اموال

---

[1] قال ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ: بیع ھذہ الدیون من غیر من علیہ والشراء بہا من غیر من علیہ فینظر ان اضاف البیع والشراء الی الدین لم یجز۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۸۲ فصل واما شرائط الصحۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتاویٰ تنقیح حامدیۃ ج۲ ص۲۴۹ کتاب المداینات۔

اهل الحرب بغیر قتال یصرف علیہ فی مصالح المسلمین کما یصرف الخراج قالوا ھو مثل الاراضی التی اجلوا اھلھا عنھا۔ (الھدایۃ ج ۲ ص۵۶۴ کتاب السیر، فصل: واذا دخل الحربی الینا۔ الخ) [۱]

ہم جنس موزونی اشیاء کو بلاوزن فروخت کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں کچھ اشیاء بغیر تول کے فروخت کی جاتی ہیں یعنی اگر بعض موزونی اشیاء مثلاً پیاز، لہسن وغیرہ اندازہ سے بغیر تول کے اپنی ہم جنس پر فروخت کی جائیں تو از روئے شرع یہ بیع درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ موزونی اشیاء بغیر تول کے اپنی جنس پر فروخت کرنا اور تبادلہ میں لینا جائز نہیں کیونکہ اس میں ربٰوا (سود) کا شبہ پایا جاتا ہے، پس یہی شبہ حقیقی ربٰوا کے قائم مقام ہوکر بیع جائز نہ ہوگی۔

لما قال علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ویجوز بیع الطعام والحبوب مکایلۃً و مجازفۃً وھذا اذا باعہ بخلاف جنسہ لقولہ علیہ السلام اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم بعد ان یکون یداً بیدٍ بخلاف ما اذا باعہ بجنسہٖ مجازفۃً لما فیہ من احتمال الربٰوا۔ (الھدایۃ ج ۳ ص۲۷ کتاب البیوع) [۲]

گڑ کا معیار بہتر بنانے کے لیے رنگ کاٹ استعمال کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں گڑ صاف کرنے کے لیے

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وما اخذ منھم بلا حربٍ ولا قھرٍ کالھدیۃ والصلح فھو لا غنیمۃ ولا فیئٌ وحکمہ حکم الفیئ لا یخمس ویوضع فی بیت المال۔
(رد المحتار ج ۴ ص۱۳۸ باب المغنم وقسمتہ، مطلب فی بیان معنی الغنیمۃ والفیئ)
ومثلہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۲۷۲ کتاب السیر۔

[۲] قال ابن نجیم: ویباع الطعام کیلاً وجزافاً لحدیث البخاری فاذا اختلف ھذہ الاصناف فبیعوا کیف شئتم ولا یرد علیہ بیع الجنس بالجنس من الربٰوا مجازفۃً لما سیأتی فی الربٰوا من انہ غیر جائز الا اذا کان قلیلاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۲۸۲ کتاب البیوع)
ومثلہٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۴۷۹ کتاب البیوع۔

رنگ کاٹ (خاص قسم کا کیمیکل) استعمال کیا جاتا ہے تاکہ سفید ہو کر قیمت بڑھ جائے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور بیع پر کیا اثر پڑے گا؟

الجواب: اگر گڑ کی صفائی اور اس کا معیار بہتر بنانے کے لیے رنگ کاٹ استعمال کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر رنگ کاٹ کے استعمال کا مقصد ادنیٰ قسم کو اعلیٰ ظاہر کرنا ہو یا مشتری کی تلبیس اور اسے دھوکہ دینا مقصود ہو تو یہ ملاوٹ کے مترادف ہو کر ناجائز اور حرام ہوگا۔

اخرج الامام ابوداؤدؒ: عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم مر برجل یبیع طعامًا فسئله کیف تبیعه فاخبره فاوحی الیه ان ادخل یدك فادخل یده فیه فاذا هو مبلول فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم لیس مِنّا مَنْ غَشَّ۔

(ابوداؤد ج ۲ ص۱۳۳ باب نهی عن الغش۔ کتاب البیوع) [1]

جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کرنا

جمعہ کی اذان کے بعد تجارت (کاروبار) کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جمعہ کے دن جب وقت داخل ہونے پر اذان دی جائے تو اُس وقت جمعہ کے متعلقہ امور کے علاوہ دیگر امور میں مصروف ہونا مناسب نہیں، اس بناء پر جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے جمعہ کی سعی اور تیاری متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے جمعہ کی اذان کے بعد تجارت کو موقوف کر دینا چاہیئے۔

لما قال الله تبارك وتعالیٰ: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورة الجمعه آیت ۹) [2]

---

[1] قال فی الهندیة: ویکره ان یلبس الجید بالردی وان یصبغ اللحم بالزعفران۔
(الفتاویٰ الهندیة ج ۳ ص۲۱۵ فصل فی الاحتکار)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۵ ص۱۰۲ باب البیع الفاسد، بعد مطلب احکام نقصان المبیع فاسدًا۔

[2] لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: والبیع عند اذان الجمعة قال الله تعالیٰ وذروا البیع ثم فیه اخلال بواجب السعی علی بعض الوجوه وقد ذکرنا الاذان المعتبر فیه فی کتاب الصلوٰة کل ذلك یکره لما ذکرنا ولا یفسد به البیع۔ (الهدایة ج ۳ ص۶۹ فصل فیما یکره۔ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص۹۹ فصل فی البیع الفاسد۔

ضرورت سے زائد روٹیاں جمع کر کے فروخت کرنا

سوال:۔ بعض لوگ ضرورت سے زائد روٹیاں (ٹکڑے وغیرہ) جمع کر کے فروخت کرتے ہیں تو کیا ان روٹیوں کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید و فروخت کے لیے بنیادی طور پر کسی چیز کا مال متقوم ہونا لازمی ہے، اس بناء پر روٹی اور آٹا چونکہ مال متقوم میں سے ہے لہٰذا اسکی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے۔

لما قال فخرالدين عثمان بن على الزيلعيؒ: وشرطه ان يكون فى العقد عوضان كل واحدٍ منهما مال يتحقق ركن البيع وهو مبادلة المال بالمال۔ (تبيين الحقائق ج۴ ص۶۱ فصل فى قبض المشترى المبيع فى البيع الفاسد بامر البائع) [1]

کاریز کا پانی فروخت کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں پانی کی کمی دور کرنے کے لیے کاریز استعمال کئے جاتے ہیں، تو کیا ان کاریزوں سے حاصل ہونے والا پانی فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کرام نے کاریز کو نہر جاری کے حکم میں شمار کیا ہے، نہر کے پانی کی طرح کاریز کا پانی بھی مملوک اور محرز نہیں اسلئے کاریز کا پانی فروخت کرنا جائز نہیں، تاہم اگر اس کو باقاعدہ طور پر محرز کر کے فروخت کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال على بن ابى بكر المرغينانيؒ: والثالث اذا دخل الماء فى المقاسم فحق الشفعة ثابت..... ولان البئر ونحوها ما وضع للاحراز ولا يملك المباح بدونه كالظبى اذا تكنس فى ارضه۔

(الهداية ج۴ ص۴۸۲ فصول فى مسائل الشرب) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجيم المصرى رحمه الله: وقيد بقوله وكل من عوضيه مال ليخرج البيع بالميتة وكل بيع باطل۔ (البحر الرائق ج۶ ص۹۲ فصل فى البيع الفاسد)

وَمِثْلُهُ فى حاشية الشلبى على هامش تبيين الحقائق ج۴ ص۳ كتاب البيوع۔

[2] قال العلامة ابن نجيم المصرى رحمه الله: والقناة مجرى الماء تحت الارض..... لانه نهر فى الحقيقة تعتبر بالنهر ولان الانهار والابار والحياض لم توضع للاحراز والمباح لا يملك الا بالاحراز۔ (البحر الرائق ج۸ ص۲۱۲ كتاب احياء الموات)

وَمِثْلُهُ فى رد المحتار ج۶ ص۴۳۹ كتاب احياء الموات۔

بیع فضولی کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی کی مملوکہ زمین اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر اس کے بھائی نے فروخت کردی، اب وہ اپنی زمین واپس لینا چاہتا ہے، اس کے اصرار کے باوجود بھی مشتری واپس کرنے پر رضامند نہیں، تو اب مذکورہ زمین کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ کسی کی مملوکہ زمین میں مالک کی اجازت کے بغیر شرعاً کسی کو بھی تصرّف کا حق حاصل نہیں لہٰذا جو زمین کسی کی بذریعہ شہادت ثابت شدہ و تسلیم شدہ ملکیت ہو تو اُس میں کسی اور کا تصرّف درست نہیں اور وہ شرعاً اپنی ملکیتی زمین واپس لینے کا مجاز ہے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: ومن باع ملك غيره بغير امره فالمالك بالخيار ان شاء اجاز البيع وان شاء فسخ۔ (الهداية ج ۳ ص ۹۰ کتاب البیوع۔ فصل فی بیع الفضولی) [۱]

جانوروں کے خون کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ جانوروں کا خون بیچنا کیسا ہے، اور اس سے انتفاع کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ خون بذاتِ خود ایک نجس شے ہے اور اسلام نے اس کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے، اس سے بلا ضرورتِ شرعی انتفاع لینا بھی صحیح نہیں، لہٰذا جانوروں کے خون کی خرید و فروخت اور اس سے انتفاع دونوں صحیح نہیں ہے۔

قال العلامة التمرتاشیؒ: بطل بيع ماليس بمال كالدم والميتة۔ (تنویر الابصار ج ۴ ص ۱۱۲ کتاب البیوع)

کما قال اللہ تعالیٰ: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۱۷۳)

کما قال الرسولؐ: ان الله اذا حرم على قوم اكل شئ حرم عليهم ثمنه۔

(اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۸۰ ابواب البیوع الفاسدۃ۔ باب حرمۃ بیع الخمر الخ)

---

[۱] قال العلامہ ابن عابدین رحمہ اللہ: شرائط النفاذ اثنان الملك اوالولاية وان لايكون فى البيع حق لغير البائع فلم ينفذ بيع الفضولى۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۵۰۵ کتاب البیوع، مطلب شرائط البیع انواعٌ اربعۃ)

وَمِثْلُهٗ فی الھندیۃ ج ۳ ص ۳ کتاب البیوع، الباب الاول فی تعریف البیع .... الخ۔

[۲] قال العلامۃ علی بن ابی بکر المرغینانیؒ: بيع الميتة والدم والحر باطل لانها ليست اموالاً فلا تكون محلا للبيع۔ (الهداية ج ۳ ص ۳۳ باب الفاسد۔ کتاب البیوع)

مشترکہ جائیداد اور اراضی کی بیع و شراء کا حکم

سوال:۔ مشترکہ جائیداد اور اراضی کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں؟

الجواب:۔ مشترکہ جائیداد کی خرید و فروخت جائز ہے بشرطیکہ اس میں تمام شرکاء کی رضامندی شامل ہو کیونکہ ہر ایک اپنے حصہ کا مالک ہے اور مالک اپنے حصہ میں تصرف کرسکتا ہے، لہٰذا یہ بیع صحیح ہے فاسد نہیں ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ : اذ باع احد الشریکین نصفها فان ثم یجوز البیع فی نصف الدار لان بیع المالك انصرف الی نصیبه باع احدهما نصیبه فالبیع جائز فی المواضع۔ (تنقیح الحامدیة ج ۱ ص ۲۲۵ کتاب البیوع)[1]

مشتری کا بائع کو دھوکا دینا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے بغبنِ فاحش زمین خریدی، اب وہ تیرہ چودہ سال کے بعد یہ زمین بائع کو واپس کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کو یہ حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ ایسی خرید و فروخت جس میں ایک دوسرے کو دھوکا دیا گیا ہو فریقین کو اسے رَدّ کرنے کا اختیار ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ : وان غر المشتری البائع او با العکس او غره الدلال فله الرّد۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۱۶۸ باب المرابحة والتولیة)

لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ اس غبن کے معلوم ہونے سے پہلے مشتری نے مبیع میں تصرف نہ کیا ہو اور نہ بائع نے ثمن میں تصرف کیا ہو جس سے ان کی رضا معلوم ہوتی ہے۔
کما قوله علیه السلام : نهی عن بیع الحصاة وعن بیع الغرر۔ (اعلاء السنن ج ۴ ص ۸۹)[2]

---

[1] قال العلامة الزیلعیؒ : هذا لانه بالبیع صار شرکة ملك حتی لا یجوز لکل واحدٍ منهما ان یتصرف فی نصیب الاجر ثم بالقصد بعد ذلك صار شرکة عقد فیجوز لکل واحد منهما ان یتصرف فی نصیب صاحبه۔ (تبیین الحقائق ج ۳ ص ۳۱۷ کتاب البیوع)

[2] قال العلامة خالد اتاسیؒ : اذا غرّ احد المتبایعین الآخر وتحقق ان فی البیع غبنًا فاحشًا فللمغبون ان یفسخ البیع حینئذٍ۔ (شرح المجلة ج ۱ ص ۱۹۹ الفصل السابع)۔

قربانی کے لیے خرید ے گئے حاملہ جانور کی واپسی کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے کسی سے قربانی کے لیے جانور خریدا، بیع ہو جانے کے بعد مشتری کو علم ہوا کہ وہ تو حاملہ ہے، کیا صرف اس وجہ سے اس کو واپس کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- بیع تام ہو جانے کے بعد جب کسی جانور میں عیب کا پتہ چلے اور وہ بائع کے ہاں سے ہی اس جانور میں موجود ہو اور بائع نے بتایا بھی نہ ہو تو اس وجہ سے مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے، کسی جانور کا حاملہ ہونا کوئی عیب نہیں اس لیے صورتِ مسئولہ میں مشتری کو بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں، تاہم اقالہ کی صورت میں مبیعہ واپس کیا جا سکتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: نعم له ردها بعيب الحبل والحبل عيب في الجارية لا في البهائم۔ (تنقيح الحامدية ج۱ ص۲۷۰ كتاب البيوع- باب الخيارات) [1]

بیع فسخ کرنے کی صورت میں بائع پر جرمانہ لگانا

سوال:- دو آدمیوں نے کچھ مشترکہ زمین فروخت کی اور مشتری سے کچھ رقم نقد لے لی اور بقیہ رقم رجسٹری کی تکمیل تک مؤخر کر دی گئی اور اس کے ساتھ مشتری نے یہ شرط لگائی کہ اگر بائع نے زمین واپس لی تو اسے پچیس ۲۵ روپے جرمانہ ادا کرنا ہوگا، کیا ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب:- مذکورہ صورت میں اگر یہ شرط اور رقم کی وصولی وغیرہ بیع کے ایجاب و قبول کے وقت لگائی گئی ہو تو یہ بیع فاسد ہے اور اس سے ہر ایک بلا رضائے غیر فسخ کر سکتا ہے، نیز فسخ کی صورت میں وصول کردہ رقم واپس کرنا ضروری ہے تاہم فسخ کرنے والے سے جرمانہ لینا جائز نہیں اور اگر ایجاب و قبول کے بعد ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: طلب في الشرط الفاسد اذا ذكر

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: رجل اشترى حمارًا واحبلها لايردها بالعيب۔ (خلاصة الفتاوى ج۳ ص۳۷ باب خيار العيب، كتاب البيوع)
وَمِثْلُهٗ في البحر الرائق ج۶ ص۴۵ باب خيار العيب۔

بعد العقد او قبله لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لاحدهما او فيه نفع مبيع هو اهل الاستحقاق بنفع - (رد المحتار ج۴ ص۱۳۶ باب بیع الفاسد) ؎۱

وقتِ معین تک ثمن کی ادائیگی کا اختیار دینا

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے متعلق کہ اگر بائع مشتری سے یہ کہے کہ اگر تو شام تک مجھے رقم ادا کردے تو تیرے اور میرے درمیان معاملہ باقی ورنہ رد ہو گا، کیا ایسا کرنا صحیح ہے ؟

الجواب :- اس طرح کی بیع کرنا بیع کی صحت کے منافی نہیں، لہٰذا اگر صورت مسئولہ کے مطابق اگر مشتری نے شام تک طے شدہ رقم بائع کو ادا نہ کی تو استحساناً بیع ختم ہو جائے گی۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله: وعن باع على انه ان لم ينقد الثمن الى ثلثة ايام فلا بيع بينهما جاز - (الهداية ج۳ ص۳۴ باب خيار الشرط) ؎۲

پشیمان ہونے پر رقم واپس کرنا لازم ہے

سوال، ایک شخص نے کسی سے مکان خریدا اور کچھ پیشگی رقم بھی اسے دے دی، مگر ایجاب وقبول اور مبیعہ پر قبضہ کرنے کے بعد کسی وجہ سے مشتری مکان خریدنے پر پشیمان ہو گیا اور بائع کو مکان واپس کرکے ادا کردہ رقم واپس لینا چاہتا ہے۔ تو کیا مشتری مکان واپس کرکے بائع سے اپنی رقم لینے کا شرعاً حقدار ہے یا نہیں ؟

الجواب :- بائع کے لئے پیشگی کی رقم لینا حرام ہے، بلکہ بائع اپنے مبیع پر قبضہ کے بعد ثمن مشتری کو واپس کردے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله : فان شرط اكثر منه او اقل فالشرط باطل

؎۱ كما في الحديث قوله عليه السلام: كل شرط ليس في كتاب الله فهو باطل فبطل الشرط الواحد وكل ما لم يعقد ا ه به - (اعلاء السنن ج۱۴ ص۱۱۳ باب النهي عن البيع بالشرط)
وَمِثْلُهٗ في الهداية ج۳ ص۴۳ كتاب البيوع - باب بيع الفاسد -

؎۲ قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : فان نقد الثمن تم البيع وان لم ينقد انفسخ البيع وفي بعضها فسد البيع ولو باع عبداً على انه ان لم ينقد المشترى الثمن الى ثلثه ايام فلا بيع صح استحساناً - (رد المحتار ج۴ ص۵۰ كتاب البيوع)

ویرد مثل الثمن الاوّل لقوله علیه السلام من اقال نادمًا بیعته اقال الله عثرته یوم القیامۃ۔ (الهدایۃ ج۳ ص۷۱ باب الاقالۃ) [1]

بیع میں بیعانہ ضبط کرنے کے رواج کا شرعی حکم

سوال:- کسی شخص نے ایک مکان فروخت کیا اور رواج کے مطابق مشتری سے کچھ رقم بطور بیعانہ بھی لے لی، اور اس بیع میں فریقین کے مابین یہ شرط طے پائی کہ ایک مدتِ معین تک اگر بائع انکار کر دے تو وہ مشتری کو دس ہزار روپے بطور جرمانہ دے گا، اور اگر مشتری مقررہ مدت میں باقی رقم ادا کرکے اس مکان کی رجسٹری نہ کرا سکا تو بیعانہ کی رقم ضبط کر لی جائے گی۔ اس کے کسی وجہ سے مشتری اس شرط کو پورا نہ کر سکا تو کیا بائع کو بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

الجواب:- مذکورہ صورت میں مشروط عقدِ بیع فاسد ہے اور متعاقدین کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے، نیز بائع کو بیعانہ ضبط کرنے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔ [2]

کما قوله علیه السلام: نهی عن بیع العربان (اعلاء السنن ج۱۴ ص۱۲۷ باب النهی عن بیع العربان)

کلوگرام کے حساب سے کوئی چیز خرید کر سیر کے حساب سے فروخت کرنا جائز ہے

سوال:- ایک شخص بیرونِ ملک سے کچھ چیزیں کلوگرام کے حساب سے خرید کر اپنے ملک میں سیر کے حساب سے فروخت کرتا ہے، اسی طرح وہاں سے کپڑا میٹر کے حساب سے خرید کر اپنے وطن میں اُسے گز کے حساب سے فروخت کرتا ہے، تو کیا اس کا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے مطابق خرید و فروخت کا یہ طریقہ بالکل جائز ہے

---

[1] قال العلامۃ ابن الهمامؒ: وحقیقۃ الفسخ لیس الا رفع الاوّل کان لم یکن فیثبت الحال الاوّل وثبوت الحال الاوّل هو برجوع عین الثمن الاوّل الی مالکه کان لم یدخل فی الوجود غیره وهو یستلزم تعیین الاوّل۔ (فتح القدیر ج۶ ص۱۱۴ باب الاقالۃ)

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: کل شرط لا یقتضیه العقد وفیه منفعۃ لاحد المتعاقدین او للمعقود علیه وهو من اهل الاستحقاق یفسده۔ (الهدایۃ ج۳ ص۶۲ باب البیع الفاسد)

بشرطیکہ اس میں کوئی دھوکا نہ ہو۔

قال العلامة المرغینانیؒ: یجوز بیع الطعام والحبوب مکایلة ومجازفة ـــ قال ویجوز باناء بعینه لا یعرف مقداره وبوزن حجر بعینه لا یعرف مقداره لان الجهالة لا تفضی الی المنازعة۔ (الهدایة ج ۳ ص ۲۷ کتاب البیوع)[1]

نابالغ کی جائیداد جبراً فروخت کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ:۔

(۱) کیا کسی نابالغ کی جائیداد جبراً فروخت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۲) دو نابالغ بھائیوں میں سے ایک، اپنے دوسرے بھائی کی جائیداد فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اُس کو اِس کا علم بھی نہ ہو؟

(۳) شفعہ کا حق نسبت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے یا جوار (قُرب) کی وجہ سے؟

الجواب:۔ (۱) کسی اجنبی کو نابالغ کی جائیداد بدون اس کی رضا کے فروخت کرنا درست نہیں، تاہم باپ کو منفعت کے پیش نظر تصرف کا حق ہے۔

(۲) اگر یہ فروخت کنندہ بذاتِ خود یتیم ہو اور اس کے ساتھ نابالغ اور غیر عاقل بھی ہو تو اس کی خرید و فروخت کالعدم و نامنظور ہے

لما قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وشرط اهلیة المتعاقدین یکونهما عاقلین لا یشترط البلوغ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۵ کتاب البیوع)

(۳) اور شفعہ کا حق نسبتِ نسب کی بجائے شرکت اور جوار (قُرب) کی وجہ سے زیادہ حاصل ہے۔

قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمه الله: واذا اکره الرجل علی بیع ماله اوعلی شراء سلعةٍ اوعلی ان یقر لرجل بالف یواجر داره واکره علی ذلك

---

[1] قال العلامة بدر الدین العینی رحمه الله: یباع الطعام کیلا ای من حیث الکیل ویباع ایضاً وجزاماً لان بکل منهما یصیر معلوماً اما المکایلة فظاهر واما الجزاف فلانه بالاشارة تفع الجهالة۔ (عینی شرح کنز ج ۲ ص ۳ تحت فی بیان احکام البیوع)
ومثله فی البحر الرائق ج ۵ ص ۲۸۲ تحت احکام البیوع۔

بالقتل او بالضرب الشدید و بالحبس فباع او اشتریٰ فھو بالخیار ان شاء مضی البیع وان شاء فسخہ بالمبیع ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۳۳ کتاب البیوع)[۱]

بائع کا منفعت کی شرط لگانا باطل ہے

سوال :- ایک شخص نے کسی پر ایک مکان بطور رہن یہ شرط لگا کر فروخت کر دیا کہ جب رقم واپس کی جائے گی تو مکان بھی واپس مل جائے گا ، تو کیا یہ بیع شرعاً جائز ہے ؟

الجواب :- جس بیع میں بائع کی منفعت کے لیے ایسی شرط لگائی گئی ہو تو وہ بیع فاسد ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں اس سے ممانعت کی گئی ہے ۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ : وکل شرط لایقتضیہ العقد وفیہ منفعۃ لاحد المتعاقدین او للمعقود علیہ وھو من اھل الاستحقاق یفسدہ العقد۔

(الھدایۃ ج۳ ص۶۲ کتاب البیوع ، باب البیع الفاسد)[۲]

رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے بیع وشراء کا حکم

سوال :- ایک گاؤں کے مکینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم اپنے گاؤں کی چیزیں مثلاً انڈے ، مرغیاں وغیرہ فلاں خاص شخص ہی کو فروخت کریں گے ، نیز وہ اس معین شخص پر یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ تو ہم کو بیس روپے ماہانہ چندہ دے گا جسے ہم رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کریں گے ، تو کیا خرید وفروخت کیلئے ایسی شرط

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدینؒ : (وقولہ بالجور) القضاء بخلاف الحق اما عن خطاء او عمد وکل علی وجھین اما فی حقہ تعالیٰ او حق العبد فالخطاء فی حق العبد اما ان یمکن فیہ التدارک والرد اولا فان امکن بان قضی بمال او صدقۃ او طلاق او عتاق ..... یبطل القضاء ۔ (ردالمحتار ج۴ ص۳۸۰ کتاب القضاء مطلب فیما لو قضی بالجور)

وایضاً (وقف بیع مال الغیر) لو الغیر بالغاً عاقلاً فلو صغیراً او مجنوناً لم ینعقد اصلاً کما فی الزواھد معزیاً للحاوی ۔ (الدرالمختار علیٰ ہامش ردالمحتار ج۲ ص۱۵۲ کتاب الوقف)

[۲] قال العلامۃ المرغینانیؒ : کل شرط لایقتضیہ العقد وفیہ منفعۃ لاحد المتعاقدین الیٰ اخرہ ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۶۲ باب بیع الفاسد)

ومِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج۳ ص۵۴ کتاب البیوع ۔ باب البیع الفاسد ۔

لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ درج بالا صورت میں منصوبہ بندی سے ایک معین شخص سے خرید وفروخت جائز ہے بشرطیکہ اس سے ذخیرہ اندوزی اور روزہ مرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں بڑھانا مقصود نہ ہو، البتہ چندہ دینے کی شرط لگانا جائز نہیں، ہاں اگر کوئی اپنی خوشی سے چندہ دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔

وفی مجلۃ الاحکام : البیع بشرط لیس فیہ نفع لاحد العاقدین یصح والشرط لغو ۔ (مجلۃ الاحکام ص۸۹ المادۃ ۱۸۹ کتاب البیوع ۔ الفصل الرابع فی الشرط بالبیع) [1]

موہوبہ زمین کی خرید وفروخت کا حکم

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موہوبہ زمین کی خرید وفروخت کی جا سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ موہوبہ زمین کو باقاعدہ ہبہ کے بعد فروخت کیا جا سکتا ہے بلکہ اس سے واہب کو رجوع کا حق بھی ختم ہو جاتا ہے ۔

قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ : اذا باع الموہوب لہ الموہوب او اخرجہ عن ملکہ بالہبۃ والتسلیم لایبقی للواہب حق الرجوع ۔ (شرح المجلۃ ۔ المادۃ ۸۷۰ ص۴۸۱ تحت احکام الہبۃ) [2]

الکحل کی تجارت کا حکم

سوال :۔ آجکل بعض ادویات میں الکحل استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا کاروبار رواج پکڑ چکا ہے، تو کیا الکحل کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں ؟

---

[1] قال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانیؒ : لو شرطا فی البیع نفعاً علی اجنبی کما اذا باعہ شیئاً بشرط ان یقرضہ فلان عشرۃ دراہم فالبیع صحیح والشرط لغو ۔ (شرح مجلۃ الاحکام ص۸۹ المادۃ ۱۸۹ کتاب البیوع ۔ الفصل الرابع فی الشرط بالبیع)

[2] قال العلامۃ ابن نجیمؒ : خروج الہبۃ من ملک الموہوب لہ بالکلمۃ بان باع الہبۃ او وہبہا (البحر الرائق ج۷ ص۲۹۳ تحت باب الرجوع فی الہبۃ)

الجواب: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اشربہ اربعہ کے علاوہ جب شراب دیگر اناج واشیاء سے بنائی گئی ہو تو بصورت شرعی مجبوری استعمال کرنا جائز ہے تو اس کی تجارت کی بھی گنجائش موجود ہے۔ موجودہ الکحل (جو کہ شراب ہی کی ایک قسم ہے) چونکہ پٹرول، جو، مکئی وغیرہ اشیاء سے بنائی جاتی ہے اور ضرورتاً بہت ساری ادویات، رنگوں کے علاوہ دیگر کیمیکلز میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اس لیے بناء برقول امام ابوحنیفہؒ اس کی خرید و فروخت جائز ہے، موجودہ دور میں عموم بلویٰ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: الشراب لغة کل مائع یشرب واصطلاحاً مایسکر والمحرم منها اربعة...... وصح بیع غیر الخمر۔ قال ابن عابدینؒ: (تحت قوله صح بیع غیر الخمر) ای عنده خلافاً لهما فی البیع والضمان لکن الفتوٰی علیٰ قوله فی البیع۔ (ردالمحتار ج۶ ص۴۵۴ کتاب الاشربة) [۱]

حیوانات کی ادھار بیع کا حکم

سوال: ایک آدمی نے دوسرے شخص سے کہا کہ آپ اس سال مجھے اپنا بیل دے دیں، میں اس کے عوض میں آئندہ سال دوسرا بیل دے دوں گا، تو کیا شرعاً یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسئولہ صورت میں حیوان کی بیع حیوان کے بدلے میں بصورتِ قرض ہے جو کہ شرعاً حرام ہے، اس لیے دونوں عاقدین کی یہ عقدِ بیع جائز نہیں۔

عن ابن عمرؓ ان النبی صلی الله علیه وسلم نهی بیع الحیوان بالحیوان نسیئةً۔ (معانی الآثار ج۲ ص۲۲۹ باب النهی عن بیع الحیوان بالحیوان نسیئةً) [۲]

---

[۱] قال العلامة المرغینانیؒ: الاشربة المحرمة اربعة...... وقد بینا المعنیٰ من قبل الا ان حرمة هٰذه الاشربة دون حرمة الخمر حتیٰ لایکفر مستحلها ویکفر مستحل الخمر..... ویجوز بیعها ویضمن متلفها عند ابی حنیفة خلافاً لهما فیهما الخ۔ (الهدایة ج۴ ص۴۹۲ کتاب الاشربة)

[۲] قال الشیخ ظفر احمد العثمانیؒ: لایجوز بیع شئ من الحیوان من الرقیق ولا غیره بشئ من الحیوانات الرقیق ولا غیره نسیئة لان الحیوان لایجوز فیه السلم ای التاجیل وقال عن عبدالله بن مسعودؓ انه نهی السلم فی الحیوان۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۳۸۵ باب النهی عن بیع الحیوان بالحیوان نسیئةً)

وَمِثْلُهٗ فی کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ج۲ ص۳۰۸ کتاب البیع، ارکان السلم۔

خشک وتر کھجور میں تفاضل

سوال:۔ تیار کھجور جو کہ عام طور پر بازار میں ملتی ہے اگر اس کو تر یعنی کچی کھجور سے (جو کہ ابھی تک درخت پر ہے) دوگنا زیادہ وزن سے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بازار میں دونوں کی قیمت میں بہت فرق ہے، مثلاً تر کھجور فی کلو دس[۱۰] روپے اور تیار کھجور تیس[۳۰] روپے فی کلو کے حساب سے فروخت کی جاتی ہے۔

الجواب:۔ احناف کے نزدیک رطب اور تمر دونوں ایک جنس سے ہیں اس لیے ان کی بیع برابر سرابر کی جائے گی، زیادتی ربٰو (سود) میں داخل ہے، لہٰذا تر کھجور کو عام کھجور کے مقابلہ میں دوگنا وزن یا قیمت پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ويجوز بيع الرطب بالتمر مثلاً بمثل عند ابي حنيفةؒ وقالا لا يجوز لقوله عليه السلام حين سئل عنه او ينقص اذا جف فقيل نعم فقال عليه السلام لا اذا وله ان الرطب تمر لقوله عليه السلام حين أهدى اليه رطب أ وكل تمر خيبر هكذا سماه تمراً و بيع التمر بالتمر بمثله جائز۔ (الهداية على صدر فتح القدير ج ۶ ص ۱۶۸ باب الربٰو)[۱]

مختلف ممالک کی کرنسی کی تجارت کا حکم

سوال:۔ آجکل صراف بازار میں ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے مُلک کی کرنسی سے زیادہ داموں بیچنے کا رواج عام ہے، مثلاً ایک آدمی نے امریکی ڈالر ایک دن قبل پچاس[۵۰] روپے کا لیا ہے اب وہ اس کو پچپن[۵۵] روپے میں فروخت کرتا ہے۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دو ملکوں کی کرنسی چونکہ مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہے اور اسی وجہ سے ان کے نام کی اکائیاں وغیرہ مختلف ہوتی ہیں، اور مختلف الاجناس اشیاء

---

[۱] قال العلامة اكمل الدين البابرتيؒ: (قال ويجوز بيع الرطب بالتمر مثلا بمثل) بيع الرطب بالتمر متفاضلاً لا يجوز بالاجماع ومثلاً بمثل جوزه ابو حنيفةؒ خاصة وقالا لا يجوز۔

(العناية على هامش فتح القدير ج ۶ ص ۱۶۸ باب الربٰو)

وَمِثْلُهٗ في الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۵ ص ۱۸۱ باب الربٰو۔

کو تفاضل کے ساتھ بیچنا جائز ہے، لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے تفاضل کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے ۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: وان عدما...... حل کهروی بمرویین لعدم العلة فبقی علی اصل الاباحة وان وجد احدهما ای القدر وحده او الجنس حل الفضل وحرم النساء ولو مع التساوی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۱۷۲ باب الربٰو، مطلب فی الابراء عن الرباء) لہ

قبل القبض کسی چیز کی فروخت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں جائیداد کی خرید و فروخت (پراپرٹی) کا کاروبار کرتا ہوں، اس تجارت میں بعض اوقات زمین اور مکانات وغیرہ کا اس کے مالک سے قبضہ لیا جاتا ہے تاکہ اس کو کسی اور شخص پر فروخت کر دیا جائے تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگرچہ قبل القبض کسی چیز کا فروخت کرنا شرعاً ممنوع ہے، البتہ احناف کے نزدیک زمین اس حکم سے مستثنیٰ ہے لہٰذا زمین پر قبضہ کرنے سے قبل اس کی بیع کرنا جائز ہے ۔

قال الشیخ عبد الرحمٰن الجزائری رحمہ اللہ: أما البیع الاعیان غیر المنقولة قبل قبضها کبیع الارض والضیاع والنخیل والدور ونحو ذلک من الاشیاء الثابتة التی لا یخشٰی هلاکها فانه یصح ۔ (کتاب الفقه علی مذاهب الاربعة ج ۲ ص ۲۳۴ کتاب البیع، مبحث التصرف فی المبیع) لہ ۲

لہ قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: واذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیه حل التفاضل والنساء لعدمة العلة المحرمة والاصل فیه الاباحة واذا وجدا حرم التفاضل والنساء لوجود العلة واذا وجد احدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء ۔

(الهدایة علی فتح القدیر ج ۶ ص ۱۵۳ باب الربٰو)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۶ ص ۱۵۳ باب الربٰو ۔

۲ لہ قال الشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ: والثالث لا یجوز بیع مبیع قبل قبضه الا الدور والارض قاله ابو حنیفة وابو یوسف۔ (رحمهم اللہ)

(اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۲۳۶ باب النهی عن بیع المشتری قبل القبض)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۸۱ فصل شرائط صحة البیع ۔

قسطوں کے اختتام سے قبل گاڑی کو پہنچنے والے نقصان کا ذمہ دار کون ہے ؟

سوال:۔ اگر ایک گاڑی قسطوں پر خریدی جائے اور قسطوں کی مکمل ادائیگی سے قبل اگر گاڑی کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ نقصان بائع کا متصور ہوگا یا مشتری کا ؟ قرآن وسنت سے جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں ؟

الجواب :۔ بیع چاہے نقد رقم سے ہو یا اُدھار سے، ایجاب و قبول کر لینے اور قبضہ ہو جانے پر بیع تام ہو جاتی اور مبیع مشتری کی ملکیت بن جاتی ہے، اس کے بعد مبیعہ کو جو نقصان پہنچے گا وہ مشتری کا ہوگا، بائع پر رجوع صحیح نہیں، تاہم اگر بیعہ بائع کی ملکیت میں ہلاک ہو جائے تو نقصان بائع پر ہوگا۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ :۔ المبیع اذا ھلك فی ید البائع قبل ان یقبضه المشتری یھلك من مال البائع ولا شیٔ علی المشتری ...... اذا ھلك المبیع بعد القبض ھلك من مال المشتری ولا شیٔ علی البائع۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادۃ ۲۹۳،۲۹۴ ص۱۵۰ الفصل الخامس) [1]

قسط لیٹ ہونے کی وجہ سے مبیع واپس نہیں ہو سکتا

سوال: گاڑیوں کی تجارت کرنے والے بعض لوگ قسطوں میں گاڑی فروخت کرتے وقت یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر مشتری نے اتنی مدت میں تمام قسطیں ادا نہ کیں تو ادا کی گئی اقساط ضبط متصور ہوں گی اور بیعہ میری ملکیت ہوگا، اور دونوں (بائع اور مشتری) ان شرائط پر دستخط کرتے ہیں۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ بعض اقساط لیٹ ہو جانے یعنی عدم ادائیگی کی صورت میں بائع بیعہ کو واپس لینے کا

---

[1] قال العلامة برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ :۔ ولو قبضه المشتری وھلك فی یدہ فی مدۃ الخیار ضمنه بالقیمة ...... ولو ھلك فی ید البائع انفسخ البیع ولا شیٔ علی المشتری اعتبارًا بالبیع الصحیح المطلق۔ (الھدایة علی صدر فتح القدیر ج ۵ ص۵۰۴ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج ۵ ص۵۰۴ کتاب البیوع۔

شرعاً مجاز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید و فروخت میں ایجاب و قبول کر لینے سے بیع تام ہو جاتی ہے، اس کے بعد فریقین میں سے کسی کو بھی شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ فریق ثانی کی رضامندی کے بغیر مبیعہ پر ہاتھ ڈالے۔ اسی بناء پر صورتِ مسئولہ میں اس قسم کی شرائط طے کرنا لغو ہے، رقم بدستور مشتری کے ذمے واجب الادا ہے، اور اگر وہ ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو قانون کا سہارا لے کر رقم وصول کی جاسکتی ہے، اس طرح لیت و لعل کرنے سے اس کے ذمہ باقی اقساط ختم نہیں ہو جاتیں اور نہ بائع بغیر اس کی رضامندی کے مبیعہ واپس لے سکتا ہے۔

قال العلامة سلیم رستم باز رحمہ اللہ: اذا کان البیع لازماً فلیس لاحد المتبایعین الرجوع عنہ۔ (شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۳۷۵ ص۱۱ الفصل الثانی فی احکام انواع البیوع) [1]

گاہکوں کو مختلف قیمتوں پر سودا بیچنے کا شرعی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ دوکاندار حضرات ایک گاہک کو ایک دام سے کوئی چیز دیتا ہے جبکہ دوسرے گاہک کو وہی چیز کسی اور دام سے دیتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا کہ دونوں گاہکوں میں برابری کرنا ضروری ہے؟

الجواب:۔ بیع نام ہے ایک مال کو دوسرے مال سے باہمی رضامندگی سے تبدیل کرنا، شریعت نے اس معاملے میں کسی کو پابند نہیں کیا ہے، اس لیے دوکاندار کا ایسا کرنا جائز ہے تاہم ناجائز منافع سے پرہیز کیا جائے۔

قال العلامة علی حیدر رحمہ اللہ: وجاء تعریف البیع فی کثیر من الکتب الفقهیة بانه مبادلة المال بالمال بالرضا۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۱ ص۱۰۶ مقدمة فی بیان الاصطلاحات الفقهیة) [2]

---

[1] قال العلامة علی حیدر رحمہ اللہ: لیس لاحد المتبایعین او ورثته فی البیع النافذ اللازم ان یرجع عنه رضاء الآخر بوجه من الوجوه۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۱ ص۴۰ الفصل الثانی فی بیان احکام انواع البیع)

[2] قال العلامة ابن الهمام رحمہ اللہ: قال فخر الاسلام البیع لغة مبادلة المال بالمال وکذا فی الشرع لکن زید فیه قید التراضی۔ (فتح القدیر ج۵ ص۴۵۵ کتاب البیوع)

ومثله فی کنز الدقائق ص۲۲۷ کتاب البیوع۔

تجارت میں منافع کا تعین نہیں

سوال:- بعض تاجر ایک چیز جس قیمت سے خریدتے ہیں پھر اس کو دوگنا، سہ گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ کیا اسلام نے منافع کے لیے کوئی حد مقرر کی ہے یا نہیں؟

الجواب:- شریعتِ مقدسہ نے تجارت میں مال کے منافع کی کوئی خاص حد مقرر نہیں کی، یہ دونوں عاقدین کا باہمی معاملہ ہے، جس طرح طے پا جائے اسی طرح جائز ہے البتہ اس حد تک منافع لینا کہ جس سے لوگوں کو ضرر پہنچتا ہو خلافِ مروت ہے، حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ وہ ناجائز منافع خوری پر قابو پانے کے لیے مناسب اقدام کرے۔

قال العلامة علی حیدرؒ: جاء تعریف البیع فی کثیر من الکتب الفقهیة بانه مبادلة المال بالمال بالرضاء۔ (درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج ۱ ص۱۰۶ مقدمه فی بیان الاصطلاحات الفقهیة) [1]

بیوی کا شوہر کی اجازت کے بغیر اس کا مال فروخت کرنا

سوال:- کیا بیوی اپنے شوہر کی مملوکہ چیز بغیر اس کی اجازت کے فروخت کر سکتی ہے یا نہیں، مطلع ہو جانے پر شوہر کو اپنی چیز واپس لینے کا اختیار ہے یا نہیں؟

الجواب:- بیوی باوجود قربت کے شوہر کے مال میں بمنزلہ اجنبیہ کے ہے جس میں اس کے تصرفات، تصرفاتِ فضولی کے حکم میں ہے، علم ہو جانے پر شوہر کو اختیار ہے کہ وہ ایسی بیع کو باقی رکھے یا مسترد کرے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: کل تصرف صدر منه تملیکاً کان کبیع وتزویج او اسقاطاً کطلاق واعتاق وله مجیز ای لهذا التصرف من یقدر علی اجازته حال وقوعه انعقد موقوفاً۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۱۰۶ فصل فی الفضولی کتاب البیوع) [2]

---

[1] قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: هو مبادلة المال بالمال بالتراضی۔ (کنز الدقائق ص۲۲۷ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۵۵ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: البیع الذی یتعلق به حق الغیر کبیع الفضولی وبیع المرهون ینعقد موقوفاً علی اجازة ذلک الآخر۔ (مجلة الاحکام۔ المادة ۳۶۸ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۱ ص۳۹۱۔ الباب السابع۔ تحت المادة ۳۶۸۔

بجلی کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بجلی کی بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بجلی کوئی عین نہیں ؟

الجواب:۔ چونکہ مبیعہ کا عین ہونا ضروری نہیں اس لیے اگر کوئی چیز عین نہ ہو مگر عرفاً وہ مال سمجھی جاتی ہو تو اس کی بیع جائز ہے، لہٰذا بجلی اگرچہ عین نہیں لیکن اس کی بیع وشراء جائز ہے اس لیے کہ اس قسم کی اشیاء مالیت میں داخل ہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: المالیۃ تثبت بتمول الناس کافۃ او بعضھم۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۰۱ کتاب البیع مطلب فی تعریف المال والملک)[1]

ڈرافٹ کی رسید کی بیع کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا بھائی سعودی عرب میں محنت مزدوری کرتا ہے، اگر وہ ڈرافٹ کے ذریعے کچھ پیسے پاکستان اپنے اہل وعیال کے لیے بھیجے اور کسی وجہ سے وہ ڈرافٹ لیٹ ہو جائے اور اس کے اہل خانہ کو رقم کی اشد ضرورت ہو تو کیا میں اُن کے اہلِ خانہ سے اس ڈرافٹ کی مالیت کے عوض وہ ڈرافٹ خرید سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب:۔ ڈرافٹ بل اگرچہ فی ذاتہٖ ایک سادہ کاغذ ہے جس کی کوئی ذاتی قدر وقیمت نہیں مگر اس وقت وہ ایک معین رقم کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے اِس وقت بناء برعرف وہ بھی قیمتی مال بن چکا ہے اس لیے اس کو اتنی قیمت کے بدلے خریدنا جائز ہے جتنی کہ اس کی مالیت ہے، اسی طرح ٹریول چیک اور بانڈز وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: والمالیۃ تثبت بتمول الناس کافۃ او بعضھم۔ (رد المحتار ج۴ ص۵۰۱ کتاب البیع، مطلب فی تعریف المال والملک)[2]

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: المال ھو کل عین ذات قیمۃ مادیۃ بین الناس۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۳۴۵ الفصل الاول عقد البیع)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المنتقی علیٰ ھامش مجمع الانھر ج۲ ص۳ کتاب البیوع۔

[2] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: المال ھو کل عین ذات قیمۃ مادیۃ بین الناس۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۳۴۵ کتاب البیوع)
وَمِثْلُہٗ فی الدر المنتقی علیٰ ھامش مجمع الانھر ج۲ ص۳ کتاب البیوع۔

زندہ مرغی کو تول کر فروخت کرنا

سوال :- آجکل بازار میں زندہ مرغیاں تول کر فروخت کی جاتی ہیں جبکہ ان کا گوشت حساب شدہ وزن سے کم ہوتا ہے، تو کیا ایسا معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- چونکہ زندہ مرغیوں کے مروجہ طریقہ بیع میں پولٹری فارم والا مشتری پر صرف گوشت فروخت نہیں کرتا بلکہ وہ زندہ مرغی فروخت کرتا ہے اس لیے اصل مبیع معلوم ہونے کی وجہ سے ایسا معاملہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : البیع شرعاً مبادلۃ شیٔ مرغوب فیہ بمثلہ ...... علیٰ وجہ مفید مخصوص ای بایجاب او تعاط اھ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۵ کتاب البیوع) [1]

مرغیوں کی بیٹ کو بطور کھاد فروخت کرنا

سوال :- جناب مفتی صاحب! آجکل مالکانِ پولٹری فارم مرغیوں کی بیٹ کو بصورتِ کھاد زمینداروں پر فروخت کر دیتے ہیں، کیا شرعی ایسی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں ؟ نیز اس بیع سے وصول شدہ رقم کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :- مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ پولٹری فارم کی کھاد صرف مرغیوں کی بیٹ پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ اس میں چاول کا چھلکا، مٹی اور لکڑی وغیرہ کا برادہ اور دیگر کئی اشیاء خلط ملط ہوتی ہیں اس لیے اس کو فروخت کرنا مرخص اور اس سے حاصل ہونے والی رقم بھی جائز اور حلال ہے، فقہی ذخائر میں اس کے نظائر موجود ہیں۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : و رجیع الآدمی لم یغلب علیہ التراب فلو مغلوباً بہ جاز کسرقین و بعر واکتفی فی البحر بمجرد خلط

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : البیع : و اصطلاحاً عند الحنفیۃ مبادلۃ مال بمال علیٰ وجہ مخصوص او ھو مبادلۃ شیٔ مرغوب فیہ بمثلہ علیٰ وجہ مخصوص ای بایجاب او تعاط اھ۔

(الفقہ الاسلامی و ادلتہٗ ج۴ ص۳۴۴ ۔ الفصل الاول عقد البیع)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۷۳ کتاب البیوع۔

بتراب ۔ قال ابن عابدینؒ تحتہ و یجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع بہ والوقود بہ ۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۱۱۱ فصل بیع الفاسد ۔ قبل مطلب الآدمی مکرم شرعاً وکافراً) [1]

تصنیف یا طباعت کے حقوق فروخت کرنا

سوال:۔ آجکل تصنیف وتالیف اور طباعت کے حقوق کی تجارت عام ہے، مصنّف حضرات اپنی تصانیف کے مسودے تاجرانِ کتب پر مہنگے داموں فروخت کردیتے ہیں، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حقِ تصنیف اگرچہ حقوقِ مجردہ سے متعلق ہے مگر حقوقِ مجردہ کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ حقوق جن کے ساتھ مالی منفعت وابستہ ہو جیسے حقِ وظیفہ وغیرہ۔ (۲) دوسرے وہ حقوق جن کے ساتھ مالی منفعت متعلق نہیں، جیسے حقِ شفعہ وغیرہ۔ شریعتِ اسلامی میں مالی منفعت والے حقوق سے دستبرداری کے عوض مال لینا جائز ہے۔ حقِ تصنیف کے ساتھ بھی دورِ حاضر میں چونکہ مالی منفعت وابستہ ہے اس لیے اس کی بیع وشراء جائز ہے، فقہی اصطلاح میں اس کو حق اسبقیت کہا جاتا ہے۔

قال الحصکفیؒ: ولا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ وعلی ھذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالاوقاف وفیھا فی آخر بحث تعارض العرف مع اللغۃ المذھب عدم اعتبار العرف الخاص لکن افتی کثیر باعتبارہ وعلیہ فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال۔

الدرالمختار علی ردالمحتار ج ۴ ص ۱۶ کتاب البیوع [2]

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ولا بأس ببیع السرقین اوالسرجین وھوالزبل وبیع البعر لانہ منتفع بہ لأنہ یلقی فی الارض لاستکثار الریع فکان مالاً والمال محل للبیع۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۴ ص ۴۴۶ بیع النجس والمتنجس)

[2] قال العلامۃ خالد اتاسیؒ: اقول علی ماذکرہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال ---- کما جاز النزول عن الوظائف ونحوھا لاسیما اذا کان صاحب حق العلو فقیراً قد عجز عن اعادۃ علوہ فلولم یجز ذلک لہ علی الوجہ الذی ذکرناہ یتضرر فلیتامل ولیحرر۔ (شرح مجلۃ الاحکام ۔ مادۃ ۲۱۶ ج ۲ ص ۱۲۱ الفصل الثانی فی بیع مایجوز ومالا یجوز)

ومثلہ فی نظام الفتاوی ج ۲ ص ۳۱۴ کتاب المعاملات۔

فارمی مرغیوں کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ آجکل جو فارمی مرغیاں فروخت ہو رہی ہیں ان کو جو خوراک دی جاتی ہے اس میں دیگر چیزوں کے علاوہ خشک خون بھی ہوتا ہے جو کہ حرام ہے، تو کیا اس طرح خون کھانے والی مرغیوں کی خرید و فروخت اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ان مرغیوں میں نجاست اور خون ملی ہوئی خوراک کھلانے کی وجہ سے بدبو پیدا ہو جاتی ہو تو پھر ان کا کھانا ناجائز اور خرید و فروخت مکروہ ہے، اور اگر ان مرغیوں کو نجاست اور خون وغیرہ کھلانا بند کر کے پاک غذا کھلائی جائے یہاں تک کہ ان کی بدبو بالکل ختم ہو جائے تو پھر ان کا کھانا، بیع و شراء اور ہبہ وغیرہ سب درست ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الملتقی المکروه الجلالة التی اذا قربت وجد منها رائحة فلا توکل ولا یشرب لبنها ولا یعمل علیها ولا یکره بیعها وهبتها وفی تلک حالها۔ (رد المحتار حاشیة علی الدر المختار جلد ۵ ص۲۱۵ کتاب الذبائح) [۱]

چونکہ اس بارے میں تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مرغیوں کی غذا میں خون یا دوسرے نجس اجزاء نہایت کم مقدار میں ہوتے ہیں، دوم یہ کہ اس غذا کی تیاری میں کیمیکلز استعمال ہوتے ہیں جس کی وجہ سے خون اور دیگر نجس اجزاء کی ماہیت بدل جاتی ہے، لہٰذا قلبِ ماہیت اور اجزاء نجسہ کے مغلوب ہو جانے کی وجہ سے فارمی مرغیوں کا کھانا، ان کی خرید و فروخت اور ہبہ وغیرہ سب درست اور جائز ہے۔

---

[۱] وفی الهندیة: انما تکون جلالة اذا نتن وتغیر لحمها ووجدت منه ریح منتنة فهی الجلالة حینئذٍ لا یشرب لبنها ولا یؤکل لحمها وبیعها وهبتها جائز هذا اذا کانت لا تخلط ولا تأکل الا العذرة غالباً الخ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۲۸۹ الباب الثانی فی بیان ما یؤکل من الحیوان ومالا) ومثلهٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۱۲۳ کتاب الکراهیة۔

کتیا کا دودھ پینے والے گائے کے بچے کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ گائے کا بچہ اگر کتیا کا دودھ پی لے اور مالک کو پتہ لگ جائے کہ اس بچھڑے نے کتیا کا دودھ پیا ہے، اب اگر مالک اس کو فروخت کرنا چاہے تو کیا اس کی خرید و فروخت اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر گائے کے اس بچے نے چند دن بعد پاک خوراک کھائی ہو تو پھر اس کی خرید و فروخت کرنا اور کھانا لا بأس بہ ہے ورنہ کراہت سے خالی نہیں۔

لما فی الهندية: الجدي اذا كان يربي بلبن الاتان والخنزير ان اعتلف اياماً فلا بأس بمنزلة الجلالة والجلالة اذا حبست اياماً فعلفت لا بأس بها فكذا هذا۔
(الفتاویٰ الهندية ج ۵ ص ۲۹۰ الباب الثانی فی بیان ما یؤکل من الحیوان وما لا یؤکل) [1]

بائع اول کا مشتری ثانی سے واپس خریدنا جائز ہے

سوال:۔ زید نے عمرو پر ایک گاڑی نقد رقم پر فروخت کی، بعد میں عمرو نے وہ گاڑی بکر کو تین، چار مہینے کے قرض پر دے دی، اب اگر زید اس گاڑی کو بکر سے فروخت کردہ قیمت سے کچھ کم یا زیادہ قیمت پر خرید لے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اسے سود کا معاملہ قرار دیتے ہیں تو کیا واقعی یہ سودی معاملہ ہے؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں بائع اول کے لیے یہ مبیعہ مشتری ثانی سے اُس قیمت سے کم یا زیادہ پر خریدنا جائز ہے جس قیمت پر اس نے مشتری اول پر بیچا تھا اس میں سود کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔

لما فی الهندية: ولو باع المشتری من رجل ثم ان البائع الاول اشتراه

---

[1] قال العلامة الحصكفیؒ: وكره لحمهما اى الجلالة ..... كما حل اكل جدى غذا بلبن خنزير لان لحمه لا يتغير وما غذى به يصير مستهلكاً۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۴۰ کتاب الحظر والاباحة)
ومثله فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۸۲ کتاب الکراهية۔

من المشتری الثانی باقل مما باع جاز۔ (الفتاوی الهندیة ج ۳ ص ۱۳۲ الفصل العاشر فی بیع شیئین احدهما لا یجوز البیع فیه......) [1]

نابالغ یتیموں کی جائیداد کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ چار یتیم بھائی ہیں جن میں سے ایک بالغ اور تین نابالغ ہیں، جن کا کابل شہر (افغانستان) میں ایک مکان ہے، اب وہاں کے حالات کی خرابی اور کمیونسٹ انقلاب کے پیشِ نظر بالغ بھائی اس مکان کو فروخت کرنا چاہتا ہے کیونکہ خطرہ ہے کہ مکان غصب نہ ہو جائے، تو کیا ان تین نابالغ اور ایک بالغ بھائی کے مشورے سے اس مکان کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں اگر مکان نہ بیچنے سے ان یتیموں کا نقصان ہو رہا ہو تو اس کو بیچ دیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سے ان کے لیے کوئی دوسرا محفوظ پلاٹ، مکان یا زمین خرید لی جائے یا وہ صورت اختیار کی جائے جس میں ان یتیموں کو فائدہ ہو، ضرر اور نقصان نہ ہو۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وجاز شراء مالا بد للصغیر منه وبیعه ای بیع مالا بد للصغیر منه لاخ وعمّ واُمّ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۷۶ فصل فی البیع، کتاب الحظر والاباحة) [2]

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: المشتری اذا باع المبیع من آخر قبل نقد الثمن جاز للبائع شراؤه منه بالاقل۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۱۶۷ باب الاقالة)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۱۰۴ باب الاقالة۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: وشراء مالا بد للصغیر منه وبیعه للعمّ والاُمّ والملتقط...... یعنی یجوز لهٰؤلاء الثلاثة ان یشتروا للصغیر ویبیعوا مالا بد منه وذٰلك مثل النفقة والسکونة ولانه لولم یکن لهم ذٰلك لتضرر الصغیر وهو ممنوعٌ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۲۰۹ فصل فی البیع، کتاب الکراهیة)

ژالہ باری سے متاثر ہونے والی مچھلیوں کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ بعض اوقات بارش اور ژالہ باری کی وجہ سے مچھلیاں پانی کے اوپر تیرنے لگتی ہیں جو کہ بظاہر مری ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان میں کسی قسم کی بدبو اور تعفن نہیں ہوتی، تو بعض لوگ ان مچھلیوں کو اکٹھا کرکے فروخت کرتے ہیں، تو کیا اس طرح کی مچھلیوں کا کھانا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو مچھلی طبعی موت سے مری ہو تو اس کا کھانا اور خرید و فروخت برائے خوراک جائز نہیں ہے اور جو مچھلی کسی عارضی سبب مثلاً بارش یا اولے وغیرہ پڑنے کی وجہ سے مری ہو تو اس کا کھانا اور خرید و فروخت جائز ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ کی بیع بھی درست ہے۔

لما فی الھندیۃ: والاصل ان السمك متی مات بسبب حادث حل اکلہ وان مات حتف انفہ لابسبب ظاھر لا یحل اکلہ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۴۲۸ الباب السادس فی الصید السمك)[۱]

مبیعہ میں زیادتی بائع کا حق ہے

سوال:۔ ایک شخص نے دو[۲] جریب زمین فروخت کی اور اس کا حدود اربعہ بھی لکھ کر دیدیا اور ہر جریب کی قیمت بھی متعین کرلی، بیع کے بعد زمین مذکورہ کی پیمائش کی گئی تو وہ متعین مقدار سے زائد نکلی، اب یہ زائد زمین مشتری کا حق ہے یا بائع کا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مقدارِ متعینہ سے زائد زمین بائع کا حق ہے، البتہ مشتری کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یا تو وہ اس مبیعہ کو چھوڑ دے یا پھر اضافی رقم بائع کو ادا کرکے کل مبیعہ لے لے۔

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یحل حیوان مائی الا السمك الذی مات بآفۃ ولو متولداً فی ماءٍ نجس ولو طافیۃ مجروحۃ وھبانیۃ غیر الطافی علی وجہ الماء الذی مات حتف انفہ۔ (الدرالمختار علی ھامش ردالمحتار ج ۵ ص۲۱۶ کتاب الذبائح)

ومثلہٗ فی البحرالرائق ج ۸ ص۱۷۲ فصل فی مایحل ومالایحل۔

لما فی الھندیۃ: ولو قال بعت منك ھٰذا الثوب اوھٰذہ الارض علیٰ انھا عشرۃ اذرع کل ذراع بدرھم فوجدھا عشرۃ لزمتہ بعشرۃ درھم ولاخیار لہٗ وان وجدھا خمسۃ عشر ذراعاً فھو بالخیار ان شاء اخذ الجمیع کل ذراع بدرھم وان شاء ترکھا۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۳ ص ۱۲۴ الفصل الثامن فی جھالۃ المبیع اوالثمن) [1]

تصاویر کی خرید وفروخت کا شرعی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں تصاویر کا کاروبار کرتا ہوں، کیا یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں، اور اس کی آمدنی حلال ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی ذی روح کی فوٹو اور تصاویر بنانا اور ان کی خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے، ظاہر ہے کہ ناجائز اور حرام کاروبار سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی ناجائز ہی ہوتی ہے۔

لما اخرج الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن عون ابن ابی جحیفۃ عن ابیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھیٰ عن ثمن الدم وثمن الکلب وکسب البغی ولعن اکل الربٰو وموکلہ والواشمۃ والمستوشمۃ والمصور۔

(صحیح البخاری ج ۲ ص ۸۸۱ باب من لعن المصور۔ کتاب اللباس) [2]

زقوم کا پھل کھانے اور اس کی خرید وفروخت کا حکم

سوال:۔ بعض لوگ زقوم (تھوہر) کا پھل

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: وان زاد شئ علیہ فھو للبائع لان البیع وقع علیٰ مقدار معین والقدر لیس بوصف۔

(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۸۸ کتاب البیع)

[2] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: ولایجوز علی الغناء والنوح والملاھی لان المعصیۃ لایتصور استحقاقھا بالعقد فلا یجب علیہ الاجر من غیر ان یستحق علیہ لان المبادلۃ لاتکون الا عند الاستحقاق۔

(البحر الرائق ج ۸ ص ۲۰ باب الاجارۃ الفاسدۃ)

بڑے شوق سے کھاتے ہیں، اور آجکل بازاروں میں اس کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زقوم جہنم کا درخت ہے اس لیے اس کا پھل کھانا اور خرید و فروخت جائز نہیں ہے، تو کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب:۔ دنیا کے زقوم اور جہنم کے زقوم میں زمین آسمان کا فرق ہے اور زقوم کے پھل میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے لہٰذا اس کا کھانا اور خرید و فروخت دونوں جائز ہیں۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: (البیع) شرعاً مبادلة شئ مرغوب فیہ بمثلہ خرج غیر المرغوب کتراب ومیتة ودم الخ۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۳ کتاب البیوع) [1]

اجرت قبل القبض کی خرید و فروخت کا حکم | زید ٹھیکداری کا کام کرتا ہے۔ اس کے ہاں کاروبار کا یہ طریقہ ہے کہ وہ دوسرے اشخاص سے گاڑیاں کرایہ پر لے لیتا ہے اور اُجرت کی رسید دے دیتا ہے۔ مگر اُجرت کام ختم ہونے کے بعد دیتا ہے۔ اب اگر گاڑی کے مالک کو پیسوں کی ضرورت ہو۔ اور وہ اس رسید کو ٹھیکدار یا کسی دوسرے پر فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو کیا وہ اس طرح شرعاً کرسکتا ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب:۔ بیع کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ بائع کو مبیعہ پر ملکِ تام حاصل ہو اور مبیعہ قبل القبض پر چونکہ ملکیتِ تام حاصل نہیں ہوتی اس لیے ایسی بیع درست نہیں ہوتی، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں چونکہ موجر نے اُجرت کو قبل القبض فروخت کیا ہے اس لیے یہ معاملہ درست نہیں۔

قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: لا یملك الاجرة الا بواحد من

---

[1] قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللہ: (البیع) ھو مبادلة المال بالمال بالتراضی ..... وفی کشف الکبیر المال ما یمیل الیہ الطبع .... والمالیة انما تثبت بتمول الناس کافة او بتقوم البعض والتقوم یثبت بہا وبإباحة الانتفاع لہ شرعاً۔
(البحر الرائق جلد ۵ ص۲۵۶ کتاب البیع)

هذه الاربعة والمراد انه لا يستحقها الموجر الا بذلك ...... لكن ليس له بيعها قبل قبضها ۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۳۰ کتاب الاجارة) [1]

گدھوں اور کتوں کے گوشت کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ بعض ممالک میں گدھوں اور کتوں کا کا گوشت بازار میں فروخت کیا جاتا ہے تو کیا گدھے اور کتے کو ذبح کر کے ان کا گوشت وغیرہ فروخت کرنا عند الاحناف جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ گدھے اور کتے کو اگر باقاعدہ ذبح کیا گیا ہو تو پھر ان کا گوشت اور چمڑا بیچنا جائز ہے، لیکن فروخت کرنے کے جواز سے کھانے کا جواز لازم نہیں آتا ۔

لما فی الهندیة : ویجوز بیع لحوم السباع والحمر المذبوحة فی الروایة الصحیحة ولا یجوز بیع لحوم السباع المیتة کذا فی محیط السرخسی واما جلود السباع والحمر والبغال فما کانت مذبوحة اومدبوغة جاز بیعها وما لا فلا ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۳ ص ۱۱۵ الفصل الخامس فی بیع المحرم الصید وفی بیع المحرمات) [2]

شیر اور ریچھ کی چربی کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ شیر اور ریچھ کی چربی کو حکماء اور طبیب حضرات خرید کر اسے مختلف امراض میں دوائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، تو کیا ان درندوں کی چربی کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ اگر یہ چربی مذبوح شیر اور ریچھ کی ہو تو اس کی تجارت جائز ہے جبکہ

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ :۔ قوله وما یستجره الانسان الخ ذکر فی البحر ان من شرائط المعقود علیه ان یکون موجوداً فلم ینعقد بیع المعدوم الخ (رد المحتار ج ۴ ص ۱۳ مطلب فی بیع الاستجرار)

ومثله فی الهندیة ج ۳ ص ۳ کتاب البیوع ۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ : قوله وجلد میتة قید بها لانها لو کانت مذبوحة ذباع لحمها او جلدها جاز لانه یطهر بالزکاة الا الخنزیر خانیة ۔ (رد المحتار حاشیة علی الدر المختار ج ۴ ص ۱۲۷ مطلب الدراهم والدنانیر جنس واحد فی مسائل)

مردار زیچھ اور شیر کی چربی کی تجارت جائز نہیں ہے۔

لما فی الهندیة : ويجوز بيع لحوم السباع والحمر المذبوحة في الرواية الصحيحة ولا يجوز بيع لحوم السباع الميتة كذا في محيط السرخسي۔

(الفتاوى الهندية ج ۳ ص ۱۱۵ الفصل الخامس في بيع المحرم الصيد وفي بيع المحرمات) [1]

ذبح سے پہلے کھال کی خرید و فروخت کا حکم

سوال:۔ قربانی کے جانور کی کھال قربانی کرنے سے پہلے فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ قربانی کرنے سے پہلے جانور کے چرم وغیرہ کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

لما فی الهندية : ولو باع الجلد والكرش قبل الذبح لا يجوز فان ذبح بعد ذلك ونزع الجلد والكرش وسلم لا ينقلب العقد جائزاً كذا في الذخيرة۔

(الفتاوى الهندية ج ۳ ص ۱۲۹ الفصل التاسع في بيوع الاشياء المتصلة بغيرها.........)

صحیح چیز میں ردّی کی ملاوٹ کر کے فروخت کرنا

سوال:۔ ایک شخص اعلیٰ قسم کی مکئی زیادہ قیمت پر اور ادنیٰ یعنی ردّی قسم کی مکئی کم قیمت پر خریدتا ہے پھر ان دونوں کو ملا کر ان کے معیار کے مطابق نرخ مقرر کر کے فروخت کرتا ہے، تو اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر خریدنے والے کو اس ملاوٹ کے متعلق بتا دیا جائے اور پھر بھی

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ : قوله وجلد ميتة قيد بها لانها لو كانت مذبوحة فباع لحمها او جلدها جاز لانه يطهر بالزكوٰة الا الخنزير خانية۔

(رد المحتار حاشية على الدر المختار ج ۴ ص ۱۲۷ مطلب الدراهم والدنانير جنس واحد في مسائل)

وقال ايضاً : بخلاف الودك اى دهن الميتة لانه جزءها فلا يكون مالاً ابن ملك فلا يجوز بيعه الخ۔ (رد المحتار حاشية على الدر المختار ج ۴ ص ۱۲۸ مطلب الدراهم والدنانير جنس واحد)

ومثله فى الخانية على هامش الهندية ج ۲ ص ۱۵۳ باب بيع الفاسد۔

خرید لیتا ہے تو یہ معاملہ لا بأس بہ ہوگا، اور اگر خریدار کو اس ملاوٹ کے متعلق نہ بتایا جائے اور وہ اسے عمدہ اور ملاوٹ سے پاک مکئی سمجھ رہا ہو تو یہ معاملہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہے: من غشنا فلیس منّا۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر برجل یبیع طعاما فساله کیف تبیع؟ فاخبرہ فاوحیٰ الیہ ان ادخل یدك فیہ فادخل یدہ فیہ فاذا ھو مبلول فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من غشّ۔ (بذل المجہود فی حل ابی داؤد ج۵ ص۱۲۴ کتاب البیوع۔ باب فی النہی عن الغش) [۱]

زبانی سودا بیع بالمعدوم کے حکم میں ہے

سوال:۔ احمد نے زید کے ساتھ ایک سودا کیا کہ کل کو ۱۰۰ افغانی (افغان کرنسی) ایک روپیہ چھ آنے پر دوں گا، دوسرے دن احمد نے بکر سے ۱۰۰ افغانی کا ایک روپیہ چار آنے پر سودا کیا، یہ صرف زبانی کلامی سودا تھا، کسی طرف سے قبضہ نہیں ہوا تھا، اب احمد بکر کو زید کے سامنے لاکر زید سے ۲ آنے منافع لے کر چلا گیا اور باقی معاملہ کو زید اور بکر کے درمیان چھوڑ دیا، تو اب یہ ۲ آنے منافع احمد کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مبیعہ کی بیع قبل القبض جائز نہیں صرف زبانی سودا کرنے سے بیع تام نہیں ہوتی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی زید اور احمد کے مابین بیع تام نہیں ہوئی لہٰذا زید کے لیے یہ ۲ آنے منافع لینا جائز نہیں ہے۔

وفی الهندیة: ومنها فی المبیع وهو ان یکون موجوداً فلا ینعقد بیع المعدوم وماله خطر العدم۔ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۲ کتاب البیوع) [۲]

---

[۱] عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر علی صبرۃ طعام فادخل یدہ فیھا فنالت اصابعه بللا فقال ماھذا یا صاحب الطعام قال اصابته السماء یا رسول اللہ فقال افلا جعلته فوق الطعام حتی یراہ الناس مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي۔
(مشکوٰۃ ج۲ ص۲۴۸ کتاب البیوع۔ باب المنهی عنها من البیوع۔ الفصل الاول)

[۲] قال العلامة الحصکفیؒ: لان رکن البیع مبادلة المال بالمال ولم یوجد والمعدوم کبیع حق التعلی..... لانه معدوم۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۱۱۳ باب بیع الفاسد مطلب فی بیع المغیب فی الارض)

مشتری کی ٹال مٹول میں بیع کو فسخ کرنا

سوال:۔ اگر بیع ہو جانے کے بعد مشتری ثمن (قیمت) ادا کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو کیا بائع بیع کو فسخ کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ آجکل یہ ایک رواج بن چکا ہے؟

الجواب:۔ بیع ایک ایسا معاملہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے صورتِ مسئولہ میں مشتری کے ٹال مٹول کرنے پر چونکہ بائع راضی نہیں کہ مشتری نہ تو قیمت ادا کرتا ہے اور نہ ہی چیز واپس کرتا ہے لہٰذا اس مجبوری کی وجہ سے بائع کو بیع فسخ کرنے کا حق حاصل ہے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: لان المشتری لما جحد کان فسخا من جهته اذا الفسخ یثبت به کما اذا تجاهد فاذا عزم البائع علی ترك الخصومة تم الفسخ بمجرد العزم ...... ولانه لما تعذر استیفاء الثمن من المشتری فات رضا البائع فیستقبل بفسخه۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۳۶ مسائل شتیٰ، باب التحکیم)

ادائیگی ثمن کے غیر متعین وقت کا حکم

سوال:۔ آجکل ایک عام رواج ہے کہ گاہک جب کسی جاننے والے دوکاندار کے پاس چلا جاتا ہے تو سودا سلف خریدنے کے بعد اُسے کہہ دیتا ہے کہ پیسے بعد میں دوں گا لیکن ادائیگی کا وقت مقرر نہیں کرتا، تو کیا اس قسم کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اُدھار کی بیع میں جب تک ثمن کی ادائیگی کے وقت کا تعین نہ کیا جائے تو وہ بیع فاسد ہوگی، مگر صورتِ مسئولہ میں چونکہ بیع ہو جانے کے بعد گاہک نے دوکاندار سے کہا ہے کہ پیسے بعد میں دوں گا، لہٰذا اگر دوکاندار بخوشی اسے قبول کرلے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

قال الحصکفیؒ: وصح بثمن حال وهو الاصل وموجل الی معلوم لئلا یفضی الی النزاع۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۴ ص ۲۵ مطلب فی التاجیل الی اجل مجهول) [1]

---

[1] قال العلامة ابن نجیمؒ: قوله وصح بثمن حال و باجل معلوم ای البیع لاطلاق النصوص وفی السراج الوهاج ان الحلول مقتضی العقد وموجبه والاجل لا یثبت بالشرط قید بعلم الاجل لان جهالة تفضی الی النزاع۔
(البحر الرائق ج ۵ ص ۲۷۹ کتاب البیع)

مُردار جانوروں کی ہڈیوں کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :۔ اگر کسی جگہ کوئی جانور مردار ہو جائے اور مالک اس کو باہر پھینک دے تو کیا اس کی ہڈیوں کو فروخت کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یا گوشت کی طرح ہڈیوں کی بیع بھی ناجائز ہے؟

الجواب :۔ ویسے تو شرعاً کسی بھی غیر مذبوحہ جانور کی بیع جائز نہیں مگر اس حکم سے اُس کے بعض اجزاء مثلاً ہڈیاں، بال اور سینگ وغیرہ مستثنیٰ ہیں لہٰذا مردار جانور کے ان اجزاء کی خرید و فروخت جائز ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله : وبيع جلود الميتات باطل اذا لم تكن مذبوحة او مدبوغة و يجوز بيع عظامها و عصبها و صوفها و ظلفها و قرنها۔ (الفتاوى قاضی خان على هامش الهندية ج۲ ص۱۳۳ فصل فی البيع الباطل)[1]

واؤچر کو فروخت کرنے کا حکم

سوال :۔ ہم لوگ تمباکو کمپنی والوں پر فروخت کرتے ہیں اور کمپنی والے نقد ادائیگی کی بجائے اس رقم کی رسید، جسے واؤچر کہا جاتا ہے، دیدیتے ہیں، تو کیا ہم اس رسید (واؤچر) کو بوقتِ ضرورت کم قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :۔ واؤچر بذاتِ خود کاغذ کا ایک بے قیمت پُرزہ ہے مگر اس رقم کی وجہ سے قیمتی بن جاتا ہے اس لیے اس کو فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن واؤچر میں درج رقم سے کم پر فروخت کرنا سُود سے خالی نہیں اس لیے ناجائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ : (الربا) قال فی البحر فضل احد المتجانسين نعم هذا يناسب تعريف الكنز بقوله فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال۔

(رد المحتار حاشیہ علی الدر المختار ج۴ ص۱۹۶ باب الربو)[2]

---

[1] وفی الهندية : اما شعر الميتة وعظمها وصوفها وقرنها فلا بأس بالانتفاع بها و بيع ذلك كله جائز۔ (الفتاوى الهندية ج۳ ص۱۱۵ الفصل الخامس فی بيع المحرمات)

[2] قال العلامة ابن نجيمؒ : فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال ای فضل احد المتجانسين على الآخر بالعيار الشرعی ای الكيل والوزن۔ (البحر الرائق جلد۶ ص۱۲۴ باب الربو)

بیع قبل القبض کا حکم

سوال:- ایک آدمی نے کسی سے ....۳۰ ہزار کلوگرام مال کا زبانی سودا کیا لیکن مال نہیں اٹھایا بلکہ بائع کے پاس ہی پڑا ہے، چند دن بعد اس مال کی مارکیٹ میں قیمت بڑھ جاتی ہے تو مشتری بائع سے کہتا ہے کہ آپ مجھے منافع دے کر مال اپنے پاس ہی رکھیں، تو کیا مشتری کے لیے یہ منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- شریعتِ مقدسہ میں مبیعہ پر قبضہ کرنے سے قبل اس کو کسی پر فروخت کرنا جائز نہیں، اس سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی، چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی بظاہر بیع المنقول قبل القبض ہے اس لیے اس کی بیع جائز نہیں۔

لما فی الهندیة: فنقول من حکم المبیع اذا کان منقولا ان لا یجوز بیعه قبل القبض الی ان قال واما اذا تصرف فیه مع بائعه فان باعه منه لم یجز بیعه اصلا قبل القبض۔ (الفتاویٰ الهندیة ج ۳ ص ۱۳ الفصل الثالث فی معرفة المبیع والثمن والتصرف) [۱]

مبیعہ کو دوبارہ بائع پر فروخت کرنے کی شرط لگانا

سوال:- بعض لوگ کوئی چیز فروخت کرتے وقت مشتری کے ساتھ یہ شرط لگاتے ہیں کہ جب میرے پاس پیسے آجائیں تو اس چیز کو مجھ پر دوبارہ فروخت کروگے یا جب تم فروخت کرنا چاہو تو معاملہ میرے ساتھ ہی ہوگا کسی اور پر فروخت نہیں کروگے۔ تو کیا بیع کرتے وقت اس قسم کی شرائط لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے بیع پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

الجواب:- بیع میں اس قسم کی شرائط جن میں بائع یا مشتری یا مبیعہ کو کوئی فائدہ ہو، لگانا شرعاً جائز نہیں، اس قسم کی شرائط سے کاروبار (بیع) فاسد ہوجاتا ہے لہٰذا صورتِ مذکورہ کی بیع فاسد ہے۔

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ: وهو لا یصح به القبض ...... وقیل بالقبض لان العقد فی ذاته صحیح غیر انه لا یجب علی المشتری دفع الثمن لعدم القبض۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۴۸ مطلب اشتریٰ دارًا ما جوة لا یطالب بالثمن قبل قبضها)

قال العلامة الحصکفیؒ: ولا بیع بشرط عطف علی الی النیروز یعنی الاصل الجامع فی فساد العقد بسبب شرط لا یقتضیه العقد ولا یلائمه وفیه نفع لاحدھما اوفیه نفع لمبیع۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۴ ص۱۳۵ مطلب فی البیع بشرط الفاسد) ؎۱

سونے کے زیورات کی اُدھار تجارت کا حکم

سوال:۔ ہم چند پاکستانی دوست ملائیشیا میں پہلے کپڑے کی ادھار تجارت کرتے تھے لیکن اب کپڑے کی تجارت کا بہت مندہ ہے جبکہ سونے کے زیورات مثلاً انگوٹھیاں، بالیاں، جھومر اور دوسری اشیاء کی زبردست مانگ ہے تو ہم نے یہ تجارت شروع کردی، اب ہم سونے کے یہ زیورات ادھار پر بیچتے ہیں اور ماہانہ قسطوار یہ رقم ہمیں واپس ملتی ہے، اب کسی نے بتایا ہے کہ اس طرح ادھار پر سونے کی تجارت جائز نہیں ہے لیکن عدم جواز کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کی، لہٰذا آپ اس کے جواز اور عدم جواز کی وضاحت فرماکر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ اگر سونے کی تجارت اس طریقہ سے ہو کہ سونا نقد ہو اور روپیہ اُدھار جیسا کہ سوال میں ہے تو پھر یہ تجارت جائز ہے اس لیے کہ یہ دونوں مختلف الاجناس اشیاء ہیں، اور اگر دونوں ادھار پر ہوں تو پھر ناجائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (تنبیه) سئل الحانوتی عن بیع الذھب بالفلوس نسیئة فاجاب بانه یجوز اذا قبض احد البدلین۔ (رد المحتار حاشیة علی الدر المختار ج۴ ص۲۰۵ باب الربوٰ، کتاب البیوع) ؎۲

؎۱ وفی الھندیة: ولو باع شیئاً علی ان یھب له المشتری او یتصدق علیه او یبیع منه شیئاً او یقرضه کان فاسداً۔ (الفتاوی الھندیة ج۳ ص۱۳۴ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد البیع والتی لا تفسده)

؎۲ لما فی الھندیة: وروی الحسن عن ابی حنیفةؒ اذا اشتری فلوساً بدراھم ولیس عند ھذا فلوس ولا عند الآخر دراھم ثم ان احدھما دفع وتفرقا جاز وان لم ینقد واحد منھما حتی تفرقا لم یجز کذا فی المحیط۔

(الفتاوی الھندیة ج۳ ص۲۲۴ الفصل الثالث فی بیع الفلوس)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی البزازیة علی ھامش الھندیة ج۵ ص۲ کتاب الصرف۔

جعل سازی کے ذریعے ویزے فروخت کرنا

سوال :- جناب مفتی صاحب! آجکل بعض لوگ پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ پر اصل فوٹو کو تبدیل کر کے جعلسازی سے کسی دوسرے شخص کو سمندر پار ممالک میں بھیجتے ہیں اور اس پر بھاری رقم لیتے ہیں۔ تو کیا ان لوگوں کا یہ کاروبار شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- ویزہ اگرچہ کاغذ کا ایک پرزہ ہوتا ہے مگر متعلقہ ملک کی حکومت کی طرف سے اسے قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے لہٰذا قانونی دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے اس کو بیچنا اور اس کی بھاری قیمت لینا شرعاً جائز ہے۔ لیکن کسی خاص (نامی نیٹ) ویزہ میں تصویر تبدیل کر کے کسی دوسرے شخص پر فروخت کرنا سراسر دھوکہ ہے اور نہ ہی ایسے ویزے کی کوئی قانونی حیثیت ہوتی ہے، لہٰذا دھوکہ دہی اور غیر قانونی طریقے سے کسی پر ویزہ فروخت کر کے بھاری رقم لینا ناجائز اور حرام ہے، اس لیے کہ ویزہ کے عوض پیسے لینا قانونی تحفظ کی بناء پر تو جائز ہے نہ کہ دھوکہ دہی کے ذریعے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : (قوله فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال) _ قال العلامة العینیؒ : فی فتاواہ لیس شیٔ یعتمد علیه ولکن العلماء والحکام مشوا ذٰلک للضرورة واشترطوا امضاء الناظر مثلاً یقع فیه نزاع۔

(ردالمحتار جلد۴ ص۵۱۹ کتاب البیوع مطلب فی النزول عن الوظائف بالمال)

گندے انڈے فروخت کرنے کا حکم

سوال :- ایک دوکاندار نے اپنے گاہک پر کچھ انڈے فروخت کیے، گھر جا کر اس نے جونہی انڈے توڑے تو وہ گندے نکل آئے، تو کیا گاہک کو شرعاً حق حاصل ہے کہ وہ گندے انڈے دکاندار کو واپس کر کے اس سے اپنی رقم لے لے؟

الجواب :- انڈے جب خراب ہو جائیں تو وہ مال نہیں رہتا، ان کا فروخت کرنا جائز نہیں اگر کہیں ایسا معاملہ ہو گیا ہو اور گاہک ان گندے انڈوں کو استعمال میں نہ لایا ہو تو اس کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوکاندار کو گندے انڈے واپس کر کے اس سے اپنے پیسے لے لے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ : من اشتریٰ بیضاً او بطیخاً او قثاءً او خیاراً او جوزاً فکسرہ فوجدہ فاسداً فان لم ینتفع به رجع بالثمن لانه لیس بمال فکان البیع باطلاً۔

(الهدایه ج۳ ص۴۷ باب البیع الفاسد)

باب فی الخیار

(بیع میں خیار کے مسائل واحکام)

خیارِ رؤیت کا حکم

سوال:۔ اگر ایک چیز ایسی حالت میں خریدی جائے کہ مشتری نے اصالتاً یا وکالتاً نہ دیکھی ہو اور دیکھنے کے بعد مشتری کو پسند نہ آئے تو کیا وہ اس کو واپس کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو چیز بغیر دیکھے خریدی جائے تو بیع کی حقیقت موجود ہو کر معاملہ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں رہتا، تاہم مشتری کو دیکھنے پر اختیار حاصل ہے، اگر اسے پسند نہ ہو تو وہ بغیر کوئی وجہ بتائے بائع کو واپس کر سکتا ہے، تاہم اگر خریدنے پر آمادہ ہو تو پھر پوری قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانیؒ:۔ ومن اشتری شیئاً لم یرہ فا لبیع جائز وله الخیار اذا راہ ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردہ۔

(الھدایة ج۳ ص۴۷ کتاب البیوع۔ باب خیار الرویة) [۱]

غبنِ فاحش کا مسئلہ

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے زمین خریدی، لیکن خریدتے وقت دلال یا بائع نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے وہ زمین ایسی قیمت پر فروخت کی جو کہ عام مارکیٹ کے حساب سے کہیں زیادہ تھی، تو کیا اس بنا پر مشتری یہ زمین بائع کو شرعاً واپس کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مشتری نے ان تمام حالات کو جانتے ہوئے بھی اس زمین میں تصرف کیا ہو اور اس کے مالکانہ تصرفات پر کچھ مدت گذر گئی ہو تو پھر اس کو واپس کرنے کا حق

---

[۱] قال فی الھندیة: من اشتری شیئاً لم یرہ فله الخیار اذا راٰہ ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ردّ سواء راٰہ علی الصفة التی وصفت له اوعلی خلافها۔

(الفتاوی الھندیة ج۳ ص۵۷ الباب السابع فی خیار الرؤیة)

ومِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۶ باب خیار الرؤیة۔

حاصل نہیں، کیونکہ غبنِ فاحش میں اگرچہ مشتری کو مبیعہ واپس کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن اس پر علم کے باوجود تصرفات کرنے سے یہ حق باقی نہیں رہتا۔

لما قال العلامة سلیم رستم باز: المشتری الذی حصل له تغریر اذا اطلع علی الغبن الفاحش ثم تصرف فی المبیع تصرف الملاک سقط حق فسخه کما ...... لو سقی الارض المبیعة او غرسها الی غیر ذلك من التصرفات الدالة علی الرضا۔ (شرح مجلة الاحکام تحت المادة ۳۵۹ ص۲۰۴)[1]

جملہ عیوب سے برأت کا اعلان کر کے کوئی چیز فروخت کرنا

سوال:۔ ایک آدمی نے کوئی چیز فروخت کرتے وقت مشتری سے یوں کہا کہ اس چیز کے نقائص کے بارے میں اگر کچھ کہنا ہو تو اب کہہ لے ورنہ بعد میں میں کسی قسم کے عیب کا ذمہ دار نہیں ہوں گا، کیا بائع کا مشتری کو اس طرح کہنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ خرید و فروخت میں بیع بشرط برأت من العیوب درست ہے کہ بائع مبیعہ کے تمام عیوب سے برأت کا اعلان اور اظہار کرے، اس طرح کرنے سے بعد میں تنازعہ اور کبیدہ خاطری کی گنجائش نہیں رہتی اس لیے اس شرط پر کوئی معاملہ کرنا شرعاً مرخص ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وصح البیع بشرط البرأة من کل عیب وان لم یسم خلافاً للشافعی لان البرأة عن الحقوق المجهولة لا یصح عنده ویصح عندنا لعدم افضائه الی المنازعة ویدخل فیه الموجود والحادث بعد العقد قبل القبض فلا یرد بعیب بان قال بعتك هذا العبد علی انی بری من کل عیب۔ (ردالمحتار ج۵ ص۲۷۲ تحت مطلب فی البیع بشرط البرأة من کل عیب)[2]

---

[1] قال حافظ الدین محمد بن البزازؒ:۔ کل تصرف یدل علی الرضا بعد العلم به یمنع الرد والرجوع بالنقص ...... وسقی الارض وزراعتها وکسح الکرم رضاء۔
(البزازیة علی هامش الهندیة ج۴ ص۳۵۱/۳۵۲ کتاب البیوع۔ باب الخیار)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۳ ص۶۵ کتاب البیوع۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: وصح البیع بشرط البرأة من کل عیب وان لم یسم خلافاً للشافعی لان البرأة من الحقوق المجهولة لا تصح عنده وتصح عندنا لعدم افضائه الی المنازعة۔
(تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۱ ص۲۷۳ جواب السوال باب خیار الرؤیة)

وَمثلهٗ فی شرح المجلة لسلیم رستم باز تحت المادة ۱۸۹ ص۸۹

بیع بالوفاء کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے دس ہزار روپے کے عوض زمین کی بیع قطعی کرکے مشتری سے معاوضہ نقد وصول کرلیا ہے اور اب اس زمین میں بائع کا کوئی دخل نہیں رہا، لیکن بیع اس شرط سے طے کی کہ میعادِ مقررہ میں رقم واپس ہونے پر زمین واپس کی جائے گی۔ تو کیا بیع مذکورہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اصل قواعد کی رُو سے یہ معاملہ رہن ہو کر اس زمین سے اِنتفاع حرام ہوگا اور اگر اس معاملہ کو بیع تصوّر کیا جائے تو مشروط ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہے، تاہم بحالتِ اضطرار بائع کے لیے متاخرین کے فتویٰ پر عمل کرنے کی گنجائش ہے لیکن بلا ضرورتِ شدیدہ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: وبیع الوفاء ذکرتہ ھنا تبعاً للدرر وصورتہ ان یبیعہ العین بالف علی انہ اذا ردعلیہ الثمن رد العین...... قیل ھو رھن قال منلا انفاعن جواھر الفتاوی انہ الصحیح وقیل بیع یفید الانتفاع بہ ھذا متحمل لاحد القولین، الاول انہ بیع صحیح مفید لبعض احکامہ من حل الانتفاع بہ الا انہ لایملک بیعہ وقال الزیلعی فی الاکراہ وعلیہ الفتوی۔ الثانی القول الجامع لبعض المحققین انہ فاسد فی حق بعض الاحکام کحل الانزال ومنافع المبیع ورھن فی حق البعض حتی لم یملک المشتری بیعہ من اٰخر ولا رھنہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ص۲۷۷ ج۵ کتاب البیوع۔ باب الصرف مطلب بیع الوفاء)[1]

اطلاع علی العیب کا حکم

سوال:۔ زید نے عمر کو ایک چیز فروخت کرتے وقت یہ کہا کہ اس چیز میں فلاں عیب ہے، مشتری (عمر) نے زید سے کہا کوئی بات نہیں ہے اور وہ چیز خرید لی، مشتری نے اس پر قبضہ بھی کرلیا اور اس میں تصرّف بھی کیا، اب ایک سال کے بعد مشتری اس عیب کی وجہ سے

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: القول الثامن الجامع لبعض المحققین انہ فاسد فی حق بعض الاحکام حتی ملک کل منھما الفسخ وصحیح فی بعض الاحکام کحل الانزال ومنافع المبیع ورھن فی حق البعض (بحذف یسیر) وینبغی ان لایعدل فی الافتاء عن القول الجامع

(البحر الرائق ج۶ ص۸ باب خیار الشرط، تحت "فرع")

ومثلہ فی التبیین الحقائق ج۵ ص۱۸۳ باب خیار الشرط۔

بلیعہ واپس کرنا چاہتا ہے، تو کیا اسے واپسی کا اختیار رہے ؟

الجواب:۔ بائع جب مشتری کو مبیعہ میں عیب پر مطلع کر دے اور اطلاع علی العیب کے بعد مشتری بیع تام کر کے بلیعہ پر قبضہ اور تصرف کرنے کے بعد بائع کو اس عیب کی وجہ سے واپس کرنا چاہے تو شرعاً اس کو یہ اختیار حاصل نہیں، تاہم اگر بائع و مشتری باہمی رضامندی سے اقالہ کرنا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

قال العلامة سلیم رستم باز رحمہ اللہ: بعد اطلاع المشتری علی عیب فی المبیع اذا تصرف فیہ تصرف الملک سقط خیارہ مثلا وعرض المشتری المبیع للبیع بعد اطلاعہ علی عیب قدیم فیہ کان عرض المبیع للبیع رضی بالعیب فلا یردہ بعد ذلک۔ (شرح المجلۃ ص۱۸۵ المادۃ ۳۴۴)

عدم رؤیت کی وجہ سے تبادلۂ زمین منسوخ کرنا

سوال:۔ دو دوستوں زید اور عمر نے آپس میں بن دیکھے زمین کا تبادلہ کیا تھا لیکن بعد میں ایک (زید) کی زمین بنجر اور دوسرے (عمر) کی زمین زرخیز نکلی، تو کیا زید سے عمر اپنی زمین کی واپسی کا حق رکھتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بیع و شراء اور تبادلہ کی صورت میں عاقدین کا بلیعہ یا عوضین کو دیکھ لینا ضروری ہے، اگر کوئی تبادلہ یا سودا بن دیکھے ہو جائے تو عدم رؤیت کی وجہ سے دونوں کو اپنی اپنی چیز واپس لینے اور دینے کا حق حاصل ہے، لہٰذا عمر زید سے اپنی زرخیز زمین واپس لے سکتا ہے۔

قال الشیخ ابن الھمام رحمہ اللہ: ولنا قولہ علیہ السلام من اشتری شیئاً لم یرہ فلہ الخیار اذا راٰہ۔ (فتح القدیر ج۶ ص۳۳۶ باب الخیار)

قال العلامة برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: من اشتری شیئاً لم یرہ فلہ الخیار اذا راٰہ ان شاء اخذہ بجمیع ثمنہ وان شاء

لہ لما فی الھندیۃ: الاصل ان المشتری متی تصرف فی المشتری بعد العلم بالعیب تصرف الملک بطل حقہ فی الرد۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۳ ص۷۵ کتاب البیوع، باب الخیار)

ردّه سواء الخ (الهداية ج ۳ ص ۳۵ باب خيار العيب) ؎۱

عیب دار چیز کی خرید و فروخت

سوال:۔ عیب دار اشیاء کی بیع وشراء (خرید و فروخت) جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع میں مبیعہ کا مال متقوم ہونا ضروری ہے، عیب ایک خارجی شے ہے اس لیے عیب دار اشیاء کی بیع جائز ہے بشرطیکہ عیب کو چھپایا نہ جائے۔

عن زيد بن ثابت انهٗ قال من باع غلامًا بالبراءة فهو برئ من كل عيب وكذلك الى آخره۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۹۲ ـ باب البيع بالبراءة من كل عيب) ؎۲

غیر ملکی ویزوں کی خرید و فروخت میں خیارِ عیب کا حکم

سوال:۔ زید نے عمرو سے الریاض (سعودی عرب) کا ویزا اس شرط پر خرید اکہ کفیل الریاض کا رہنے والا ہو گا، اب عمرو الریاض میں زید کے لیے کفیل کا انتظام کرنے سے قاصر رہا جس کی وجہ سے زید نے کچھ عرصہ پہاڑوں میں حکومت سے چوری چھپے گذارا، بالآخر مجبوراً اپنے آپ کو سعودی حکومت کے حوالہ کر دیا جس نے قانونی کارروائی کے بعد اُسے واپس پاکستان بھیج دیا، زید نے عمرو کو پاکستانی کرنسی میں ۴۰ ہزار روپے نقد دیئے تھے اور مزید ۳۰ ہزار کا وعدہ کیا تھا تو اب اس صورت میں زید عمرو کو حسبِ وعدہ ۳۰ ہزار روپے دینے کا پابند ہے یا عمرو زید کو چالیس ہزار روپے واپس کرے گا؟ شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں اگر سعودی عرب کا ویزا بیع کے وقت موجود تھا

؎۱ قال العلامة ابن عابدينؒ: رجل اشترى ارضاً اوكرماً فظهر ان شربه فكان على ناوقة اى ميزاب توضع على ظهر نهر او موضع آخر كان له ان يردلان ذلك يعد عيبا عند الناس الخ المشترى بالخيار ان شاء امسكها بجميع الثمن وان شاء ردّ۔ (تنقيح الحامدية ج ۱ ص ۲۷۶ كتاب البيوع، باب الخيار)

؎۲ قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: واذا اطلع المشترى على العيب فى المبيع فهو بالخيار وان شاء اخذهٗ بجميع الثمن وان شاء ردّه۔ (الهداية ج ۳ ص ۲۳ باب خيار العيب)

ومِثلُهٗ فى رد المحتار ج ۴ ص ۱۰۰ باب خيار العيب۔

اور اس میں الریاض شہر کے ہی کسی باشندہ کی کفالت کا ذکر تھا مگر الریاض پہنچنے پر کفالت کا معاملہ معاہدہ کے برعکس نکلا تو اس میں مشتری کو نقص وفسخ کا حق حاصل ہے۔

لما فی الھندیۃ: وان اشتری ثوبًا علیٰ انہ عشرۃ اذرع بعشرۃ الیٰ قولہ فالمشتری بالخیار الیٰ قولہ وان نقص فقد فات الوصف المرغوب فیختل رضاہ فیخیر الخ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۳ ص ۱۲۴ الفصل الثامن فی جھالۃ المبیع اوالثمن) [1]

اور احتمال مذکورہ صورت میں بھی ظاہر ہے کہ وصف مرغوب فوت ہوا ہے، لہٰذا مشتری کو نقص کا اختیار حاصل ہے۔

خیارِ رؤیت ناقابلِ انتقال حق ہے

سوال:۔ ہمارے والد صاحب نے کراچی سے کچھ مال منگوایا اور مال پہنچنے سے قبل والد صاحب فوت ہو گئے، جب مال آیا تو وہ عیب دار نکلا جو کہ ہمیں پسند نہیں، اب ہم اس مال کو واپس کرنا چاہتے ہیں مگر کمپنی والے نہیں مانتے، تو کیا شرعاً ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم اس مال میں خیارِ رؤیت کا حق استعمال کر کے مال واپس کر دیں؟

الجواب:۔ خیارِ رؤیت ایسا حق ہے کہ جس میں ارث جاری نہیں ہوتا اور نہ یہ ورثا کی طرف منتقل ہوتا ہے، لہٰذا اگر آپ کے والد صاحب نے مال کو نہیں بھی دیکھا ہو اور ان کے انتقال کے بعد پسند نہ آنے پر آپ کو شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ خیارِ رؤیت کا حق استعمال کر کے اُسے واپس کریں کیونکہ بیع تام ہو چکی ہے، تاہم اگر کمپنی والے اقالہ کرنا چاہیں تو صحیح ہے۔

لما فی مجلۃ الاحکام: خیار الرؤیۃ لاینتقل الی الوارث فاذا مات المشتری قبل ان یری المبیع لزم البیع ولاخیار لوارثہ۔ وقال العلامۃ رستم باز: لان خیار الرؤیۃ لیس الا مجرد ارادۃ ومشیئۃ وھذا وصف فلا یمکن انتقالہ الی الوارث۔ (شرح مجلۃ الاحکام ص ۱۷۱ المادۃ ۳۲۱ باب الخیارات)

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: ثم الخیارات بلغت سبعۃ عشر الثلاثۃ..... وفوات وصف مرغوب فیہ۔ قال ابن عابدینؒ: ھو ما یذکرہ فی ھذا الباب فی قولہ اشتری عبدًا بشرط خبزہ اوکتبہ الخ۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۴ ص ۵۰، ۵۱ باب خیار الشرط)
ومثلہ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۲۴ باب خیار الشرط۔

باب الاقالة

(سودا واپس کرنے کے احکام ومسائل)

اقالہ میں طرفین کا رضامند ہونا

سوال:۔ بائع اور مشتری کے درمیان باقاعدہ عقد (سودا) ہو جانے کے بعد اگر ایک فریق واپسی کی خواہش کرے لیکن دوسرا فریق اس پر رضامند نہ ہو، تو کیا واپسی کا خواہش مند جبراً اپنا حق واپسی منوا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ باقاعدہ ایجاب وقبول کے بعد عقدِ بیع لازم ہو کر کسی ایک کو جبراً عقد ختم کرنے کا حق حاصل نہیں، تاہم اگر اقالہ کی صورت ہو تو اس کے لیے طرفین کی رضامندی ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : من شرائطها اتحاد المجلس ورضا المتعاقدين لان الكلام فى رفع عقد لازم واما رفع ما ليس بلازم فلمن له الخيار بعلم صاحبه لا برضاه بحر ۔ (رد المحتار ج۵ ص۱۲۱ باب الاقالة) [1]

اقالہ میں قیمت کم کرنے کی شرط لگانا

سوال: انعقادِ بیع کے بعد اگر طرفین اس شرط پر بیع فسخ کرنا چاہیں کہ مشتری بائع کو ادا کی ہوئی رقم میں سے کچھ چھوڑے گا، کیا شرعاً دونوں کے لیے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع فسخ کرتے وقت اگر بائع اور مشتری قیمت کم کرنے کی شرط لگاتے ہیں تو دونوں کی رضامندی سے بیع فسخ ہو کر بائع مشتری کو پوری رقم واپس کرے گا، رقم منہا کرنے کی شرط کالعدم ہو کر باطل رہے گی۔

لما قال العلامة على بن ابى بكر المرغينانى رحمه الله : الاقالة جائزة فى البيع

---

[1] قال فى الهندية : وشرط صحة الاقالة رضاء المتقائلين ۔

(الفتاوى الهندية ج۳ ص۱۵۷ الباب الثالث عشر فى الاقالة)

ومثله فى شرح مجلة الاحكام لسليم رستم باز، تحت المادة ۱۹۰ ص۹۲

بمثل الثمن الاوّل فان شرط اکثر منه او اقل فالشرط باطل ویرد مثل الثمن الاوّل۔

(الهدایة ج۳ ص۷ باب الاقالة) [1]

فروخت شدہ چیز کو کم قیمت پر واپس لینا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو قرض پر اونٹ فروخت کیا، قیمت کی ادائیگی کے وقت مشتری نے ادائیگی سے انکار کرتے ہوئے مبیع واپس کرنا چاہا، اب بائع مشتری سے اونٹ اسی قیمت پر یا اس سے کم قیمت پر واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں باقاعدہ طور پر ایجاب وقبول ہو کر بیع قطعی ہو چکی ہے جس سے مبیعہ بائع کی ملکیت سے نکل کر مشتری کی ملکیت میں آچکا ہے لیکن اب اگر مشتری بیع فسخ کر کے مبیعہ واپس کرنا چاہتا ہے تو بائع کو مبیعہ سابقہ قیمت پر یا اس سے زائد قیمت پر واپس لینے میں کوئی حرج نہیں تاہم یہ جائز نہیں کہ بائع مبیعہ کو کم قیمت پر واپس لے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: لو باع شیئاً اصالةً بنفسه او وکیله او وکالة عن غیره لیس له شراءه باقل لا لنفسه ولا لغیره۔

(رد المحتار ج۵ ص۷۴ باب البیع الفاسد، مطلب فی التداوی بلبن البنت۔الخ) [2]

مبیعہ پسند نہ آنے پر واپس کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے دوسرے آدمی پر کوئی چیز اس شرط پر فروخت کی کہ یہ فلاں کمپنی کی مصنوعات

---

[1] قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: الثالث انها لا تفسد الشرط الفاسد وان لم تصح تعلیقها به بل یکون الشرط لغواً فلو تقایلا علیٰ ان یوخر المشتری الثمن سنة اوعلیٰ ان یحط منه خمسین صحت الاقالة لا التاخیر والحط۔

(شرح مجلة الاحکام لسلیم رستم باز ص۹۱ المادة ۱۹۰ الفصل الخامس فی الاقالة)

ومثله فی الهندیة ج۳ ص۱۵۶ الباب الثالث عشر فی الاقالة۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: شراء ما باع باقل مما باع من الذی اشتراه او من وارثه قبل نقد الثمن لنفسه او لغیره........ فاسد عندنا۔

(خلاصة الفتاوی ج۳ ص۴۱ کتاب البیوع، الفصل الرابع فی البیع الفاسد واحکامه)

ومثله فی الهندیة ج۳ ص۱۳۴ الباب العاشر فی الشروط التی تفسد والتی لا تفسده۔

میں سے ہے جو کہ عمدہ اور اعلیٰ معیار کی حامل ہے، لیکن خریدنے کے بعد اس چیز کی حقیقت کچھ اور نکلی، تو کیا اس وجہ سے مشتری کو مبیعہ واپس کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عقدِ بیع کے وقت کسی چیز کے بیان کیے ہوئے ایسے اوصاف (جن کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے) کا مبیعہ میں موجود ہونا ضروری ہے ورنہ عدم موجودگی کی صورت میں مشتری کو کل قیمت پر لینے یا بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل رہے گا۔ اس بناء پر مذکورہ صورت میں کمپنی کی مصنوعات بوقتِ بیع بیان کردہ اوصاف یعنی عمدگی اور پائیداری سے عاری معلوم ہوں تو مشتری کو کل قیمت پر لینے یا واپس کرنے کا حق حاصل ہے۔

لما قال فی الهندیة: وان اشتریٰ ثوبًا علیٰ انه عشرة اذرع بعشرة او ارضًا علیٰ انها مائة اذرع بمائةٍ فوجدها اقل فالمشتری بالخیار ان شاء اخذها بجمیع الثمن وان شاء ترك وان وجدها اکثر من الذراع الذی سماه فهو للمشتری ولا خیار للبائع وان نقص فقد فات الوصف المرغوب فیختل رضاه ولا یحط شیٔ من الثمن کذا فی الکافی۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۱۲۴ الفصل الثامن) [1]

اقالہ کی صورت میں رقم میں زیادتی جائز نہیں

سوال:۔ زید نے اپنا کھیت بکر پر مبلغ ایک لاکھ روپے میں فروخت کر دیا بکر نے موقع پر دس ہزار روپے زید کو پیشگی دیدیئے اور بقایا رقم چند دنوں کے بعد دینے کا وعدہ کیا، ایک مہینہ گذرنے کے بعد زید نے اپنا کھیت بکر سے واپس لینا چاہا اور کہا کہ میں کھیت کو فروخت نہیں کرتا ہوں، اور بکر کو اس کی اصل رقم دس ہزار روپے کے علاوہ پانچ ہزار روپے بطورِ پشیمانی بھی دیئے، تو کیا بکر کے لیے

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: اشتریٰ من اخر فرسًا ذکر البائع انها من نسلِ خیل فلان لفرس مشهور بالجودة ثم تبین کذبه هل له الرد ام لا فاجاب اذا اشتراها بناءً علیٰ ما وصف له بثمن لو لم یصفها بهذه الصفة لا تشتری بذلك الثمن والتفاوت بین الثمنین فاحش وهی لا تساوی ما اشتراها به له الرد اذا تبین خلاف ذلك۔ (تنقیح فتاویٰ حامدیة ج۱ ص۲۳۷ باب الخیارات)

ومثله فی شرح مجلة الاحکام، تحت المادة ۸۹ ا ص۸۹ باب الخیارات۔

یہ پانچ ہزار روپے بطورِ پشیمانی کے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ میں ایجاب وقبول کے بعد اگرچہ بیع منعقد ہو چکی تھی اور زید زمین کو واپس لینے کا مجاز نہیں تھا مگر جب بکر نے بیع فسخ کرنے پر رضامندگی ظاہر کی اور بیع کو ختم کر دیا (اسے شرعاً اقالہ کہا جاتا ہے) تو اس کے بدلے میں بکر کے لیے زید سے بصورتِ جرمانہ اور پشیمانی کے اپنی اصل رقم کے علاوہ مزید کچھ رقم لینا حلال نہیں ہے۔

لما ورد فی الحدیث: لایحل مال امرءٍ مسلم الا عن طیب قلبه انتھی۔

(مشکوٰۃ المصابیح ج۱ ص۲۵۵ باب الغصب والعاریۃ) [1]

ثمن خرچ ہو جانے سے اقالہ کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک آدمی کسی زمیندار سے خریدی ہوئی چیز اسے واپس کرنا چاہتا ہے اور زمیندار بھی واپسی پر راضی ہے لیکن جو رقم اس نے مشتری سے لی تھی وہ اس سے ختم ہو چکی ہے، اب زمیندار مشتری سے کہتا ہے کہ تم مجھے یہ چیز واپس کر دو لیکن پیسے ایک ماہ کے بعد ملیں گے۔ تو کیا ایسا اقالہ کرنا جائز ہے جبکہ واقعتاً زمیندار کے پاس پیسے نہیں ہیں؟

الجواب:۔ ثمن (پیسوں) کا تلف یا ختم ہو جانا اقالہ کے انعقاد کیلئے مانع نہیں ہے اسلئے اگر دونوں متعاقدین باہمی رضامندی سے اقالہ کرنا چاہتے ہوں اور مشتری رقم کی واپسی کا انتظار کر سکتا ہو تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ سلیم رستم باز رحؒ: ھلاک الثمن ای تلفه لایمنع صحۃ الاقالۃ ـــ قال العلامۃ سلیم رستم باز رحؒ: وذٰلك لان الاقالۃ رفع البیع والاصل فی البیع المبیع لاالثمن ولھٰذا لوھلك المبیع قبل القبض یبطل البیع بخلاف ھلاك الثمن۔

(شرح مجلۃ الاحکام ص۹۵ المادۃ ۱۹۶ فصل فی الاقالۃ)

---

[1] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: قوله وتصح بمثل الثمن الاوّل حتٰی لو کان الثمن عشرۃ دنانیر فدفع الیه دراھم ثم تقابلا وقد رخصت الدنانیر رجع بالدنانیر لابما دفع وکذا الورد بعیب الخ۔

(رد المحتار علیٰ ہامش الدر المختار ج۴ ص۱۶۵ باب الاقالہ)

ومِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۰۴ باب الاقالۃ۔

باب المرابحة والتولية
(بیع مرابحہ و تولیہ کے احکام و مسائل)

بیع مرابحہ میں منافع کی مقدار متعین نہیں

سوال: ایک دوکاندار عام طور پر مارکیٹ سے زائد نرخ پر سودا فروخت کرتا ہے تو کیا یہ جائز ہے؟ نیز کیا شریعت نے کسی چیز کی فروخت پر منافع کی کوئی حد مقرر کی ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت مقدسہ نے خرید و فروخت کو بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی پر موقوف رکھا ہے، بائع اور مشتری جس نرخ پر بھی متفق ہوں وہی نرخ شرعاً جائز ہے۔ فقہاء نے بیع مرابحہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے نرخ کی تعین نہیں فرمائی ہے،[1] البتہ بازار کے عام نرخوں سے زائد پر فروخت کرنا جائز تو ہے مگر خلافِ مروت ہے۔

لما قال فی الهندية: ومن اشترىٰ شيئًا واغلی فی ثمنه جاز۔

(الفتاویٰ الهندية ج۳ ص۱۶۱ کتاب البیوع، الباب الرابع عشر فی المرابحة والتولية ..الخ)

بیع مرابحہ میں شبۂ خیانت سے اجتناب ضروری ہے

سوال: اگر کسی چیز کو ادھار سے خریدا جائے تو فروخت کرتے وقت اُس کو یہ بتلانا ضروری ہے کہ مَیں نے اس کو اتنی قیمت میں ادھار خریدا ہے اور اتنے نفع میں فروخت کرتا ہوں؟

الجواب: بیع مرابحہ کا دارومدار دیانت و امانت پر ہے، اس میں ہر اس قدم سے اِجتناب ضروری ہے جس سے شبۂ خیانت ہو، چونکہ ادھار میں عموماً نقد کی نسبت سے قیمت زیادہ رکھی جاتی ہے اس لیے ادھار سے خریدی ہوئی چیز اگر گاہک کو قیمتِ خرید بتا کر فروخت کرے تو اصل قیمت کے ساتھ ادھار کا اظہار بھی ضروری ہے۔

---

[1] قال العلامة جلال الدين الخوارزمیؒ: هو مبادلة المال بالمال بالتراضی۔

(الكفاية فی ذيل فتح القدير ج۵ ص۴۵۴ کتاب البیوع)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدير ج۴ ص۴۵۵ کتاب البیوع۔

لما قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ :۔ ومن اشتری غلاماً بالف درھم نسیئۃً فباعہ بربح مائۃٍ ولم یبین فعلم المشتری فان شاء ردہ وان شاء قبل لان للاجل شبھاً بالمبیع الا یری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔ (الھدایۃ ج ۲ ص ۶۷ باب المرابحۃ والتولیۃ) [۱]

بیع مرابحہ میں گز اور میٹر کے تعین کی ضرورت

سوال: کپڑے کا ایک دوکاندار بعض کپڑا گز کے حساب سے اور بعض میٹر کے حساب سے خریدتا ہے اور گاہک کو ایک روپیہ فی گز منافع لے کر بیچتا ہے اور بل دکھا کر میٹر اور گز کی تفصیل طے کئے بغیر معاملہ طے ہو جاتا ہے، کیا دوکاندار کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب: گاہک کو کسی چیز کی قیمتِ خرید بتا کر فروخت کرنا بیع مرابحہ ہے، میٹر اور گز میں چونکہ تقریباً ساڑھے تین انچ فرق ہے اس لیے میٹر کے حساب سے خریدے ہوئے کپڑے کو میٹر اور گز کا تعین کئے بغیر فروخت کرنے میں خیانت کا قوی احتمال ہے اس لیے معاملہ کو یوں مبہم کر کے چھوڑنا جائز نہیں ہے، دوکاندار کو چاہیئے کہ اول تو گاہک کو قیمتِ خرید بتائے ہی نہیں اور اگر قیمتِ خرید بتائے تو پھر گز اور میٹر کا فرق بتا دینا بھی انتہائی ضروری ہے۔

لما قال العلامۃ علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ :۔ ولھذا کان مبناھما علی الامانۃ والاحتراز عن الخیانۃ وعن شبھتھا۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۵۷ باب المرابحۃ والتولیۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ : اشتراہ بالفٍ نسیئۃً وباع بربح مائۃ بلا بیان خیر المشتری۔ وقال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : ای بعین ردہ واخذہ بالف ومائۃ حالۃ لان للاجل شبھاً بالمبیع الا تری انہ یزاد فی الثمن لاجلہ۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۱، ۱۴۲، مطلب اشتری من شریکہ سلعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص ۲۲۴ باب المرابحۃ والتولیۃ۔

[۲] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ : فالاصل فیہ ان بیع المرابحۃ والتولیۃ بیع امانۃ .... فتجب صیانتھا عن الخیانۃ وعن سبب الخیانۃ والتھمۃ لان التحرز عن ذلک کلہ واجب ما امکن۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۲۲۳ باب المرابحۃ والتولیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی رد المحتار ج ۵ ص ۱۳۸ باب المرابحۃ والتولیۃ۔

آمدورفت کا خرچہ خریدی گئی چیز کی اصل قیمت میں ملانا

سوال: ایک دوکاندار کوئی چیز خریدنے کے لیے کسی دوسرے شہر جائے تو اس پر جو خرچہ آمدورفت وغیرہ آتا ہے وہ اگر اس چیز کی قیمتِ خرید میں شمار کرکے فروخت کرے تو اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: کسی چیز کے خریدنے وقت اس پر آنے والے اخراجات عقدِ مرابحہ کی صورت میں قیمتِ خرید میں ملاکر گاہک سے وصول کرنا شبۂ خیانت کا مقتضی ہے اس لیے ازروئے شرع یہ جائز نہیں کہ بائع اصل قیمت بتاتے وقت یہ اضافی اخراجات بھی اس میں ضم کرے۔ تاہم قیمتِ خرید سے قطع نظر کرکے بائع فروخت کرنے کے لیے جو معیار مقرر کرے اس میں اصل قیمت کے ساتھ اضافی اخراجات بھی شامل ہوں اور مشتری اور بائع کے درمیان باہمی رضامندی سے کسی قیمت پر اتفاق ہو تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: لا يضم نفقة نفسه اى فى سفره ككسوته وطعامه ومركبه وغسل ثيابه۔ (رد المحتار ج ۵ ص۱۳۷ باب المرابحة والتولية)[۱]

کسی چیز کی قیمتِ خرید میں اضافی اخراجات ملانے کی صورت

سوال: بیرونِ ملک سے سامانِ تجارت منگوانے کی صورت میں مختلف سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی اور دوسرے اخراجات سے قیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ ایک چیز کی قیمت بین الاقوامی منڈی میں ایک ہزار روپے ہو تو یہاں پہنچتے پہنچتے اُس کے جملہ اخراجات دس ہزار روپے سے متجاوز ہو جاتے ہیں، تو کیا یہاں اس چیز کو ان کئی گنا اضافی اخراجات کے ساتھ فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: سامانِ تجارت پر آنے والے اخراجات کو قیمتِ خرید میں ضم کرنا مرتعص ہے اس صورت میں اضافی اخراجات خریدے ہوئے مال پر تقسیم کرکے گاہک سے وصول کرنے میں

---

[۱] لما قال فى الهندية: ولا يحمل عليه ما انفق عليه فى سفره من طعامٍ ولا كراء ولا مؤنةٍ لانعدام العرف فيه ظاهراً كذا فى المبسوط۔

(الفتاوى الهندية ج۳ ص۱۶۲ الباب الرابع عشر فى المرابحة والتولية)

ومثلهٗ فى البحر الرائق ج۶ ص۱۱۱ كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية۔

شرعاً کوئی حرج نہیں، تاہم شبۂ خیانت سے بچنے کے لیے اگر قیمتِ خرید بتانے کی ضرورت محسوس ہو تو اضافی اخراجات ملا کر قیمتِ خرید بتانا دیانت کے خلاف ہے، البتہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی ہے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: و یجوز ان یضیف الی رأس المال اجرۃ القصار والطراز والصبغ والفتل واجرۃ حمل الطعام ویقول قام علیّ بکذا ولا اشتریته بکذا کیلا یکون کاذباً۔ (الھدایة ج۳ ص۵۷ باب المرابحة والتولیة) [1]

بیع مرابحہ میں خیانت کے باعث مشتری کا مبیعہ واپس کرنا

سوال: مشتری اگر بائع پر اعتماد کر کے دو فیصد منافع دینے پر تیار ہو جس کے نتیجے میں بائع نے چار ہزار کی خریدی ہوئی چیز مشتری پر پانچ ہزار میں فروخت کر دی، بعد میں مشتری کو کسی ذریعہ سے بائع کے جھوٹ پر آگاہی ہوئی کہ یہ چیز تو اس نے چار ہزار میں خریدی تھی، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مشتری بائع سے ادا کی گئی زائد رقم (ایک ہزار بیس روپے) واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بیع مرابحہ میں جب بائع کی خیانت ظاہر ہو جائے تو مشتری کو بیع فسخ کرنے کا حق حاصل ہے تاہم طے شدہ قیمت میں کمی کرنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں مشتری یا تو خریدی ہوئی چیز بائع کو واپس کر کے اپنی پوری رقم واپس لے لے یا پھر طے شدہ پوری قیمت ادا کرے۔

لما قال علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: فان اطلع المشتری علی خیانة فی المرابحة فھو بالخیار عند ابی حنیفة رحمہ اللہ ان شاء اخذہ بجمیع الثمن وان شاء ترکہ۔ (الھدایة ج۳ ص۵۷ باب المرابحة والتولیة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن نجیم رحمہ اللہ: وله ان یضم الی رأس المال اجر القصار والصبغ والطراز والفتل وحمل الطعام وسوق الغنم ویقول قام علیّ بکذا ولا یقول اشتریته لانه کذب۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۰ باب التولیة والمرابحة)

ومثلہ فی رد المحتار ج۵ ص۱۳۵ کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة)

[2] قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: فان ظھر خیانة فی مرابحة باقرارہ او برھان علی ذلک او بنکوله عن الیمین اخذہ المشتری بکل ثمنه او ردہ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۱۳۷ کتاب البیوع باب المرابحة والتولیة۔

ومثلہ فی بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲۶ باب المرابحة والتولیة۔

سیل ٹیکس قیمتِ خرید میں ملانے کا حکم

سوال:۔ حکومت تاجروں اور چھوٹے دوکانداروں سے سیلز ٹیکس کے نام سے جو ٹیکس وصول کرتی ہے تو کیا بائع کے لیے اتنی مقدار رقم مبیعہ کی قیمتِ خرید میں ملانا اور مشتری سے وصول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ موجودہ دور میں حکومت کی طرف سے عائد کردہ سیلز ٹیکس یا دیگر ٹیکس چونکہ جائز حدود سے نکل کر ظلم و تعدّی کے دائرہ میں داخل ہیں اور اس میں کسی امیر یا غریب کی تمیز بھی نہیں، شرح ٹیکس بھی اتنی زیادہ ہے کہ دینے والا اس کی ادائیگی سے عاجز ہو جاتا ہے اس بناء پر سیلز ٹیکس بالکل اُس رقم کی طرح ہے جو راستے میں تاجروں سے ظلماً و جبراً وصول کی جاتی ہے۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں مشتری کو قیمتِ خرید بتاتے وقت اس میں ٹیکس کا اضافہ ضم کرنے میں خیانت کا پہلو غالب ہو جاتا ہے، تاہم اگر بائع مشتری کو قیمتِ خرید بتائے بغیر جملہ ٹیکسوں کا حساب کرکے اُس سے کسی قیمت پر اتفاق کرلے تو کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمه الله: لا يضم اجر الطبيب ...... وما يؤخذ في الطريق من الظلم الا اذا جرت العادة بضمه هٰذا اهو لا اصل كما علمت فليكن المعول عليه۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص ۱۳۷ باب المرابحة والتولية)

ضلع ٹیکس، پل ٹیکس، محصول چونگی وغیرہ اخراجات اصل قیمت میں ملانا

سوال:۔ پل ٹیکس، ضلع ٹیکس، راہداری اور محصول چونگی وغیرہ کے اخراجات مبیعہ کی اصل قیمت سے ملانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آجکل حکومت کے عائد کردہ مذکورہ بالا ٹیکس ظالمانہ اور جابرانہ صورت اختیار کر چکے ہیں، ان اضافی اخراجات کا مبیعہ کی قیمتِ خرید میں ملانا یا نہ ملانا تجّار کی عادت اور عرف پر موقوف ہوگا، پس اگر تجّار کی عادت اور عرف ملانے کی ہو تو پھر ایسا کرنا جائز رہے ورنہ اضافی اخراجات کا اصل قیمت میں ملانا جائز نہیں۔

---

[۱] قال العلامة ابن نجيم المصري رحمه الله:۔ هي اي التولية بيع بثمن سابق والمرابحة بيع وبزيادة۔ (البحر الرائق ج ۶ ص ۱۰۱ باب المرابحة والتولية)

ومثله في الهندية ج ۳ ص ۱۶۳ كتاب البيوع۔ باب المرابحة والتولية۔

لما قال العلامة علاؤالدین الحصکفی رحمہ اللہ : لا یضم اجر الطبیب ...... وما یاخذ فی الطریق من الظلم الا اذا جرت العادۃ بضمہ ھذا ھو الاصل کما علمت فلیکن المعوّل علیہ ۔ (الدرالمختار علی صدر ردالمحتار ج۵ ص۱۳۷ باب المرابحۃ والتولیۃ) لہ

قسطوں میں اشیاء کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیّت

سوال:۔ آج کل بعض کاروباری ادارے عوام کی سہولت کے لیے روزمرّہ استعمال کی اشیاء قسطوں میں فروخت کرتے ہیں لیکن نقد ادائیگی کی نسبت اقساط میں خریدنے کی صورت میں زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، تو کیا بذریعہ اقساط حکومتی یا بعض پرائیویٹ اداروں سے اشیاء ضروریہ خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دورِ حاضر میں اقساط کے ذریعے روزمرہ استعمال کی چیزوں کی خرید و فروخت کا رواج عام ہو چکا ہے کیونکہ کم آمدنی اور متوسط طبقہ کے لوگ مہنگائی اور تنگدستی کی وجہ سے اپنی ضرورت کی چیزیں نقد ادائیگی کرکے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، لہٰذا انہیں ضروری اشیاء اور دیگر سامان وغیرہ مجبوراً قسطوں میں خریدنا پڑتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بائع اسی وقت اپنا سامان خریدار کی طلب پر اس کے حوالے کردیتا ہے جبکہ خریدار اُس چیز کی قیمت نقد ادا نہیں کرتا بلکہ طے شدہ قسطوں کی صورت میں ادا کرتا ہے، اس طریقہ پر کوئی چیز خریدنے کی صورت میں اس کی قیمت زیادہ لگائی جاتی ہے، اگر خریدار اس چیز کو نقد خریدنا چاہے تو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے جبکہ قسطوں میں ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت دینی پڑتی ہے۔

مذکورہ طریقۂ بیع میں صرف یہی ایک پیچیدگی نظر آتی ہے کہ ادھار خریدنے کی صورت میں قیمت زیادہ اور نقد خریدنے کی صورت میں قیمت کم دینی پڑتی ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء و محدّثین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اُدھار بیع میں نقد بیع کے مقابلہ میں زیادہ قیمت لگانا شرعاً مرخّص ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ عاقدین کسی ایک قیمت پر متفق ہوں

لہ قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ : والذی یوخذ فی الطریق من الظلم لا یضم الا فی موضع جرت العادۃ فیہ بینھم بالضم ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۱۱ باب المرابحۃ والتولیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۳ ص۱۶۳ کتاب البیوع باب المرابحۃ والتولیۃ ۔

اس کا مطلب یہ ہؤا کہ اگر بائع یہ کہے کہ یہ چیز میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں، اور طرفین کسی ایک نرخ پر اتفاق کئے بغیر جدا ہوئے تو یہ بیع ناجائز ہے، البتہ اگر اسی مجلس میں نقد یا ادھار میں سے کسی ایک قیمت پر دونوں کا اتفاق ہو گیا تو بیع جائز ہے
یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نقد اور ادھار کی بجائے مختلف مدتوں کے مقابلے میں مختلف قیمتیں مقرر کی جائیں، مثلاً نقد سو روپے میں جبکہ ادھار ایک سو بیس روپے میں، اور یہ ادھار ایک ماہ کے لیے ہو گا، اور اگر ادھار دو ماہ کا ہو تو ایک سو پچاس روپے ہیں، اور اگر ادھار تین ماہ کے لیے ہو تو اور بھی زیادہ قیمت ہوگی۔ توجس طرح نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو اسی طرح مدتوں کے اختلاف کی بناء پر بھی قیمتوں میں اختلاف جائز ہے، کیونکہ بیع کی ان دونوں قسموں میں بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عاقدین کے درمیان عقدِ بیع میں مختلف مدتوں اور قیمتوں کے درمیان کسی ایک مدت اور قیمت کا تعین ہونا ضروری ہے۔ اور اگر یہ کہا کہ ایک ماہ تک رقم ادا کروگے تو اتنی قیمت، دو ماہ تک ادا کروگے تو اتنی قیمت، اور تین ماہ تک ادا کروگے تو اتنی قیمت، اور اگر تعین کئے بغیر جدا ہوئے تو جہالت لازم ہو کر بیع ناجائز ہے۔

قال الامام ترمذی رحمہ اللہ: تحت هٰذا الحدیث نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعةٍ وقد فسر بعض اهل العلم قالوا بیعتین فی بیعة ان یقول ابیعك هٰذا الثوب بنقدٍ لعشرة وبنسئةٍ بعشرین ولا یفارقه احد البیعین فان فارقه فلا بأس به اذا کانت العقدة علیٰ احدٍ منهما۔ (الترمذی ج ۱ ص۲۳۳ کتاب البیوع۔ باب ما جاء فی النهی عن بیعتین فی بیعة) [1]

ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا | سوال:۔ بعض اوقات ایک چیز

---

[1] قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: لان للاجل شبهًا بالمبیع الا یرٰی انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔
(الهدایة ج ۳ ص۷۶ باب المرابحة والتولیة، کتاب البیوع)
ومثلهٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص۱۱۶ باب المرابحة والتولیة۔

نقد ادائیگی کی صورت میں کم قیمت پر جبکہ ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر ملتی ہے، کیا نقد اور ادھار کی صورت میں قیمت میں کمی بیشی جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ نقد اور ادھار کی صورت میں قیمت میں کمی بیشی مرخص ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مجلسِ عقد میں مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد مقرر کر لی جائے ۔

لما قال العلامة علی ابن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ :لان للاجل شبهًا بالمبیع الا یری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل ۔ (الهدایة ج۳ ص۷۶ کتاب البیوع۔ باب المرابحة والتولیة) ؎۱

بیع مرابحہ میں دھوکہ سے لی گئی زائد رقم پر رجوع کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے شوتل (جانوروں کا چارا) خریدنا چاہا اور اُس سے اس کا نرخ پوچھا تو اس نے بتایا کہ بوری کے حساب سے ۴۵ روپے فی بوری مجھے پڑتی ہے اور آپ کو میں ۵۰ روپے فی بوری کے حساب سے دوں گا، وہ شخص اس سے بوریاں خرید لیتا ہے اور بعد میں اس کو پتہ چلتا ہے کہ بازار میں تو اس کا ریٹ ۴۸ روپے فی بوری ہے، اب شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟ کیا وہ بائع سے زیادہ لی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ بیع مرابحہ کی ہے، بیع مرابحہ میں عاقدین کے مابین جو بھی طے پا گیا وہی اس چیز کی قیمت ہے، البتہ غبن فاحش کی صورت میں مشتری کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس سودے کو طے شدہ قیمت پر قبول کرے یا واپس کر کے بائع سے اپنے پیسے واپس لے لے، نقصان یا زیادتی کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا ۔

قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: فان اطلع المشتری علی خیانة فی المرابحة فهو بالخیار۔ (الهدایة ج۳ ص۵۵ باب المرابحة والتولیة) ؎۲

؎۱ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ :۔ لان للاجل الا تری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل ۔
(البحر الرائق ج۶ ص۱۱۴ کتاب البیوع ، باب المرابحة والتولیة)
ومثلہ فی فتح القدیر ج۶ ص۱۳۳ کتاب البیوع ۔ باب المرابحة والتولیة ۔

؎۲ قال العلامة ابو البرکات النسفی رحمہ اللہ : فان خان فی مرابحة اخذ بکل ثمنہ ۔
(کنز الدقائق علی هامش البحر الرائق ج۳ ص۱۱۰ تحت باب المرابحة)
ومثلہ فی ردّ المحتار ج۴ ص۱۷۴ باب المرابحة والتولیة ۔

بیع کو زیادہ قیمت پر فروخت کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک دوکاندار آٹھ آنے کی چیز دو روپے میں فروخت کرتا ہے لیکن اپنی قیمتِ خرید کو خفیہ رکھتا ہے، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق ایسا کرنا جائز اور حلال تو ہے مگر خلافِ مروت ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ مناسب قیمت پر فروخت کرے، قیمتِ خرید کو ظاہر کیے بغیر مبیع بیچنے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: ولو اشترٰی ثوبًا بالعشر دراھم رقمۃً اثنی عشر فباعہ مرابحۃ علی الرقم بغیر بیان جاز اذا کان الرقم معلومًا والربح معلومًا ولا یکون خیانۃ لانہ صادق لکن لا یقول اشتریتہ لانہ یکون کاذبًا فیہ۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲۳ فی تحت بیان فی المرابحۃ) [1]

بیع مرابحہ میں فیصدی کے ساتھ منافع کے تعین کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص بیع مرابحہ کرتے وقت اصل قیمت سے زائد رقم کیلئے فیصدی کا سہارا لے، مثلاً زید (تاجر) بکر (گاہک) سے کہتا ہے کہ میں آپ سے اس مال میں پانچ فیصد منافع لوں گا، تو کیا یہ عقد جائز ہے؟ کیا یہ سود کے زمرے میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عقدِ مرابحہ میں اس نوعیت سے منافع کا تعین کرنا اگرچہ آجکل کے سودی لین دین کے ساتھ مشابہ ضرور ہے مگر حقیقت میں یہ سود نہیں لہٰذا صرف مشابہت کی بناء پر اس کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق منافع کا تعین فیصد کے اعتبار سے کرنا جائز ہے، اس لیے کہ اس عقد میں بیع مرابحہ کے جملہ لوازمات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: المرابحۃ نقل ما ملکہ بالعقد الاول بالثمن الاول مع زیادۃ ربح والتولیۃ نقل ما ملکہ بالعقد الاول بالثمن الاول من غیر زیادۃ ربح والبیعات جائزان۔ (الھدایۃ ج۳ ص۵۴ باب المرابحۃ والتولیۃ)

ومِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۰۷ تحت باب المرابحۃ والتولیۃ۔

وضاحت

★

آجکل بلکہ زمانہ قدیم سے بازار میں ایک رواج چلا آرہا ہے کہ تاجر حضرات کوئی چیز نقد ادائیگی کی صورت میں کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور اُدھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر بیچتے ہیں۔ اہل علم حضرات نے اس کی شرعی حیثیت کو اُجاگر کرنے کے لئے بہت کچھ لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ دارالعلوم حقانیہ کے ترجمان ماہنامہ الحق میں بھی اس موضوع پر ایک طویل سلسلۂ بحث چلا تھا، اس بحث میں مولانا طاسین صاحب کراچی، مولانا قاضی عبدالکریم صاحب کلاچوی نے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا جبکہ دارالعلوم حقانیہ کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ نے دارالعلوم کا مؤقف دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اب افادۂ عام کے لیے اس سلسلۂ بحث کو فتاویٰ دارالعلوم حقانیہ میں شامل کیا جارہا ہے۔ ——— (از مرتب) ———

اُدھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت

حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مجلسِ علمی کراچی

زیر نظر مضمون میں میرا اصل مقصد، جس خاص مسئلہ کی شرعی حیثیت سے بحث و تحقیق کرنا ہے وہ مسئلہ ہے کہ اُدھار پر کوئی چیز اُس قیمت سے زائد پر فروخت کرنا جو قیمت اس چیز کی بازار میں بصورت نقد رائج ہو، مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں عام طور پر بصورتِ نقد ایک سو روپے ہے اس کو مثلاً ایک سال کے اُدھار پر ایک سو پچاس روپے میں فروخت کرنا اور خریدنا۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یعنی اس میں جس معاشی معاملے کا ذکر ہے قرآن وحدیث کی رُو سے یہ جائز معاملہ ہے یا ناجائز معاملہ؟ اس بحث و تحقیق میں اس کا تعین کرنا اصل مقصود ہے، اور یہ اس لیے کہ متعدد اشخاص نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا ہے اور یہ ایک زندہ مسئلہ ہونے کے ساتھ اپنے اثرات و معروضی نتائج کے لحاظ سے بڑا اہم اور ضروری مسئلہ بھی ہے۔

بحث کے شروع میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حقیقت میں کسی مسئلہ و معاملہ کے متعلق شرعی حکم صرف وہی ہو سکتا ہے جس کا تفصیلی یا اجمالی ثبوت قرآن وحدیث میں موجود ہو، کیونکہ شریعتِ اسلامی کا حقیقی ماخذ و سرچشمہ صرف قرآن وحدیث ہیں لہٰذا اصلاً اس بحث کا دائرہ انہی تک محدود رہے گا، تعامل صحابہ کرامؓ در اصل کتاب و سنت پر مبنی ہے۔ لہٰذا کسی مسئلہ اور معاملہ کی شرعی حیثیت متعین کرنے کے لیے اس کو دیکھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے۔ محدثینِ کرام کے ہاں حدیث کا جو وسیع مفہوم ہے اس میں آثارِ صحابہؓ بھی شامل ہیں، مطلب یہ کہ کسی معاملہ کے شرعی جواز و عدم جواز کے متعلق صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ فقہ و فتاویٰ کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث کی اس نص اور دلیل کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی بناء پر اس فقیہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے اور یہ اس لیے بھی کہ وفاقی شرعی عدالت کے جج حضرات کسی فقیہ کے قول کو صرف اس وقت مانتے ہیں جب اس کے ساتھ قرآن و حدیث کی کوئی دلیل موجود ہو کیونکہ دستور مملکتِ خداداد پاکستان کے اندر صرف قرآن وحدیث کو اسلامی احکام کا ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔

اصل مسئلہ پر بحث سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک ادھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے تو یہ قرآن وحدیث کی رُو سے قطعی طور پر جائز ہے۔ اس کے ثبوت میں قرآنِ مجید کی

آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے، اور یہ بھی کہ بعض دفعہ ادائیگی کے وقت آپؐ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی۔ قرآن وحدیث میں قرضِ حسنہ کے متعلق جو تعلیم ہے اس سے بھی صریح طور پر اُس ادھار کا جواز ثابت ہوتا ہے جس پر کوئی اضافہ نہ ہو۔ کسی ضرورتمند کو ادھار پر اس کی ضرورت کی چیز اسی قیمت پر دینا جو نقد کی صورت میں ہو قرضِ حسنہ کی تعریف میں آتا ہے جو کہ بڑے اجر و ثواب کا نیک عمل ہے، بعض احادیث میں اس کو صدقہ سے تعبیر فرمایا ہے جو نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ مستحب و مستحسن عمل ہے۔

اسی طرح بیع مرابحہ کی وہ شکل بھی قطعی طور پر جائز ہے جس میں فروخت کی جانے والی چیز کی اصل قیمت بھی صحیح بتلائی گئی اور اس پر نفع کی مقدار بھی صرف اتنی لگائی گئی ہو جو تاجروں کے ہاں اور بازار کے عام رواج کے مطابق ہو یا اس سے بھی کم ہو، مثلاً اگر بازار میں عام طور پر نفع کی مقدار دس فیصد رائج ہو اور مرابحہ میں فروخت کرنے والا فروخت کی جانے والی چیز کی اصل قیمت پر زیادہ سے زیادہ دس فیصد منافع لگائے، مثلاً جو چیز اس کو سو روپے میں پڑی ہے اس پر نفع دس روپے یا اس سے کم لگا کر بیع مرابحہ کے طور پر فروخت کرے تو اس کے جواز میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ بالفاظِ دیگر بازار میں عام نرخ کے مطابق ایک چیز کی قیمت ایک سو روپے تھی اور مرابحت کی شکل میں بھی وہ ایک سو روپے میں ہی فروخت کی گئی یا مثلاً رعایت کے ساتھ ایک سو پانچ روپے میں فروخت کی گئی تو بیع مرابحہ کی یہ صورت بالکل جائز ہوتی ہے اور شرعی طور پر یہ معاملہ قطعاً درست ہوتا ہے کیونکہ اس میں فریقین معاملہ کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے، اور یہ اس وجہ سے موجود ہوتی ہے کہ اس میں ہر فریق کے لیے اس کی چیز کا اس کی مرضی کے مطابق معاوضہ پایا جاتا ہے جو قلبی رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہے بخلاف مرابحت کی ایسی شکل کے کہ جس میں فروخت کرنے والا خریدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز بازار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نفع پر فروخت کرتا ہے، مثلاً یہ دیکھتے ہوئے کہ خریدار نقد ادائیگی نہیں کر سکتا کچھ عرصہ کے ادھار پر لینا چاہتا ہے لہٰذا ادھار کی وجہ سے نفع دس فیصد کی بجائے بیس یا تیس فیصد لگا دیتا ہے، اس صورت میں خریدار کی اگرچہ ظاہری طور پر رضامندی موجود ہوتی ہے لیکن حقیقی طور پر موجود نہیں ہوتی کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ جو چیز وہ ادھار کی وجہ سے مثلاً ڈیڑھ سو روپے میں خرید رہا ہے وہ بازار میں بصورتِ نقد سو روپے میں ملتی ہے اور یہ کہ فروخت کرنے والا دوسرا فریق اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پچاس روپے کا اضافہ کر رہا ہے چنانچہ وہ ضرورت کے تحت لے تو لیتا ہے لیکن دل سے خوش نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کے لیے پچاس روپے کا مادی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا مرابحہ کی یہ شکل بلحاظِ حقیقت

درست نہیں ہوتی بلکہ باطل معاملہ کی تعریف میں آتی ہے، اس کی مزید کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

اب میں اپنے اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں یعنی یہ کہ اُدھار کی صورت میں کوئی چیز نقد قیمت کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ جہاں تک جواز کا تعلق ہے تو انتہائی تلاش وجستجو کے باوجود مجھے قرآنِ کریم، احادیثِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی ایسی دلیل نہیں مل سکی جس سے معاملہ مذکورہ کا جواز نکلتا اور ثابت ہوتا ہو۔ البتہ عدم جواز کے متعلق قرآن، حدیث اور آثار صحابہؓ میں واضح اور قطعی دلائل ملتے ہیں۔ تحریم ربوٰ سے متعلق جو آیات، احادیث اور آثار ہیں ان سے معاملہ زیرِ بحث کا قطعی طور پر ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ قرآن حکیم نے عہدِ جاہلیت کی جس متعارف ربٰو کو قطعی طور پر حرام وممنوع قرار دیا ہے اُس کی چند شکلوں میں سے ایک شکل یہ بھی تھی کہ ایک شخص دوسرے پر کوئی چیز اُدھار بیچتا تو مدتِ قرض کے لحاظ سے اس کی قیمت میں اضافہ کرتا۔ مثلاً ایک چیز جس کی قیمت بازار میں ایک سو درہم ہوتی ایک سال کے اُدھار پر ڈیڑھ سو درہم میں بیچتا، پھر جب ایک سال کے بعد بھی مقروض ڈیڑھ سو درہم ادا نہ کرسکتا تو قرض خواہ اس سے کہتا میں مدتِ قرض میں مزید اتنا اضافہ کر دیتا ہوں تم اپنے ذمہ رقم کی مقدار اتنی بڑھا دو اور پھر قرض کی رقم کی مقدار مزید ایک سال کے لیے دو سو درہم کر دی جاتی، پھر اگر دوسری مدت میں بھی وہ ادا نہ کرسکتا تو مزید مہلت کے عوض قرض کی رقم میں مزید اضافہ کر دیا جاتا، اس طرح بڑھتے بڑھتے یہ رقم اصل کے کئی گنا ہو جاتی یعنی أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً بن جاتی، یہی حال نقد کے قرض میں بھی ہوتا، ایک آدمی دوسرے کو مثلاً ایک سو درہم ایک سال کے لیے قرض دیتا تو اس مدت کے لحاظ سے اس میں اضافہ کر دیا جاتا جو درمیان میں ہر ماہ یا سال کے بعد یکمشت اصل کے ساتھ واجب الادا ہوتا، جیسا کہ موجودہ بینکاری نظام میں ہوتا ہے۔ غرضیکہ قرآن حکیم نے ربٰو النسیئہ کی جن مروجہ شکلوں کو حرام قرار دیا اُن میں سے ایک شکل ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شکل بھی تھی جس کا اظہار مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے جن کو مفسرین کرام نے تحریم ربٰو کی آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے:۔

(۱) عن زید بن اسلم رضی اللہ عنہ قال کان الربوا الذی اذن اللہ فیہ بالحرب لمن لم یترکہ عند الجاھلیۃ یکون للرجل علی رجل حق الی اجل فاذا حل الاجل قال صاحب الحق تقضی ام تربی، فان قضاہ اخذ منہ والا طواہ۔ (جامع الاصول ج ۱ ص ۴۷۹ رقم حدیث ۳۰۴۔ باب الربوٰ۔ الفرع الثالث فی عادات المتقدم)

(ترجمہ) ”حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا وہ ربٰو جس کو ترک نہ کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اعلانِ جنگ فرمایا عہدِ جاہلیت میں اس کی شکل اس طرح تھی کہ ایک آدمی کا دوسرے پر ایک خاص

مدت کے لیے حق یعنی دین و قرض ہوتا پس جب مقررہ وقت آتا تو صاحبِ حق یعنی قرض خواہ اپنے مقروض سے کہتا ادا کرتے ہو یا مزید مہلت کے عوض مالِ قرض میں اضافہ کرتے ہو؟ اگر وہ ادا کرتا تو ٹھیک معاملہ ختم کر دیتا ورنہ اس کو ہر مرتبہ بڑھاتا چلا جاتا۔"

(۲) عن مجاھدؓ انہٗ قال فی ربٰو الذی نھی اللہ عنہ کان فی الجاھلیۃ یکون للرجل علی الرجل دَین فیقول لک کذا وکذا وتؤخر عنی فیؤخر عنہ۔ (تفسیر الطبری ج ۳ ص ۱۰۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت مجاہدؒ نے فرمایا وہ ربٰو جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا عہدِ جاہلیت میں اس کی شکل یہ ہوتی کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر واجب الادا دَین (قرض) ہوتا تو جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو مقروض آدمی اپنے قرض خواہ سے کہتا مہلت بڑھا دو اور مطالبہ مؤخر کر دو اس کے بدلے آپ کے لیے اتنا اتنا مزید ہوگا چنانچہ وہ مطالبہ مؤخر کر کے مہلت بڑھا دیتا اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا۔"

(۳) عن سعید بن جبیرؒ قال ان الرجل کان یکون لہٗ علی الرجل المال فاذا حل الاجل طلبہ من صاحبہ فیقول المطلوب اخر عنی وازید ک فی مالک فیفعلان ذلک۔ (تفسیر الدر المنثور ج ۱ ص ۳۶۵ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت سعید بن جبیرؒ نے ربٰو جاہلی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا وہ اس طرح تھی کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی پر بطور قرض مال ہوتا پھر جب قرض کی مقررہ مدت پوری ہوتی تو قرض والا اپنے مقروض سے اپنا مال طلب کرتا پھر اگر مقروض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا تو مقروض سے کہتا مجھے مزید مہلت دیجئے میں اس کے عوض آپ کے مال میں آپ کے لیے اضافہ کر دیتا ہوں، چنانچہ وہ آپس میں ایسا کر لیتے اور یوں یہ سلسلہ جاری رہتا۔"

(۴) عن قتادۃؓ قال ان ربٰو الجاھلیۃ یبیع الرجل البیع الی اجل مسمّی فاذا حل الاجل ولم یکن عند صاحبہ قضاء زادہ واخر عنہ۔ (تفسیر الطبری ج ۳ ص ۱۰۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۷۵)

(ترجمہ) "حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ربٰو جاہلی کی ایک شکل یہ تھی کہ ایک آدمی اپنی کوئی چیز ایک خاص وقت تک کے لیے قرض پر بیچتا پھر جب وہ خاص وقت آتا اور اس کے مقروض کے پاس ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو مال بڑھا کر مزید مہلت دے دیتا۔"

(۵) عن عطاء ابن ابی رباح قال کانت ثقیف تداین فی بنی المغیرۃ فی الجاھلیۃ فاذا حل الاجل قالوا نزیدکم وتؤخرون۔ (تفسیر الدر المنثور ج ۲ ص ۱۲۸ سورۃ آل عمران آیت ۱۳۰)

(ترجمہ) "حضرت عطاء بن ابی رباحؒ نے فرمایا عہد جاہلیت میں بنو ثقیف، بنو المغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو بنو المغیرہ، بنو ثقیف سے کہتے ہم تمہارا مال زیادہ کر دیتے ہیں

آپ ہمیں مزید مہلت دے دیجئے ۔‘‘

ان مذکورہ روایات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ربٰو الجاہلی جس کا دوسرا نام ربٰوالنسیئۃ ہے، قرض کا ایسا معاملہ تھا جس میں مہلت اور مدتِ قرض کے عوض مال قرض میں اضافہ کیا جاتا تھا خواہ وہ قرض نقد کی صورت میں ہو یا کسی فروخت کردہ چیز کی قیمت کی صورت میں، اور یہ کہ اس کو قرآنِ حکیم نے حرام و ممنوع ٹھہرا کر اس خیال کی نفی اور تردید کر دی کہ قرض دینے والا مہلت قرض کے عوض مقروض سے قرض کے اصل مال پر کچھ بھی زائد مال مل سکتا ہے ۔

یہاں یہ مناسب اور مفید سمجھتا ہوں کہ اکابر مفسرین کرام کی کچھ عبارات پیش کر دوں جو انہوں نے ربائے جاہلی کی تفسیر میں فرمائی ہیں تاکہ حقیقتِ حال اچھی طرح واضح ہو جائے ۔ چنانچہ امام ابوبکر الجصاص ؒ اپنی جلیل القدر فقہی تفسیر میں ربٰو کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں :۔

والربٰوا الذی کانت العرب تعرفہ وتفعلہ انما کان قرض الدراھم والدنانیر الیٰ اجل بزیادۃ علیٰ مقدار ما استقرضہ علیٰ ما یتراضون بہ ھٰذا کان المتعارف المشھور عندھم ۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۵۵۲ باب الربٰو)

(ترجمہ) ’’وہ ربٰوا جس کو اہلِ عرب جانتے پہچانتے اور کیا کرتے تھے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ ایک مقررہ مدت تک دراہم و دنانیر کے قرض کا معاملہ تھا جس میں یہ طے پاتا تھا کہ قرض کے اصل مال پر کچھ زائد بھی ضرور لینا دینا ہوگا، ربٰو کا یہی معاملہ عربوں کے ہاں متعارف اور مشہور تھا ۔‘‘

اس سے کچھ آگے ایک اور عبارت اس طرح ہے :۔

و لم یکن تعاملھم بالربٰو الاعلی الوجہ الذی ذکرنا من قرض دراھم ودنانیر الیٰ اجل مع شرط الزیادۃ ۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۵۵۳ باب الربٰو)

(ترجمہ) ’’عربوں کے اندر جس ربٰو پر عملدرآمد تھا اس کی وہی شکل تھی جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا یعنی ایک خاص مدت تک دراہم و دنانیر کا قرض جس کے ساتھ زیادتی کی شرط ہوتی تھی ۔‘‘

پھر دو صفحات کے بعد ایک تیسری عبارت کچھ اس طرح ہے :۔

انہٗ معلوم ان الربٰو الجاھلیۃ انما کان قرضاً مؤجلاً بزیادۃ مشروطۃ فکانت الزیادۃ بدلاً من الاجل، فابطلہ اللہ وحرمہ وقال وان تبتم فلکم رءُوس اموالکم لاتظلمون ولا تظلمون ۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۵۵۴ باب الربٰو من ابواب لوبٰو الذی تضمنت الآیۃ تحریمہ)

(ترجمہ) ’’یہ ایک معلوم اور جانی ہوئی بات ہے کہ عہدِ جاہلیت کی ربٰو سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ

زیادتی کی شرط کے ساتھ میعادی قرض کا معاملہ تھا اور اس میں قرض کے اصل مال پر جو زیادتی ہوتی تھی وہ مدت اور مہلتِ قرض کا بدل سمجھی جاتی تھی پس اس کو اللہ تعالیٰ نے باطل قرار دیا اور فرمایا اگر تم اس سے توبہ کر کے باز آجاؤ تو پھر تمہارے لیے صرف تمہارے اصل اموال ہیں جو تم نے بطور قرض دیئے تھے نہ تم ان پر کچھ زائد لیکر اپنے مقروضوں پر ظلم کرو اور نہ وہ تمہارے اصل اموال روک کر تم پر ظلم کریں۔"

واضح رہے کہ یہاں ظلم کے معنی حق تلفی کے ہیں۔

اس تیسری عبارت میں جو بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ کہ قرض کے اصل مال پر جو زیادتی مشروط ہوتی تھی وہ اجل یعنی مدتِ قرض کا عوض اور بدل سمجھی جاتی تھی۔

دوسرے مفسر امام فخر الدین الرازیؒ نے اپنی عظیم المرتبت تفسیر مفاتیح الغیب میں جو کہ تفسیر الکبیر کے نام سے معروف ہے، ربٰو کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

اما الربٰو النسیئۃ فھو الامر الذی کان مشھورًا متعارفًا فی الجاھلیۃ وذٰلک انھم کانوا یدفعون المال علی ان یاخذوا کل شھر قدرًا معینًا ویکون رأس المال باقیًا، ثم اذا حل الدّین طالبوا المدیون برأس المال فان تعذر علیہ الاداء زادوا فی الحق والاجل فھٰذا ھو الربٰو الذی کانوا فی الجاھلیۃ یتعاملون۔ (تفسیر الکبیر ج ۷ ص ۹۱ سورۃ البقرہ)

(ترجمہ) "البتہ ربٰو النسیئۃ جو عہدِ جاہلیت میں مشہور اور متعارف تھی عملاً اس کی شکل اس طرح تھی کہ بعض لوگ اپنا مال دوسروں کو بطور قرض اس شرط پر دیتے کہ وہ ہر ماہ اپنے مقروض سے خاص مقدار میں کچھ مال بطور سود لیتے رہیں گے اور قرض کا اصل مال اپنی حالت پر باقی رہے گا پھر جب ادائیگی مقررہ وقت آتا تو وہ مقروض سے اصل مال کا مطالبہ کرتے پھر اگر اس کے لیے ادائیگی مشکل ہوتی تو اپنے حق اور قرض کی مہلت میں اضافہ کر دیتے، پس یہی وہ ربٰو تھی جس کا لوگ عہدِ جاہلیت میں لین دین اور کاروبار کرتے تھے۔"

اسی تفسیر میں ربٰو سے متعلق ایک اور عبارت کچھ اس طرح ہے :۔

کان الرجل فی الجاھلیۃ اذا کان لہٗ علی انسان مائۃ درھم الی الاجل فاذا جاء الاجل ولم یکن المدیون واجدًا لذٰلک قال زدنی فی المال حتی ازید فی الاجل فربما جعلہ مائتین۔ (تفسیر الکبیر ج ۹ ص ۲ سورۃ آل عمران آیت ۱۳۰)

(ترجمہ) "زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی کے کسی انسان پر ایک خاص وقت کیلئے ایک سو درہم قرض ہوتے پھر جب وہ وقت آتا اور مقروض کے پاس ادائیگی کیلئے مال نہ ہوتا تو وہ کہتا تم میرے حق میں اضافہ کردو تاکہ میں اجل کو زیادہ کر دوں پس بسا اوقات وہ سو درہم کے دو سو درہم کر دیتا۔"

مذکورہ عبارات میں اس کی تصریح ہے کہ عہدِ جاہلیت کی ربٰو جس کو قرآن مجید نے قطعی حرام بتلایا ہے اس کے اندر جو مرکزی تصوّر کار فرما تھا وہ یہ کہ مقرض یعنی قرض دینے والا مدتِ قرض کے بدلے قرض کے اصل مال پر کچھ زائد مال کا حقدار قرار پاتا ہے، قرآنِ کریم نے اس ربٰو کو حرام قرار دے کر اور یہ فرماکر کہ مقرض اپنے اصل مال پر جو کچھ بھی زائد لیتا ہے وہ اس کا حق نہیں ہوتا بلکہ مقروض کا حق ہوتا ہے، تصوّر مذکور کی نفی کر دی ہے، گویا یہ فرمایا کہ اجل اور مدتِ قرض کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مال کا بدل بن سکتی ہو اور جس کا کوئی معاوضہ لیا دیا جا سکتا ہو۔

یہاں تک ربٰو الجاہلی اور ربٰو النسیئۃ کی حقیقت و ماہیت اور اس کی شرعی حیثیت کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ جو کچھ لکھا اور عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں جب ہم اپنے زیرِ بحث معاملے کا تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ اپنی حقیقت و ماہیت، اپنے منشاء و مقاصد اور اپنے لازمی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربٰو النسیئۃ جیسا معاملہ ہے، وہ اس طرح کہ اس میں ایک شئے جس کی قیمت نقد سے بازار میں عام طور پر مثلاً ایک سو روپے ہوتی ہے جب ایک سال کے ادھار پر وہ ایک سو پچاس روپے میں بیچی جاتی ہے تو اس میں پچاس روپے کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک سال کی مدت و مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے، نیز جس طرح ربٰو النسیئۃ میں مقروض سے قرض کے اصل مال پر لیا جانے والا زائد مال بلا عوض ہوتا اور مقروض کی حق تلفی قرار پاتا ہے۔ اسی طرح زیرِ بحث معاملہ میں بیچی جانے والی شئے کی اصل قیمت پر ادھار کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے بیچنے والے کی طرف سے خریدار کے لیے اس کا کوئی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیچنے والا جو زائد لیتا ہے خریدار کا حق لیتا اور اس کی حق تلفی کرتا ہے، نیز جس طرح ربٰو النسیئۃ میں قرض دہندہ کا مقصد بغیر کسی دماغی و جسمانی محنت و مشقت کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ضمانت کے اپنے سرمائے اور تمول کو بڑھانا ہوتا ہے اسی طرح زیرِ بحث بیع المؤجل کے معاملہ میں فروخت کنندہ کا مقصد بغیر کسی پیداآور محنت اور عملی جدوجہد کے اور بغیر کسی نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری کے نفع کمانا اور اپنے سرمائے کو بڑھانا ہوتا ہے۔ پھر جس طرح ربٰو النسیئۃ کے معاشرے میں معاشی عدمِ توازن اور غیر فطری نشیب و فراز رونما ہوتا اور ملکی دولت چند اغنیاء اور سرمایہ داروں کے درمیان سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح زیرِ بحث معاملہ کے بھی عام رواج سے معاشرے میں ویسی ہی معاشی حالت پیدا ہوتی ہے غرضیکہ وہ تمام اخلاقی، معاشرتی اور معاشی برائیاں جو ربٰو النسیئۃ کے عملی رواج سے ظہور میں آتی اور معاشرے کے توازن کو بگاڑتی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام نے ربٰو النسیئۃ کو قطعی طور پر حرام اور ممنوع ٹھہرایا ہے، وہ سب زیرِ بحث بیع مؤجل کے معاملہ سے بھی لازماً ظہور میں آتی ہیں لہٰذا اصول قیاس کا تقاضا یہ

ہے کہ اس معاملہ کا بھی وہی شرعی حکم ہونا چاہیئے، جو معاملہ ربٰو النسیئۃ کا ہے یعنی حرام کیونکہ بنیادی طور پران کے درمیان کچھ فرق نہیں صرف لفظی فرق ہے جس کا عقود ومعاملات میں شرعًا کوئی لحاظ اور اعتبار نہیں ہوتا۔ الاعتبار فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والالمبا مسلّمہ قاعدہ کلیہ ہے ۔

قرآن مجید کی جس دوسری آیت سے معاملہ زیر بحث کی شرعی حیثیت پر روشنی پڑتی اور اس کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے وہ سورۃ النساء کی یہ آیت کریمہ ہے :۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ۔ (سورۃ النساء آیت ۲۹)

(ترجمہ) "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے اموال ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ وہ ایسی تجارت کا طریقہ ہو جس میں فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہو۔"

اس آیتِ کریمہ کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں باطل طریقہ سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی ممانعت ہے اور اِلَّا حرفِ استثناء کے بعد دوسرے حصہ میں ایسی تجارت کے طریقہ سے ایک دوسرے کا مال لینے کی اجازت ہے جس میں ہر فریق کی حقیقی اور دلی رضامندی پائی جاتی ہو۔ پہلے حصہ میں جو لفظ باطل ہے وہ حق کی ضد ہے، اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ناحق کیا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کرام نے باطل کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول پیش کیا ہے :۔

الباطل ھو کل ما یوخذ من الانسان بغیر عوض۔ (تفسیر الکبیر ج ۱۰ صـ۶۹ سورۃ النساء آیت ۳۰)

(ترجمہ) "ہر وہ مال لینا باطل ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض کے لیا جائے"۔

علامہ رشید الرضا باطل کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

امّا الباطل مالم یکن فی مقابلتہ شیٔ حقیقی۔ (تفسیر المنار صـ)

(ترجمہ) "باطل وہ ہے جو کسی حقیقی شے کے مقابلہ میں ہو یعنی اس کے بالمقابل کوئی حقیقی چیز نہ ہو"۔

لہٰذا آیت مذکورہ کے پہلے حصہ کا مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بغیر عوض کے نہ لو، یعنی معاوضے کے معاملات میں ایک دوسرے کا مال بغیر ایسے عوض کے نہ لو جو مالیت اور قدر و قیمت میں اس کے برابر ہو کیونکہ کسی مال کا صحیح عوض اور بدل صرف وہ ہوتا ہے جو قدر و قیمت میں اس مال کے برابر ہو، بنا بریں آیت کریمہ کے پہلے حصہ کی رُو سے ہر وہ معاشی معاملہ باطل اور ممنوع قرار پاتا ہے جس میں ایک فریق کے لیے اس کے مال کا سرے سے عوض موجود ہی نہ ہو یا عوض تو موجود ہو لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے اس مال کے مساوی نہ ہو۔ آیت کریمہ کے دوسرے حصہ

بیں معاوضے کے صرف اس معاملہ کو باطل سے مستثنیٰ اور جائز بتلایا گیا ہے جس میں ہر فریق کیلئے اس کی چیز کا بدل موجود ہوتا لہٰذا فریقین کی حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے، چونکہ تجارت یعنی بیع وشراء کا معاملہ ایسا ہی ہے اس میں بائع کو اپنی چیز کا عوض ثمن اور قیمت کی شکل میں اور مشتری کو اپنی چیز کا عوض خریدی ہوئی شئے یعنی مبیع کی شکل میں ملتا ہے۔ البتہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بائع مشتری کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی چیز اُس قیمت سے زائد پر بیچ دیتا ہے جو عام طور پر بازار میں اس چیز کی ہوتی ہے، یا بعض دفعہ مشتری بائع کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی چیز اُس قیمت سے کم پر خرید لیتا ہے جو بازار میں عام طور پر ہوتی ہے، لہٰذا بیع وشرائع کی ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہیں ہوتی اس وجہ سے کہ اس کے لیے اس کی چیز کا پورا اور صحیح عوض و بدل موجود نہیں ہوتا لہٰذا بیع وشراء کا ایسا معاملہ کسی ایک فریق کی حقیقی رضامندی موجود نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز وممنوع قرار پاتا ہے۔ جہاں تک ظاہری اور زبانی رضامندی کا تعلق ہے وہ تو معاملۂ ربٰو میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ربٰو کا معاملہ حرام وممنوع رہتا ہے، بلکہ حقیقت میں رضامندی کا خارجی اور معروضی معیار ہر فریق کے لیے اس کی چیز کا صحیح عوض وبدل موجود ہونا ہے، وہ موجود ہو تو اس کا مطلب رضامندی کا موجود ہونا ہے اور موجود نہ ہو تو اس کا مطلب رضامندی کا موجود نہ ہونا ہے۔

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کی تفسیر میں جو عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں معاملۂ زیر بحث کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ معاملہ باطل کا بھی مصداق نظر آتا ہے کیونکہ اس میں بیچنے والا ادھار کی وجہ سے اپنی سو روپے کی چیز جو ڈیڑھ سو میں بیچتا ہے تو اس میں خریدار سے جو پچاس روپے زائد لیتا ہے ان کا کوئی عوض اس کی طرف سے خریدار کے لیے موجود نہیں ہوتا لہٰذا وہ بغیر عوض کے دوسرے کا مال لیتا ہے جس کو آیت کے اندر باطل سے تعبیر کر کے ممنوع ٹھہرایا گیا ہے، نیز بیع وشرائع کا یہ ایسا معاملہ دکھائی دیتا ہے جس میں ایک فریق کے لیے اس کی چیز کا عوض موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کی رضامندی موجود نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ اس میں خریدار کے لیے مذکورہ بالا مثال کے مطابق پچاس روپے کا عوض موجود نہیں ہوتا جو قرض کی وجہ سے بیچنے والا خریدار سے لیتا ہے لہٰذا اس کی حقیقی رضامندی بھی موجود نہیں ہوتی لہٰذا اس پہلو سے بھی یہ معاملہ ناجائز اور ممنوع قرار پاتا ہے۔

زیر بحث معاملہ کی شرعی حیثیت سے متعلق جہاں تک احادیثِ نبویہ کا تعلق ہے تو متعدد احادیث سے بھی اس کا ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے، ان بکثرت احادیث سے بھی جن میں ربٰو کی سختی کے ساتھ مذمت اور ممانعت ہے، طوالت سے بچنے ہوئے میں ان کو یہاں نقل اور ذکر نہیں کر رہا، بیع عینہ کی ممانعت

سے متعلق جو احادیث ہیں ان سے بھی اس معاملے کا عدم جواز مفہوم و مستنبط ہوتا ہے البتہ یہاں میں اس حدیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں ربٰو النسیۃ کی حقیقت بیان فرمائی گئی ہے جو کہ حدیث کی بعض کتابوں میں ان الفاظ سے موجود ہے :-

عن علیؓ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل قرض جر منفعۃ فھو ربًا۔ (بلوغ المرام مترجم م ص۱۷۳ حدیث ۸۸۲)

(ترجمہ) "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربٰو ہے"

مطلب یہ کہ جو قرض، قرض دینے والے کیلئے قرض لینے والے کی طرف سے مالی منفعت کا سبب اور ذریعہ بنتا ہو وہ ربٰو ہے۔ اس حدیث کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ سند کے لحاظ سے اگرچہ ضعیف ہے، لیکن اس کے مضمون کی تائید چونکہ متعدد آثارِ صحابۂ کرامؓ سے ہوتی ہے لہٰذا اس کو ہمیشہ قابلِ اعتماد سمجھا گیا اور فقہاء کرام اس سے استدلال کرتے رہے ہیں، صحابۂ کرامؓ کے وہ آثار جن سے اس حدیث کو تقویت ملتی ہے سنن الکبریٰ للبیہقیؒ اور اعلاء السنن وغیرہ میں مذکور ہیں۔ ان آثار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ قرض دینے والا قرض کی وجہ سے اپنے مقروض سے کسی طرح کا کوئی مادی فائدہ اٹھائے اگرچہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، میں بغرض اختصار ان کو یہاں نقل نہیں کر رہا جو دیکھنا چاہے کتب مذکورہ میں دیکھ سکتا ہے۔ مولانا ظفر احمد تھانوی رحمہ اللہ نے ربٰو کے موضوع پر اپنے رسالہ کشف الدجیٰ میں ان کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ جو امداد الفتاویٰ میں بھی شامل ہے۔

بہر حال اس حدیث کی رُو سے بھی معاملہ زیر بحث ناجائز قرار پاتا ہے کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو شخص مثلاً ایک سو روپے کی چیز ادھار پر ڈیڑھ روپے میں فروخت کرتا ہے وہ پچاس روپے جو زائد لیتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قرض سے فائدہ اٹھاتا اور منفعت اندوز ہوتا ہے، اگر قرض نہ ہوتا تو نقد کی صورت میں اس کو اس چیز کے صرف سو روپے ملتے، پھر جب یہ معاملہ حدیث مذکور کے مطابق ربٰو کی تعریف میں آتا ہے تو اس کا بھی وہی شرعی حکم ہو سکتا ہے جو ربٰو و سُود کا ہے یعنی حرام و ناجائز ہونا۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس کی بناء پر پورے وثوق و یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر بحث معاملہ قرآن و حدیث کی رُو سے حرام اور ناجائز معاملہ ہے۔

اس کے بعد یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے بعض علماء کرام نے اپنی کتابوں میں بطور فتویٰ لکھا ہے کہ معاملہ مذکور شرعاً جائز معاملہ ہے یعنی شرعاً اس میں کچھ حرج نہیں کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زائد قیمت پر بیچی جائے، چنانچہ اسی فتوے کے پیش نظر بلا سود بینکاری کے لیے سود کے متبادل جو معاملات تجویز کیے گئے ہیں ان میں سے ایک معاملہ یہ بھی ہے گویا بینک کو اس کی اجازت دیدی گئی ہے کہ اس سے اگر کوئی شخص مشین وغیرہ خریدنے کے لیے قرضہ مانگے تو وہ اس کو سود پر نقد دینے کی بجائے اس سے یہ کہے کہ میں تیری مطلوبہ چیز خرید کر تم کو ایک سال کے ادھار پر دیدیتا ہوں اور ادھار کی وجہ سے مرابحہ کے نام پر اس کی اتنی قیمت لگائے جو بازار کی مروجہ قیمت سے کہیں زائد ہو، مثلاً یہ کہے کہ یہ چیز جو مجھے سو روپے میں پڑی ہے پچاس روپے کے نفع کے ساتھ بیچتا ہوں تم ایک سو پچاس روپے ایک سال کے بعد ادا کر دینا، مطلب یہ کہ اس طرح کے معاملہ کو بینک کیلئے جائز قرار دیا گیا ہے جو حقیقت میں اپنے مقصد اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربٰو کی طرح کا معاملہ ہے اگرچہ اس کو بیع مرابحہ اور بیع مؤجل کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ویسے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا بیع مرابحہ بھی شرعاً اُس وقت جائز ہے جب اس میں ربح و نفع کی مقدار بازار کے عام عرف و رواج کے مطابق ہو، اسی بیع مؤجل بھی شرعاً اُس وقت جائز ہے جب بیچی جانے والی چیز کی قیمت اُدھار میں بھی اتنی ہی ہو جتنی نقد کی صورت میں تھی۔

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات علماء کرام معاملہ زیر بحث کو شرعاً جائز سمجھتے اور کہتے ہیں ان کے وہ دلائل کیا ہیں جن کی بنا پر وہ ادھار کی چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کو جائز و درست مانتے ہیں لیکن اس بارے میں نہ میں اُن حضرات میں سے کسی کا اسم گرامی ذکر کروں گا اور نہ اس کتاب کا نام لکھوں گا جس میں کسی نے ایسا لکھا ہے بلکہ صرف وہ دلائل ذکر کروں گا جو ان حضرات نے اپنے مؤقف کے ثبوت میں پیش فرمائے ہیں اور فیصلہ اہل علم حضرات پر چھوڑ دوں گا جو استدلال اور استنباط کے مختلف طریقوں کا غیر معمولی علم و فہم رکھتے، صحیح اور غلط استدلال کے درمیان تمیز کر سکتے اور فیصلہ کرنے میں انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔

قارئین کرام یہ پڑھ کر حیران و متعجب ہوں گے کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں نہ تو قرآن مجید کی کوئی آیت پیش کرتے ہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث، نہ آثار صحابہؓ میں سے کوئی اثر، نہ ائمہ مجتہدین کا کوئی اجتہادی قول اور نہ مسلمہ قواعد فقہیہ میں سے کوئی قاعدہ پیش فرماتے ہیں بلکہ اس کے ثبوت میں بطور دلیل فقہ حنفی کی دو مشہور کتابوں مبسوط اور

ہدایہ کی ایک ایسی عبارت پیش کرتے ہیں جس سے کسی طرح بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنا خریدنا شریعتِ اسلامی کی رو سے جائز ہے۔ میں اُس عبارت کو پیش کرنے سے پہلے جس سے ان حضرات نے استدلال فرمایا ہے اُس سیاق وسباق کا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں وہ عبارت ذکر ہوئی ہے تاکہ حقیقتِ واقعہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

جس سیاق وسباق میں وہ عبارت واقع ہے اس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ فقہ حنفی کی مذکورہ بالا کتابوں میں جہاں بیع مرابحہ کی بحث ہے اس میں بیع المرابحہ کی فقہی تعریف، اس کی صحت کی شرائط اور اس کی مختلف شکلوں اور ان کے متعلق شرعی احکام کا بیان ہے۔ بیع مرابحہ کی تعریف جن الفاظ میں کی گئی ہے اردو زبان میں اس کا مطلب اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے بیع مرابحہ خرید وفروخت کا ایسا معاملہ ہے جس میں ایک شخص یہ کہہ کر اپنی کوئی چیز دُوسرے پر فروخت کرتا ہے کہ یہ چیز میں نے اتنے میں خریدی یا مجھے اتنے میں پڑی ہے اور اتنے نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں اور دوسرا اس پر اعتماد و بھروسہ کر کے وہ چیز خرید لیتا ہے گویا اس میں کوئی چیز اس کی قیمتِ خرید پر متعین نفع کے ساتھ بیچی خریدی جاتی ہے، چونکہ اس بیع میں سچائی اور دیانتداری بنیادی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اس کو بیع الامانۃ بھی کہا جاتا ہے، اس بیع کی صحت اور تکمیل کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ حقیقتاً جھوٹ اور خیانت موجود نہ ہو بلکہ اس کا شبہ بھی نہ پایا جاتا ہو، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ معاملہ طے پا جانے کے بعد اگر جھوٹ و خیانت کا شبہ ظاہر ہو جائے تو خریدار کو اس کے ردّ وقبول کا خیار ہوتا ہے یعنی چاہے تو اس کو برقرار رکھے اور چاہے تو ختم کر دے۔

بیع المرابحہ کی وہ شکلیں جن میں جھوٹ وخیانت کے شبہ کی بنا پر خریدار کو معاملہ طے ہو جانے کے بعد ردّ وقبول کا خیار ہوتا ہے ان میں سے ایک شکل جس کا امام محمد الشیبانیؒ نے اپنی کتاب جامع الصغیر میں ذکر کیا ہے، اس طرح ہے:۔

من اشترٰی غلامًا بالف درهم نسیئة فباعه بربح مائة درهم ولم يبين فعلم المشتري فان شاء ردّه وان شاء قبل۔ (جامع الصغیر ص ۳۴۸ باب فی المرابحۃ والتولیۃ)

(ترجمہ) "ایک شخص نے ایک غلام ایک ہزار درہم میں اُدھار پر خریدا اور پھر ایک سو درہم کے نفع پر اس کو فروخت کر دیا اور خریدار کو یہ نہیں بتلایا کہ میں نے ایک ہزار درہم میں اُدھار پر خریدا تھا، معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار کو اس کا علم ہوا تو ایسی صورت میں اس کو ردّ و قبول دونوں کا اختیار رہتا ہے۔"

جامع الصغیر میں امام محمد الشیبانیؒ نے عبارت مذکور کے بعد اس کی کوئی توجیہہ نہیں فرمائی کہ اس صورت میں خریدار کو معاملے کے رد کا کیوں اختیار ہوتا ہے؟ اس کی عقلی طور پر کیا وجہ ہے؟ لیکن بعد کے بعض حنفی فقہاء کرام نے مذکورہ جزیئے کو نقل کرنے کے بعد اس کی توجیہہ بھی لکھی ہے شمس الائمۃ السرخسیؒ نے اپنی کتاب المبسوط میں اس کے متعلق جو تحریر فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے"۔

قال رحمہ اللہ واذا اشتری شیئاً نسیئۃ فلیس لہ ان یبیعہ مرابحۃ حتی یتبین انہ اشتراہ نسیئۃ لان بیع المرابحۃ بیع الامانۃ تنفی عنہ کل تہمۃ وجنایۃ ویتحرز فیہ من کل کذب وفی معاریض الکلام شبہۃ فلا یجوز استعمالھا فی بیع المرابحۃ ثم الانسان فی العادۃ یشتری الشیٔ بالنسیئۃ باکثر مما یشتری بالنقد۔ (المبسوط ج ۱۳ ص ۷۸ باب المرابحۃ والتولیۃ)

اس عبارت کا وہ حصہ جو اس بحث کا مقصود ہے یہ ہے:۔

ثم الانسان فی العادۃ یشتری الشیٔ بالنسیئۃ باکثر مما یشتری بالنقد۔

(ترجمہ) پھر انسان عادۃً ادھار کی چیز اس قیمت سے زائد پر خرید لیتا ہے جو نقد کی صورت میں ہوتی ہے"۔

مطلب یہ کہ ادھار پر خریدی ہوئی چیز جب مرابحہ کے طور پر فروخت کی جائے تو امانتداری اور راست گوئی کا تقاضا یہ ہے کہ فروخت کرنے والا خریدار کو صاف بتلادے کہ یہ شے میں نے ادھار پر اتنے میں خریدی ہے اور اتنے نفع کے ساتھ فروخت کرتا ہوں، اور یہ بتا دینا اس لیے ضروری ہے کہ حاجتمند انسان جب کوئی شے ادھار پر خریدتا ہے تو عادتاً بمقابلہ نقد کے زیادہ قیمت پر خرید لیتا ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہ چیز بھی اس نے اپنی حاجتمندی اور ناداری کی وجہ سے زیادہ قیمت پر خرید لی ہو جو بصورت نقد بازار میں اس کی نہ ہو، اور اب چونکہ وہ نقد کی صورت میں فروخت کر رہا ہے ادھار کی صورت میں نہیں کر رہا لہٰذا اس پر لازم ہے کہ خریدار کو اس حقیقت سے آگاہ کردے، چنانچہ آگاہ ہو جانے کے بعد بھی اگر وہ اس کو مطلوبہ قیمت پر خرید لیتا ہے تو پھر اس کو طے شدہ معاملہ فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا بخلاف اس صورت کے کہ وہ خریدار کو اس سے آگاہ نہیں کرتا اور معاملہ طے پا جانے کے بعد اُسے اس کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس معاملے کو فسخ کر سکتا ہے۔

المبسوط کی مذکورہ عبارت میں جس انسان اور اسکی عادت کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ وہی ہو سکتا ہے جو کسی چیز کا حاجتمند ہو اور ناداری کی وجہ سے نقد پر نہ خرید سکتا ہو اور وہ چیز اس کو نقد کی قیمت پر بطور قرضِ حسنہ کے بھی نہ مل سکتی ہو۔ ایسا انسان اپنی حاجت براری کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ وہ ادھار دینے والے کی مرضی کے مطابق زیادہ قیمت پر خرید لے۔ اور لفظ عادت کا مطلب ہے کہ ایسا ہوتا ہے یہ مطلب نہیں کہ

ایسا لازماً اور دائماً ہوتا ہے، کیونکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قرض حسنہ کی اسلامی تعلیم پر عمل کرنے والے اور ربو کی ہر شکل سے بچنے اور اجتناب کرنے والے متقی مسلمان جب کسی حاجتمند انسان کو اس کی ضرورت کی چیز اُدھار پر دیتے ہیں تو اسی قیمت پر دیتے ہیں جو بصورت نقد بازار میں اس کی رائج ہوتی اُدھار کی وجہ سے زیادہ قیمت پر نہیں دیتے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مادی فائدہ کے بغیر کسی کو قرض نہیں دیتے اور اپنے معاشی معاملات میں اسلامی اصول و احکام اور حلال و حرام کا خیال نہیں رکھتے، اسی لیے ایسے لوگوں کا رویہ اور طرز عمل شریعت اسلامی کی رو سے جائز و درست نہیں ہوتا۔ شمس الائمہ السرخسیؒ کی مذکورہ عبارت میں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ ان کے نزدیک لوگوں کی مذکورہ عادت شرعاً جائز و درست عادت ہے، رہا یہ سوال کہ پھر انھوں نے اس کو ناجائز کیوں نہیں لکھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ان کا مقصد اس عادت کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا نہیں بلکہ ان کا اصل مقصد بیع المرابحہ کی ایک خاص شکل سے متعلق امام محمدؒ کے مذکورہ قول کی توجیہ کرنا ہے جو عادت مذکور کے ناجائز ہونے کی شکل میں بھی ہو جاتی ہے۔

مبسوط کی مذکورہ عبارت کے بعد اب میں صاحب الہدایہ علامہ المرغینانیؒ کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جس سے زیر بحث معاملے کے جواز کے لیے استدلال فرمایا گیا ہے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:-

قال من اشترى غلاماً بالف درهم نسيئة فباعه بربح مائة ولم يبين، فعلم المشترى فان شاء ردّه وان شاء قبل لان للاجل شبها بالمبيع الا يرى انه يزداد فى الثمن لاجل الاجل والشبهة فى هذا ملحقة بالحقيقة فصار كانه اشترى شيئين و باع احدهما مرابحة بثمنهما۔ (هداية اخيرين ص ۵۷، ۵۸ باب المرابحة والتولية)

(ترجمہ) "امام محمدؒ نے کہا جس نے ایک ہزار درہم کے بدلے ایک غلام ادھار پر خریدا اور پھر مرابحہ کے طور پر ایک سو درہم کے نفع پر اس کو بیچ ڈالا اور خریدار کو نہیں بتلایا کہ میں نے یہ ادھار پر خریدا تھا بعد میں خریدار کو اس کا علم ہوا، پس اب اگر وہ چاہے تو اس کو رد کر دے اور چاہے تو اس کو قبول کر سکتا ہے کیونکہ اجل یعنی قرض کی مہلت اور مدت بیچی جانے والی چیز سے کچھ مشابہت رکھتی ہے کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کیا جاتا ہے اور چونکہ مرابحت کے باب میں شبہ مبیع کو حقیقت مبیع سے ملحق کر دیا گیا ہے لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ گویا بیچنے والے نے جس قیمت میں دو چیزیں خریدی تھیں یعنی غلام اور اجل، اس قیمت پر ان میں سے ایک یعنی غلام کو بیچ دیا۔"

اس عبارت میں مقصودِ بحث اس کا وہ حصہ ہے جس میں صاحب ہدایہ نے امام محمدؒ کے قول مذکور کی توجیہ بیش فرمائی ہے یعنی مرابحہ کی مذکورہ شکل میں معاملہ طے پاجانے کے بعد خریدار کو معاملہ فسخ کرنے کا جو اختیار حاصل ہوتا ہے، عقلی طور پر اسکی وجہ کیا ہے، وہ وجہ صاحب ہدایہ کے نزدیک مرابحہ کی اس شکل میں شبہ خیانت کا پایا جانا ہے جس سے بیع مرابحہ کو پاک ہونا چاہیئے کیونکہ بیع المرابحہ بیع الامانۃ ہے اور شبہ خیانت کی جو وضاحت انہوں نے فرمائی ہے وہ یہ کہ جو شخص ادھار پر کوئی چیز خریدتا ہے اس کے متعلق گو یقین نہ سہی لیکن یہ شبہ ضرور ہوسکتا ہے کہ اس نے جس قیمت میں وہ چیز خریدی ہے وہ قیمت تنہا اس چیز کی نہ ہو بلکہ ادھار کی جو اجل اور مہلت ہے اس کی بھی ہو کیونکہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ادھار کی مہلت اور مدت کی وجہ سے فروخت کی جانے والی چیز کی قیمت بڑھا دیتے ہیں، لہٰذا ادھار پر خریدی ہوئی ہر چیز کے متعلق یہ شبہ ضرور ہوسکتا ہے کہ اسکی جو قیمت ہے وہ تنہا اس کی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ اجل اور مہلت ادھار کی بھی ہو بنا بریں جو شخص نقد کی صورت میں بھی اس شئے کی وہی قیمت وصول کرتا ہے جو ادھار کی صورت میں اس شئے کی تھی تو گویا وہ دو چیزوں کی قیمت ایک چیز سے وصول کرتا ہے کیونکہ نقد کی صورت میں اجل نہیں ہوتی صرف چیز ہوتی ہے لہٰذا وہ ایک طرح کی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے جو مرابحہ کے معاملہ میں عیب ہے اور چونکہ مبیع میں عیب ظاہر ہونے کی صورت میں خریدار کو رد و قبول کا خیار ہوتا ہے لہٰذا بیع المرابحہ کی اس شکل میں بھی خریدار کو رد و قبول کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

اس توجیہ کے ضمن میں علامہ مرغینانیؒ نے اپنی اس بات کی تائید میں کہ اجل مبیع سے کچھ مشابہ ہے فرمایا الاتری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اجل یعنی ادھار کی مدت کی وجہ سے شئے کی قیمت بڑھا دی جاتی ہے، اس سے بعض اہل علم حضرات نے یہ مطلب نکالا ہے کہ ادھار کی چیز کی قیمت بمقابلہ نقد کے بڑھا دینا شریعت اسلامی کی رو سے جائز ہے، حالانکہ عبارت مذکورہ سے یہ مطلب بالکل نہیں نکلتا۔ اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے بلحاظ واقعہ بالکل درست ہے کہ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں یعنی ادھار کی چیز کی قیمت زیادہ کر دیتے ہیں لیکن ان کا ایسا کرنا قرآن و حدیث کی رو سے جائز ہوتا ہے یا ناجائز؟ عبارت مذکورہ کے کسی لفظ سے اس کا اظہار نہیں ہوتا اسلئے کہ صاحب ھدایہ کا مقصد یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اجل کی مبیع سے کچھ مشابہت یا اجل کے مبیع ہونے کا شبہ ہے کیونکہ کچھ لوگ اجل کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرتے ہیں، یہاں ان کا مقصد اس کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا اور یہ بتلانا نہیں کہ ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ یہی وجہ ہے کہ ہدایہ کے شارحین نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں لکھا فتح القدیر، بنایۃ، غایۃ اور کفایۃ وغیرہ کو دیکھ لیجئے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اجل کیوجہ سے شئے کے ثمن میں اضافہ کرنا جائز ہے۔ اسی طرح کسی کا اس کو ناجائز نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں پر مقصد اس کے جواز و عدم جواز سے بحث کرنا ہے ہی نہیں، نیز جو معاملہ بدیہی طور پر

ناجائز ہو اس کو ناجائز لکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بہرحال کسی معاملے کے جائز یا ناجائز ہونے کا اصل معیار قرآن وحدیث اور ان کے اصول و احکام ہیں، چنانچہ جو معاملہ ان کے مطابق ہو وہ جائز اور جو مطابق نہ ہو بلکہ خلاف ہو وہ ناجائز قرار پاتا ہے۔ لوگوں کا اس کو کرنا یا نہ کرنا اس کے جواز وعدم جواز کا کوئی معیار نہیں ورنہ شریعت ایک کھلونا بن کر رہ جائے گی۔

علاوہ ازیں اگر مذکورہ عبارت یعنی یزاد فی الثمن لاجل الاجل سے یہ مفہوم ہے کہ اجل یعنی مہلت قرض کسی ثمن وقیمت کا عوض و بدل بن سکتی ہے تو تین سطروں کے بعد خود صاحب ہدایہ نے واضح الفاظ سے اس کی نفی کردی ہے، فرمایا "وان استهلكه ثم علم لزمه بالف ومائة لان الاجل لا يقابله شئ من الثمن" اور اگر مذکورہ مثال میں خریدار نے خریدنے کے بعد غلام کو ہلاک یا فروخت کر دیا یعنی اس کے ہاتھ میں نہ رہا اور پھر اس کو یہ علم ہوا کہ وہ ایک غلام ایک ہزار درہم میں ادھار پر خریدا گیا تھا اور ایک سو درہم منافع کے ساتھ مجھ پر فروخت کیا گیا تو اب وہ فروخت کرنے والے سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا اور اس کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جو گیارہ سو روپے آپ کو دیئے ہیں ان میں جو اجل کا عوض تھے وہ مجھے واپس کر دو کیونکہ اجل ایک ایسی چیز ہے جس کے مقابلہ میں کوئی ثمن نہیں ہو سکتا۔ "لان الاجل لا يقابله شئ من الثمن" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اجل اور مہلت ادھار کے بالمقابل کوئی مال لینا دینا جائز نہیں۔ اور چونکہ ہمارے زیر بحث معاملہ میں بصورت ادھار نقد کے مقابلہ میں جو زائد قیمت لگائی جاتی ہے وہ اجل اور مدت ادھار کی وجہ سے لگائی جاتی ہے، لہٰذا ھدایہ کی اس دوسری عبارت سے الٹا اس معاملے کا ناجائز ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ المبسوط اور الہدایہ کی جن عبارات سے معاملہ زیر بحث کے جواز کے لیے استدلال کیا گیا ہے، اگر کچھ بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ استدلال بے جان نظر آتا ہے اور ان عبارات سے کسی طرح اس معاملے کا جواز نہیں نکلتا جبکہ اس کے مقابلہ میں عدم جواز کے دلائل قرآن وحدیث سے تعلق رکھتے اور مضبوط و مستحکم دلائل ہیں جو قدرے تفصیل کے ساتھ پہلے عرض کیے گئے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس مسئلہ پر از سر نو پڑھیں اور غور وفکر کریں گے اور پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ اس معاملے کی شرعی حیثیت کا تعین فرمائیں گے

جواب از

حضرت العلامہ مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مدظلہ کلاچی

استفتاء:۔ بخدمت گرامی استاذ محترم حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مدظلہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! گذارش یہ ہے کہ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک بابت رجب ۱۴۱۲ھ بمطابق دسمبر ۱۹۹۱ء میں حضرت مولانا طاسین صاحب کا ایک مضمون آیا ہے جس میں انہوں نے بیع نقد اور نسیہ میں قیمت کے فرق کو ناجائز قرار دیا ہے اور حرام تک سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ ہمارے اکابرین اسے جائز قرار دیتے رہے ہیں، جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ امدادیہ میں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امداد المفتین میں، حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہ نے احسن الفتاویٰ میں اور مفتی کل ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ کفایت المفتی میں ہے۔
ان سب حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے ـــــ آپ صحیح صورتحال سے مطلع فرمائیں کہ ان دونوں باتوں میں تعارض ہے یا نہیں؛ اگر ہے تو کس کو صحیح سمجھا جائے اور پوچھنے والوں کو کیا بتلایا جائے ـــــ اگر اجازت ہو تو آپ کا جواب تطبیق یا ترجیح کا الحق کو بھیج دوں ـــــ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ الحق بھی مولانا طاسین صاحب کی رائے کی تائید میں ہے کیونکہ اس نے بلا کسی نکیر کے اس کو شائع کیا ہے۔

حافظ عبدالقیوم حقانی خطیب جامع مسجد لوہاراں کلاچی ۲۸ رجب ۱۴۱۲ھ

الجواب:۔ دونوں فتوؤں میں تعارض ظاہر ہے ـــــ اکابر علماء مذکورین فی السوال کے فتویٰ کو غلط سمجھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، حضرت مولانا طاسین صاحب کا مضمون الحق میں ادھورا ہے بیثاق میں غالباً پورا ہے، اور مجھے کسی صاحب نے اُن کے مضمون کا عکس (فوٹوسٹیٹ) بھی بھیجا ہے۔ مولانا نے اپنے مضمون میں دو باتیں فرمائی ہیں میں مختصراً ان پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ جواز کا فتویٰ دینے والوں کے پاس دلیل ہدایہ اور مبسوط کی یہ عبارت ہے الاتری انہ یزاد الثمن لاجل الاجل، آپ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ

معاملہ جائز بھی ہے انہوں نے مرابحہ کی بحث میں صرف لوگوں کی عادت کا ذکر کر دیا ہے اس کو جائز کہنے کی بات نہیں کی ــــ دوسری بات یہ کہ جائز کہنے والوں کے پاس قرآن وسنت کی کوئی دلیل تو کیا کسی مجتہد کا قول بھی نہیں۔

اس ناکارہ کے ناتمام مطالعہ کے مطابق حضرت مولانا کی یہ دونوں باتیں محلِ نظر ہیں آپ کا یہ فرمانا کہ علامہ سرخسیؒ نے صرف لوگوں کی عادت کا ذکر کیا ہے خود اسے جائز نہیں فرمایا، اس کے لیے ناظرین کو علامہ سرخسی رحمہ اللہ کی مبسوط جلد ۱۳ ص ۸ ملاحظہ فرما لینا چاہیئے، عبارت یہ ہے:-

واذا عقد العقد علیٰ انہٗ الی اجل کذا بکذا وبالنقد بکذا او قال الی شھرٍ بکذا والی شھرین بکذا او ھو فاسد لانہٗ لم یعاملہ علیٰ ثمنٍ معلومٍ ولنھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن شرطین فی بیع وھٰذا ھو تفسیر الشرطین فی بیعٍ۔

(ترجمہ) "جب عقد اس طرح کیا جائے کہ اجل پر قیمت اتنی ہے اور نقد پر اتنی یا ایک مہینہ کا اجل ہو تو قیمت اتنی اور دو ماہ کا اجل ہو تو قیمت اتنی، تو یہ عقد فاسد ہوگا اور فاسد اسلئے ہوگا کہ معاملہ میں ثمن معلوم نہ ہوسکا تردد میں چھیڑ دیا، اور اس لیے بھی فاسد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں شرطین سے منع فرمایا ہے اور شرطین فی بیع کے یہی معنی ہیں، (یعنی ثمن یا مبیعہ میں تردد)"۔

آپ نے دیکھا کہ اس صورت کے فساد کی وجہ علامہ سرخسیؒ نے تردد فی الثمن کو کہا ہے جو اصولِ بیع کے بھی خلاف ہے اور نصِ صریح کے بھی۔ علامہ سرخسیؒ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ صورت چونکہ ربٰو النسیئۃ میں داخل ہے اس لیے فاسد ہے ــــ اس پر بھی اگر اطمینان نہیں تو علامہ سرخسیؒ کی اس عبارت کے ساتھ متصل یہ صریح عبارت بھی پڑھ لیجئے، آپ فرماتے ہیں:-

وھٰذا اذا افترقا علیٰ ھٰذا فان کان یتراضیان بینھما ولم یتفرقا حتّٰی قاطعہ علیٰ ثمنٍ معلومٍ واتمّا العقد فھو جائز لانھما ما افترقا الا بعد تمام شرط صحۃ العقد۔

(ترجمہ) "یعنی فساد اس صورت کا اس وقت ہے کہ جب بائع اور مشتری اسی متردد انہ حالت میں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں، لیکن اگر وہ دونوں راضی ہو گئے اور جدا ہونے سے پہلے پہلے ثمن معلوم کر لیا اور عقد کو اتمام تک پہنچا دیا (یعنی ایک ہی صورت اجل والی یا نقد والی متعین کر لی) تو پھر یہ عقد جائز ہے کیونکہ اب بائع اور مشتری صحتِ عقد کی شرط کو پورا کر کے آپس میں جدا ہو گئے ہیں"۔

تو ایسی صورت میں نہ تو بیع کے عام اصول کی خلاف ورزی ہوئی کہ نہ ثمن مجہول ہے اور نہ مبیع

اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کی خلاف ورزی ہوئی کیونکہ شرطین فی بیع کے معنی علامہ سرخسیؒ نے یہی بیان فرمائے کہ ثمن وغیرہ میں یہ تردد ہو یا یہ یا وہ، جیسا کہ انہوں نے فرمایا وھذا ھو الشرطین فی بیع۔ اب آپ خود ہی فرمائیں کہ مولانا کی اس تاویل میں کتنی جان ہے کہ علامہ سرخسیؒ نے لوگوں کی عادت کا ذکر کیا ہے کہ جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

دوسری بات کہ مجوزین کے پاس کسی مجتہد کا قول بھی نہیں ہے (اس سے اتنا تو بہرحال معلوم ہوا کہ حضرت مولانا کے نزدیک غیر مجتہد کے لیے (جیسے کہ ہم سب ہیں) مجتہد کا قول بھی دلیل شرعی ہے) تو اس کے لیے کتاب الاصل المعروف بالمبسوط کا صفحہ ۱۹ جلد ۵ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ واضح رہے کہ کتاب کی لوح پر یہ عبارت درج ہے اور جس میں غالباً کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔

كتاب الاصل المعروف بالمبسوط

للامام الحافظ المجتهد الربانی ابی عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی رحمہ اللہ تعالیٰ

آپؒ فرماتے ہیں: واذا باع الرجل بيعاً فقال هو بالنسيئة بكذا او بالنقد بكذا كذا او قال الى اجل كذا بكذا۔ وكذا افا فترقا على هذا فانه لايجوز بلغنا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه نهى عن شرطين فى بيع قال محمدؒ حدثنا بذلك ابوحنيفةؒ رفعه الى النبىّ صلى الله عليه وسلم۔ "یعنی جب کوئی اس طرح بیع کرے کہ قرض پر اتنی قیمت ہے اور نقد پر اتنی یا ایک ماہ کی مدت پر اس کی قیمت یہ ہے اور دو ماہ کی مہلت پر قیمت وہ ہے اور پھر تردد کی حالت میں بائع اور مشتری ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع میں شرطین سے منع فرمایا ہے، یعنی ثمن وغیرہ کا تردد، جیسا کہ شرح سرخسیؒ میں پہلے گذر چکا ہے۔"

کتاب الاصل کی یہ عبارت اس لیے نقل کی گئی ہے تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو کہ زیر بحث صورت کو جائز کہنے والوں کے پاس کسی مجتہد کا قول ہے یا نہیں۔ باقی رہے وہ بہت سے دلائل اور کثیر عبارتیں جو آپ نے اپنے مضمون میں تحریر فرمائی ہیں تو ان کی تفصیل میں گئے بغیر اتنا عرض ہے کہ مولانا کے خیال میں زیر بحث صورت ربوٰ بالنسیئہ میں داخل ہے اور مجوزین کے نزدیک جن میں صاحب ھدایہ اور صاحب مبسوط (سرخسیؒ) اور خود مجتہد ربانی امام محمد شیبانیؒ شامل ہیں، یہ صورت ربوٰ النسیئہ میں داخل نہیں ہے ورنہ اس کے عدم جواز کو صورت تردد تک محدود نہ رکھتے اور تعیین صورت یا نقد یا نسیہ پر جواز کا فتویٰ نہ دیتے اور صاف فرما دیتے کہ یہ صورت ربوٰ النسیئہ کی ہے اس لیے حرام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اجل ایک وصف ہے اور وصف کا نہ کوئی عوض لیا جا سکتا ہے نہ دیا جا سکتا ہے

لیکن وصف مرغوب کی وجہ سے قیمت بڑھ سکتی ہے اور نامرغوب کی وجہ سے قیمت گھٹ جاتی ہے۔ دیکھئے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام اصول بتادیا کہ جیّدھا وردیھا سواءٌ۔ جیّد اور ردّی کا مقابلہ ہو بھی تو
برابر برابر لینا ہوگا جودت کے عوض زیادتی نہ دے سکتے ہو نہ لے سکتے ہو۔ بہترین کھجور کے ایک سیر کے
بدلہ میں معمولی کھجور کے دو سیر دینے سے منع فرمادیا کیونکہ اس میں سیر کے بدلے سیر آجاتا اور دوسرا
سیر وصف جودت کے عوض میں لیا جاتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔ لیکن خود ہی حیلہ کی یہ صورت بتلادی کہ
ردّی کھجور کو کم قیمت پر بیچ ڈالو۔ بجائے ایک سیر کے دو سیر فروخت کردو اور پھر بہتر کھجور کو زیادہ قیمت
سے لے لو۔ تو کیا بہترین کھجور کی قیمت کا اضافہ اس وصف مرغوب کی وجہ سے نہیں ہوا۔ اس عقلی اور
فطری بات کا انکار آخر کون کرسکتا ہے کہ مرغوب چیز کی قیمت بمقابلہ نامرغوب کے زیادہ ہوگی، اسکے
باوجود یہ صورت جائز نہیں کہ ایک سیر بہتر کھجور کے بدلہ میں معمولی کھجور کا ایک سیر تو سیر کے مقابلہ میں ہو
اور دوسرا سیر جودت کے مقابلہ میں ہو، اور اسی طرح یہ بھی ناجائز ہے کہ بہتر کھجور والے کو معمولی کھجور کا ایک سیر
اور مثلاً ایک روپیہ بھی ساتھ دیدیا جائے کیونکہ اس صورت میں یہ روپیہ یا دوسرا سیر وصف کے عوض
ثابت ہوگا اور وصف کا عوض لینا جائز نہیں حالانکہ بہتر کھجور کو عام کھجوروں کے نرخ سے زیادہ قیمت
پر خریدنا بالکل جائز ہے حالانکہ یہاں بھی قیمت کی زیادتی وصف کی وجہ سے ہے نہ کہ کسی اور وجہ سے
یہی معاملہ ہے اجل کا بھی ـــ کہ نفس اجل کا عوض لینا ناجائز ہے لیکن بوجہ اجل کے قیمت کا بڑھ جانا فطری
اور عقلی بات ہے اور شریعت نے اس کو منع نہیں فرمایا، جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصف
کے متعلق فرمایا کہ بہتر کھجور کو زیادہ قیمت سے خرید لیا کرو۔ اسی کو فقہاء اسلام نے فرمایا ان الاجل
لایقابلہ الثمن اور وان الثمن یزاد لاجل الاجل۔ نفس اجل پر عوض لینے کی وہی صورت ہے جو
آپ کی عبارات میں بھی ہے اور جس کو ربٰو النسیۃ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ عقد ہوا اس پر کہ ایک ماہ کے
بعد اس مبیعہ کا ایک روپیہ دے دو اور جب مشتری نے ایک ماہ کے بعد روپیہ نہیں دیا تو بائع نے
کہا کہ چلو دوسری پہلی پر دے دو لیکن چار آنے بڑھا کر، تو یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ اجل ہی کو بیچا
گیا۔ لیکن اجل ایک وصف مرغوب ہے کہ مشتری کو فوری رقم نہیں دینی پڑتی اور آسانی سے اپنا کام
چلالیتا ہے، ہاں جنس اور قدر ایک ہونے کی صورت میں اس آسانی سے کام چلانے کا اعتبار نہیں کیونکہ
اموال ربویہ ہیں اور نص کے خلاف اس لیے اس کی قیمت بڑھ گئی جیسے جید کھجور کی قیمت بوجہ جودت کے
بڑھ گئی ـــ حالانکہ صرف جودت کا عوض نہ اپنی جنس سے دیا جاسکتا ہے نہ غیر جنس سے، جیسا کہ
پہلے عرض کرچکا ہوں۔

بہر حال فقہاء کرام حتیٰ کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زیر بحث صورت ربٰو النسیئۃ میں داخل نہیں بلکہ اس مسئلہ میں اب مولانا (طالبین صاحب) کے ہمخیال حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مرحوم کا اسی مسئلہ پر ایک مضمون جنوری کے "حکمت قرآن" میں چھپ چکا ہے جس میں انہوں نے بہت سی وہی عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے جو کہ مولانا کے مضمون میں ہیں کہ سود سے اس بیع مؤجل کا فرق دو وجوں سے ہے کہ یہ دین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی سے ثمن جنگا بتلا دینا ہے نیز مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ پھر آگے دیکھا کہ یہ زیر بحث صورت اگرچہ عین ربٰو تو نہیں مگر یہاں بھی ذہنیت وہی سود خوارانہ ہے، پھر کہتے ہیں کہ یہ مقصد اور مفاسد کے لحاظ سے ایک حرام حیلہ ہے یا اگر نرم الفاظ استعمال کئے جائیں تو مکروہ اور شریعت اسلامی کے اصل مزاج کے خلاف ایک حیلہ ہے۔ (اگر حضرت مفتی صاحب مرحوم بقید حیات ہوتے تو ان سے اسلام کے اصل مزاج اور غیر اصل مزاج کا فرق دریافت کیا جاتا) بہر حال مفتی صاحب کے نزدیک بھی ان عبارات سے مسئلہ زیر بحث یقینی طور پر ثابت نہیں کیونکہ ربٰو النسیئۃ اور اس صورت میں دو وجوں سے فرق ہے، ربٰو النسیئۃ عین سود ہے جبکہ یہ عین سود نہیں اس کو حرام کہنے کی بجائے مکروہ کہنے کی گنجائش ہے۔

باقی رہی مولانا کی یہ جذباتی بات کہ اس سے مجبور لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ تو گذارش یہ ہے کہ اگر ضروریات زندگی کی بنیادی چیزیں مثلاً اشیاء خورد و نوش، علاج و ادویات کی چیزیں ستر پوشی کا عام لباس حتیٰ کہ جانوروں کا چارہ اور گھاس وغیرہ کمیاب ہونے کی وجہ سے مہنگے داموں بیچی جائیں تو وہ یقیناً حرام اور عذاب الٰہی کا باعث ہے۔ مگر اس میں نہ تو مؤجل اور معجل کا فرق ہے، اگر نقد کی صورت میں ایسا کرے تو بھی کبیرہ گناہ اور اجل کی صورت میں ایسا کرے تو بھی عذاب الٰہی کا مستحق، اور نہ بایں معنیٰ کہ وہ بیع ہی نہیں ہوتی، بیع ہو گئی، طے شدہ دام دینے پڑیں گے ہاں بوقت ضرورت حکومت تسعیر سے کام لے سکتی ہے اور اس کی مخالفت پر تعزیر کا حق بھی رکھتی ہے۔ مگر اس سے زیر بحث مسئلہ کو مطلقاً حرام اور سود کہنا یا بار بار قطعی حرام کہنا مناسب نہیں، اس سے یا تو تمام فقہاء مجوزین اور ان کے متبعین کی تجہیل لازم آتی ہے یا تفسیق، جو کسی طرح بھی اخلاف صالحین کے شایان شان نہیں، تجہیل اس لیے کہ یہ روایات اور عبارات عام معروف ہیں اور یقیناً مولانا صاحب کے پیش نظر ہوں گی اور تفسیق اس صورت میں کہ جان بوجھ کر ان سے چشم پوشی کی اور لوگوں کو غلط راستہ پر ڈالا اگر اخلاف اسی طرح بیبا کی سے اسلاف کو بدنام کرتے رہے تو نفاذ اسلام و شریعت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہا۔ والامر بید اللہ۔ علاوہ ازیں یہ کاروبار، قرض پر مال خریدنا ہمیشہ مجبوری سے ہی نہیں ہوتا

بلکہ زیادہ تر صورتیں ایسی ہیں کہ کاروباری لوگ اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے ایسا کرتے ہیں تو ایسے میں ظاہر ہے کہ گناہ بھی نہیں، اسی طرح وہ اشیاء جو صرف عیاشی کے لیے خریدی جاتی ہیں یا زیادہ سہولت کے لیے ان کو گراں قیمت پر دینے میں بھی کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی ۔ فقط واللہ اعلم

الحق کو بھیجنے میں کوئی حرج نہیں، باقی ان کا خیال تو ان کو ہی معلوم ہوگا، شاید تکمیل مضمون کے بعد کوئی تائید یا ترمیم و تردید لکھیں ۔ بہتر ہے کہ "حکمت قرآن" لاہور کو بھی بھیجدیا جائے کیونکہ انہوں نے اس موضوع پر مختلف مقالات شائع کرنے کی پیشکش کی ہے ۔

جواب از

مولانا مفتی غلام الرحمٰن صاحب مدظلہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

یہ مضمون درحقیقت حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ کے اس مضمون کا تجزیہ اور تفصیلی تجزیہ ہے جو مجلہ "الحق" کی جلد ۲۷ کے شمارہ ۳/۴ میں "ادھار چیز زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا ۔ قبل ازیں حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم کا وقیع مضمون بھی "الحق" کے حوالہ سے بطور جواب قارئین کرام کی نذر سے گذرا ہوگا جس میں کافی حد تک زیر بحث مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

اول الذکر مضمون نگار کی اسلامی اور جدید معاشیات پر عمیق نظر اور متعلقہ فن میں وافر معلومات رکھنے سے کسی کو انکار نہیں، موصوف کا ملک کی ان چند گنتی چنی شخصیات میں شمار ہوتا ہے، جن کو اہل نظر جدید معاشی نظام میں اسلامی نظام معیشت کا وکیل سمجھتے ہیں ۔ آپ کی علمی کاوشیں "مجلس علمی" میں ادبی اور ریسرچ و تحقیق کے میدان میں مسلم ہیں، بایں ہمہ ممکن ہے کہ موصوف کی زیر بحث مسئلہ میں رائے وقتی مصلحت یا مروجہ حالات و واقعات سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے موزوں ہو لیکن شرعی نقطہ نظر سے موصوف کے اٹھائے ہوئے نکات قابل توجہ ہی نہیں بلکہ محل نظر بھی ہیں ۔ موصوف کی رائے کہ "ادھار کی صورت میں قیمت کی زیادتی حرام اور ناجائز ہے"، کے تجزیہ سے قبل ہم قرآن و حدیث کے حوالہ سے مسئلہ کا ایک طائرانہ مطالعہ کر کے داخلی اور خارجی قرائن کی رو سے اس کا جائزہ لیں گے لیکن اس سے قبل مسئلہ کا اجمالی تعارف بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ قارئین کرام کسی الجھن اور غلط فہمی کے شکار نہ ہوں ۔

قدیم معاشرہ کے مطالعہ سے قطع نظر موجودہ معاشرہ کی ۹۸ فیصد آبادی ایسے معاشی مسائل میں

جکڑی ہوتی ہے کہ کوئی شخص اپنی ضرورت کی کسی چیز کو یکمشت نقد خرید نے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی آمدنی اور قوتِ برداشت کو مدنظر رکھ کر ماہانہ یا سالانہ قسط وار خریدنے پر تیار ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ بائع نقد گاہک یعنی یکمشت زرِ بیع ملنے کی صورت میں ادھار پر فروخت کرنے کے لیے بہت کم آمادہ ہوگا (معاملات میں تقوٰی اور دیانتداری کی بات اگرچہ اس سے الگ ہے) کیونکہ اُدھار کی صورت میں اس کی مالی منفعت لازمی طور پر متاثر ہوگی، اس لیے بائع کو اُدھار پر آمادہ کرنے کے لیے قیمتِ فروخت میں نقد کی نسبت سے کچھ زیادتی رکھی جاتی ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر نقد کی حالت میں اس چیز کی قیمت کھلی مارکیٹ میں ایک سو روپے ہو تو ادھار کی وجہ سے اس کی قیمت ایک سو بیس روپے تک پہنچ جاتی ہے، اب بائع کا ادھار کی وجہ سے قیمت میں بیس روپے کا اضافہ وصول کرنے یا مُشتری کے ایسے معاملہ کے ارتکاب کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ میرے ناقص خیال میں دوسرے عام فہم مسائل کی طرح اس کا جواب بھی نہایت آسان الفاظ میں دیا جاسکتا ہے لیکن موصوف کے علمی وتحقیقی مزاج اور باریک بینی نے اس کو ایک نظری اور پیچیدہ مسئلہ بنا دیا۔

آسان اور سہل ہونے سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہم پاکستان میں اٹھانوے فیصد فقہ حنفی کے مقلد ہیں، شاید ملک کے طول وعرض میں "تبحّر فی العلم" والے حضرات بہت کم تعداد میں ہوں لیکن مجتہدین فی الشرع، فی المذہب، فی المسائل کے رُتبہ تک پہنچنے والے تو درکنار اصحاب التخریج اور اصحاب الترجیح کے پایہ کا بھی کوئی شخص نظر نہیں آتا، ایسے علمی انحطاط کے حوالے سے ہمیں سیدنا امام ابوحنیفہؒ یا ان کے مذہب کے مسلّمہ قواعد وضوابط کی رُو سے مسلک کے ذیلی مجتہدین میں سے کسی ایک کے فرمودات پر اعتماد کرتے ہوئے اصل مراجع یعنی آیتِ قرآنی یا حدیث کے مطالبہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ایسے نازک مرحلہ پر طبقہ ثالثہ کے سرخیل علامہ سرخسیؒ یا طبقہ خامسہ کے نامور فقیہ صاحبِ ہدایہ (علامہ مرغینانیؒ) کے قول پر بغیر کسی تاویل اور دلیل وحُجّت کے اعتماد کرنا ہمارا فریضۂ منصبی میں سے ہے۔

قدیم فقہی ذخائر میں کسی واضح جزئیہ کے مُیسّر ہونے کے باوجود اصل مراجع یعنی قرآن وحدیث سے کسی دلیل کا مطالبہ کرنا درحقیقت مجتہدین کا کام ہے، اس لیے موصوف کا یہ تمہیدی بیان اکابرِ اُمت کی رائے سے موافقت نہیں رکھتا کہ:۔

"کسی معاملہ کے شرعی جواز وعدم جواز کے متعلق صرف اتنا کافی نہیں کہ فقہ وفتاوٰی کی فلاں کتاب میں فلاں فقیہ نے اس کو جائز یا ناجائز کہا اور لکھا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث کی اُس نص اور دلیل کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس کی بناء پر اُس

فقیہ نے ایسا کہا اور لکھا ہے"۔ (ماہنامہ الحق ج ۲۷ شمارہ ۳ ص۲۱)

مقلد کی ذمہ داری

میرے خیال میں مقلد کو تسلیم و رضا کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ورنہ شاید ایسے بے موقع لب کشائی سے اپنے مذہب و مسلک پر بدگمانی کا شکار ہو کر اس سے ہاتھ دھونا نہ پڑیں۔ بارہویں صدی کے نامور فقیہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ اصول افتاء کے ضمن میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

فاقول ان ھذا الشرط (اعنی لایحل ان یفتی بقولنا حتی یعلم من این قلنا) کان فی زمانھم اما فی زماننا فیکتفی با لحفظ کما فی القنیۃ وغیرھا فیحل الافتاء بقول بل یجب وان لم من این قال۔ (شرح عقود رسم المفتی ص۲۷ فلیس الا القول بالتفصیل)

(ترجمہ) "میرے خیال میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کہ "ہمارے قول پر اس وقت تک فتویٰ دینا جائز نہیں جب تک اصل مرجع معلوم نہ ہو" کا اشتراط ان کے اپنے دور میں تھا ہمارے وقت میں محض مذہب کی جزئیات پر فتویٰ دینا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے اگرچہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ امام نے کس دلیل کی روشنی میں یہ بات کہی ہے"۔

مقلدین کو دلیل کا مطالبہ کرنا مقلدین کا کام نہیں بلکہ مجتہدین کا کام ہے، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں:۔

ولاشک ان ھذا خاص بالمفتی المجتھد دون المقلد المحض فان التقلید ھو الاخذ بغیر معرفۃ دلیل۔ (شرح عقود رسم المفتی ص۲۷ فلیس الا القول بالتفصیل)

(ترجمہ) "اس میں کوئی شک نہیں کہ دلیل کا مطالبہ کرنا مجتہد کا کام ہے اور مقلد کے لئے تو بغیر دلیل کے مطالبہ کرتے کے صرف جزئیہ پر عمل کرنے سے اور کوئی چارہ نہیں"۔

دلیل کے مطالبہ کی حقیقت

کیونکہ دلیل کا یہ مطلب نہیں کہ متعلقہ مسئلہ میں صرف قرآن حکیم کی آیت یا حدیث کا اجمالی تذکرہ ہو اور نہ ایسے شخص کے شکوک و شبہات کے ازالہ کے لیے اجمالی علم کارآمد ہے جو ابتداء ہی سے فقہی اقوال پر قناعت کا نظریہ نہ رکھتا ہو بلکہ دلیل کا مطالبہ کرتے وقت اس میں مذہب و مسلک کے قواعد و ضوابط کی رُو سے طریقہ استدلال اور پھر داخلی و خارجی قرائن کے حوالہ سے پرکھنے کی صلاحیت ضروری ہے اور متعلقہ مسلک کے جملہ مسائل پر علم بھی ضروری ہے تاکہ سیاق و سباق کے حوالہ سے مسئلہ پر پورا علم رکھے، ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی علمی بصیرت اس معیار پر پہنچی ہوئی ہو تو تقلید کی جگہ یہ خود

مجتہد بننے کا حقدار ہے پھر اس کو تقلید کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی، جیسا کہ علامہ موصوفؒ مزید فرماتے ہیں :۔

لان معرفة الدليل انما تكون للمجتهد لتوقفها على معرفة سلامته من المعارض وهي متوقفة على استقراء الادلة كلها ولا يقدر على ذلك الا المجتهد اما مجرد معرفة ان المجتهد الفلانی اخذ الحكم الفلانی من الدليل الفلانی فلا فائدة فيها۔ (شرح عقود رسم المفتی ص۲۴ فليس الا القول بالتفصيل)

(ترجمہ) "دلیل کی پہچان مجتہد کا وظیفہ ہے کیونکہ اس کے لیے دلیل کے معارضہ سے محفوظ ہونے کا علم ضروری ہے جس کے لیے جملہ دلائل کا استقرا ضروری ہے اور اس پر مجتہد کے سوا اور کوئی قادر نہیں تاہم محض یہ جاننا کہ فلاں امام نے فلاں دلیل سے یہ حکم لیا ہے کسی خاص فائدہ کا حامل نہیں"۔

ہم تو مقلد ہیں اور ہمارے لیے علامہ مرغینانیؒ یا علامہ سرخسیؒ کا جزئیہ تو درکنار بلکہ محض حضرت تھانویؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کی رائے بھی حرفِ آخر ہے، تقلید کے حوالہ سے ہم ان ائمہ کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہوئے اصل مراجع کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن یہاں زیر بحث مسئلہ میں مولانا محترم اور آپ کے ہمنوا حضرات کی تسلی کے لیے اپنے طالبعلمانہ مطالعہ کے حوالہ سے چند حوالہ جات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ قارئین پر واضح ہو کہ فقہاء کا یہ مسئلہ ان کی ذاتی اختراع یا عندیہ نہیں بلکہ اس کی تائید میں منصوص واقعات، آیت اور حدیث بطور استناد کے موجود ہیں۔

زیر نظر مسئلہ میں قیمت میں زیادتی کی حقیقت

اس کی پوری حقیقت تو انشاء اللہ آئندہ صفحات میں موصوف کے مضمون کے تجزیہ کے بعد واضح ہو جائے گی کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں یہ تفاوت کیا ادھار کا عوض ہے یا ادھار کی وجہ سے ہے، دونوں کا دائرہ کار کیا ہے؟ اور دونوں کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے؟ تاکہ منصوص حرام وناجائز کاروبار "ربوٰ النسیئۃ" سے اس کا فرق ہو سکے۔ سردست ہم یہ مقدمہ رکھ کر دلائل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں کہ زیر نظر مسئلہ میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں یہ تفاوت ادھار کا معاوضہ نہیں، حقیقت میں ایسا کبھی نہیں کہ زر بیع میں کچھ قیمت مبیعہ کی ہے اور کچھ قیمت اس اجل کی ہے تاکہ بوقتِ ضرورت کوئی ایک دوسرے سے الگ ہو سکے بلکہ معاشرتی اور واقعاتی نظائر و حالات کو مدنظر رکھ نقد میں ادھار کی نسبت منافع، فوائد اور دوسری خوبیوں کی فراوانی کی وجہ سے

کچھ زیادتی آتی ہے"ہم آسانی کے لیے اسے یوں تعبیر کرسکتے ہیں کہ"ان الزیادۃ ھھنا لاجل الاجل لا لعوض الاجل"۔ یعنی"یہاں پر زیادتی ادھار کی وجہ سے ہے ادھار کے عوض میں نہیں"۔
قرآن وحدیث میں اس کے متعدد نظائر پائے جاتے ہیں جس میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آتی ہے بلکہ صحابۂ کرامؓ کے بعض واقعات عملی طور پر اس کے شاہد ہیں۔

قرآن سے استدلال

قرآن مجید کی"آیت المداینہ" پر سوچ وفکر کرنے سے شاید اس حقیقت شناسی کے لیے مواد مل سکے کہ اجل کی وجہ سے قیمت میں تفاوت جائز ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے:

"خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے مقررہ مدت تک کیے ہوئے عقدِ سَلَم کے معاملہ کو اپنی کتاب میں یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۔۔۔) کی رُو سے حلال قرار دے کر اجازت دی ہے"۔ (تفسیر المظہری جلد ۱ ص ۴۱۴ سورۃ البقرہ)

اور حضرت ابن عمرؓ بھی فرماتے ہیں:

لا بأس بالطعام الموصوف بسعر معلوم الی اجل معلوم۔ (بخاری شریف ج ۱ ص ۳)

(ترجمہ)"مقررہ مدت تک مقررہ نرخ پر معلوم غلہ کے کاروبار میں کوئی حرج نہیں"۔

معلوم ہوا کہ آیت مداینہ بنیادی طور پر"عقد سَلَم"کے بارے میں ہے اور عقد سلم کی تعریف علماء نے یوں کی ہے:"بیع اجل بعاجل"۔ (فتح القدیر جلد ۶ ص ۲۰۴ باب السّلَم)

اس اجمال کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی مشتری مقررہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے مثلاً کسی شخص کو ایک ہزار روپے دیکر یہ معاہدہ کرے کہ یہ رقم پیشگی وصول کرکے فلاں وقت مجھے گندم اس نرخ کے اعتبار سے دینے کے پابند رہوگے اور بائع بھی مقررہ شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے رقم وصول کرکے معاہدہ قبول کرے تو اسے"عقد سلم" کہا جاتا ہے۔ خیر القرون کے دور سے لیکر آج تک بغیر کسی انکار کے یہ معاملات جائز اور مشروع ہیں۔"عقد سلم" کی ماہیت پر غور وخوض کرنے کے بعد یہ حقیقت کسی پر مخفی نہیں کہ مشتری وقتی طور پر یکمشت زرِ سلم کی ادائیگی پر تیار رہو کر مہینوں تک مبیعہ کی وصولی کے لیے انتظار کس جذبہ کے تحت کرتا ہے؟ کیا اس کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی کا کوئی حسین جذبہ کارفرما ہے؟ کبھی نہیں! اگر خیر خواہی کا جذبہ ہوتا تو قرضۂ حسنہ کی صورت میں بائع سے اس آڑے وقت میں تعاون کا ہاتھ بڑھادیتا، متعدد شرائط کی رعایت کرکے پیشگی رقم دیکر مہینوں تک مبیعہ کی وصولی کا

انتظار کرنے سے بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بارگراں کے تحمل کے عوض اس کو مقررہ وقت پر مبیعہ ارزاں قیمت پر میسر ہو کیونکہ عقدِ سلم میں مبیعہ بازار کی قیمت سے بائع کو عموماً سستا پڑتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ عقدِ سلم کی مشروعیت میں اس فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

انما ابیح علیٰ خلاف القیاس رفع حاجۃ الفقیر حالا عن نفقۃ عیاله القادر علی المسلم فیه مالا وحاجۃ المشتری الی الاستبیاح لعیاله وهو بالسلم اسهل اذ یکون المبیع فی المسلم نازلا عن قیمته فی البیع غالبا۔ (التفسیر المظہری ج۔۱ ص۴۲۱ سورۃ البقرہ)

(ترجمہ) "عقدِ سلم خلاف القیاس ہونے کے باوجود اس وجہ سے جائز قرار دیا کہ اس میں بائع اپنی خستہ حالی میں بچوں کے لیے خرچہ کا بندوبست کر کے مستقبل میں اسکی ادائیگی پر قادر ہو کر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جبکہ مشتری کو سلم میں فائدہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ عموماً عقدِ سلم میں قیمت مروجہ قیمت سے ارزاں ہوتی ہے۔"

معلوم ہوا کہ عقدِ سلم میں زرِ بیع کی پیشگی ادائیگی اور مبیعہ کی تاخیر سے قیمت کی مارکیٹ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی، عقدِ سلم میں ادھار یعنی نسیہ لازمی شرط ہے، اگر اس میں ادھار نہ ہو تو سلم کی حقیقت ختم ہو جائے گی، لہٰذا جب بیع عاجل بعاجل میں نسیہ اور ادھار کی وجہ سے قیمت میں تفاوت کا آنا ممنوع نہیں، سود کے زمرہ میں نہیں آتا تو زیرِ نظر معاملہ یعنی ادھار میں جو بیع عاجل بعاجل کی مخصوص صورت میں قیمت کا تفاوت کیوں ممنوع قرار دیا جا رہا ہے، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عقدِ سلم خلاف القیاس وارد ہو کر اس پر دوسرا معاملہ قیاس نہیں کیا جاتا کیونکہ عقدِ سلم غیر موجود مبیعہ کی فروخت کے جواز کی حیثیت سے خلاف القیاس ہے نہ ہم اس پر کوئی قیاس کرتے ہیں بلکہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نقد اور ادھار میں مبیعہ یا ثمن کا متاثر ہو کر کمی یا زیادتی کا آنا مشروع معاملہ ہے ربٰو بالنسیہ کے زمرہ میں نہیں آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عملی واقعہ سے استدلال

نسیہ کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آنے کے جواز کی نشاندہی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا تعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی سے ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں "باب شراء النبیؐ بالنسیئۃ" کے عنوان سے باب باندھ کر یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی طور پر نقد کی طرح بعض اوقات ادھار پر بھی ضروریاتِ زندگی خریدیں، اس باب میں امام بخاریؒ نے اس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت لائی ہے جس میں

آپ فرماتی ہیں :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اشتری طعاماً من یہودی الی اجل ورھنہ درعا من حدید ۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۴۱ باب الرھن عند الیھود وغیرھم)

(ترجمہ) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے کچھ غلہ ادھار پر خریدا اور اپنا لوہے کا بنا ہوا ایک درع اس کے پاس رہن میں رکھا۔"

امام بخاریؒ نے یہ روایت متعدد بار مختلف مسائل میں نقل کی ہے، اس لیے نسیہ پر معاملہ کا جواز ناقابلِ انکار حقیقت ہے ۔ موصوف بھی اپنے مقالہ کی ابتدا میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

"جہاں تک اُدھار و قرض پر کوئی چیز بیچنے اور خریدنے کا تعلق ہے قرآن و حدیث کی رُو سے قطعی طور پر جائز ہے، اس کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیت مداینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث پیش کر دینا کافی ہیں جن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسروں سے ادھار پر ضرورت کی چیزیں لینے کا واضح بیان ہے اور یہ بھی کہ بعض ادائیگی کے وقت آپؐ نے بہتر طور پر ادائیگی فرمائی۔" (ماہنامہ الحق جلد ۲۷ شمارہ ۳ ص ۲۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جیسے دوسرے معاملات کے مطالعہ سے قطع نظر ہم یہودی سے مذکورہ معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں، ایک متعصب دشمنِ اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اور پھر اس کے بعد روزمرہ ضرورت آنے والی چیز "درع" کو رہن کرنے کے پسِ پردہ واقعات کے جائزہ سے جو صورت سامنے آتی ہے اس میں زیرِ نظر مسئلہ کے جواز کے لیے قوی مستدل موجود ہے ۔ اس پسِ پردہ حقیقت کے جاننے کے لیے ہمیں اس واقعہ کا مطالعہ مدینہ منورہ کے معاشی حالات کو مدِنظر رکھ کر کرنا ہوگا ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ میں جب کسی چیز کی مانگ زیادہ ہو تو اس کا گاہک بھی زیادہ ہوتا ہے اور جب خریدار زیادہ ہوں تو اس چیز کے بدلنے کے مواقع وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، ایسے وقت میں بائع ادھار کی نسبت سے نقد کو زیادہ ترجیح دیتا ہے الا یہ کہ ادھار میں اگر کہیں مالی منفعت بہ نسبت نقد کے زیادہ ہو تو پھر وہ صوابدید پر فیصلہ کرتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاملہ کے وقت مدینہ منورہ کی معاشی حالت کے حوالہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت مدینہ منورہ میں غلہ کی بہت زیادہ ضرورت تھی، عموماً لوگوں کو بیرونی قافلوں کے آنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا اور جب کسی قافلہ کے آنے کی خوشخبری سنائی جاتی تو بسا اوقات فاقہ زدہ معاشرہ کی حالت غیر ہو جاتی

اور اپنی جان کی خبر تک نہ رہتی، چنانچہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضؓ کو تجارتی قافلہ آنے کی خبر اس وقت ملی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو صحابہ کرامؓ کثیر تعداد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلے چھوڑ کر قافلہ کی طرف دوڑ پڑے جس پر سورۃ الجمعہ کی آخری آیتیں نازل ہوئیں۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت مدینہ منورہ میں خرید و فروخت کی مارکیٹ پر یہودی چھائے ہوئے تھے وہ قافلہ والوں سے غلہ خرید کر بعد میں من مانی قیمت پر فروخت کرتے تھے ان کو نقد کا گاہک ایسی ضرورت کی اشیاء میں لازمی طور پر میسر تھا، یہ لوگ نقد کی نسبت ادھار کو ترجیح کسی شوق کی وجہ سے نہیں دیتے تھے بلکہ مالی منفعت کی خاطر یہ لوگ ادھار کا معاملہ کرتے تھے، ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادھار کے معاملہ سے غالب گمان یہ ہے کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں قیمت کا تفاوت لازمی طور پر اختیار کیا گیا ہو گا ورنہ نقد کے گاہک ملنے کے باوجود یہودی کو ادھار کا معاملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مالی منفعت اور زیادہ قیمت کی وصولی کے سوا یہودی کے اس اقدام کے لیے اور کوئی دوسرا محرک نظر نہیں آتا۔

اس میں اس کا احتمال بھی نہیں کہ یہودی نے کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محض احسان کے جذبہ سے حسنِ سلوک کر کے محض نقد کی قیمت پر بطور ادھار دیا ہو کیونکہ لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا کے صریح ہونے کے باوجود یہودیوں جیسی متعصب قوم سے مسلمانوں کے ساتھ اور خاص کر حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر خواہی، حسن سلوک اور مواسات کے جذبات کی توقع کرنا بے سود ہے۔ بلکہ حدیث میں و رھنہ درعہ کے الفاظ سے بھی خیر خواہی کے جذبہ کی تردید ہو رہی ہے، آخر کار جب ہمدردی مقصود تھی آپؐ سے توثیق کے لیے رہن کا مطالبہ کیوں کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی درعہ بطور رہن رکھنے کے لیے کیسے تیار ہوئے جو آپؐ کی مجاہدانہ زندگی کی روزمرہ ضرورت تھی۔

یہ ایسے امور ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں نسیہ کی صورت میں نقد کی نسبت سے قیمت زیادہ رکھی گئی ہو۔

خیر القرون میں زیرِ بحث مسئلہ کا عملی ثبوت

مذکورہ شہادات کے علاوہ صحابہ کرامؓ کی زندگی میں بھی ہمیں ایسا واضح، غیر مبہم اور

ٹھوس ثبوت ملتا ہے جس سے مسئلہ کی شرعی حیثیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے جواز میں صحابۂ کرامؓ کے دور میں کوئی اختلاف نہیں تھا اور صحابۂ کرامؓ خود ایسے معاملات کرتے تھے، سیدہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت زید بن ارقمؓ کے واقعہ میں اس کی صریح دلیل موجود ہے۔ امام احمدؒ روایت میں کچھ اضافہ بھی ہے، لیکن صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ نے جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سیدنا امام ابو حنیفہؒ کے واسطہ سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

ان امرأۃ قالت لعائشۃؓ ان زید بن ارقم باعنی جاریتہ بثمانمائۃ درھم ثم اشتراھا منی فقالت ابلغیہ عنی ان اللہ قد ابطل جھادہ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لم یتب۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۷ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے عرض کی کہ زید بن ارقمؓ نے مجھ پر ایک لونڈی آٹھ سو درہم میں فروخت کر کے دوبارہ چھ سو درہم میں خریدی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا میری طرف سے زید بن ارقمؓ کو یہ پیغام پہنچاؤ کہ اگر اس نے اپنے اس کئے ہوئے کام سے توبہ نہ کی تو اللہ تعالے اس کا وہ جہاد ضائع کر دے گا جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں کیا ہے"۔

اگرچہ اس روایت میں نقد اور نسیہ (ادھار) کا کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن مسند احمد کی روایت میں اس پر یہ اضافہ آیا ہے:-

انی بعث من زید غلاما بثمانمائۃ درھم نسیئۃ واشتریتہ بستمائۃ نقدا۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۷ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "کہ میں نے اس سے آٹھ سو درہم ادھار پر غلام خرید کر چھ سو درہم نقد پر دوبارہ اس پر فروخت کیا ہے"۔

اس روایت کو دیکھ کر کسی کے ذہن میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہنا چاہیئے، کیونکہ زید بن ارقمؓ کے اس معاملہ میں نقد کی قیمت اگر چھ سو درہم ہے تو ادھار کی قیمت آٹھ سو درہم مقرر کی جا رہی ہے۔

شاید اس پر کسی کو شبہ ہو، ممکن ہے کہ یہ حضرت زید بن ارقمؓ کا انفرادی عمل ہو اور دوسرے صحابہؓ آپؓ سے اتفاق نہ رکھتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس پر مطلع ہو کر بہت سخت الفاظ میں پیغام بھیجا کہ اگر اس نے اپنے کیے ہوئے کام سے رجوع نہ کیا تو اس کا جہاد جیسا مبارک عمل بھی ضائع ہو جائے گا، گویا آپ نے یہ اقدام گناہ کبیرہ سمجھ کر دوسرے اعمال کے لیے مبطل قرار دیا۔

لیکن یہ شبہ بے بنیاد ہے کیونکہ یہاں پر حضرت زید بن ارقمؓ کے اس معاملہ میں دو چیزیں ہیں پہلی چیز یہ ہے کہ نقد اور اُدھار کی قیمت میں آپ نے تفاوت رکھا، دوسری چیز یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے فروخت کیے ہوئے غلام یا لونڈی کو دوبارہ کم قیمت پر قبل نقد الثمن خرید کر بظاہر سُودی معاملہ کا ارتکاب کیا، حضرت عائشہؓ کے انکار کا تعلق اول الذکر مسئلہ سے نہیں بلکہ اتنی شدت سے انکار آپ نے دوسرے معاملہ کو مدنظر رکھ کر کیا، آپ نے اسے ربٰو کی ایک ذیلی شکل قرار دے کر اس پر ربٰو کی آیت تلاوت کی، پھر ربٰو کا تعلق بھی اوّل معاملہ سے نہیں تھا یعنی نسیہ میں اس چیز کی قیمت آٹھ سو روپے مقرر کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی، اگر صرف یہ عقد ہوتا تو اس پر انکار کی گنجائش نہ رہتی لیکن دوسرے معاملہ میں کہ اپنی ہی فروخت کی ہوئی چیز کو قبل نقد الثمن کم قیمت پر خریدنے میں سُودی عناصر نظر آرہے تھے اس لیے آپ نے انکار کیا اور پہلا معاملہ بھی اس اعتبار سے درست نہ رہا کہ دوسرے حرام معاملہ کی پوری عمارت اس پر مبنی ہوئی تھی، اس لیے حضرت عائشہؓ نے دونوں پر انکار کر کے فرمایا کہ بُری ہے وہ چیز جو تو نے خریدی اور فروخت کی، علامہ جلال الدین الخوارزمیؒ اس تفرقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

وانما ذمت البیع الاول وان کان جائزا عندها لانها صارت ذریعة الی البیع الثانی هو موسوم بالفساد - (الکفایة علی الهدایة - فتح القدیر ج ۶ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "آپ نے پہلی بیع کی مذمت بھی کی حالانکہ یہ آپ کے ہاں بھی جائز معاملہ تھا کیونکہ یہ دوسرے ناجائز اور فاسد عقد کے لیے ذریعہ تھا۔"

یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں "بئس ما اشتریت واشتریت" بُری ہے وہ چیز جو تو نے خریدی اور فروخت کی"۔ عقد ثانی با اعتبار وجود مؤخر ہونے کے باوجود آپ نے ذم کرتے ہوئے پہلے ذکر کیا کیونکہ بنیادی طور پر اس کی مذمت مقصود تھی۔

حضرت زید بن ارقمؓ کے اس تفاوت پر اقدام اور حضرت عائشہؓ کا اس تفاوت پر خاموشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادھار کے معاملہ میں قیمت کا تفاوت خیر القرون کے معاشرہ میں بھی مروج تھا اس پر کوئی انکار نہیں کر رہے تھے اور نہ کسی نے اس کو "ربٰو النسیئة" میں شمار کیا۔

مختلف الجنس اشیاء کے تبادلہ میں تفاضل حقیقی و حکمی دونوں جائز ہیں

ازروئے شرع خرید و فروخت کا معاملہ عاقدین کی باہمی رضامندی پر مشتمل ہے لیکن اموال ربویہ میں ان پر چند پابندیاں عائد کی گئی ہیں "اشیاء ستہ" کا حدیث

سے جہاں دوسرے ائمہ نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق علّت نکال کر ربو کی شکلیں متعین کیں تو احناف نے "جنس وقدر" کی علّت نکالی، اس لیے جہاں کہیں دونوں علّتیں پائی جاتی ہیں وہاں پر احناف نے تفاضل حقیقی اور تفاضل حکمی (نسیہ) دونوں حرام قرار دیں، مثلاً اگر کوئی شخص دوسرے پر گندم کے عوض گندم فروخت کرتا ہے تو ایک من کے بدلہ میں جیسا کہ دو من خریدنا حرام ہے، ایسا ہی تفاضل حکمی (کہ ایک چیز وصول کرکے دوسرے کی وصولی کے لیے مہلت دی جائے) بھی حرام ہے اور اگر کہیں جنس و قدر میں سے کوئی ایک علّت پائی جائے تو وہاں پر تفاضل حکمی تو حرام ہے لیکن تفاضل حقیقی میں کوئی حرج نہیں اسلئے کہ ایک من گندم کے عوض دو من مکئی لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس میں نسیہ حرام ہے، اور جہاں کہیں جنس وقدر دونوں نہ ہوں تو مختلف الجنس اشیاء میں "واذا اختلف الجنسان فبیعوا کیف شئتم" کی رو سے تفاضل حقیقی اور حکمی دونوں حلال ہیں۔

زیرِ نظر معاملہ میں ثمن اور مبیعہ دونوں مختلف جنس ہیں جن کے درمیان قدر بھی مشترک نہیں اس لیے تفاضل میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیئے، تاہم نسیہ اور نقد کے مابین تفاوت کا اعتبار کرنا عقد کی تکمیل کے بعد ثانوی امور ہیں جن کا عقد کے قوام سے کوئی تعلق نہیں۔

نقد و نسیہ کی قیمت میں تفاوت کا جواز ائمہ کا اختلافی مسئلہ ہے

ائمہ کرام کے درمیان زیرِ نظر مسئلہ میں اتفاق ہونے کی نشاندہی ایک دوسرے مسئلہ سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت زید بن ارقمؓ کی سابقہ روایت پیش کی جاتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص اگر کوئی چیز نسیہ اور ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے اور پھر بغیر کسی ثمن کی ادائیگی کے دوبارہ اپنی فروخت کی ہوئی چیز بغیر کسی ثالث کے حائل ہونے کے نقد پر کم قیمت سے خریدے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ثالث کے حائل نہ ہونے کے بغیر بھی یہ عقد جائز ہے لیکن احناف کے نزدیک ثالث کے حائل ہونے کے بغیر یہ عقد ناجائز ہے تاہم اگر درمیان میں ثالث آجائے اور فروخت کرتے وقت نسیہ کی وجہ سے اس کی قیمت پانچسو روپے رکھی گئی تھی لیکن دوبارہ بائع نے نقد رقم دے کر اپنی فروخت کی ہوئی چیز کم قیمت یعنی چارسو روپے پر خریدی تو پھر شوافع کی طرح احناف کے نزدیک بھی جائز ہے ایسا ہی ثمن کی وصولی کے بعد جواز اتفاقی ہے۔ علامہ کمال ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

وقید بقوله قبل نقد الثمن لان ما بعده یجوز بالاجماع

باقل الثمن - (فتح القدیر ج ۶ ص۶۸ باب البیع الفاسد)

(ترجمہ) "ثمن کی ادائیگی سے قبل مسئلہ کی تقیید سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر معاملہ بعد نقد الثمن کا ہو تو پھر بالاتفاق جائز ہے۔"

اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اصل قیمت کی زیادت میں جیسا کہ نقد میں زیادتی کا احتمال ہے تو "حالة او نسیئة" کے عموم سے نسیہ کا بھی احتمال ہے تو نسیہ میں زیادہ قیمت مقرر کرکے بعد میں کم قیمت نقد پر خرید نے سے ہمارے مؤقف کی تائید ہوتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ مقالہ نگار کے انداز بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیر نظر مسئلہ فقہ حنفی میں شاید صرف ان دو کتابوں تک محدود ہے لیکن حقیقت میں یوں نہیں ہے بلکہ فقہ حنفی کی اکثر کتابوں میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ نے یہ مسئلہ علاؤ الدین الحصکفیؒ کی عبارت کی شرح میں "رد المحتار علی الدر المختار" جلد ۴ ص۱۵۸ پر، اور ابن نجیم المصریؒ نے البحر الرائق جلد ۶ ص۱۱۴ پر یہ مسئلہ ذکر کیا ہے، اگرچہ اکثر فقہاء نے جو علت بیان کی ہے وہ ایک نظر آتی ہے لیکن میرے خیال میں فقہ حنفی کی اہم کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس میں یہ مسئلہ نہ ہو۔ لیکن محض فقہی ذخائر سے عبارات کا نقل کرنا موصوف کے نزدیک کسی خاص فائدہ کا حامل نہیں اس لیے عبارات کے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ زیر نظر مسئلہ کے عدم جواز کے بارے میں کسی ایک کتاب میں بھی کوئی صریح جزئیہ نہیں ملتا، اس لیے موصوف کو اپنے مؤقف کے اثبات کے لیے دوسرے جزئیات کا سہارا لینا پڑا، اگر یہ کہیں ناجائز ہوتا تو اتنے ضخیم فقہی ذخائر میں کہیں نہ کہیں اس پر تصریح ضرور ہوتی۔

موصوف کے مقالہ کا جائزہ یہاں تک اصل مسئلہ کے جواز کے بارے میں بات ہو رہی تھی ابھی ہم ذرا آگے قدم بڑھاتے ہوئے موصوف کے ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جن کی وجہ سے موجودہ معاملہ ناجائز اور حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ دو قسطوں پر مشتمل مقالہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عدم جواز کا نظریہ تین باتوں پر مبنی ہے:۔

(۱) ربٰوا النسیۃ: آپ کے نزدیک زیر نظر مسئلہ "ربٰوا النسیۃ" کی ایک ذیلی قسم ہے، کبریٰ تو مسلمات دین میں سے ہے کہ قرآن و حدیث کی رو سے ربٰو کی جملہ قسمیں حرام ہیں، اس لیے یہ معاملہ بھی حرام ہے ظاہر بات ہے کہ کبریٰ کے تسلیم ہونے کی وجہ سے اس پر بحث کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن صغریٰ

ایک نظری مسئلہ ہونے کی وجہ سے کافی غور وخوض کا محتاج تھا اس لیے موصوف نے اس پر بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے، چنانچہ پہلی قسط کا ۴/۲ سے زائد حصہ اس پر مشتمل ہے، موصوف فرماتے ہیں :-

"غرضیکہ قرآن کریم نے ربٰوا النسیئۃ کی جن مروجہ شکلوں کو حرام قرار دیا ان میں ایک شکل ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلہ میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شکل بھی تھی جس کا اظہار مندرجہ ذیل روایات سے ہوتا ہے جن کو مفسرین کرام نے تحریم ربٰو کی آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے"۔ (الحق ج ۲۷ ش ۳ صـ۲۳)

آپ نے ربٰوا النسیئۃ کی حقیقت زید بن اسلمؓ، مجاہدؒ، سعید بن جبیرؓ، قتادہؓ، اور عطاء بن ابی رباح جیسے بلند پایہ اکابرین کے حوالہ سے نقل کرکے یہ کوشش کی ہے کہ یہی حقیقت ربٰو زیر نظر مسئلہ میں بھی کارفرما ہے۔ پھر مزید وضاحت کے لیے آپ نے ابوبکر الجصاصؒ اور امام فخرالدین رازیؒ کے اقوال کا سہارا بھی لیا ہے جن میں ربٰوا النسیئۃ کی حقیقت بیان ہوتی ہے، اس خیال کو مزید تقویت دیتے ہوئے موصوف نے ان اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جو سود کی وجہ سے معاشرہ پر پڑتے ہیں، آپ کے خیال میں یہی زیر نظر معاملہ کے بھی اثرات ہیں۔

(۲) بیع باطل: موصوف نے جس دوسری حقیقت پر زیر نظر مسئلہ کے عدم جواز کی عمارت قائم کرنے کی کوشش کی ہے وہ بیع باطل کی تعریف ہے، آپ حضرت ابن عباسؓ، حضرت حسن بصریؒ اور علامہ رشید رضا کے حوالہ سے بیع باطل کی حقیقت بیان کرتے ہوئے بعد ازاں مروجہ معاملہ پر یہی حقیقت منطبق کرکے فرماتے ہیں :-

"آیت مذکورہ کی تفسیر میں جو عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں معاملہ زیر بحث کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ معاملہ باطل کا بھی مصداق نظر آتا ہے"۔

(الحق ج ۲۷ شمارہ ۴ صـ۳۶)

(۳) تیسری چیز جو موصوف اپنے موقف کی تائید کے لیے پیش کرتے ہیں وہ قرض میں کسی منفعت کی حرمت کا حکم ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کی روایت کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربٰو ہے"، موصوف اس روایت کے آخر میں فرماتے ہیں :-

"بہر حال اس حدیث کی رو سے بھی معاملہ زیر بحث ناجائز قرار پاتا ہے"۔ (الحق ج ۲۷ شمارہ ۴ صـ۳۶)

اس کے علاوہ موصوف کے مقالہ کے آخر میں ہدایہ اور مبسوط سرخسی کے واضح جزئیات سے جان چھڑانے کے لیے ایسی کمزور اور رکیک توجیہات کی گئی ہیں جو "توجیہ بما لا یرضیٰ قائلہ" کا مصداق ہے۔ ان توجیہات کی حقیقت، قوام وثبات یا ضعف و کمزوری کے لیے قارئین کرام حضرت مولانا قاضی عبدالکریم صاحب دامت برکاتہم کے مقالہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم آئندہ موصوف کے ان تین نکات پر بحث کریں گے جو بزعم مقالہ نگار زیر نظر مسئلہ کی حرمت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلی وجہ کی کمزوری جہاں تک زیر نظر معاملہ کو "ربوا النسیۃ" کی قسم قرار دینے کی بات ہے تو ربوا کا دائرہ اتنا وسیع نہیں جو اُدھار کے معاملہ کو بھی سمیٹ سکے، چند وجوہات کی وجہ سے ادھار کا معاملہ ربوٰ النسیۃ سے مختلف ہے۔

۱۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "ربوا النسیہ" میں اجل کو باقاعدہ مستقل مبیعہ کی حیثیت سے اعتبار دیا جاتا ہے۔ موصوف کے مقالہ کے حوالہ سے اکابرین امت سے اس کی جو حقیقت نقل کی گئی ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقررہ مدت کے خاتمہ پر دائن مدیون کے پاس جاکر کہہ دیتا کہ میری فلاں رقم جو تیرے ذمہ ہے وہ ادا کرو۔ اگر ابھی ادا نہیں کر سکتے ہو تو اتنی مدت کے بعد مجھے اس مدت کے عوض مقررہ رقم کے ساتھ مزید اتنی رقم دو گے۔ عروض کی طرح اجل کی کمی اور زیادتی کو دیکھ کر قیمت لگائی جاتی اجل میں مالیت وتقوم کی حقیقت معدوم ہونے کی وجہ سے دائن کو اصل رقم پر بغیر کسی معاوضہ کے زیادت دی جاتی۔ جس کو قرآن نے حرام قرار دیا۔ شیخ عبدالرحمن الجزیری ربوا کی تقسیم کرتے ہوتے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وینقسم الی قسمین الاول ربوٰ النسیئۃ وھو ان تکون الزیادۃ المذکورۃ فی مقابلۃ تاخیر الدفع...... لا خلاف بین ائمۃ المسلمین فی تحریم ربوٰ النسیئۃ وھو کبیرۃ من الکبائر بلا نزاع۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج۲ ص۲۴۵ مباحث الربوٰ)

(ترجمہ) "ربوٰ کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم "ربوٰ النسیئۃ" ہے، یہ وہ قسم ہے کہ جس میں مذکورہ زیادتی تاخیر سے دینے کے مقابلہ میں دی جاتی ہے..... اکابرین امت میں اس کی حرمت میں کسی کا اختلاف نہیں یہ بالاتفاق گناہ کبیرہ ہے۔"

یہی وہ حقیقت ہے جو مفسرین، محدثین، فقہاء اور دوسرے ارباب تحقیق کی تحریرات میں نظر آتی ہے شاید تعبیر میں کوئی مبالغہ نہ ہو کہ ہم اس سے یوں کہیں کہ یہ زیادتی اجل کا معاوضہ ہے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں زیر نظر معاملہ میں یہ مفروضہ زیادتی معاوضہ کی حیثیت سے نظر نہیں

آتی ، نہ مقررہ میعاد کی کوئی قیمت مقرر کی جاتی اور نہ اس کو عاقدین مبیعہ کا کوئی جزء تسلیم کرتے ہیں تاکہ کسی وقت مقررہ قیمت، مبیعہ اور اجل پر تقسیم ہوسکے، یہی وجہ ہے کہ عام فقہاء اس زیادتی کیلئے بعوض الاجل کی جگہ "لاجل الاجل" کی علت ذکر کرتے ہیں۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: یزاد فی الثمن لاجل الاجل۔ ابن عابدینؒ اور ابن نجیم المصریؒ فرماتے ہیں: ویزاد فی الثمن لاجلہ۔ گویا دونوں کا بنیادی فرق یہی ٹھہرا کہ ادھار کے معاملہ میں زیادتی "لاجل الاجل" اور "ربوٰ النسیئۃ" میں زیادتی لعوض الاجل ہے، ایسے واضح فرق ہونے کے باوجود پھر بھی یہ معاملہ ربوٰ کی ذیلی قسم قرار دینا غلط فہمی یا سینہ زوری ہے۔ تاہم یہ فرق باریک ہے، شاید اس فرق کی مزید وضاحت ایک مثال سے ہوسکے مثلاً ایک شخص کراچی سے پشاور تک ریل گاڑی میں سفر کرتا ہے تو اصل کرایہ تین سو روپے ہے جو کسی بھی گاڑی میں اپنے لیے سیٹ مقررہ مسافت تک اسی قیمت پر لے سکتا ہے لیکن اسی گاڑی میں ایئر کنڈیشن سیٹ کا کرایہ پانچسو روپے لگایا جاتا ہے لہٰذا دونوں کرایوں کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصل کرایہ تو تین سو روپے ہے لیکن مؤخر الذکر سیٹ کے کرایہ میں یہ اضافہ محض سہولیات اور مراعات کے اضافہ کی وجہ سے ہے یہ اضافہ کسی سہولت کا معاوضہ نہیں۔

ایسا ہی یہاں پر بھی معاملہ ہے کہ ادھار میں یہ زیادتی کسی اجل کا معاوضہ نہیں کہ اس کو حرام اور ممنوعہ معاملات میں شمار کیا جاسکے بلکہ یہ النقد خیر من النسیئۃ کو مدنظر رکھتے ہوئے مؤخر ادائیگی کی وجہ سے مقرر کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ نقد وصولی میں مشتری کو بروقت ادائیگی کی زحمت ہو لیکن بائع کو فائدہ ہوگا جبکہ تاخیر سے ادائیگی میں مشتری کو سہولت دی جاتی ہے اور بائع کے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے قیمتِ فروخت نسبتاً زیادہ لگائی جاتی ہے تاکہ بائع بطیب خاطر ادائیگی کے لیے تیار رہے اور مشتری بھی اپنی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے خوشی سے وہ قیمت ادا کرے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ حرام معاملہ میں ایسی دو اشیاء کا تبادلہ ہے جن کی جنس اور قدر آپس میں متحد ہے۔ چونکہ دائن جب مدیون سے معاہدہ کے اختتام پر یہ کہتا ہے کہ اگر ابھی میرے پیسے مثلاً ایک ہزار روپے نہیں دیتے ہو تو چھ مہینوں کے بعد ایک ہزار کی جگہ پندرہ سو روپے دو گے گویا اس میں تبادلہ عرض اور ثمن کا نہیں رہا، چونکہ اختتام معاہدہ پر دائن کا حق مبیعہ نہیں رہتا بلکہ مبیعہ کی قیمت رہی تو تبادلہ رقم کا رقم سے آیا، ایسی حالت میں لازمی بات ہے کہ جنس اور قدر کی موجودگی میں تفاضل حقیقی اور حکمی دونوں آئے جو کہ قطعی حرام ہے۔

لیکن زیرِ نظر معاملہ میں یہ صورت بالکل نہیں، یہاں پر تبادلہ مبیعہ اور ثمن کا ہے، اوّل ہی سے بائع اور مشتری کے درمیان ایجاب و قبول میں یہی قیمت منظورِ نظر رکھی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں جہاں بیع مطلق کی تعریف صادق آتی ہو یعنی مبیعہ اور ثمن کا تبادلہ ہو تو تفاضل میں کوئی حرج نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں بائع اور مشتری کے درمیان نقد قیمت پر معاہدہ طے پائے اور بعد ازاں مشتری نقد ادائیگی سے قاصر ہو اور یہ کسی معاوضہ کی وجہ سے ثمن کی ادائیگی نہ کرے تو اس وقت یہ لازمی طور پر ربٰو النسیئۃ کے مترادف ہے کیونکہ نقد ادائیگی پر معاہدہ کے وقت بائع کا حق ابھی مقررہ ثمن کی مقدار میں متعین ہوا تو ابھی اجل کی وجہ سے زیادتی نہیں اس مقررہ حق کے مقابلہ میں ہے جو ناجائز ہے۔

دوسری وجہ کی کمزوری جہاں تک موصوف کی دلیل کے دوسرے حصہ کا تعلق ہے تو یہ بھی شُبہ سے خالی نہیں، یہ مشکل ہے کہ بیع باطل کی تعریف زیرِ نظر معاملہ پر صادق ہو۔ اس کے بطلان کے لیے ہم پہلے ایک مقدمہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ عقدِ بیع میں ایجاب و قبول کے بعد جب تک اس عقد کا فسخ ہو کر کسی دوسرے معاملہ کی تجدید نہ ہو تو کمی اور زیادتی کی نسبت اصل عقد کی طرف جائے گی۔ مثلاً بائع اور مشتری ایجاب و قبول کر کے معاہدہ کریں اور بعد ازاں بائع مقررہ مبیعہ کے ساتھ یا مشتری مقررہ قیمت سے کوئی زیادتی ادا کرے تو اس کی نسبت اصل عقد کی طرف کی جائے گی، چنانچہ استحقاق کی صورت میں یہ کمی اور زیادتی لازمی طور پر ظاہر ہو گی۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں:۔

ویجوز للمشتری ان یزید للبائع فی الثمن و یجوز للبائع ان یزید للمشتری فی المبیع و یجوز ان یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذٰلک فالزیادۃ والحط یلتحقان باصل العقد عندنا۔ (الهدایۃ ج ۳ ص ۵۲ کتاب البیوع)

(ترجمہ) "مشتری کے لیے جائز ہے کہ وہ بائع کے لیے قیمت میں زیادتی کرے جبکہ بائع مشتری کو مبیعہ میں اضافہ کر سکتا ہے اور قیمت میں کمی بھی جائز ہے، استحقاق ان تمام سے متعلق ہو گا، پس کمی اور زیادتی ہمارے نزدیک اصل عقد سے ملحق ہوتی ہے"۔

اس قاعدہ پر چلتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیرِ نظر معاملہ میں قیمت میں یہ زیادتی اصل مبیعہ کے عوض میں آتی ہے اگر قیمت نقد کی صورت میں کم ہو یا ادھار کی صورت میں زیادہ ہو ہر دو صورتوں میں مبیعہ کی قیمت سمجھی جائے گی۔ تو بیع باطل کی تعریف "مایؤخذ من الانسان بغیر عوض" یا "مالم یکن فی مقابلۃ

شیٔ حقیقی کے مروجہ معاملہ پر کبھی صادق نہیں آتی، اس میں یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بائع کو زیادتی بغیر عوض ملی بلکہ تمام قیمت مبیعہ کی ہے، اصل اور اضافہ دونوں کے درمیان ایسا شدید اتصال موجود ہے کہ دونوں کی دوسرے سے جدائی متصور نہیں، یہ کبھی نہیں کہا جاتا ہے کہ اس قیمت کا اتنا حصہ مبیعہ کا ہے اور اتنا حصہ درمیان میں اجل کا ہے، آخر کار "اجل" میں اتنی قوت کہاں ہے جس کو مبیعہ شمار کیا جا سکے۔ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں :۔

لان الاجل فی نفسہ لیس بمال فلا یقابلہ شیٔ حقیقۃ اذا لم یشترط زیادۃ الثمن بمقابلۃ قصداً ویزاد فی الثمن لاجلہ اذا ذکر الاجل بمقابلۃ زیادۃ الثمن قصداً۔ (رد المحتار علی الدر المختار ج۴ ص۱۵۸ باب المرابحۃ والتولیۃ)

(ترجمہ) "کیونکہ اجل بذاتِ خود کوئی مال نہیں، پس حقیقت میں جب ثمن کی زیادت قصداً اس کے عوض میں شمار نہیں کی گئی ہو تو کوئی چیز اس کا معاوضہ نہیں، البتہ قیمت میں زیادتی کی جا سکتی ہے جبکہ اجل زیادتِ ثمن کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہو۔"

بہر حال بیع باطل کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی اس لیے لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کی رو سے یہ ناجائز نہیں بلکہ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ کی رو سے جائز ہے، قسط وار ادائیگی کی صورت میں مشتری کی سہولت کو مدنظر رکھ کر یہ کہنا بے جا نہیں کہ مشتری بیک وقت ادائیگی کے تحمل کے بوجھ سے چھٹکارا پا کر معمولی اضافہ برداشت کرنے پر لازمی طور پر خوش ہوگا ورنہ ممکن ہے کہ مشتری کو بیک وقت ادائیگی کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے کہیں مبیعہ کی خریداری سے محروم ہونا پڑے۔ اس لیے مشتری کی رضامندی نہ ہونے کا دعویٰ کرنا خلافِ واقعہ ہے، یہ الگ بات ہے کہ اگر بائع احسان سے کام لے کر کم قیمت پر مبیعہ فروخت کرنے پر تیار ہو تو اس سے مشتری کو خوشی حاصل ہوگی، لیکن اس سے مزید ایک خوشی کی اور صورت بھی ہے کہ بائع محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے مبیعہ بغیر کسی عوض کے مجاناً مشتری کے حوالہ کرے لیکن اس کو معاشرہ کا لازمی حصہ قرار دینا یا ہر ایک کو احسان کا پابند کرنا شریعت کے عادلانہ نظام سے متصادم ہے کیونکہ شریعت کسی پر ایسے اضافی بوجھ ڈالنے کے حق میں نہیں البتہ تقویٰ اور نیکی حاصل کرنے کے دروازے دونوں پر ہر وقت کھلے ہیں۔

تیسری وجہ کی کمزوری حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کہ "ہر وہ قرض جو منفعت اندوزی کا ذریعہ بنے وہ ربٰو ہے" کا حکم بھی بظاہر اس معاملہ پر چسپاں کرنا

مشکل نظر آتا ہے، کیونکہ یہ حکم وہاں ہے جہاں قرض کی موجودگی میں دائن مدیون سے کسی مادی منفعت کا استفادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم وہاں ہو سکتا ہے جہاں قرض کا معاملہ باعتبار وجود منفعت کے حصول سے مقدم ہو، لیکن یہاں پر معاملہ کی نوعیت اس سے مختلف ہے، یہ کبھی نہیں ہوتا کہ پہلے قرض دیکر پھر منفعت کا معاملہ کیا جائے، بلکہ اس معاملہ کی ہم یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی وجہ سے فائدہ یعنی مشتری کو رقم دینے میں سہولت کا فائدہ اور بائع کو قیمت میں مالی فائدہ آیا، گویا ظاہری انتفاع کا دائرہ ایسا بھی نہیں جو صرف دائن کی ذات تک محدود ہے بلکہ دائن اور مدیون دونوں اس فائدہ سے بہرہ ور ہو رہے ہیں تاہم کسی غیر واقعی اور امکانی احتمال شبہ انتفاع کی وجہ سے ممکن ہے اس عقد پر غیر مستحسن کا حکم لگایا جاتا ہے جو خواص کے دائرہ تک محدود رہتا ہے لیکن اس کو بالکل حرام اور ناجائز قرار دینے کا حکم دوسرے اصول سے بھی متصادم ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ کی ۹۸ فیصد آبادی اس کاروبار میں مبتلا ہے اسے کسی جواز کے احتمال کے ہوتے ہوئے حرام کے کھاتے میں ڈالنا دانشمندی نہیں، جہاں کہیں جواز کا امکان ہو اور یہ احتمال کسی شرعی نص سے بظاہر متصادم نہ ہو تو جواز کے معاملہ کے لیے ایسے احتمال کو بنیاد بنانا اوفق بالروایت والدرایت ہے اگرچہ حرمت کے لیے دوسری جانب میں کوئی احتمال نظر آتا ہے، تاہم تقویٰ کا میدان اس سے الگ ہے جس کے لیے ایسے مشتبہات سے بچنا بھی کمال سمجھا جاتا ہے۔

باب السلم

(بیع سلم کے مسائل واحکام)

بیع سلم کی حقیقت

سوال: ایک کمپنی اپنی مصنوعات سیزن میں فروخت کرے تو ایک قیمت لگاتی ہے لیکن اگر کوئی شخص ان کو پیشگی رقم دے دے تو کمپنی اُسے خصوصی رعایت دیتی ہے اور مقررہ قیمت سے کم وصول کر کے حسب وعدہ اپنی مصنوعات اسے دیتی ہے، کیا کسی کمپنی یا فیکٹری کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی کمپنی کو پیشگی رقم دے کر مقررہ وقت پر رعائتی قیمت سے اس کی مصنوعات خریدنا عقد سلم کے حکم میں ہے، ایسا عقد اُس وقت جائز ہے جب اس میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں: ۱۔ جنس معلوم ہو ۲۔ نوع معلوم ہو ۳۔ صفت معلوم ہو ۴۔ قدر اور اندازہ معلوم ہو ۵۔ مدت معلوم ہو (کم از کم ایک ماہ ہو) ۶۔ راس المال معلوم ہو ۷۔ مطلوبہ چیز دینے کا مکان معلوم ہو ۸۔ جدائی سے قبل راس المال پر قبضہ ہو۔ (الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص۲۱۶)

لما قال العلامة الحصکفیؒ: السلم هو...... شرعاً بیع آجلٍ وهو المسلم فیه بعاجلٍ وهو راس المال۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص۲۰۹ باب السلم) [1]

مالدار کے لیے بیع سلم کی اجازت

سوال: کیا شریعت مطہرہ میں غنی کیلئے بیع سلم کی اجازت ہے یا یہ بیع صرف غرباء کے لیے خاص ہے؟

الجواب: عقد سلم کے جواز میں اگرچہ غرباء اور فقراء کی ضرورت بنیادی طور پر محرک اور سبب ہے لیکن ضرورت کی موجودگی ایک خفیہ معاملہ ہے جس پر ہر کسی کو مطلع ہونا مشکل ہے، اس لئے شریعت نے ایسی حالت میں بیع سلم میں شرائط کی موجودگی کو اعتبار دے کر غرباء اور امراء دونوں

---

[1] قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: معناه الشرعی بیع آجل بعاجل ۔۔۔ وسیذکر المصنف شرائطه۔ (فتح القدیر ج ۶ ص۲۰۴ باب السلم)

ومثله فی الهندیة ج ۳ ص۱۷۸ باب السلم۔

کے لیے جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ سفر کی حالت میں مشقت اور تکلیف سے قطع نظر کر کے محض سفر کو مشقت کا قائم مقام قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة ابن الهمام رحمه الله: ولما كان جوازه للحاجة وهي باطنة انيت بامر ظاهر كما هو المستمر في قواعد الشرع كالسفر للمشقة ونحوه وهو ذكر الاجل فلم يلتفت بعد ذلك الى كون المبيع معدوما عند المسلم اليه حقيقة او موجودا قادرا هو عليه۔ (فتح القدير ج۶ ص۲۱۸ باب السلم)[1]

کرنسی نوٹوں میں بیع سلم کی اجازت ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے امریکی ڈالر وصول کر کے ان کے عوض میں پاکستانی کرنسی نوٹ دینے کی میعاد کر کے معاملہ طے کیا کہ تین ماہ بعد پاکستانی کرنسی نوٹ ادا کروں گا، کیا مذکورہ طریقہ سے معاملہ طے کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کرنسی نوٹ چونکہ خلقی طور پر ثمن نہیں بلکہ عرف اور رواج کی وجہ سے ثمن کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اس لیے ثمن عرفی بننے کے بعد اس میں کوئی قدر نہ رہی بلکہ عددِ متقارب کے حکم میں آ کر عقدِ سلم کے جواز کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ پس اگر سلم کی شرائط کی رعایت کر کے کوئی شخص ایسا معاملہ کرے تو بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں، تاہم اگر سود خوری کے لیے یہ طریقہ اپنایا جائے تو پھر اس سے اجتناب بہتر رہے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين ابوبكر الكاساني رحمه الله: واما السلم في الفلوس عددا فجائز عند ابي حنيفةؒ وابي يوسفؒ وعند محمدؒ لا يجوز بناءً على ان الفلوس اثمان عنده فلا يجوز السلم فيها كما لا يجوز السلم في الدراهم والدنانير وعندهما ثمنيتها ليست بلازمة بل تحتمل الزوال لانها ثبتت بالاصطلاح فتزول

---

[1] قال العلامة جلال الدين الخوارزميؒ: قلنا شرعيته لرفع حاجة المفاليس والا فلاس امر باطن لا يمكن الوقوف على حقيقته والشرع بنى هذه الرخصة على الحاجة ...... والبيع بالخسران دليل الحاجة ونظيره اقامة السفر مقام المشقة اقامة النكاح مقام الماء في النسب۔ (الكفاية في ذيل فتح القدير ج۶ ص۲۱۹، باب السلم، قادرا تحت قوله: لو كان قادرا على التسليم لم يوجد المرخص)
ومثله في العناية على هامش فتح القدير ج۶ ص۲۱۷ باب السلم۔

بالاصطلاح ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۲۰۸ باب السلم، فصل: واما الذی یرجع الی المسلم فیہ فانواع) لہ

بیع سلم میں تمام قیمت کی وصولی ضروری ہے

سوال:۔ بائع اور مشتری کے درمیان دو ہزار روپے پردس من اناج کا عقد اس شرط پر ہؤا کہ سولہ سو روپے حالاً ادا کرے گا، جبکہ چار سو روپے دو ماہ بعد اناج وصول کرتے وقت ادا کرے گا، تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بیع سلم میں راس المال کا تعین اور عقد مجلس میں ادائیگی لازم ہے لہٰذا اگر رأس المال کے قبض کرنے سے قبل اگر طرفین جدا ہوئے تو یہ بیع درست نہ ہوگی، تاہم رأس المال کا جتنا حصہ ادا کیا گیا ہو اتنے میں ہی سلم جاری ہوگا، پس مذکورہ معاملہ میں بھی آٹھ من اناج میں بیع سلم درست ہو کر دو من میں باطل ہوگی، البتہ اگر مجلس برخواست کرتے سے قبل تمام رقم ادا کر دی جائے تو عقد جائز ہے۔

وفی الهندیة: السادس ان یکون مقبوضًا فی مجلس السلم سواء کان رأس المال دینا او عینا عند عامة العلماء استحسانا وسواء قبض فی اول المجلس او فی اخره لان الساعات المجلس لها حکم ساعة واحدة وکذا الو لم یقبض حتی قاما یمشیان فقبض قبل ان یفترقا بابدانهما جاز۔ اھ (الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۷۹ الباب الثامن عشر فی السلم) ۲ہ

لہ قال العلامة ابن نجیمؒ: ویصح فی العددی المتقارب کالبیض والجوز والفلس لانه عددی یمکن ضبطه فیصح السلم فیه وقیل لا یصح عند محمدؒ لانه ثمن مادام یروج وظاهر الروایة عن الکل الجواز۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۵۶ باب السلم)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۲۱۰ باب السلم۔

۲ہ قال العلامة الحصکفی رحمه الله: وبقی من الشروط قبض رأس المال ولو عینًا قبل الافتراق بابدانهما وان ناما وسارا فرسخا او اکثر۔ قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله قبض رأس المال) فلو انتقض القبض بطل السلم۔ اھ (رد المحتار ج۵ ص۲۱۶ کتاب البیوع۔ باب السلم)

وَمِثْلُهٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۲ ص۳۴ باب السلم۔

جانوروں میں بیع سلم کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حیوانات میں بیع سلم شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حیوانات میں بیع سلم کا مسئلہ فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے، احناف کے نزدیک چونکہ بیع سلم کے لیے مبیعہ کا وزنی، کیلی یا عددیاتِ متقاربہ ہونا ضروری ہے اور حیوانات ان میں سے کسی بھی قسم میں داخل نہیں، اس لیے حنفیہ کے نزدیک حیوانات میں بیع سلم جائز نہیں۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ وھم یسلفون فی الثمر فقال من اسلف فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم۔ (جامع الترمذی ج۱ ص۲۴۵ باب ما جاء فی السلف فی الطعام والتمر) [1]

مالکانِ رسائل وجرائد کا خریداروں سے پیشگی قیمت لینا

سوال:- جناب مفتی صاحب! آجکل مذہبی اور غیر مذہبی رسائل وجرائد کے مالکان خریداروں سے سالانہ چندہ کی رقم پیشگی وصول کر لیتے ہیں جبکہ پورے سال کا رسالہ انہیں بعد میں وصول ہوتا ہے۔ تو کیا مالکان رسائل و جرائد کا پیشگی رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: رسائل وجرائد کی سالانہ رقم پیشگی لینے کا معاملہ بیع سلم کا معاملہ ہے جو شرعاً جائز ہے اسلئے کہ اس میں اصل معاملہ کاغذ کا ہوتا ہے اور وہ سال بھر بازار میں موجود رہتا ہے۔

قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: السلم شرعاً بیع آجل وھو المسلم

---

[1] قال الشیخ ظفر احمد العثمانی رحمہ اللہ: عن ابن عباس رضی اللہ عنہ: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن السلف فی الحیوان، اخرجہ الحاکم فی المستدرک ج۲ ص۵۲ وقال صحیح الاسناد۔ (اعلاء السنن ج۱۴ ص۴۱۹ باب النھی عن السلف فی الحیوان)

ومثلہٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۲۱۱ باب السلم۔

فیہ بعاجل وھو رأس المال ورکنہ رکن البیع حتی ینعقد بلفظ بیع فی الاصح......
وشرطہ ای شروط صحتہ التی تذکر فی العقد سبعۃ بیان جنس کبر وتمر و
بیان نوع کمسقی او بعلی وصفتہ وقدر واجل و بیان قدر رأس المال اھ
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۲۱۴،۲ باب السلم) [1]

جوس کے کریٹوں میں بیع سلم کا حکم سوال:۔ شربت اور جوس بنانے والی کمپنیوں کا اپنی مصنوعات فروخت کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کمپنی اپنے کسی ڈیلر کو عام ریٹ پر مثلاً ٦٢ روپے فی کریٹ دیتی ہے لیکن اگر ڈیلر کمپنی کو یہ رقم سیزن سے کچھ مدت پہلے ادا کردے تو کمپنی اُسے ٥٢ روپے فی کریٹ دیدیتی ہے اس طرح سے ڈیلر کو دس روپے فی کریٹ بچت ہو جاتی ہے، یہ طریقہ خرید و فروخت میعاد مقرر اور غیر مقرر دونوں طرح کا ہوتا ہے، تو کیا یہ طریقہ بیع شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ بیع بیع سلم کے طریقے سے ہو تو شرائط سلم کی موجودگی میں بیع درست ہوگی، بیع سلم کی شرائط یہ ہیں: ۱ جنس معلوم ہو ۲ مال کی قسم معلوم ہو ۳ صفت معلوم ہو ۴ مقدار معلوم ہو ۵ مدت کا تعین ہو ۶ مبیع کے ادا کرنے کی جگہ مقرر ہو۔
(اشراق نوری شرح قدوری ص۱۳۴ باب السلم) اور اگر پیشگی کی یہ رقم کمپنی کو بطور قرض دی جاتی ہو تو بموجب حدیث کل قرضٍ جرّ نفعاً فھو ربوٰا یہ سودی معاملہ ہوگا۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وشرطہ ای شروط صحتہ التی تذکر فی العقد سبعۃ بیان جنس ونوع ..... وصفۃ...... وقدر...... واجل واقلہ فی السلم شھر...... وبیان مکان الایفاء للمسلم فیہ الخ
(الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۲۳۱ باب السلم)

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: وھو ان یسلم عوضاً حاضراً فی عوض موصوف فی الذمۃ الی اجل.......... الثامن ان یکون جنس المسلم فیہ ای المبیع موجوداً فی الاسواق بنوعہ وصفتہ من وقت العقد الی حلول اجل التسلیم ولا یتوھم انقطاعہ عن ایدی الناس۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۵۹۸،۶۰۸ المطلب الثانی تعریف السلم)

مسلّم فیہ ناپید ہوجائے تو....

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ بیع سلم کرے اور وقتِ معینہ سے قبل ہی وہ شے ناپید ہوجائے تو کیا مشتری اس کے بدلے کوئی اور چیز لے سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بیع سلم میں جب مسلم فیہ (جس کے بارے میں بیع ہوئی ہے) اگر مدتِ معینہ میں ناپید ہوجائے اور مسلم الیہ (بائع) ادا کرنے سے عاجز ہو تو اس صورت میں مشتری کو اختیار ہے کہ وہ مسلم فیہ تک انتظار کرے یا اپنے پیسے واپس لے لے، اس کے بدلے میں دوسری چیز لینا شرعاً جائز نہیں، تاہم عقد ختم کرنے یعنی اپنی رقم واپس لینے کے بعد نئے سرے سے عقد بیع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ : ولو انقطع بعد الاستحقاق خیر رب السلم بین انتظار وجودہ والفسخ واخذ رأس المال۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۲۳۸ باب السلم)[1]

جانبین سے موزونی اشیاء میں بیع سلم جائز نہیں

سوال:۔ ایک آدمی نے چند بوری چینی ۸۱۰ روپے فی بوری کے حساب سے ایک شخص پر ۲/۱ ۲ ماہ کی میعاد پر فروخت کی اور اس سے وعدہ لیا کہ آپ اس وقت مجھے سرسول دیں گے، جبکہ معاہدہ کرتے وقت سرسول کی قیمت ۶۱۰ روپے فی من تھی، جب میعاد پوری ہوگئی تو سرسول کی قیمت تقریباً گیارہ سو روپے فی من تھی، اس پر اُس شخص نے سرسوں دینے سے انکار کردیا، بالآخر ۹۰۰ روپے فی من پر فیصلہ ہوا، تو اب یہ نفع یعنی ۲۹۰ روپے فی من لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ بظاہر بیع سلم کی یہ صورت ناجائز ہے لہٰذا فریقین اس عقد کو ختم کرکے اپنا اپنا مال یا اس کا مثل اگر عین مال موجود نہ ہو واپس لے لیں، اور اگر سلم کی تمام شرائط موجود بھی ہوں تب بھی چینی اور سرسوں میں سلم جائز نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں اس بیع پر بیع فاسد کا حکم جاری ہوگا کیونکہ یہ عقدِ ربوٰ ہے اور عقدِ ربوٰ بیع فاسد کے حکم میں ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : من جملۃ صور البیع الفاسد

---

[1] وفی الھندیۃ : ولا یجوز ان یأخذ عوض رأس المال شیئاً من غیر جنسہ فان اعطاہ من جنس اجود منہ او اردأ فی الصفۃ الخ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۳ ص۱۸۶ الفصل الثالث فیما یتعلق بقبض رأس المال والمسلم فیہ)

جملة العقود الربوية ۔ (رد المحتار علی حاشیہ الدر المختار ج۴ ص۱۹۷ باب الربٰو)

وقال العلامة خالد الآتاسیؒ، ثم اعلم ان اسلام الموزون فی الموزون والمکیل فی الموزون لا یصح لوجود علتی الربٰو او احدھما الخ۔ (شرح المجلة ج۲ ص۳۸۷ باب السلم)[1]

چلغوزی میں بیع سلم کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے (ایجنسی وزیرستان) میں لوگ چلغوزی کے دانوں میں بیع سلم کرتے ہیں، یہ چلغوزی پورے ملک کی مختلف مارکیٹوں میں سال کے بارہ مہینے ہر وقت ملتی ہے جبکہ ہمارے علاقے میں ابھی تک درختوں میں ہے، تو کیا ایسی چلغوزی میں بیع سلم جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ ظاہر ہے کہ بیع سلم اس جدید چلغوزی میں ہے جو ابھی تک درختوں پر ہے اور مارکیٹ میں ابھی نہیں پہنچی ہے اور مارکیٹ میں موجود بھی نہیں ہے اس لیے یہ بیع سلم درست نہیں۔

لما فی الهندیة: السادس ان یکون المسلم فیه موجودًا من حین العقد الی حین المحل حتی لو کان منقطعا عند العقد موجودًا عند المحل وعلی العکس او منقطعًا فیما بین ذلك وھو موجود عند العقد والمحل لا یجوز کذا فی فتح القدیر وحد الوجود ان لا ینقطع من السوق وحد الانقطاع ان لا یوجد فی السوق وان کان یوجد فی البیوت ھٰکذا فی السراج الوھاج۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۳ ص۱۸۰ الباب الثامن عشر فی السلم۔ الفصل الاول)[2]

---

[1] وفی الهندیة: العاشر ان لا یشمل البدلین احد وصفی علة ربا الفضل وھو القدر او الجنس وھذا مطرد الا فی الاثمان فانه یجوز اسلامھا فی الموزونات لحاجة الناس۔

(الفتاوٰی الهندیة ج۳ ص۱۸۰،۱۸۱ الباب الثامن عشر فی السلم۔ الفصل الاول)

[2] قال العلامة الحصکفی رحمه الله: ولا فی حنطة حدیثة قبل حدوثها لانها منقطعة فی الحال وکونها موجودة وقت العقد الی وقت المحل شرط فتح القدیر۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۲۰۳ باب السلم)

ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۵۵ باب السلم۔

افیون میں بیع سلم جائز ہے

سوال: ایک شخص مثلاً زید نے بکر سے کہا کہ مجھے ایک ہزار روپے دے دو، اس کے بدلے میں میں آئندہ سال فصل کے موقع پر ایک سیر افیون دیدوں گا، جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اگلے سال افیون کی قیمت تین ہزار روپے فی سیر ہوگی، تو کیا یہ معاملہ سودی تو نہیں ہے یا جائز ہے؟

الجواب: پہلے تو افیون کی بیع سے بلا ضرورت احتراز کرنا لازم ہے لیکن مال متقوم ہونے کی وجہ سے صورت مسئولہ میں جو عقد کیا گیا ہے یہ بیع سلم کی صورت ہے لہٰذا اگر بیع سلم کی تمام شرائط کا لحاظ رکھا جائے تو جائز ہے۔ آئندہ سال افیون کی قیمت کی کمی یا زیادتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: (السلم) هو.... بیع آجل .... بعاجل..... و رکنه رکن البیع.... ویصح فیما امکن ضبط صفته ومعرفة قدره کمکیل وموزون الخ۔ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۴ ص۲۲۶ باب السلم)[1]

کپڑے میں بیع سلم کا حکم

سوال: اگر کوئی تاجر کسی فیکٹری کے مالک سے اس طرح معاملہ طے کرے کہ آئندہ سال گرمی کے موسم میں مجھے اتنے تھان کپڑا درکار ہوگا اور جملہ شرائط طے کرکے رقم فیکٹری کے مالک کے حوالے کردے تو کیا یہ سودا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورت مسئولہ بیع سلم کا مسئلہ ہے لہٰذا سودا طے کرتے وقت اگر اس کے جملہ اوصاف، مقدار، کپڑا کس چیز سے بنا ہوگا، وغیرہ کی وضاحت کردی جائے تو شرعاً یہ سودا جائز ہے۔

لما فی مجلة الاحکام: الکرباس والجوخ وامثالهما من المذروعات یلزم تعیین طولها وعرضها ورقتها ومن ای شئ نسیج ومن نسیج ای محل هی۔

{ شرح المجلة لرستم باز ص۲۱۸ المادة ص۳۸۵
الفصل الثالث فی السلم }

◎

---

[1] وفی الهندیة: ان یکون السلم فیه موجوداً من حین العقد الی حین المحل... ان یکون السلم فیه مما یتعین بالتعیین۔ وهٰکذا شروط اُخر۔
(الفتاوی الهندیة ج۳ ص۱۸۰ باب السلم)

کتاب
الربوٰ

یاایها الذین امنوا لا
تاکلوا الربوٰا اضعافا
مضاعفة واتقوا الله تفلحون۔

کتاب الرّبوٰا
(سُود کے احکام و مسائل)

سُود کی حقیقت

سوال: جناب مفتی صاحب! سود کی تعریف کیا ہے اور یہ کن کن چیزوں میں کن صورتوں میں پایا جاتا ہے؟

الجواب: قرض دار کو کچھ رقم ایک خاص مدت کے لیے اس شرط کے ساتھ دینا کہ واپس کرتے وقت اصل زر سے زائد دے گا، سُود کہلاتا ہے اور اسے اُدھار کا سود کہتے ہیں۔

لما قال الامام الجصاص الرازیؒ: ھو القرض المشروط فیہ الاجل وزیادۃ مال علی المستقرض۔ (الاحکام القرآن ج۱ ص۴۶۹ باب البیع)

ایک ربوٰ معاملاتِ بیع وشراء کا ہے، حضور انورؐ نے اس بارے میں چھ چیزوں کا ذکر فرمایا ہے کہ آپس میں ان کا تبادلہ برابر ہونا چاہیئے، وہ چھ چیزیں سونا، چاندی، گیہوں، جَو، کھجور اور انگور ہیں۔ ان اشیاء میں سُود کی علت عندالاحناف قدر (پیمانہ) اور جنس ہے، اگر جنس بدل جائے اور کوئی چیز وزنی اور کیلی نہ ہو تو پھر تبادلے میں کمی بیشی جائز ہے، اگر کسی بھی چیز کے اندر قدر اور جنس ہو تو تبادلہ کے وقت کمی یا زیادتی کی تو یہ سُود ہو گا، ان میں اُدھار کا معاملہ بھی سُود ہو گا۔ اگر سُود کی دونوں علتوں میں سے ایک علت پائی جائے تو کمی بیشی جائز ہو گی لیکن اُدھار پھر بھی سُود کے زمرہ میں آئے گا۔

قال الحصکفیؒ: الربا و شرعا فضل ولو حکماً فدخل ربا النسیئۃ والبیوع الفاسدۃ فکلھا من الربوا خال عن العوض بمعیار شرعی وھو الکیل والوزن مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضۃ وعلۃ القدر مع الجنس وان وجد احرم الفضل والنساء وان وجد احدھما حل الفضل وحرم النساء۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج۴ ص۱۷۶ باب الربوا) [له]

[له] لما فی الھندیۃ: وھو فی الشرع عبارۃ عن فضل مال لا یقابلہ عوض فی معاوضۃ مال بمال وھو محرم فی کل مکیل وموزون بیع مع جنسہ وعلتہ القدر والجنس وان وجد القدر والجنس حرم الفضل والنساء وان وجد احدھما وعدم الآخر حل الفضل وحرم النساء۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۳ ص۱۱۷ باب الربوا)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۲۴ باب الربوا۔

سُود سے بچنے کا حیلہ

سوال:۔ آجکل بینک لوگوں کو ٹریکٹر خرید کر دیتا ہے، پھر بینک نے ٹریکٹر کمپنی کو جتنی رقم ادا کی ہوتی ہے اُس رقم کو گاہک سے بمع سُود کے قسط وار وصول کرتا ہے، کیا اس سُود سے بچنے کا کوئی حیلہ ہے؟

الجواب:۔ (۱) اگر بینک کمپنی سے ٹریکٹر خرید کر خود آگے بیچتا ہے تو قسط وار زیادہ رقم قیمتِ خرید سے وصول کر سکتا ہے اور ثمن کی یہ زیادتی اُدھار کی وجہ سے ہے۔ جو کہ شرعاً مرخص ہے۔

لما قال العلامة المرغيناني رحمه الله: الا يرى انه يزاد في الثمن لاجل الاجل۔

(الهداية ج۳ ص۷۴ باب الربو)

(۲) اگر بینک گاہک کا وکیل بن کر ٹریکٹر اپنے مؤکل کو خرید شدہ قیمت سے زیادہ پر دیتا ہے تو یہ ناجائز ہے کیونکہ وکیل اپنے مؤکل کی شرائط کے مطابق چلے گا۔

لما قال العلامة الكاساني رحمه: اذا قال له اشتر لي جارية بالف درهم فاشترى جارية باكثر من الالف تلزم الوكيل دون الموكل لانه خالف امر الموكل فيصير مشتريا لنفسه۔

(بدائع الصنائع ج۶ ص۲۹ بيان في حكم التوكيل)

(۳) بینک نے مثلاً گاہک کی طرف سے کمپنی کو ایک لاکھ روپے دے دیئے اور گاہک سے ڈیڑھ لاکھ وصول کرنا چاہتا ہے، ٹریکٹر گاہک نے کمپنی سے خرید لیا لیکن اب بینک کی رقم اس کے ذمہ قرض ہے، اور بینک زیادہ وصول کرنا چاہتا ہے، تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ بینک اپنے ایک لاکھ کے عوض گاہک سے زمین وغیرہ خرید کر اپنے قبضہ میں لے لے پھر اس زمین کو گاہک کے ہاتھ ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کر دے اور قسط وار ڈیڑھ لاکھ وصول کرتا رہے۔

قال العلامة ابن نجيم: رجل له على آخر عشرة دراهم فاراد ان يؤجلها الى السنة ويأخذ منه ثلاثة عشر فالحيلة ان يشترى منه بتلك العشرة متاعا ويقبض المتاع منه وقيمة المتاع عشرة ثم يبيع المتاع منه بثلاثة عشر الى سنة۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۲۶ باب الربو) [1]

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري: رجل له آخر عشرة دراهم فاراد ان يؤجلها الى سنة ويأخذ منه ثلاثة عشر فالحيلة ان يشترى منه بتلك العشرة متاعا ويقبض المتاع منه وقيمة المتاع عشرة ثم يبيع المتاع منه بثلاثة عشر الى سنة۔ (خلاصة الفتاوى ج۲ ص۱۰۲ باب الربو)

سُودی رقم کا مصرف

سوال :- بینک کی طرف سے منافع کی شکل میں ملنے والی سودی رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اول تو بینک میں رقم رکھنے سے گریز ہی کرنا چاہیئے اور اگر مجبوراً حفاظت کی نیت سے رکھ دی جائے تو اس پر جو سود منافع کی صورت میں ملتا ہے وہ وہ بینک والوں کے لیے نہ چھوڑے بلکہ اُن سے لے کر غرباء اور فقراء پر بلا نیتِ ثواب صدقہ کردے۔

قال العلامة الحصکفیؒ : کما لو غصب عبداً وآجرہ فینقص فی ہٰذہ الاجارۃ ...... وان استغلہ فنقصہ الاستغلال او آجر المستعار ونقص ضمن النقصان وتصدق بما بقی من الغلۃ والاجرۃ۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : ویؤمران یتصدق بہا لاستفادتہا ببدل خبیث وھو التصرف فی مال الغیر۔ (الدر المختار ورد المحتار ج ۶ ص ۱۸۸ کتاب الغصب)[1]

گُڑ، گندم قرض پر دے کر واپسی کے وقت زیادتی کی شرط لگانا سُود ہے

سوال : ایک شخص نے کسی آدمی سے گُڑ اور گندم ایک خاص پیمانہ کے مطابق خاص مدت کے لیے قرض لیا اور وقت معین پر واپسی کے ساتھ زیادتی کی شرط لگادی کہ قرض ادا کرتے وقت اتنی مقدار میں گُڑ اور گندم ساتھ زیادہ بھی دوں گا، کیا اس طرح معاملہ کرنا ازروئے شرع صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اشیاءِ ربویہ میں باہم قرض و اقراض جائز ہے لیکن واپسی کے وقت مساوات شرط ہے، گندم تو منصوص ہے، حدیث میں مساوات کی شرط ہے اور گُڑ میں اس منصوص کی علت قدر اور جنس پائی جاتی ہے، لہٰذا گندم اور گڑ واپس کرتے وقت زیادتی کی شرط سُود ہے۔

---

[1] لما قال العلامۃ ابن البزاز رحمہ اللہ : ولو بلغ المال الخبیث نصاباً لا یجب فیہ الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق۔ (البزازیۃ علی ہامش الہندیۃ ج ۴ ص ۸۶ کتاب الزکوٰۃ ۔ الفصل الثانی فی المصرف)

قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: الحنطة بالحنطة مثلاً بمثل یداً بید والفضل ربٰو وعد الاشیاء الستة۔
(الهدایة ج۳ ص۷۷ باب الربٰوا) ۱؎

سُود پر قرضہ دینا ناجائز ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا سُود پر قرضہ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سود پر قرضہ دینا شرعی طور پر قطعاً ممنوع اور حرام ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں، قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں صراحتاً اس کی ممانعت ہے، اس لیے سُود پر قرضہ دینا جائز نہیں ہے۔

لما قال اللہ تعالیٰ: احل اللہ البیع وحرم الربٰو۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵) ۲؎

دَینِ مؤجل میں کمی کرکے معجل وصول کرنا حرام ہے

سوال:۔ ایک شخص کا دوسرے آدمی کے ذمہ پانچ ہزار روپے قرض تھا، مقروض نے اس میں کمی کا مطالبہ کیا، قرض خواہ نے کہا کہ دو ہزار روپے اس شرط پر کم کرکے معاف کرتا ہوں کہ بقایا تین ہزار روپے فوراً واپس کردو تو مقروض کا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرض خواہ کا مقروض کو اس شرط پر دو ہزار روپے معاف کرنا کہ بقایا تین ہزار روپے فوراً وصول کرے ناجائز ہے، عقد میں جو مدت مقرر کی گئی تھی یہ اس کا عوض ہے، دَینِ مؤجل کو معجل کر رہا ہے اور یہ حرام ہے۔

قال الامام الجصاص الرازی رحمہ اللہ: الرجل یکون علیہ الف درهم دَینٌ مؤجل

۱؎ قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: کل قرض جر نفعاً حرام اذا کان مشروطاً۔
(ردالمحتار ج۵ ص۱۶۶ باب الربٰوا۔ مطلب کل قرض جر نفعاً حرام)
وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۵۴ باب الرّبٰوا۔

۲؎ وفی الهندیة: قال محمدؒ فی کتاب الصرف ان ابا حنیفةؒ کان یکره کل قرض جرّ منفعة۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۳ ص۲۰۲ فصل فی الصرف)
وَمِثْلُہٗ فی الهدایة ج۳ ص۱۳۱ کتاب الحوالة۔

فیصالحہ منہ علیٰ خمس مائۃ حالہ فلا یجوز۔ (الاحکام القرآن ج ۲ ص۱۸۷) سلہ

قرض دے کر نفع متعین کرنا ناجائز ہے

سوال:۔ ایک آدمی کو کاروبار کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، کسی دوسرے آدمی نے کہا کہ اس شرط پر سرمایہ دوں گا کہ دس فیصد منافع مجھے ضرور دو گے، کیا اس شرط پر قرضہ دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ روپے بطور قرض دے کر اس پر دس فیصد یا کوئی بھی فیصد منافع مقرر کرنا سود ہے جو کہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: کل قرض جرّ نفعاً حرام ای اذا کان مشروطاً کما علم مما نقلہ عن البحر۔ (رد المحتار ج ۵ ص۱۶۶ باب الربوٰ۔ مطلب کل قرض جر نفعا حرام) [1]

مساوی حقوق کے وقت قرعہ اندازی سود نہیں

سوال:۔ چند آدمی ہر ماہ کچھ رقم جمع کرتے ہیں اور پھر قرعہ اندازی کے ذریعے جس کا نام نکل آتا ہے تو وہ جمع شدہ رقم لے لیتا ہے پھر ہر ماہ اپنے حصے کی رقم جمع کرتا رہتا ہے لیکن قرعہ اندازی سے اس کا نام نکل جاتا ہے، اس طرح باری باری قرعہ اندازی میں ہر ایک کا نام آتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ قرعہ اندازی سود ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چند افراد کا اس طرح ہر ماہ برابر برابر رقم جمع کرکے قرعہ اندازی کے

---

[1] قال العلامۃ برہان الدین المرغینانیؒ: لو کانت لہ الف مؤجلۃ فصالحہ علیٰ خمس مائۃ حالۃ لم یجز لان المعجل خیر من المؤجل وھو غیر مستحق بالعقد فیکون بازاء ما حطہ عنہ وذٰلک اعتیاض عن الاجل وھو حرام۔

(الھدایۃ ج ۳ ص۲۵۱ باب الصلح فی الدَّین)

وَمِثْلُہٗ فی الجوھرۃ النیرۃ ج ۲ ص ۷ کتاب الصلح۔

[2] قال العلامۃ قاضی ثناء اللہؒ: قولہ وحرم الربوٰ والمعنیٰ ان اللہ تعالیٰ حرم الزیادۃ فی القرض علی القدر المرفوع۔ (تفسیر مظہری ج ۱ ص۲۹۹ سورۃ البقرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاحکام القرآن للجصاص ج ۲ ص۱۸۹ سورۃ البقرۃ۔

ذریعے کسی ایک کو دینا امدادِ باہمی اور قرض ہے اس میں تملک اور تملیک نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک شریک چاہتا ہے کہ اس بار جمع کی گئی رقم مجھے مل جائے، تو رفع نزاع اور خوش دلی کے لیے قرعہ اندازی کر لیتے ہیں، جہاں سب شرکاء کے حقوق مساوی ہوں وہاں طیبِ خاطر کے لیے قرعہ ڈالنا جائز ہوتا ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ویکتب اسامیھم ویقرع لتطیب القلوب۔

(رد المحتار ج۵ ص۱۶۶ کتاب القسمۃ) ؎

مشتری کے ہاتھ مبیع نفع کی شرط پر بیچنے کا وعدہ سود نہیں

سوال:۔ زید بکر کو سود پر قرضہ دینا چاہتا تھا لیکن بکر نے انکار کر دیا، اس پر دونوں نے سود سے بچنے کے لیے ایک حیلہ سوچا، زید نے بکر سے کہا کہ میں تمہیں دو ہزار روپے دیتا ہوں، آپ اس کا کپڑا خرید یں اور آنے جانے کا خرچہ اور کرایہ بھی تمہیں دوں گا، مال اپنے قبضے میں لے لوں گا پھر ایک آنہ فی روپیہ نفع کے حساب سے ادھار پر آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا، تو کیا سود سے بچنے کا یہ حیلہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سود سے بچنے کا مذکورہ حیلہ درست ہے، بکر زید کا وکیل بن کر مال خرید ے اور زید کے حوالے کر دے پھر زید بکر کے ہاتھ دو ہزار کا کپڑا ایک آنہ فی روپیہ منافع کے حساب سے اُدھار پر فروخت کر دے تو یہ بیع صحیح ہے کیونکہ اس صورت میں زید نفع پر اپنا مال بکر کے ہاتھ بیچ رہا ہے اگرچہ سودا ادھار ہے، اس میں کسی قسم کا سود نہیں، زید نے صرف ابتداءً بکر کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ مال آپ کے ہاتھ فروخت کر دوں گا، یہ بھی کوئی ناجائز بات نہیں۔

قال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: کل حیلۃ یحتال بہا الرجل یتخلص

؎ قال العلامۃ ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: لا لان القرعۃ یتعلق بہا حکم بل لتطییب النفوس ولورود السنۃ بہا ولان ذلک انفی للتھمۃ فکان سنۃ۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۱۹ کتاب القسمۃ)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۵۲ کتاب القسمۃ۔

بھا عن حرام او یتوصل بھا الیٰ حلال فھی حسنۃ۔ (الاشباہ والنظائر ج۴ ص۳۱۹ کتاب الحیل)[1]

سُودی رقم کے عوض سودی رقم دے کر ذمّہ فارغ کرنا

سوال:۔ ایک آدمی کی بینک میں کچھ رقم تھی جس پر اس کا سود جمع ہو گیا، اب اس شخص نے اپنی کسی ضرورت کے لیے بینک سے کچھ رقم قرض لی، اس پر بھی بینک کا سُود آیا، کیا یہ شخص اپنا سود بینک کے سود کے عوض قبل القبض یا بعد القبض دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بینک میں رقم رکھنا دونوں طرف سے سودی معاملہ ہے، بینک میں رقم رکھنا یا بینک کی کسی کے ذمہ رقم دونوں قوی دَین ہیں، دونوں جب ایک دُوسرے کو اپنا اپنا سود چھوڑ رہے ہیں تو یہ بیع مقاصہ اور سود سے نفع حاصل کرنا ہے، اس لیے سود کی حرمت کی وجہ سے یہ معاملہ بھی حرام ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵)[2]

شئ مرہونہ سے نفع کی شرط سُود ہے

سوال:۔ زید سے عمرو نے پانچسو روپے قرض لیے اور اپنی کچھ زمین زید کے پاس اس شرط پر گروی رکھی کہ زمین کی پیداوار میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے، شرعاً اس معاملہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر زید نے قرضہ اس شرط پر دیا ہے کہ شئ مرہونہ سے انتفاع لے گا تو یہ حرام ہے کیونکہ کل قرض جرّ نفعًا فھو ربوا کے حکم میں آئے گا۔ اذا کان مشروطًا

---

[1] قال العلامۃ محمد خالد الاتاسی رحمہ اللہ: وکل حیلۃ یحتال بھا الرجل لیتخلص بھا عن حرام اولیتوصل بھا الیٰ حلال فھی حسنۃ۔

(شرح المجلۃ ج۲ ص۴۵۲ احکام الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۶ ص۳۹۰ کتاب الحیل۔

[2] قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: کل قرض جرّ نفعًا حرام۔

(الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۵ ص۱۶۶ باب الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الاحکام القراٰن للجصاصؒ ج۲ ص۱۸۹ سورۃ البقرۃ۔

صار قرضًا فیه منفعة وهو ربوا والافلا بأس، اگر نفع کی شرط نہ بھی لگائی ہو پھر بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: والغالب من احوال الناس انہم انما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاہ لما اعطاہ الدراھم وھذا بمنزلۃ الشرط لان المعروف کالمشروط وھو مما یعین المنع۔ (رد المحتار ج ۵ ص۳۱۰، ۳۱۱ کتاب الرھن) [1]

اشتراکِ قدر (پیمانہ) کی صورت میں اُدھار تبادلہ ناجائز ہے

سوال:۔ ایک شخص کو مکئی کی ضرورت ہے اور وہ کسی زمیندار سے معاہدہ کے تحت خاص مقدار میں مکئی لیتا ہے، اس زمیندار سے یہ کہتا ہے کہ میں تین ماہ بعد اتنی مقدار میں اس کے بدلے میں گندم دوں گا، تو کیا یہ معاملہ شرعًا جائز ہے؟

الجواب:۔ اس قسم کے اُدھار کا تبادلہ شرعًا جائز نہیں، اگرچہ مکئی اور گندم کی جنس مختلف ہے لیکن مکئی اور گندم دونوں کیلی ہیں یعنی پیمانہ سے یہ دونوں تولے جاتے ہیں، دو چیزوں کے تبادلہ میں جب جنس یا قدر میں اشتراک ہو تو تفاضل جائز ہے اور اُدھار ناجائز، اس کو ربا النسیئہ کہتے ہیں۔

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وان وجد احدھما ای القدر وحدہ او الجنس وحدہ حل التفاضل وحرم النساء۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۴ ص۱۹۹ باب الربوٰ) [2]

---

[1] قال الامام ابو بکر الجصاص الرازیؒ: قال ابوحنیفۃؒ وابویوسفؒ ومحمدؒ والحسن بن زیادؒ و زفرؒ لا یجوز للمرتھن الانتفاع بشیٔ من الرھن ولا للراھن ایضًا۔
(الاحکام القرآن ج ۱ ص۵۳۱ باب ضمان الرھن)
وَمِثْلُہٗ فی الاشباہ والنظائر ج ۳ ص۲۴۴ کتاب الرھن۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیم رحمہ اللہ: والنساء فقط باحدھما ای وحرم التاخیر لا الفضل بوجود القدر فقط او الجنس فقط۔
(البحر الرائق ج ۶ ص۱۲۸ باب الربوٰ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص۷۹ باب الربوٰ۔

نفع کی شرط پر قرض رقم دینا سود ہے

سوال:۔ ایک دوکاندار سے کسی گاہک نے کوئی چیز خریدنی چاہی جبکہ وہ چیز اس دوکاندار کے پاس نہ تھی اور اس نے گاہک سے کہا کہ مجھ سے یہ رقم لے کر خود اپنے لیے مطلوبہ چیز خرید لو لیکن میری رقم مجھے واپس کرتے وقت اصل زر کے ساتھ اتنا منافع بھی دینا ہوگا، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ مذکورہ دوکاندار کا یہ فعل بعینہٖ ربوٰا کا معاملہ ہے کیونکہ گاہک کو قرض رقم دے کر واپسی کے لیے اپنی اصل رقم سے زیادتی کی شرط لگا رہا ہے جو کہ سود ہے، دکاندار کو صرف اپنی قرض رقم واپس لینے کا حق ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: الذهب بالذهب مثلاً بمثل وزنا بوزن یداً بید والفضل ربٰو۔ (الهدایة ج ۳ ص ۱۰۶ کتاب الصرف) [1]

اُدھار کی وجہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا سود نہیں ہے

سوال:ایک دوکاندار ایک شئے کی جو نقد قیمت لگاتا ہے جب اُسی شئے کو اُدھار پر بیچتا ہے تو قیمت بڑھا دیتا ہے، کیا اس طرح کرنا سود تو نہیں؟

الجواب:۔ کوئی چیز اُدھار پہ بیچنے کی وجہ سے اس کی قیمت میں زیادتی جائز ہے اس لیے کہ اُدھار کے مقابلے میں نقد رقم کے فوائد اور منافع زیادہ ہیں، مثل مشہور ہے کہ "نو نقد اچھے تیرہ ادھار بُرے" اس لیے نقد اور ادھار سودے کی قیمت میں تفاوت رکھنا جائز ہے۔

قال العلامة برهان الدین المرغینانی رحمه الله: الا یری انهٗ یزاد

---

[1] قال العلامة الزیلعی رحمه الله: اذا بیع جنس الاثمان بجنسه کالذهب بالذهب او الفضة بالفضة یشترط فیه التساوی والتقابض قبل الافتراق ولا یجوز التفاضل فیه۔

(تبیین الحقائق ج ۴ ص ۱۳۵ کتاب الصرف)

وَمِثلُهٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۱۹۲ کتاب الصرف۔

فی الثمن لاجل الاجل - (الهدایۃ ج ۳ ص۷۶ باب المرابحۃ والتولیۃ) ؎۱

اشیاء ربویہ میں قرض کا معاملہ

سوال:- اشیاء ربویہ میں خرید و فروخت کے وقت برابری اور نقد کا معاملہ ہوتا ہے ادھار کا معاملہ ان میں صحیح نہیں ہوتا، اگر ایک آدمی کسی کو گندم قرض دے کر یہ کہے کہ تین ماہ بعد میری قرض گندم واپس کرنی ہوگی، ان اشیاء میں قرض کا معاملہ از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب:- اشیاء ربویہ میں خرید و فروخت کے معاملہ کے وقت کمی زیادتی اور اُدھار ناجائز ہے لیکن قرض کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ قرض تبرّع اور احسان ہے اس کا کچھ عوض نہیں ہوتا بلکہ مقررہ مدت کے بعد اس شئے کا بدل واپس کیا جاتا ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ: ان القرض تبرع الا یری انہ لا یقابلہ عوض للحال ......کان المستقرض انتفع بالعین مُدّۃ ثم ردّ عین ما قبض وان کان یرد بدل فی الحقیقۃ ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۹۶ کتاب القرض)

قال الکاسانیؒ: فیختص جوازہ بما لہ مثل -(" " ص۳۹۵ ") ؎۲

الحاصل یہ کہ قرض مثلی اشیاء میں جائز ہے۔

نقد رقم کو قسط وار کرکے زیادہ وصول کرنا

سوال:- ایک آدمی نے اپنا ٹرک ایک شخص کے ہاتھ فروخت کیا اور

؎۱ قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: ویزاد فی الثمن لاجلہ اذا ذکر الاجل بمقابلۃ زیادۃ الثمن قصداً فاعتبر مالاً فی المرابحۃ احترازاً عن شبہ الخیانۃ ولم یعتبر مالاً فی حق الرجوع عملاً بالحقیقۃ ۔

(رد المحتار ج ۴ ص۱۷۱ باب الربوا)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص۱۱۵ باب المرابحۃ والتولیۃ۔

؎۲ وفی الھندیۃ: ویجوز القرض فیما ھو من ذوات الامثال کالمکیل والموزون والعددی المتقارب کالبیض - (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۳ ص۲۰۱ باب فی القرض والاستقراض)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج ۴ ص۱۷۱ باب القرض۔

کچھ رقم نقد دے کر مشتری سے کہا کہ وہ بقایا رقم مبلغ تین ہزار روپے قسط وار ہر ماہ مجھے ادا کرتا رہے، اسی دوران ٹرک کے مالک کو رقم کی ضرورت پڑ گئی تو اس نے کسی تیسرے شخص سے چالیس ہزار روپے نقد لے کر مشتری کو اس کے حوالہ کر دیا اور اسے یہ کہا کہ وہ ستر ہزار روپے قسط وار آپ کو ادا کرتا رہے گا، یہ معاملہ شرعاً کیسا ہے؟

الجواب:۔ بائع کا مشتری کو اس طرح کسی تیسرے شخص کے حوالہ کرنا صحیح نہیں یہ بعینہٖ ربوا ہے کیونکہ اس صورت میں تیسرا شخص چالیس ہزار روپے نقد دے کر ستر ہزار قسط وار وصول کرے گا تیس ہزار روپے اس کو سود کے مل رہے ہیں، اس لیے یہ معاملہ شرعاً ناجائز و حرام ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵) [۱]

مضاربت کا منافع سود نہیں

سوال:۔ میرے بھائی نے مجھ سے بیس ہزار روپے کاروبار کے لیے اس شرط پر لیے کہ اس پر جو منافع ہوگا اس کا نصف آپ کا اور نصف میرا ہوگا، اس نے یہ بھی مجھ سے کہا کہ میں ہر ماہ حساب کتاب نہیں کر سکتا اس لیے اندازہ اور تحری سے حساب لگا کر منافع دے دیا کروں گا، اس طرح وہ مجھے کبھی ۱۰۰ روپے اور کبھی ۲۰۰ روپے دیتا رہا اور اس میں کمی بیشی ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیتے ہیں، کچھ عرصہ کے بعد مجھے تردد ہوا کہ یہ تو سود ہے اس لیے میں نے بھائی سے اس سلسلہ کو ختم کرنے کی بات کی، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کا کاروبار شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ سودی معاملہ نہیں ہے بلکہ مضاربت کی ایک صورت ہے اور نفع کو تحری سے معلوم کرنا مفضی الی الجہالۃ نہیں ہے اس لیے یہ صورت جائز ہے، مضاربت میں ایسی شرط لگانا جو جہالت فی الربح کا باعث ہو نا جائز ہے۔

کما نقل الشیخ علاؤ الدین بن محمد الحصکفیؒ من الجلالیۃ: کل شرط یوجب جہالۃ

---

[۱] قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: وقد نہی الرسول علیہ السلام عن قرض جرّ نفعاً۔ (الہدایۃ ج ۳ ص ۱۳۱ کتاب الحوالۃ)

ومثلہٗ فی تبیین الحقائق ج ۴ ص ۸۵ کتاب الحوالۃ۔

فی الربح او یقطع الشرکۃ فیہ یفسدھا والا بطل الشرط وصح العقد اعتبارًا بالوکالۃ اھ

(الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج ۴ ص ۵۴۰ کتاب المضاربۃ) [1]

بینک ڈرافٹ کی شرعی حیثیت

سوال:- آجکل لوگ بینک کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ڈرافٹ کی شکل میں رقم بھیجتے ہیں جس پر بینک والے بھیجی جانے والی رقم سے کچھ زیادہ وصول کرتے ہیں، کیا یہ سود ہے یا نہیں؟

الجواب:- بینک کے ذریعے ڈرافٹ کی شکل میں رقم ارسال کرنا بینک کو قرض دینا ہے امانت نہیں، کیونکہ رقم بدلتی بھی ہے اور ضائع ہونے کی صورت میں بینک ذمہ دار بھی ہوتا ہے اس لیے زیادتی کی شرط سود ہے البتہ اس میں یہ تاویل کرنی ممکن ہے کہ زیادتی رقم کو کتابت اور فارم وغیرہ کی فیس قرار دیا جائے، اس طرح سفتجہ کی شکل بن جائے گی جس کو فقہاء کرام نے مکروہ کہا ہے ، ابتلائے عام کی وجہ سے اس میں جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے کیونکہ پوری دنیا میں یہ طریقہ رائج ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے "امداد الفتاویٰ" میں منی آرڈر کے بارہ میں یہی تحقیق کی ہے [2]

---

[1] وقال العلامۃ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: الرابع ان یکون الربح بینھما شائعًا کالنصف والثلث لاسھمًا معینًا یقطع الشرکۃ کمائۃ درھم الخامس ان یکون نصیب کل منھما معلومًا فکل شرط یؤدی الی الجھالۃ الربح فھی فاسدۃ وما لا فلا۔ اھ

(البحر الرائق ج ۷ ص ۲۶۴ کتاب المضاربۃ)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۴ ص ۲۸۷ کتاب المضاربۃ - الفصل الاول۔

[2] قال العلامۃ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ: منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے، ایک قرض جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرا اجارہ جو فارم کے لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دی جاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے، اور چونکہ اس میں ابتلائے عام ہے اس لیے یہ تاویل کر کے جواز کا فتویٰ مناسب ہے۔

(امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۴۶ کتاب الربوٰا)

ڈاکخانہ میں جمع شدہ رقم پر منافع لینے کا حکم

سوال:۔ ڈاک خانہ میں جو رقم جمع کی جاتی ہے، سال بعد اس پر نفع ملتا ہے، اس نفع کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب:۔ جس طرح بینک سے سود لینا منع ہے اسی طرح ڈاک خانہ میں جمع شدہ رقم پر منافع (سود) لینا بھی منع ہے، سود کی حقیقت جہاں بھی پائی جائے وہ حرام ہوگی۔

قال اللہ تعالیٰ: احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۵) [1]

بیع محاقلہ ربٰو (سود) میں داخل ہے

سوال:۔ جو گیہوں ابھی بالیوں میں موجود ہو اُس کو صاف کئے ہوئے گیہوں کے عوض فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جن چھ چیزوں کے تبادلہ میں برابری، نقد قیمت اور دست بدست ہونا ضروری ہے اُن میں گندم بھی داخل ہے، اس کے تبادلہ کے وقت جب جنس ایک ہو تو کمی بیشی یا ادھار سود شمار ہوگا، کھیت میں کھڑی گندم کی فصل کو صاف کی ہوئی گندم کے عوض فروخت کرنا بیع محاقلہ ہے جبکہ بیع محاقلہ ربوٰ (سود) میں داخل ہے، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ: نھی عن المزابنۃ والمحاقلۃ فالمزابنۃ ماذکرنا والمحاقلۃ بیع الحنطۃ فی سنبلھا بحنطۃ۔

(الھدایۃ ج۳ ص۵۶ باب بیع الفاسد) [2]

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: وقد نھی الرسول علیہ السلام عن قرضٍ جرّ نفعًا۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۳۱ کتاب الحوالۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۲۴۴ کتاب الحوالۃ۔

[2] قال العلامۃ ابن الھمامؒ: نھی رسول اللہ عن المزابنۃ والمحاقلۃ۔

(فتح القدیر ج۶ ص۵۳ باب بیع الفاسد)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۶ ص۷۶ باب بیع الفاسد۔

پی ایل ایس (غیر سودی کھاتہ)

سوال :- آج کل لوگ بینکوں میں پی ایل ایس کے نام سے اکاؤنٹ کھولتے ہیں، کیا اس کھاتہ میں رقم جمع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- بینکوں کے تمام معاملات سود سے منسلک ہیں، حکومت نے سود سے بچنے کے لیے نفع نقصان کے نام سے یہ شاخ کھولی ہے لیکن اس کا صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا مشکوک ہے، اگرچہ حکومت اور بینکوں کی انتظامیہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں سودی عنصر نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ پی ایل ایس میں بھی اکاؤنٹ نہ کھولا جائے، احتیاط اسی میں ہے اس لیے کہ سود بہت بڑا گناہ ہے، بشبہ سود اس میں ترک ہی بہتر ہے۔

لما اخرجه الامام ابوداؤدؒ: لما لعن رسول اللہ آکل الربوا ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال وھو سواء۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۴۷۳ باب الربو) [1]

انعامی بانڈز کی خرید و فروخت کا حکم

سوال :- آجکل پرائز بانڈز پر انعامات ملنے کا رواج عام ہے، کیا ایسا انعام لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- پرائز بانڈز (انعامی بانڈز) سود اور قمار (جوا) کی مثل ہیں، حکومت کے بجٹ میں جب بھی خسارہ ہوتا ہے تو اس کو پورا کرنے کے لیے مختلف حیلے بہانے اختیار کرتی ہے، انعامی بانڈز بھی حکومتی بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، خرید شدہ بانڈز کی قیمت پر سود لگتا ہے اور جو سود بنتا ہے اس کو قرعہ اندازی کے ذریعے جوا بنا دیا جاتا ہے، چند افراد کے نام ہی قرعہ نکلتا ہے اور باقی فی الحال محروم رہ جاتے ہیں، لہٰذا سود اور قمار کی وجہ سے ان بانڈز کی خرید و فروخت اور ان پر نکلا ہوا

---

[1] کما ورد فی الحدیث: عن جابر رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اکل الرّبوٰا ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال وھو سواء۔

(مسلم شریف ج ۲ ص ۲۷ باب الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الترمذی ج ۱ ص ۲۲۹ باب ما جاء فی اکل الربوٰ، ابواب البیوع۔

انعام لینا شرعاً جائز نہیں۔

قال اللہ تعالیٰ: (۱) اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (البقرۃ ۲۷۵)

(۲) اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ۔ (المائدۃ ۹۰) [1]

مروجہ کرنسی نوٹوں کے تبادلہ میں مساوات شرط ہے

سوال: ایک ملک کی کرنسی یعنی نوٹوں کے تبادلہ میں کمی زیادتی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: آجکل دُنیا میں رائج الوقت کرنسی نوٹوں کی حیثیت ثمنِ عرفی کی ہے جن کو ہم فلوس نافقہ کہہ سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فلوس نافقہ کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ اس لئے ان کے ہاں ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ باہمی کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔

لیکن امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں، اس لیے کہ آجکل پوری دنیا میں کاغذی کرنسی کا رواج ہے، سونا چاندی بالکل مبیعہ ہو کر رہ گئی ہے، اگر اس کے تبادلہ میں تفاضل کی اجازت دے دی گئی تو سود کا دروازہ کھل جائے گا لہٰذا امام محمدؒ کے قول کے مطابق کرنسی نوٹوں کے تبادلہ میں تفاضل کو ناجائز قرار دینا چاہیئے۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: قولہ فلس بفلسین هذا عندهما وقال محمدؒ لا یجوز۔

(ردالمحتار ج ۴ ص ۱۱۸ باب الربوٰ) [2]

دارالحرب میں کسی غیر مسلم سے سود لینا منع ہے

سوال: کیا مسلمان کے لیے دارالحرب میں کسی غیر مسلم سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامۃ الجصاص الرازیؒ: ولا خلاف بین اهل العلم فی تحریم القمار وان المخاطرۃ من القمار۔ (الاحکام القرآن ج ۱ ص ۳۲۹ البقرۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الهدایۃ ج ۳ ص ۱۳۱ کتاب الحوالۃ۔

[2] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: صح بیع الفلس بفلسین معینین عندهما وقال محمد لا یجوز۔ (البحر الرائق ج ۶ ص ۱۳۱ باب الربوٰ)

وَمِثْلُہٗ فی الهندیۃ ج ۳ ص ۱۱۸ الباب الربوٰ، الفصل السادس فی تفسیر الربوٰ واحکامه۔

الجواب:۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود لینے کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن سود کی حرمت کے بارے میں قرآن وحدیث میں نصوص مطلق ہیں، جس سے ہر جگہ سود کی حرمت معلوم ہوتی ہے، جمہور علماء اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک دارالحرب میں کسی بھی غیر مسلم سے سود لینا حرام ہے، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود نہ لیا جائے۔

قال الامام المرغینانیؒ: ولا بین المسلم والحربی فی دار الحرب خلافاً لابی یوسفؒ والشافعیؒ۔ (الهداية ج۳ ص۸۷ باب الربوٰ) ؎۱

دارالاسلام میں کسی بھی غیر مسلم سے سود لینا جائز نہیں

سوال:۔ دارالاسلام میں جو غیر مسلم ذمی رہتے ہیں اور دیگر کفار جب مال تجارت وغیرہ لے کر کچھ عرصہ کے لیے آئیں تو اُن سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرآن وحدیث میں مطلقاً سود کی حرمت مذکور ہے، اور فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ کسی ذمی غیر مسلم سے سود لینا منع ہے، اس لیے دارالاسلام میں کسی غیر مسلم سے سود لینا ناجائز ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغينانی رحمه الله: بخلاف المستأمن منهم لان ماله صار محظوراً بعقد الامان۔ (الهداية ج۳ ص۸۷ باب الربوٰ) ؎۲

؎۱ قال العلامة ابن نجیمؒ: ای لا ربا بینهما فی دار الحرب عندهما خلافاً لابی یوسفؒ۔ (البحر الرائق ج۶ ص۱۳۵ باب الربوٰ)

لما قال العلامة الزيلعی رحمه الله: وقال ابویوسفؒ والشافعیؒ لا یجوز لان المسلم التزم بالامان ان لا یتملک اموالهم الا بالعقد۔ (تبیین الحقائق ج۴ ص۹۷ باب الربوٰ)

؎۲ قال العلامة ابن الهمامؒ: بخلاف المستأمن منهم عندنا لان ماله صار محظوراً بالامان۔ (فتح القدير ج۶ ص۱۷۸ باب الربوٰ)

ومثله فی تبیین الحقائق ج۴ ص۹۷ باب الربوٰ۔

تفسیر عبارت لا ربا بین المسلم و الحربی

سوال:۔ فقہ حنفی کی کتابوں میں صراحتاً مذکور ہے: ولا ربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دار الحرب میں غیر مسلموں سے سود لینا جائز ہے، برائے مہربانی اس عبارت کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ اول تو اس میں اختلاف ہے، جمہور علماء اور امام ابو یوسفؒ، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ اور پیش کردہ عبارت کا مطلب و مفہوم یہ ہے کہ دار الحرب میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین سرے سے سود کا تحقق ہی نہیں ہوتا کیونکہ حربی کا مال مباح اُسے کسی بھی طریقے سے حاصل کیا جائے تو وہ جائز ہوتا ہے، اس لیے فقہاء کرام اس عبارت کی تشریح میں فرماتے ہیں: ولان مالھم مباح فی دارھم فبای طریق اخذہ المسلم اخذ مالاً مباحاً اذ لم یکن فیہ غدر۔ فقہاء کرام نے اس کے لیے لفظ جواز استعمال نہیں کیا، حدیث میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔

قال العلامہ برھان الدین المرغینانیؒ: لا ربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۸۷ باب الربوٰ)[۱] یہاں بھی ربوٰ (سود) کی نفی ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ اور سود کا مسئلہ

سوال:۔ ہر سرکاری ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ حکومت تنخواہ کا کچھ حصہ وضع کرتی رہتی ہے ہر سال کے بعد اس رقم پر سود لگتا ہے، اختتام ملازمت (ریٹائرمنٹ) پر حکومت یہ ساری جمع شدہ رقم ملازم کو مع سود کے ادا کر دیتی ہے، اس رقم کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ حکومت کی طرف سے سرکاری ملازم کو جو رقم اختتام ملازمت کے وقت ملتی ہے وہ شرعاً سود نہیں کیونکہ سود دو آدمیوں کے مابین عقد ہوتا ہے جبکہ دونوں طرف سے مال ہو اور مال ان کا مملوک ہو، مسئلہ مذکورہ میں ملازم کی تنخواہ سے جو

---

[۱] قال الامام ابن الھمامؒ: ولان مالھم مباح واطلاق النصوص فی مال محظور وانما یحرم علی المسلم اذا کان بطریق الغدر فاذا لم یاخذ غدراً فبای طریق یأخذہ حل بعد کونہ برضا۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۱۷۸ باب الربوٰ)
ومثلہٗ فی تبیین الحقائق ج ۴ ص ۹۷ باب الربوٰ۔

رقم کٹتی ہے وہ ملازم کی ملک نہیں ہوتی۔ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں: قولہ بل بالتعجیل او بشرطیہ او بالاستفہام او بالتمکن ای لا یملک الاجرۃ الا بواحد من ھذہ الاربعۃ۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۰۰) اس رقم پر ابھی مالک کا قبضہ نہیں ہوا اور نہ ہی اسکے وکیل نے قبضہ کیا ہے، اس کے تصرفات اس میں نافذ نہیں، ایسی رقم کے ساتھ حکومت کا معاملہ یکطرفہ ہے، اس جمع شدہ رقم کو اگر حکومت سود پر دے یا کوئی اور معاملہ کرے یا اس پر خود سود لگائے یہ سب یکطرفہ کاروائی ہے، اختتام ملازمت پر جب حکومت یہ رقم ملازم کو دے تو حکومت کی طرف سے اجرت ہی کہلائے گی، اس طرح یہ رقم اُجرت کا جزء مؤجل ہوگی نہ کہ سود۔ [۱]

جی پی فنڈ کی رقم حصول سے قبل کسی کمپنی یا بینک کو سود پر دینے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی سرکاری ملازم درخواست دے کر جی پی فنڈ کی رقم کٹتی کمپنی یا بینک کے حوالے کر کے اس پر سود حاصل کرے تو اس سودی رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ کوئی بھی سرکاری ملازم اگر درخواست دے کر اپنے جی پی فنڈ کی رقم کسی بینک یا بیمہ کمپنی کے حوالہ کر دے تو وہ کمپنی اس کی وکیل بن جائے گی، وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہوتا ہے لہٰذا کمپنی وکیل کے اعتبار سے جتنا سودی کاروبار کرے گی وہ ایسا ہوگا جیسے یہ خود اس میں ملوث ہے، کیونکہ ملازم نے باختیار خود یہ رقم کمپنی کے حوالہ کی ہے، یہ سودی رقم دوبارہ حکومت کے خزانہ میں جا کر جمع ہو جاتی ہے، اختتام ملازمت پر جب یہ رقم ملازم کو ملے گی تو سودی رقم ہوگی اس کو وہ شرعاً اپنے مصرف میں نہیں لا سکتا۔

قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ: وقد نہی الرسول علیہ السلام عن قرض جر نفعاً۔ (الہدایۃ ج۳ ص۱۳۱ کتاب الحوالۃ) [۲]

---

[۱] قال الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ: جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود کے نام پر رقم ملتی ہے وہ شرعاً سود نہیں بلکہ اُجرت (تنخواہ) ہی کا ایک حصہ ہے۔ (پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص۴)
ومثلہ فی امداد الفتاوٰی ج۳ ص۱۴۸ کتاب الربٰو۔

[۲] قال الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ: اگر بینک یا کمپنی وغیرہ اس رقم پر کچھ سود دے تو یہ شرعاً بھی سود ہوگا جس کا لینا ملازم کے لیے قطعاً حرام ہوگا۔
(پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص۲۶)

ملازم کی اجازت سے اس کی تنخواہ سے پراویڈنٹ فنڈ کی کٹوتی کا حکم

سوال:۔ کوئی بھی سرکاری ملازم جب اپنی تنخواہ سے بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے کچھ رقم کٹوائے اور وہ جمع ہوتی جائے تو اختتامِ ملازمت (ریٹائرمنٹ) کے وقت اس جمع شدہ رقم کے ساتھ حکومت کی طرف سے جو مزید رقم دی جاتی ہے از روئے شرع اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس صورت میں پراویڈنٹ فنڈ کے ساتھ حکومت کی طرف سے دی جانے والی مزید رقم تشبہ بالربوٰ ہے، اگرچہ ملازم اپنی اُجرت وصول کرنے سے قبل یہ رقم کٹواتا ہے لیکن پھر بھی اپنی اجرت میں تصرف ہے اور سود خوری کا ذریعہ بننے کا قوی احتمال ہے لہٰذا ایسی رقم سے اجتناب ہی کیا جائے خواہ محکمہ سے وصول کرے یا نہ کرے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: کل قرض جرّ نفعاً حرام اذا کان مشروطاً۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۱۶۶ باب الربوٰ۔ مطلب کل قرض جرّ نفعاً حرام)[۱]

گاڑی دلوانے کے عوض اصل رقم سے زائد کا مطالبہ کرنا سود ہے

سوال:۔ آجکل ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں یہ رواج ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو اپنے پیسوں سے گاڑی خرید کر دیتا ہے اور اس سے یہ اقرار نامہ تحریر کراتا ہے کہ سال یا دو سال کے بعد دو لاکھ کی جگہ تین لاکھ دے گا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کاروبار کی مذکورہ صورت سودی ہے اسلئے کہ گاڑی خریدنے والا مشتری کا وکیل ہے اور گاڑی کی رقم مشتری کے ذمے قرض ہے جبکہ قرض پر منافع لینا شرعاً ربوٰ (سود) ہے البتہ یہ جائز ہے کہ پہلے گاڑی اپنے لیے خریدے اور پھر تین لاکھ روپے میں مشتری پر فروخت کر دے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: کل قرض جرّ نفعاً حرام۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۱۶۶ فصل فی القرض)[۲]

---

[۱] قال الشیخ المفتی محمد شفیع الدیوبندیؒ: پراویڈنٹ فنڈ میں رقم اپنے اختیار سے کٹوائی جائے تو اس میں تشبہ بالربوٰ بھی ہے اور ذریعۂ سود بنا لینے کا خطرہ بھی ہے اسلئے اس سے اجتناب کیا جائے۔ (پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص ۴)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص ۲۵۴ کتاب الحوالۃ۔

[۲] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: القرض الذی جرّ منفعۃ قال الحنفیۃ فی الراجح عندھم کل قرضٍ جرّ نفعاً حرامٌ اذا کان مشروطاً۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۴ ص ۷۲۴ فصل فی القرض)

انعامی اسکیموں کا حکم

سوال:۔ لکی انعامی سکیم یا دیگر انعامی ٹکٹوں کا کاروبار کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اس میں ملنے والے انعام کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اس قسم کی انعامی سکیموں پر جوئے کی تعریف صادق آتی ہے اسلئے لکی انعامی سکیم یا دیگر کسی بھی قسم کی انعامی ٹکٹوں کا کاروبار شرعاً جائز نہیں اور اس سے ملنے والی انعامی رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: اکتسب حراماً واشتریٰ بہ..... تصدق بالربح والّا لا وھٰذا قیاس وقال ابوبکر کلاھما سواء ولا یطیب لہٗ۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۲۱۹ مطلب اذا اکتسب حراماً ثم کذا)[1]

غیر ملکی کرنسی کو اضافی قیمت پر خریدنا

سوال:۔ آجکل غیر ملکی کرنسی کی خرید وفروخت کا کاروبار عام ہے، تاجر لوگ غیر ملکی کرنسی کم قیمت پر خرید کر زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں، مثلاً سعودی ریال ۱۳ روپے میں خرید کر ۱۵ روپے میں فروخت کیا جاتا ہے۔ تو کیا اس طرح غیر ملکی کرنسی کی خرید و فروخت سود میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ سود متحقق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اشیاء ایک ہی جنس سے ہو، اگر جنس مختلف ہو جائے تو ان میں تفاضل (یعنی) جائز ہے۔ موجودہ دور میں مختلف ممالک کی کرنسی مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہے، اس لیے ان کی خرید و فروخت میں کمی بیشی جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ایک سعودی ریال ۱۳ روپے میں خرید کر ۱۵ روپے میں فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابوالحسن القدوریؒ: فاذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنساء واذا وجد حرم التفاضل والنساء واذا وجد احدھما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء۔ (مختصر القدوری علیٰ صدر اللباب ج۱ ص۱۲۱ باب الربوٰ)

---

[1] وفی الھندیة: کان المال بمقابلة المعصیة فکان الأخذ معصیة والسبیل فی المعاصی ردھا وذٰلک ھٰھنا برد المأخوذ ان تمکن من ردہ بان عرف صاحبہ وبالتصدق بہ ان لم یعرفہ۔ (الفتاوی الھندیة ج۵ ص۳۴۹ الباب الخامس عشر فی الکسب۔ کتاب الکراھیة)

بینک کی تعمیر کے لیے زمین دینا

سوال:۔ بینک بنانے کے لیے اپنی مملوکہ زمین حکومت کو قیمتاً دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حکومت کو بینک بنانے کے لیے زمین دینے سے اجتناب کرنا چاہیئے، کیونکہ زمین دینے والے کو زمین کے عوض سود سے حاصل شدہ رقم ملے گی۔ اور دوسرا یہ کہ بینک کا موجودہ نظام اندرون ملک و بیرونِ ملک بڑے بڑے سودی کاروباروں میں پھنسا ہوا ہے جبکہ زمین دینے کی صورت میں اعانت علی المعصیت لازم ہے، پس جس طرح سود سے اجتناب ضروری ہے اسی طرح سودی نظام کو سہارا دینا بھی مناسب نہیں۔ اس بناء پر حکومت کو بینک کے لیے زمین دینے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لما قال اللہ تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ۔ (سورۃ المائدۃ آیت ۲) [۱]

پرانے کرنسی نوٹ نئے نوٹوں کے ساتھ کم قیمت پر تبدیل کرنا

سوال:۔ پرانے کرنسی نوٹوں کی تبدیلی کے لئے طریقہ کار یہ ہے کہ جب کوئی شخص پھٹے پرانے نوٹ نئے نوٹوں سے تبدیل کرنا چاہتا ہے تو بینک اس سے کچھ کٹوتی کرتا ہے۔ مثلاً سو روپے کے پھٹے پرانے نوٹ کے بدلے میں نئے نوٹ پانچ یا دس روپے کم ملتے ہیں۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب:۔ مروجہ کرنسی کی حیثیت فلوس نافقہ کی ہے اس میں صفت ثمنیت عرف کی وجہ سے آئی ہے۔ فلوس نافقہ کی باہمی تفاضل کے ساتھ بیچنے میں احناف کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے ہاں ان کی باہمی بیع تفاضل کے ساتھ جائز ہے۔ جبکہ امام محمدؒ کے ہاں جائز نہیں۔ اگرچہ عمومی طور پر ربا (سود) سے بچنے کے لئے فی زماننا امام محمدؒ کا قول مفتی بہ ہے مگر پھٹے پرانے نوٹوں کا بینک کے ساتھ تبادلے میں کافی پیچیدگیاں ہیں۔

---

[۱] قال العلامۃ سلطان بن علی القاری رحمہ اللہ: عن جابرؓ قال لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربٰوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ قال النواوی فیہ تصریح بتحریم کتابۃ المترابیین والشہادۃ علیھما وبتحریم الاعانۃ علی الباطل وقال ھم سواء۔

(المرقاۃ ج۶ ص۵۹ باب الربٰوا۔ الفصل الاول)

ومثلہٗ فی الجامع الصغیر ص۴۲۹ باب الربٰو۔

لہٰذا ان پیچیدگیوں کی وجہ سے شیخین کے فتویٰ کی بنا پر پھٹے پرانے نوٹوں کو نئے نوٹوں کے ساتھ کمی بیشی پر تبدیل کرنا جائز ہے،

کما قال العلامة مرغینانی: ویجوز بیع الفلس بالفلسین بأعیانهما عند ابی حنیفة وابی یوسف وقال محمد لا یجوز الخ - الهدایة علی البنایة ۱۰/ص۱۷م کتاب البیوع - باب الربا

زمین کا زمین سے تبادلہ جائز ہے

سوال: ایک شخص اپنی زمین کا مخصوص حصہ دوسرے شخص کو زمین کی معینہ مقدار کے عوض دیتا ہے تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب: اموالِ ربویہ میں زیادتی اس وقت حرام ہے جب جنس اور قدر ایک ہو ورنہ کسی ایک کی موجودگی میں تفاضل جائز ہے لہٰذا زمین کا زمین کے عوض فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: سئل فیما اذا کان لزید قطعة ارض جاریة فی ملکه فباعه من عمرو بقطعة ارض مثلها بیع مقائضة بیعاً باتاً شرعیاً مسلماً لدی بینةٍ شرعیة فهل صح البیع المزبور- الجواب نعم۔

(تنقیح الفتاوی الحامدیة ج۱ ص۲۶۴ کتاب البیوع) [1]

گندم اور مکئی کا تبادلہ

سوال: گندم اور مکئی کا تبادلہ کبھی برابر اور کبھی کبھار کمی بیشی سے کیا جاتا ہے، اسی طرح کبھی دست بدست اور کبھی اُدھار سے معاملہ طے ہوجاتا ہے، کیا اس طریقہ سے گندم اور مکئی کا تبادلہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: گندم اور مکئی کا تبادلہ اگر دست بدست ہو تو جائز ہے خواہ ایک کم اور دوسرا زیادہ کیوں نہ ہو لیکن اُدھار درست طریقہ نہیں کیونکہ دونوں قدر میں متحد اور جنس میں مختلف ہیں اس لیے ادھار پر بیچنے سے اجتناب کیا جائے۔

---

[1] قال محمد خالد الاتاسیؒ: بیع المقایضة بیع العین بالعین ای مبادلة مالٍ بمالٍ غیر النقدین ثم ان اتفقا جنساً وقدراً اشترط لصحتها تساوی البدلین وتعینهما۔

(شرح مجلة الاحکام تحت المادة ۱۲۲ ج۲ ص۱۲)

ومثله فی البحر الرائق ج۶ ص۱۲۸ تحت قوله والنساء فقط بادراهما۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: واذا عدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والاصل فیہ الاباحة واذا وجد حرم التفاضل والنساء لوجود العلة واذا وجد احدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء مثل ان یسلم هرویا فی هروي وحنطة فی شعیر فحرمة ربا الفضل بالوصفین وحرمة النساء باحدهما۔ (الهدایة ج۳ ص۸۱ باب الربوٰ) [1]

فصل کے بدلے اناج دینا

سوال:۔ ایک شخص کو غلہ کی ضرورت ہے لیکن فصل ابھی تیار نہیں ہوئی، ایسی حالت میں اگر وہ کسی سے تیار غلہ خرید کر اس کے عوض کھیت میں کھڑی فصل دے دے تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسی صورت میں تیار غلہ کے بدلے میں وہ غلہ لیا جاتا ہے جو کہ کھیت میں ہے اور اس کی مقدار معلوم نہیں صرف تخمیناً اس کا اندازہ کرکے فروخت کیا جاتا ہے، چونکہ غلہ کی غلہ کے بدلے فروخت میں مقدار معلوم کرنا ضروری ہے ورنہ اس میں ربٰوا (سود) کا شبہ باقی رہتا ہے اس لیے مذکورہ صورت تبادلہ کی جائز نہیں۔

لما قال العلامة علی بن ابی بکر المرغینانی رحمہ اللہ: ولا یجوز..... بیع المزابنة..... والمحاقلة فالمزابنة ما ذکرنا والمحاقلة بیع الحنطة فی سنبلها بحنطة مثل کیلها خرصا لانه باع مکیلا بمکیل من جنسه فلا یجوز بیع بطریق الخرص کما اذا کان موضوعین علی الارض۔ (الهدایة ج۳ ص۵۴ باب ما یجوز وما لا یجوز) [2]

---

[1] قال السلیم رستم باز اللبنانی رحمہ اللہ: بیع المقایضة بیع العین بالعین ای مبادلة مال بمال غیر النقدین وشرط صحة المقایضة التساوی فی التقایض ان اتفقا جنسا وقدرا کبیع حنطة بحنطة والا فالتقایض لا التساوی کبیع کر حنطة بکری شعیر۔
(شرح المجلة تحت المادة ۱۲۲ ص۱۲ کتاب البیوع)

ومثلہ فی البحر الرائق ج۶ ص۱۲۸ باب الربوٰ۔

[2] قال العلامة ابن نجیم المصری رحمہ اللہ: والمزابنة ای لم یجز بیع المزابنة لنهیه صلی اللہ علیه وسلم عن بیع المزابنة والمحاقلة۔ والمحاقلة بیع الطعام فی سنبله بالبر۔
(البحر الرائق ج۶ ص۷۶ تحت قوله والمزابنة۔ کتاب البیوع)

ومثلہ فی فتح القدیر ج۶ ص۵۴ باب البیع الفاسد۔

سونا چاندی قرض کی صورت میں زیادہ قیمت پر فروخت کرنا

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر زرگر (سنار) حضرات سونا اور چاندی گاہک کو نقد مثلاً ۶۰۰/- روپے فی تولہ دیتے ہیں اور اگر قرض پر دیں تو ۶۵۰/- روپے فی تولہ دیتے ہیں، تو کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ باحوالہ جواب تحریر فرمائیں؟

الجواب :- موجودہ کرنسی نوٹ نہ سونے چاندی کی طرح ثمن خلقی اور نہ سونے چاندی کی رسید بلکہ قانونی تحفظ اور تقرر کی بناء پر ثمن عرفی یعنی فلوس نافقہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جو جنسیت میں سونے چاندی سے الگ ہے، اسی طرح سونا چاندی مقدوری ہے، بخلاف موجودہ کرنسی کے کہ وہ عددی ہے، اس لیے دونوں کی باہمی تجارت تفاضل اور ادھار دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ احد العوضین (دونوں میں سے کسی ایک) پر قبضہ ہو چکا ہو۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں سونے چاندی کو نقد ۶۰۰/- روپے فی تولہ اور ادھار کی صورت میں ۶۵۰/- روپے فی تولہ فروخت کرنا جائز ہے مگر عند العقد سونے چاندی پر مشتری کا قبضہ کرنا صحتِ بیع کے لیے ضروری ہے بدون اس کے بیع صحیح نہیں ہوگی۔

لما قال العلامۃ مفتی محمد تقی عثمانی : لیکن اس زمانے میں علماء اور فقہاء کی ایک بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو ان کاغذی نوٹوں کو ثمن عرفی کے طور پر مال قرار دیتی تھی۔
(فقہی مقالات جلد ۱ ص۲۳ دنیا کے کرنسی نظام میں... الخ)

وقال ایضاً : اسی طرح اب سونا کرنسی کے دائرہ سے بالکل خارج ہو چکا ہے اور اب سونے کا کرنسی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ (فقہی مقالات جلد ۱ ص۲۱)

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ : باع فلوسًا بمثلها او بدراهم او بدنانير فان نقد احدهما جاز وان تفرقا بلا قبض احدهما فلا يجز۔

(الدر المختار ج ۴ ص۲۰۴ باب الربوٰ، مطلب فی استقراض الدراهم)

قال العلامۃ ابن عابدين رحمہ اللہ : سئل الحانوتی عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فاجاب بانه يجوز اذا قبض احد البدلين۔

(رد المحتار ج ۴ ص۲۰۵ باب الربوٰ، مطلب فی استقراض الدراهم)

اسٹیٹ لائف کمپنی کی دجل و تلبیس

اور

بیمہ کی شرعی حیثیت پر دار العلوم حقانیہ کا اصل فتویٰ

سودی نظام کی محافظ حکومت اور ایک بیمہ کمپنی کی دجل و تلبیس کا تازہ شاہکار ذیل کا وہ جعلی فتویٰ ہے جو انہوں نے جامعہ دار العلوم حقانیہ کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی حضرت مولانا محمد فرید مدظلہ سے منسوب کر کے ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا ہے، جس پر مفتی صاحب موصوف کے دستخط اور فتویٰ نمبر دونوں جعلی ہیں۔

استفتاء کے جواب میں مفتی صاحب سے منسوب جعلی فتویٰ کی عبارت درج ذیل ہے:۔

جواب:۔ "ان حوالہ جات سے واضح ہے کہ دینی مسائل گذارشات بدنیتی سے پیدا ہوتے ہیں برصغیر کی اکثریت جن علماء کی پیروی کرتی ہے اکثر کا فتویٰ بیمہ کو جائز قرار دیتا ہے۔

اس بات میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ شراکت کا مسئلہ بظاہر قابل اعتراض نہیں ہے، پس اگر بیمہ کمپنی ان رقوم سے تجارت، صنعت، خدمات اور دیگر شعبوں میں ممبران کو منافع کی شکل میں کچھ نہ کچھ دیتی ہے تو قابل اعتراض نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ سائل نے اپنی خیر مقدمی تحریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے یہ سچ ہے کہ تمام حوالہ جات (اشارہ) وہ مشہور اور تسلیم شدہ حقائق ہیں اور اس میں کسی بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انتشار و افتراق سے بچنے کو ختم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک اسلامی ملک میں رہتے ہوئے اس کو بار بار پیچیدہ مسئلہ نہ بنایا جائے۔ الغرض سود سے مراد وہ رقم ہے جو قرض دی جائے یا لی جائے"۔

اہل علم، قارئین اور حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ اور ان کے طرز تحریر سے واقف حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ جعلی فتویٰ کی یہ عبارت کس قدر بودی اور جہالت پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کا اصل فتویٰ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے ماہنامہ الحق میں شائع ہو چکا ہے ذیل میں وہی فتویٰ دوبارہ نذر قارئین ہے تاکہ سودی نظام کی محافظ حکومت کا شرمناک کردار اور بیمہ کمپنی کی جعل سازی اور دجل و فریب بے نقاب ہو جائے۔ (مرتب)

بیمہ زندگی کی شرعی حیثیت

سوال : یہاں پر تمام ملک (انگلینڈ) میں ایسی کمپنیاں ہیں، جو کہ آدمی کو انشورنس (بیمہ) کرکے اس سے جوان سے کے قواعد کے مطابق خرچ ہوتا ہے وہ لے کر اس کو اس کے بعد اس معینہ مدت کے اندر یہ ذمہ داری لیتے ہیں کہ اگر اس کو کچھ ہو جائے تو اس کو ایک اچھی خاصی رقم جتنی کہ اس طرح کی پالیسی کرتے وقت عائد ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے باقیماندہ وارثوں کو دے دیتے ہیں اس کے علاوہ یہاں پر کام بھی جب ہی ملتا ہے کہ یہاں کے گورنمنٹ کے قانون کے مطابق انشورنس پہلے کرنی پڑتی ہے۔ آپ ازراہ کرم اس کے متعلق پوری تفصیل لکھیں کہ اسلامی قوانین اس قسم کی چیزوں کے کرنے پر کسی طرح کی خلاف ورزی کرنی پڑتی ہے۔ امید ہے آپ اس کی پوری تحقیق کرکے ہمیں اچھی طرح آگاہ کریں گے۔ ہماری کمیٹی کی طرف سے آپ تمام بزرگوں کو سلام مسنون قبول ہو۔

الجواب : ہمارے علم کی حد تک بیمۂ زندگی کی جو کچھ حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ یہ بیمہ اشخاص اور کمپنیوں کے درمیان ایک خاص قسم کا معاملہ اور عقد ہے جس میں افراد اور کمپنیوں کے مابین ان کے قوانین کے تحت حسب ذیل چند امور طے پاتے ہیں۔

(۱) بیمہ دار شخص ایک معین مقدار کی رقم (مثلاً ایک ہزار روپیہ) معینہ مدت مثلاً ایک سال یا دو سال تک بالاقساط ادا کرتا ہے۔ اور کمپنیاں اس کو معینہ منافع سالانہ پیش کرتی ہیں۔

(۲) یہ رقم کمپنیاں جس کام میں چاہیں صرف کر لیتی ہیں، خواہ وہ کام جائز ہوں جیسے عمارات وغیرہ) یا ناجائز ہوں جیسے سودی لین دین کے معاملات۔

(۳) بیمہ شدہ شخص اگر معینہ مدت تک بقید حیات رہے۔ اور پوری معین رقم بالاقساط اس نے کمپنی کو ادا کر دی تو وہ کمپنی سے یکمشت بالاقساط مجموعہ رقم سے زائد زر بیمہ لینے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ مقررہ مدت سے پہلے مر جائے۔ تو زر بیمہ کا مستحق اس کے ورثاء میں سے وہ شخص ہوگا۔ جو اس نے نامزد کیا ہو۔

(۴) بالفرض اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے قبل اقساط کی ادائیگی کو بند کر کے عقد بیمہ کو فسخ کرنا چاہے، تو جتنی رقم اس نے بالاقساط کمپنی کو ادا کی ہے۔ اس کو وہ رقم واپس نہیں ملے گی۔"

اگر درحقیقت" بیمۂ زندگی" کی حقیقت یہی ہو جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ تو اس کو ہم درج ذیل وجوہ کی بنا پر ناجائز اور حرام سمجھتے ہیں۔

وجہ اول : پہلی وجہ یہ ہے کہ اس عقد میں ایک طرف سود پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ کمپنی اس کو سالانہ

معینہ منافع پیش کرتی ہے۔ نیز معینہ مدت تک زندہ رہنے۔ اور تمام اقساط ادا کرنے کی صورت میں بیمہ دار شخص اقساط کی مجموعہ رقم سے زائد زر بیمہ لینے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور کمپنی سے وہ اس کو یک مشت بھی لے سکتا ہے۔ اور بالاقساط بھی۔ اور یہ سود کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

وجہ۲ دوم : دوسری طرف یہ عقد میسر اور قمار پر مشتمل ہے۔ کیوں کہ اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے پہلے مر جائے تو اس صورت میں ایک خطیر رقم کا مالک وہ شخص بن جاتا ہے جو بیمہ دار شخص نے کمپنی کے سامنے نامزد کیا ہے۔ اور اس میں میسر اور قمار کا معنی پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں محض ایک امر اتفاقی کی وجہ سے کثیر رقم نامزد شدہ شخص کی ملک میں آگئی۔ جیسی میسر اور میں آجاتی ہے اور چونکہ اسلامی شریعت نے سود اور قمار کو قطعی طور حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا بیمہ کا یہ مقصد بھی ان دونوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام قرار پائے گا۔ اسی طرح اگر بیمہ دار شخص معینہ مدت سے قبل عقد بیمہ کو فسخ کر کے اقساط کی ادائیگی کو روکنا چاہے۔ تو اس صورت میں کمپنی اس تمام رقم کی مالک قرار پائے گی۔ جو اقساط کی صورت میں اس نے کمپنی کو ادا کی ہے۔ اور یہ بھی میسر اور قمار ہے۔

وجہ۳ سوم : عقد بیمہ کے ناجائز اور حرام ہونے کے لیے تیسری وجہ یہ ہے کہ اس بیمہ دار شخص کی موت کی صورت میں کمپنی کو اس کی ادا کردہ تمام رقم کا مالک صرف وہ شخص ہوتا ہے جو اس نے نامزد کیا ہے اور باقی تمام ورثاء اس رقم سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی قانون وراثت کی رو سے اس رقم میں وہ تمام ورثاء بھی حقدار ہیں۔ جو شرعاً اس کے جائز ورثاء ہوں اس بنا پر اس عقد میں بعض تقادیر پر شرعی قانون وراثت کی صریح طور پر خلاف ورزی بھی کی جاتی ہے۔ جو یقیناً ناجائز ہے۔

وجہ۴ چہارم : مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ اس عقد بیمہ کے حرام اور ناجائز ہونے کے لیے چوتھی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس کمپنی کے ساتھ تعاون علی الاثم والعدوان بھی پایا جاتا ہے۔ جو قرآن کریم کی رو سے یہ عمل ناجائز ہے۔ لا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ کیونکہ کمپنی نہ روئے قانون اس بات کی پابند نہیں ہے کہ اس رقم کو وہ لازماً جائز اور مباح کاموں میں صرف کرے گی۔ بلکہ وہ اس کو سودی لین دین کے معاملات میں بھی صرف کر سکتی ہے،، بہر حال شرعی قوانین اور احکام کی روشنی میں بیمہ زندگی کے بارہ میں ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر جائز عقد نہیں بلکہ حرام ہے۔"

ایک اشکال اور اس کا جواب

سوال ہو سکتا ہے کہ ہماری مندرجہ بالا معروضات پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ بیمہ زندگی کا یہ عقد اور معاملہ عقد مضاربت کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے کیوں کہ جس طرح مضاربت میں ایک طرف سے سرمایہ ہوتا ہے

اور دوسری طرف سے محنت اور منافع رب المال اور مضارب دونوں کے درمیان تقسیم ہوتے ہیں۔ اسی طرح بیمہ زندگی میں جس بیمہ شدہ شخص کی طرف سے سرمایہ ہوتا ہے اور کسی کی طرف سے محنت۔ اور منافع سرمایہ کار اور کمپنی دونوں کے درمیان تقسیم کئے جاتے ہیں۔ تو کیوں نہ ہم عقد بیمہ کو مضاربت کی طرح جائز قرار دیں۔

الجواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ "بیمہ زندگی" کا معاملہ تصور جدیدہ میں سے ہے اور شریعت میں اس کے متعلق کوئی صریح نص وارد نہیں ہوئی ہے۔ اور اس قسم کے معاملات کے احکام معلوم کرنے کے لیے اس میں کوئی چارہ نہیں کہ ایسے جدید معاملات کو کسی ایسے عقد اور معاملہ سے ملحق کیا جائے جس میں شریعت نے اپنا کوئی منصوص حکم بیان کیا ہو۔ اور جس کے ساتھ یہ جدید قسم کے عقود اور معاملات زیادہ مشابہت رکھتے ہوں۔ اس طرح منصوصی معاملات اور عقود میں سے جو بھی عقد اور معاملہ ایسا مل جائے گا جس سے جدید معاملات اور عقود زیادہ مشابہ اور مطابق ہوں تو دونوں پر ایک قسم کا حکم جاری کیا جائے گا۔ مگر یہاں مصیبت یہ ہے کہ بیمۂ زندگی کا الحاق عقد مضاربت سے حسب ذیل چند وجوہ سے صحیح نہیں ہے اگرچہ بظاہر دونوں کے درمیان مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک نوعیت کے معاملات اور عقود ہیں۔ اور دونوں کا حکم ایک ہونا چاہیئے۔ جن وجوہ سے ہم اس الحاق کو صحیح تسلیم نہیں کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ء۱ بیمہ اور مضاربت میں کئی بنیادی فرق موجود ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے مثلاً مضاربت میں شرط صحت بالاجماع یہ تسلیم کی گئی ہے کہ اس میں منافع کی تقسیم نسبت کی بنیاد پر ہو۔ اور مضارب رب المال میں سے کسی ایک کو معین منافع نہیں ملیں گے بلکہ اس کا اشتراط عقد مضاربت کے لیے مفسد قرار دیا گیا ہے۔ بخلاف بیمہ کے کہ اس میں سرمایہ کار کو معین منافع (مثلاً دس فی صد) سالانہ ملا کرتے ہیں اور نسبت کی بنیاد پر منافع کی تقسیم نہیں ہوتی ہے۔ یعنی اس میں مضاربت کی طرح یہ نہیں ہوتا ہے کہ منافع میں سے نصف حصہ یا ثلث اور یا ربع وغیرہ کسی ایک فریق کو ملے گا۔ اور باقیماندہ منافع دوسرے فریق کو ملیں گے اس فرق کو سامنے رکھ کر اصول اجتہاد اور قوانین قیاس اس بات کے متقاضی ہیں کہ بیمہ کو مضاربت پر قیاس کر کے دونوں کا حکم ایک نہ قرار دیا جائے۔

ء۲ دوسری وجہ یہ ہے کہ بیمہ اور مضاربت میں ایک اور فرق بھی ایسا پایا جاتا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ۔

مضاربت میں اگر نقصان واقع ہو تو سرمایہ کار (رب المال) کو وہ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اور بیمہ میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی ہے ۔ یہاں سرمایہ کار کو منافع ہی منافع ملتے ہیں ۔ اور نقصان سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے ۔ کمپنی کو اگر کوئی نقصان پیش آجائے تو کمپنی ہی اس کا ذمہ دار ہوگی بیمہ دار شخص پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے ۔

۳۔ پھر اس پر مزید یہ کہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار کا انتقال ہوجائے ۔ تو وارثین کو صرف اتنا ہی سرمایہ مل سکتا ہے جتنا کہ دن کے مورث نے مضارب کو سپرد کیا تھا ۔ اور اس سے زائد رقم ہرگز انہیں نہیں مل سکتی ۔ برخلاف اس کے بیمہ میں اگر بیمہ دار شخص کا نقصان ہوجائے تو اس کی موت کے بعد جس شخص کو زر بیمہ ملنے والا ہے وہ ایک بڑی رقم یعنی زر بیمہ کا حقدار قرار دیا جاتا ہے یہ ایک ایسا مخاطرہ ہے جس سے شارع علیہ السلام نے روکا ہے ۔ کیوں کہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں ہے ۔ کیونکہ سوائے اتفاقات کے اس کا کوئی اصول اور ضابطہ نہیں ہے ۔ کیوں کہ بعض اشخاص تو ایسے نکلیں گے کہ آج انہوں نے بیمہ کرایا ۔ اور کل ان کے کسی وارث نے اس خطیر رقم پر قبضہ کرلیا ۔ اور بعض ایسے اشخاص ہوں گے جو بیمہ کرانے کے ایک طویل مدت بعد اس رقم پر قبضہ کرنے کے حقدار ہوں گے ۔

۴۔ اس کے علاوہ مضاربت میں اگر سرمایہ کار مرجائے تو مضارب کے پاس اس کی جو رقم ہے وہ تمام وارثین کے مابین شرعی قانون وراثت کے مطابق تقسیم ہوگی ۔ اس کے برخلاف بیمہ میں اگر بیمہ دار شخص کا انتقال ہوجائے تو زر بیمہ کا مستحق صرف وہی شخص ہوتا ہے جو بیمہ دار نے نامزد کیا ہو اور باقی وارثین اس میں اصلاً حقدار نہیں ہوتے ہیں یہ ایک طرف ان پر عظیم ظلم ہے اور دوسری طرف اس میں اسلام کے قانون وراثت کی صریح خلاف ورزی پائی جاتی ہے ۔ ۔۔۔ ان جوہری فروق کے ہوتے ہوئے بیمہ کو مضاربت پر قیاس کرنا قیاس باطل ہے ۔ اور کوئی عالم اس کے جواز کا قائل نہیں ہوسکتا ۔ بالخصوص جب کہ اس میں سود اور قمار بھی پائے جاتے ہیں ۔ جو قطعی طور پر حرام ہیں ۔ اس کے علاوہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ انہیں بعض وجوہ ایسے ہیں جو اس کے جواز حلت کے متقاضی ہیں مگر اس سے بھی تو انکار ممکن نہیں ہے کہ اس عقد میں ایسی بھی وجوہ پائی جاتی ہیں ۔ جو اس کے عدم جواز اور حرمت کے متقاضی ہیں جیسا کہ اوپر بالتفصیل بیان کی گئیں تو حضورؐ کے اس ارشاد کے بموجب دع مایریبک الی مالا یریبک ، اس عقد سے اجتناب کرنا چاہئیے کیونکہ اس میں احتیاط کا پہلو راجح ہے ۔ حضورؐ نے ایسے ہی معاملات کے بارے میں فرمایا ہے کہ ، ما اجتمع الحلال والحرام الا وقد غلب الحرام علی الحلال ۔ اسی سے علماء اصول حدیث اور اصول فقہ نے یہ قانون بنایا ہے کہ بوقت تعارض محرّم کو مبیح پر ترجیح حاصل ہوگی ۔

فقط واللہ اعلم

سود لینے دینے پر گواہ بننا اور حالتِ اضطرار میں سود دینے کا حکم

سوال :۔ (۱) ایک آدمی سود دیتا ہے، دوسرا دیتا ہے اور چند افراد اس سودی معاملے میں گواہ بن جاتے ہیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان تینوں کا کیا حکم ہے ؟
(۲) اگر کوئی شخص حالتِ اضطرار میں ہو تو کیا اس کے لیے سود پر قرض لینا جائز ہے یا نہیں؟ دینے والے کا کیا حکم ہے ؟

الجواب :۔ (۱) سودی لین دین ایسا حرام قطعی عمل ہے کہ جس پر قرآنی آیات، احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت کا اجماع دال ہے، اسکی حرمت میں کسی کو بھی شک و شبہ نہیں، سود خوری کو اپنی ماں سے زنا کرنے کے برابر جرم قرار دیا گیا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں سود خور، سود دینے والے، لکھنے والے اور اس معاملے پر گواہ بننے والوں کو بھی برابر کی سزا کا حقدار قرار دیا گیا ہے اور ان سب پر لعنت کی گئی ہے ــــ صحیح مسلم اور دوسری کتب احادیث میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ :۔
لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربٰو و مؤکلہ وکاتبہ و شاھدیہ وقال ھم سواء ۔
البنایہ میں ہے : قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ اکل الربٰو و مؤکلہ وکاتبہ و شاھدیہ اذا علموا بہ ملعونون علیٰ لسانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اھ۔
اس لیے سودی لین دین کرنے، اس پر گواہ بننے اور اسکی دستاویز لکھنے سے پرہیز کیا جائے ۔
(۲) اگر کوئی انتہاء حالتِ اضطرار میں ہو اور کوئی دوسرا راستہ اس کو اپنی ضرورتِ شدیدہ کو پورا کرنے کے لیے نظر نہ آتا ہو اور ضرورت بھی اس درجے کی ہو جو اس کے لیے موت و حیات سے وابستہ ہو تو اس صورت میں مجبوری کے تحت گنجائش موجود ہے لیکن سود لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ۔

کما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ : قلتُ ، وقد قالت الفقھاء بجواز اعطاء الرشوۃ للمضطر لدفع مضرۃ لا تندفع الا باعطائہ واما اخذ الرشوۃ فلا یجوز بحال والربٰو والرشوۃ من باب واحدٍ فمقتضاہ ان یجوز اعطاء الربٰو للمضطر لدفع مضرۃ لاتندفع الا باعطائہ واما اخذ الربٰو فلا یجوز اصلاً۔ اھ (امداد الاحکام ج ۳ ص ۵۴۲ کتاب الربٰو)

كتاب
الرهن
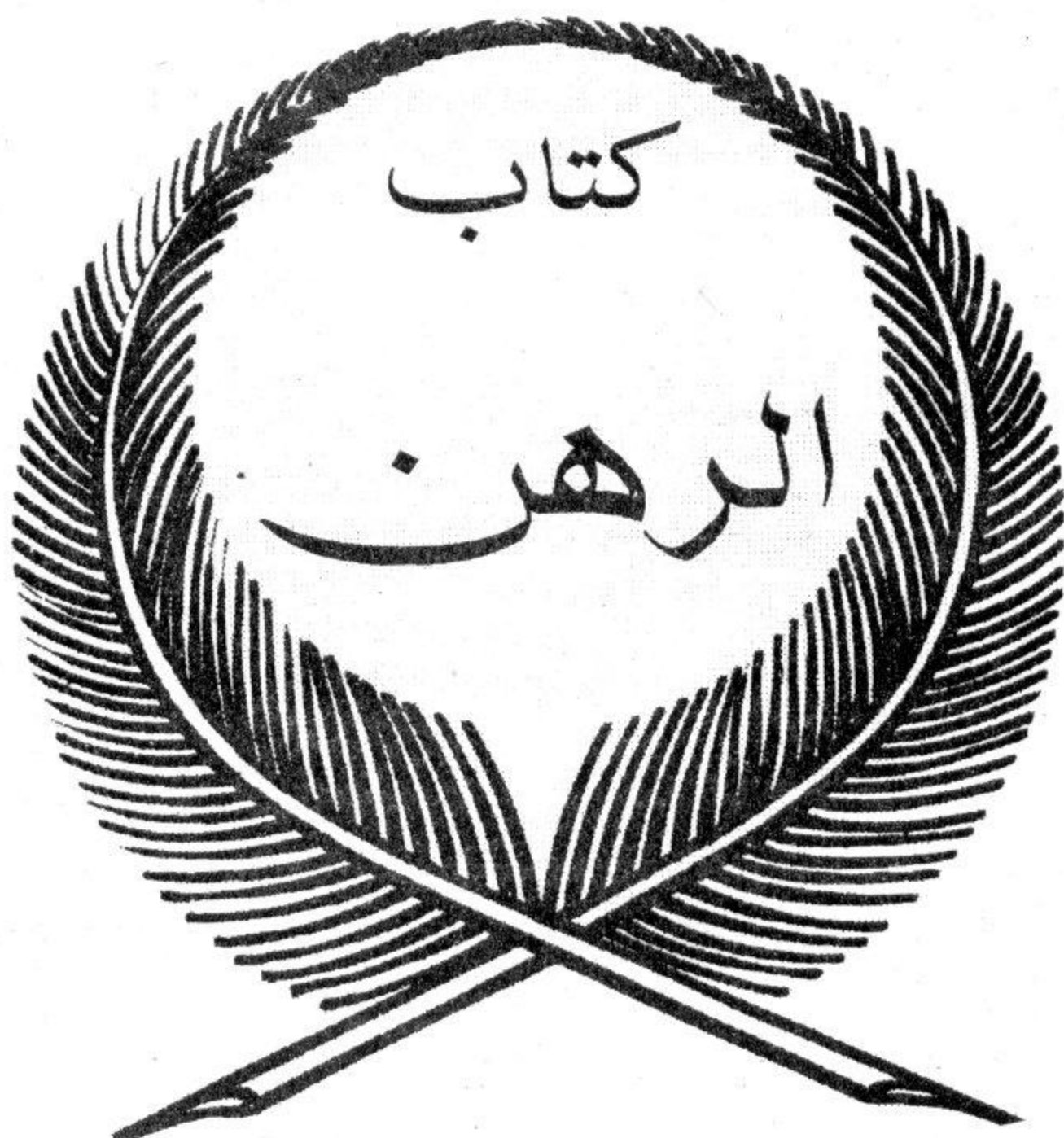
وإن كنتم على سفرٍ
ولم تجدوا كاتباً
فرهان مقبوضة

کتاب الرّہن

(رہن کے مسائل واحکام)

مرہونہ زمین کے اخراجات کی ذمّہ داری کا حکم

سوال:۔ اگر زمین مرہونہ ہو اور مرتہن نے بغیر کسی انتفاع کے سرکاری آبیانے اور ٹیکس کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کچھ رقم ادا کی۔ کیا مرہونہ زمین کی واپسی کے وقت مرتہن کو راہن سے ان اخراجات کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر راہن کی اجازت سے مرتہن مرہونہ زمین پر رقم خرچ کرے تو اجازت کی وجہ سے مُرتہن مطالبہ کا حق محفوظ رکھتا ہے ورنہ بصورتِ دیگر مرتہن کئے ہوئے اخراجات میں متبرع ہے، راہن سے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا ہے۔

لما قال الامام ابن البزاز الکردری: اخذ السلطان الخراج والعُشر من المرتہن لایرجع علی الرھن لانہ ان تطوع فھو متبرع ان مکرھا فقد ظلمہ السلطان والمظلوم لایرجع الا علی الظالم اھ (الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۵۹ نوع نفقۃ الرّھن)[۱]

مرہون سے انتفاع کا حُکم

سوال:۔ اگر مالک مرتہن کو مرہونہ سے فائدہ لینے کی اجازت دے دے تو کیا اس کی اجازت کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتہن کے لیے مرہونہ سے انتفاع لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگرچہ مالک کی باقاعدہ اجازت اس کی مملوکہ چیز سے انتفاع لینے کی گنجائش کی صورت مہیا کرکے جواز کی دلیل بن سکتی ہے لیکن مرتہن کو راہن کی طرف سے جو اجازت

---

[۱] لما قال الشیخ سلیم رستم باز رحمہ اللہ: کل من الراھن والمرتھن اذا انفق علی الرھن مالیس علیہ بدون اذن الآخر یکون متبرعًا ولیس لہ ان یطالب الآخر بما انفق۔ (شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۷۲۵ ص ۳۹۹ کتاب الرھن)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۴۵۵ الباب الرابع فی نفقۃ الرھن۔

دی جاتی ہے اس کے پس منظر میں کون سے جذبات کارفرما ہیں،
جس کی وجہ سے مالک اپنی ملکیت سے اپنی ضرورت کے باوجود دوسرے کو استفادہ کا موقعہ دیتا ہے، راہن اور مرتہن کے باہمی معاملات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مرتہن کو یہ موقعہ اس کے قرض کے عوض دیا جاتا ہے جو کہ مالک دے چکا ہے، مالک مرتہن کے احسان سے مجبور ہو کر بلا چون و چرا مرتہن کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اجازت دے دیتا ہے، اس کی یہ اجازت مجبوری کی اجازت ہے جس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرامؒ نے تصریح کی ہے کہ مالک کی اجازت کے باوجود مرتہن کے لیے رہن سے انتفاع لینے کی گنجائش نہیں ہے۔

لما قال العلامة السید احمد الطحطاویؒ: (تحت قوله وسیجئ آخر الرھن) قلت والغالب من احوال الناس انهم یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط لان المعروف كالمشروط وهو مما یعین المنع والله تعالى اعلم انتهى (حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار ج ۴ ص۲۳۴ کتاب الرهن) [1]

رہن سبب ملک نہیں

سوال:۔ اگر کسی شخص کے پاس مدتوں سے زمین بطور رہن ہو تو کیا اس سے مرتہن کی ملکیت ثابت ہو سکتی ہے یا نہیں اور راہن کو کب تک ملکیت کے دعویٰ کا حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ رہن صرف ایک وثیقہ اور ذریعہ اعتماد ہے جس سے مرتہن مرہونہ چیز کا مالک نہیں بن سکتا اس کا مالک راہن ہی رہے گا، جب چاہے مرتہن کو قرض ادا کر کے مرہونہ شے واپس لے سکتا ہے تاہم مالک قرض کی ادائیگی کے بغیر مرہونہ کی واپسی کا حق نہیں رکھتا۔

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: والغالب من احوال الناس انهم انما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط، لان المعروف كالمشروط وهو مما یعین المنع۔ والله تعالى اعلم۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۴۸۲ کتاب الرهن)

لما قال العلامة ابن البزاز الكردری رحمه اللہ: الرهن امانة عند المرتهن کالودیعة۔
(الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۸۶ کتاب الرهن الباب الرابع فی اعارته) [1]

سوال:۔ اگر مرتہن نے مالک کی اجازت | مرتہن کا بلا اجازتِ مالک مرہونہ سے اِنتفاع موجبِ ضمان ہے

کے بغیر مرہونہ سے فائدہ حاصل کیا تو کیا مالک کو اس سے تاوان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مفتیٰ بہ قول کی رُو سے جب مالک کی اجازت کے باوجود مرتہن کے لیے اِنتفاع لینا مرخص نہیں ہے تو اجازت کے بغیر یہ مالک کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے، اس لیے مالک اس سے ضمان کے مطالبہ کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

لما قال العلامة قاضی خان رحمه اللہ: رجلٌ استقرض دراهم واسکن المقرض فی داره قالوا یجب اُجر المثل علی المقرض لان المستقرض انما اسکنه فی داره عوضًا منفعة القرض لامجانًا فیجب اجر المثل علی المقرض۔ [2]
(الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۲ ص۳۰۹ کتاب القرض)

سوال:۔ اگر مرتہن مرہونہ سے اِنتفاع لے کر راہن کو اجارہ دیا کرے تو کیا اس سے مرتہن کیلئے | مرہونہ کے اجارہ کا حکم

---

[1] قال المحدث والفقیه علی بن سُلطان محمد القاریؒ: ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال لایغلق الرهن۔ ای عقده (الرهن) ای المرهون (من صاحبه) اُمالك (الذی رهنه) ای صاحبه بحیث یزول عنه منفعتهٗ بل یکون المرهون کالباقی فی ملك الراهن۔ (المرقاة شرح مشکوٰة ج۶ ص۹۳ کتاب الرهن)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی الهندیة ج۵ ص۴۶۵ الباب الثامن فی تصرف الراهن والمرتهن۔

[2] قال العلامة ابن عابدین رحمه اللہ: رجلٌ استقرض دراهم واسکن المقرض فی داره قالوا یجب اجر المثل علی المقرض لان المستقرض انما اسکنه فی داره عوضًا عن منفعة القرض لامجانًا۔ (رد المحتار ج۶ ص۶۳ کتاب القرض)
وَمِثْلُهٗ فی الفتاوی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۲۳ کتاب القرض۔

انتفاع کے جواز کی صورت پیدا ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب: ۔اجارہ ایک جائز معاملہ ہے، مالک اپنی زمین ہر اس شخص کو اجارہ کی شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے اجارہ پر دے سکتا ہے جس پر اعتماد ہو خواہ مرتہن ہو یا اور کوئی شخص، لیکن جہاں کہیں مالک اور آجر کے درمیان اس سے قبل رہن کا معاملہ موجود ہو تو رہن کے بعد اجارہ کی تجدید معاہدہ سے سابقہ عقدِ رہن ختم ہو کر باقی نہیں رہتا اور مرتہن کے انتفاع لینے میں کوئی حرج نہیں تاہم راہن مقررہ مدت کے بعد بغیر کسی قرض کی ادائیگی کے اپنی رہن مرتہن سے واپس لے سکتا ہے اور مرتہن واپس کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : اما الاجارة فالمستأجر ان کان ھو الراھن فھی باطلة..... وان ھو المرتھن وجدد القبض للاجارة..... بطل الرھن والاجرة للراھن ۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۵۱۱ کتاب الرھن) [1]

مرہونہ میں مالک کا تصرف مرتہن کی اجازت پر موقوف ہے

سوال: ۔کیا راہن کو بحیثیتِ مالک مرہونہ میں مالکانہ حقوق کے اجراء کا حق حاصل ہے یا نہیں ؟ یا اگر مالک مرہونہ کو فروخت کر دے تو کیا یہ بیع نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب: ۔رہن سے مالک کی ملکیت اگرچہ زائل نہیں ہوتی لیکن مرتہن کے حقوق کی وابستگی کی وجہ سے مالک کے جملہ مالکانہ تصرفات مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوں گے اس لیے مالک کی مرہونہ کے فروخت کا معاملہ مرتہن کی اجازت کا محتاج ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ : توقف بیع الراھن رھنه علیٰ اجازة مرتھنه او قضاء دینه فان وجد احدھما نفذ وصار ثمنه رھنًا ۔قال العلامة ابن عابدینؒ : وکذا لو توقف علیٰ اجازة الراھن بیع المرتھن فان اجاز جاز والا فلا ۔انتھیٰ ۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۵۰۶ کتاب الرھن) [2]

---

[1] لما فی الھندیة : وکذلک لو استاجره المرتھن صحت الاجارة وبطل الرھن اذا جدد القبض للاجارة ۔ (الفتاویٰ الھندیة ج ۵ ص ۴۶۵ الباب الثامن فی تصرف الراھن والمرتھن ... الخ
ومثلهٗ فی العنایة شرح الھدایة علیٰ ھامش فتح القدیر ج ۹ ص ۱۱۷ کتاب الرھن ۔

[2] لما قال الشیخ سلیم رستم باز : لو باع الراھن الرھن بدون رضی المرتھن لا ینفذ البیع ولا یبطل الخلل علیٰ حق الجنس الثابت للمرتھن ولکن اذا قضی الراھن الدین نفذ البیع وکذا لو اجاز المرتھن ذلک البیع فانهٗ ینفذ ۔ (شرح المجلة الاحکام، مادة ۷۴۷ ص ۲۳۴ بیع الوفاء)
ومثلهٗ فی الفتاویٰ الھندیة ج ۵ ص ۴۶۲ الباب الثامن فی تصرف الراھن والمرتھن ۔

مرہونہ زمین چھڑائے بغیر کسی دوسرے پر فروخت کرنا

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل میں کہ زید نے اپنی آبائی ملکیتی زمین عمرو کے پاس رہن رکھی، کچھ مدت کے بعد زید نے اپنی مرہونہ زمین عمرو سے فک کرائے بغیر خالد کو اس شرط پر فروخت کر دی کہ اگر میری یہ زمین جو کہ عمرو کے پاس رہن ہے ایکٹ میں آگئی تو وہ زر رہن جس پر زمین رہن کی گئی ہے وہ مرتہن (عمرو) کو نہ دوگے بلکہ مجھے دو گے ۔ اب زید اس بیع قطعی کرنے سے پشیمان ہے اور خالد سے کہتا ہے کہ مجھے بیع قطعی کا انتقال واپس کر دو، حالانکہ اب تک خالد کا اس زمین پر قبضہ ہوا ہی نہیں بلکہ مرتہن (عمرو) کے قبضہ میں ہے اب اس بیع قطعی کا عند الشرع کیا حکم ہے ؟ فاسد ہے یا صحیح ؟ اگر فاسد ہے تو واجب الرد ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ کا جواب ۲ دو شق پر تحریر کیا جاتا ہے ۔

(۱) راہن کا مرہونہ زمین میں تصرف قبل از سقوط از رہن فی المرہون ۲ دو قسم ہے ۔ ایک وہ تصرف ہے جو قابل فسخ ہے مثلاً بیع، کتابت، اجارہ، ہبہ، صدقہ، اقرار و ۔ دوسرا وہ تصرف ہے جس میں فسخ کا احتمال نہ ہو، جیسا کہ عتق، تدبیر، استیلاد۔ قسم دوم تصرف خارج از بحث ہے اور قسم اول کے تصرف (جو کہ فسخ کا احتمال رکھتا ہے) کا حکم یہ ہے کہ یہ تصرف بغیر رضائے مرتہن کے نافذ نہیں ہوتا اور مرتہن کا حق حبس مرہونہ میں باطل نہیں ہوتا یعنی اس قسم کا تصرف اگر راہن کرے تو وہ مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے، اگر وہ اجازت دے تو تب نافذ ہوگا۔ اور مرتہن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جب تک وہ اپنا زر رہن وصول نہ کر لے اس وقت تک مرہونہ کو اپنے پاس بند رکھے ۔ اور جب راہن مرتہن کو اپنا دین ادا کر دے اور مرہونہ کو بند رکھنے کا حق باطل ہو جاتا ہے، تو راہن کا وہ سابق تصرف جو کہ موقوف تھا اب نافذ ہو جائے گا ۔ یہ تفصیل فتاویٰ عالمگیری جلد ۵ ص ۴۸۷ کی مندرجہ ذیل عبارت سے لی گئی ہے:۔

تصرف الراهن قبل سقوط الدين فى المرهون اما تصرف يلحقه الفسخ كالبيع فالكتابة والاجارة والهبة والصدقة والاقرار ونحوها او تصرف لا يحتمل الفسخ كالعتق والتدبير والاستيلاد۔ اما الذى يلحقه الفسخ لا ينفذ بغير رضاء المرتهن ولا يبطل حقه فى الحبس واذا قضى الدين وبطل حقه فى الحبس نفذت التصرفات كلها ۔

اسی طرح اگر مرتہن نے زر رہن وصول کرنے سے پہلے اجازت دے دی تو نافذ ہو جائے گی اور اب پھر رہن راہن نہیں رہے گا مگر زر رہن بہر حال خود راہن کے ذمہ ہو گا اور اجازت دینے سے مرتہن کا حق باطل نہیں ہو گا۔ اور اس صورت میں اگر یہ تصرف بیع ہو تو اب بجائے مرہونہ کے اس کا ثمن (زر بیع) مرہون ہو گا۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری میں اسی صفحہ (جلد ۵ صفحہ ۴۸۷) پر ہے:

و لو اجاز المرتہن تصرّف الراهن نفذ و خرج من ان یکون رهنًا والدّین علیٰ حاله وفی البیع یکون الثمن رهنًا مکان المبیع ....الخ

فقہاء کی اس تحقیق کی روشنی میں صورتِ مسئولہ میں راہن نے جو تصرّف کیا ہے وہ بیع کا تصرف ہے پس وہ اجازتِ مرتہن پر موقوف ہو گا۔ اب اگر عمرو (مرتہن) نے راہن (زید) کو اجازت دی ہو تو اس کا یہ تصرّف نافذ ہو گا اور عمرو (مرتہن) کا زر رہن زید کے ذمہ لازم ہے اور اگر عمرو (مرتہن) نے اجازت نہ دی ہو تو یہ بیع موقوف ہے اور تا وصولی زر رہن عمرو (مرتہن) زمین مرہونہ کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔

(۲) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ایسی شرائط جو ملائم عقد نہ ہوں ان سے عقد بیع فاسد ہوتا ہے جس کی تفصیل فقہاء نے یوں کی ہے، الدر المختار میں ہے: ولا بیع بشرط لا یقتضیه العقد ولا یلائمه وفیه نفع لاحدهما او فیه نفع لمبیع الخ ـــ علامہ شامیؒ بصورت تنبیہ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں: قوله وفیه نفع لاحدهما الماء بالنفع ما شرط من احد المتعاقدین علی الآخر (ج ۴ ص ۱۶۷)

اور بیع فاسد کا حکم یہ ہے کہ مشتری بیع کا مالک ہو جاتا ہے یعنی بیع فاسد مفید للملک ہے اور ہر ایک پر بائع اور مشتری میں سے اس کا فسخ واجب ہے قبل القبض، اور اسی طرح بعد القبض بھی، جب تک کہ مبیع مشتری کے ہاتھ میں باقی ہو، اور اس میں مرافع الی القاضی کی شرط نہیں ہے کیونکہ جو چیز شرعًا واجب ہوتی ہے وہ قضاء قاضی کی محتاج نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کسی نے بائع یا مشتری میں سے کسی نے اس کے باقی رکھنے پر اصرار کیا تو قاضی کو جبرًا اُسے فسخ کرنے کا حق حاصل ہو گا۔

علامہ فرماتے ہیں: ویجب علیٰ کلّ واحدٍ منهما فسخهٗ قبل القبض ویکون امتناعًا عنه او بعدهٗ ما دام المبیع بحاله فی ید المشتری للفساد لانهٗ معصیة فیجب رفعها ولذا لا یشترط فیه قضاء قاضٍ لان الواجب شرعًا لا یحتاج

للقضاء واذا امر احدهما علی امساکه وعلم به القاضی فلهٗ فسخهٗ جبرًا علیهما حقًا للشرع ۔ (رد مختار بهامش الشامی ج۴ ص۱۷۳)

اس تحقیق کو مدنظر رکھتے ہوئے صورت مسئولہ میں مرتہن (زید) کی اجازت سے راہن نے مشتری (خالد) سے جو عقدِ بیع کیا ہے میرے نزدیک یہ بیع فاسد ہے کیونکہ زید نے عین عقد میں جو شرط لگائی ہے کہ اگر میری زمین ایکٹ میں آگئی تو زرِ رہن مرتہن کو نہ دو گے بلکہ مجھے دو گے اور مشتری (خالد) نے اس کو منظور کیا، تو یہ ایک ایسی شرط ہے جو نہ عقد کی مقتضیٰ ہے اور نہ ملائم عقد ہے اور اس میں احد المتعاقدین (زید بائع) کو نفع ہے لہٰذا اس سے بیع فاسد ہوگئی ہے اور اس کا فسخ کرنا واجب ہے۔ پس زید اس کو فسخ کر سکتا ہے کیونکہ مشتری (خالد) نے ابھی تک قبضہ بھی نہیں کیا ہے، اگر زید اس بیع کے باقی رکھنے پر اصرار کرے تو بذریعہ عدالت فسخ کرایا جاسکتا ہے۔ هٰذا هو الذی یعلم ما ذکر فی کتب مذهبنا ولم ینشرح به القلب ولم تطمئن به النفس فان للمقال فیه مجالاً ۔ (فقط واللہ اعلم)

غیر مسلم کی مرہونہ زمین سے انتفاع

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ میں مسلمانوں کے علاوہ سکھ اور ہندو بھی رہتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے اچھے مراسم بھی ہیں۔ خرید و فروخت، اجارہ، شادی و غمی اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شرکت وغیرہ، گویا دنیاوی طور پر ایک دوسرے سے لین دین رہتا ہے۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہندو نے مجھ سے پچاس ہزار روپے قرض لیے اور اپنی مملوکہ زمین میرے پاس رہن رکھوائی۔ تو کیا میں اس زمین میں فصل وغیرہ کاشت کر سکتا ہوں اور اس کی آمدنی میرے لیے جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض علماء کرام سے ہم نے سنا ہے کہ مرہونہ زمین سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ برائے مہربانی مسئلہ میں میری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ یہاں تک تو سب کا اتفاق ہے کہ مسلمان کی مرہونہ چیز سے انتفاع لینا جائز نہیں لیکن بعض علماء کرام کے نزدیک غیر مسلم حربی کا مال مباح ہے، اس لیے ہندو کی مرہونہ زمین سے فائدہ لینا آپ کے لیے جائز ہے البتہ پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کے رہونہ سے انتفاع درست نہیں۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: الجواب: بعض علماء کے قول پر (یباح مال الحربی رضاہ ولو بعقد فاسد) جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج۳ ص۴۶۶ کتاب الرہن)

مرہونہ زمین کے محاصل راہن کو واپس کرنا لازم ہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقہ یار حسین (ضلع صوابی) میں قرض لیتے دینے کے سلسلہ میں یہ رواج ہے کہ قرض رقم دینے والا اس کے عوض میں کچھ زمین رہن رکھ لیتا ہے اور اس مرہونہ زمین سے اُسے (مرتہن کو) انتفاع لینے کی راہن کی طرف سے اجازت ہوتی ہے ۔ اسی سلسلہ میں کچھ عرصہ قبل بندہ نے ایک استفتاء بھیجا تھا جس کے جواب میں آنجناب نے راہن کی اجازت کے باوجود مرہونہ زمین سے انتفاع لینے کو ناجائز تحریر فرمایا تھا۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے مرہونہ زمین سے فائدہ حاصل کیا ہو اور اسے استعمال بھی کیا ہو تو وہ اپنے آپ کو اس سے کس طرح فارغ الذمہ کر سکتا ہے اور اس کی عملاً کیا صورت ہوگی؟

الجواب:۔ مرہونہ زمین انتفاع لینا راہن کی اجازت کے باوجود بھی مفتیٰ بہ قول کے مطابق ناجائز و حرام ہے۔ اب اگر کسی نے ایسا کیا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے فارغ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ مرہونہ زمین سے اس نے جو محاصل لیے ہیں وہ جملہ محاصل یا ان کی قیمت راہن کو واپس کر دے تب اس کا ذمہ فارغ ہوگا۔

لما قال العلامۃ محمد عبد الحی اللکھنوی ؒ: (الجواب) بکر کو اس محاصل کا واپس کرنا لازم ہے اور بکر کو اس محاصل سے نفع حاصل کرنا جائز نہ تھا اور ایک روپیہ کے عوض میں اس محاصل کو بیچ نہیں سکتا، البتہ کل محاصل کے واپس کر دینے سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ (مجموعۃ الفتاویٰ (اردو) ج ۳ ص۱۲۹ کتاب الرہن)

كتاب
الاجارة
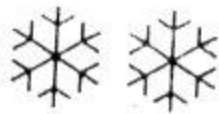
اعطوا الاجير أجره
قبل ان يجف عرقه

کتاب الاجارۃ

(اجارہ کے احکام ومسائل)

عقدِ اجارہ میں تعیینِ مدت ضروری ہے

سوال:۔ مؤجر نے مستاجر کو بغیر تعیینِ مُدّت کے دوکان اجارہ پر دے دی، اب چند سال بعد ہر چیز کے نرخ بڑھ جانے کی وجہ سے دوکان کا مالک بھی کرایہ بڑھانا چاہتا ہے لیکن مستاجر نہ تو دوکان خالی کرنے کو تیار ہے اور نہ ہی پہلے کرایہ سے زیادہ دینے کو تیار ہے جبکہ مؤجر حکومتی قانون کی وجہ سے مجبور ہے، کیونکہ حکومت کا قانون یہ ہے کہ جب تک مُستاجر (کرایہ دار) خود دوکان خالی نہ کرے مؤجر (مالکِ دوکان) اس کو بیدخل نہیں کر سکتا اور کرایہ میں کمی بیشی کرنا بھی حکومت کے اختیار میں ہے، کیا اس صورت میں مستاجر گنہگار تو نہیں ہوگا؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال یہ اجارہ فاسد ہے، مؤجر کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ مستاجر سے ہر ماہ کے شروع میں دوکان خالی کرنے یا کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کرے ورنہ بصورتِ دیگر عقدِ اجارہ فسخ کر سکتا ہے، اس مطالبہ میں مستاجر کا لیت ولعل کرنا حرام ہے اور انکار کی صورت میں مستاجر پر مؤجر کا مطلوبہ کرایہ دینا لازم ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ:۔ آجر حانوتاً کل شھر بکذا جاز فی واحد فقط وفسد فی الباقی لجھالتھا والاصل انہ متی دخل کل فیما لایعرف منتھاہ تعین ادناہ واذا مضی الشھر فلکل فسخھا بشرط حضور الآخر لانتھاء العقد الصحیح۔

(ردالمحتار ج ۶ ص ۵ باب الاجارۃ الفاسدۃ) [1]

---

[1] قال العلامۃ ابن بزاز رحمہ اللہ: آجر دارہ کل شھر بکذا ینعقد عند رأس کل شھر ولکل خیار الفسخ عند رأس کل شھر فلو ابرأ المستاجر عن اجرۃ الابد لایصح الا عن شھر واحد۔ (الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج ۵ ص ۱۷ کتاب الاجارات، الفصل الثانی فی صفتھا)

ومِثلُہٗ فی مجلۃ الاحکام، مادۃ ۴۹۴ ص ۲۷۳ الفصل الرابع فی المسائل التی تتعلق بمدۃ الاجارۃ۔

طویل مدت کے لیے زمین اجارہ پر دینا جائز ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی ذاتی مملوکہ اراضی کسی دوسرے شخص کو پچاس سال کے لیے اجارہ پر دے دی ہے، کیا اپنی مملوکہ زمین طویل مدت کے لیے اجارہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اپنی مملوکہ زمین طویل مُدّت کے لیے اجارہ پر دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ دیگر شرائط فاسدہ سے اجارہ خالی ہو، خواہ اُجرت کم مقرر ہوئی ہو یا زیادہ۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: والمنافع تارة تصير معلومة بالمدة كاستيجار الدور للسكنى والارضين للزراعة فيصح العقد على مدة معلومة اى مدة كانت لان المدة اذا كانت معلومة كان قدر المنفعة فيها معلوماً اذا كانت المنفعة لاتتفاوت وقوله اى مدة كانت اشارة الى انه يجوز طالت المدة اوقصرت لكونها معلومة۔ (الهداية ج ۳ ص ۲۹۴ كتاب الاجارات) [1]

معروف اُجرت پر اجارہ کا حکم

سوال:۔ ہمارے ہاں تین مزدور پچاس روپے یومیہ کے حساب سے مزدوری کرتے ہیں، چونکہ کام کے وقت میں صبح کے کھانے کا وقت ہوتا ہے اس لیے صبح کا کھانا ہمارے گھر سے ملتا ہے، درمیان میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا اب مزدوروں کا مطالبہ ہے کہ چونکہ رمضان المبارک میں صبح کا کھانا نہیں ملتا اس لیے بجائے پچاس کے ساٹھ روپے دیہاڑی ملنی چاہیئے، تو کیا ان مزدوروں کا یہ مطالبہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر ماہِ رمضان المبارک میں یہ اجرت برضا ورغبت جانبین کی طرف سے مقرر ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر یہ مقدار معروف ہو تو تب بھی درست ہے ورنہ بصورتِ دیگر یہ اجارۂ فاسدہ کے حکم میں ہے جو صحیح نہیں۔

---

[1] قال العلامة اكمل الدين البابرتی: ولا فرق بين طويل المدة وقصيرها عندنا اذا كانت بحيث يعيش اليها العاقدان لان الحاجة التى جوزت الاجارة لها قد تمس الى ذلك۔

(العناية على هامش فتح القدير ج ۸ ص ۸/۷ كتاب الاجارات)

ومثله فى الجوهرة النيرة ج ۱ ص ۳۱۷ كتاب الاجارات۔

لما قال الشیخ سلیم رستم باز رح : لو استاجر احد اجیر علیٰ ان یعمل یوماً یعمل من طلوع الشمس الی العصر او الی الغروب علیٰ وفق عرف البلدة فی شان العمل ۔ (شرح مجلة الاحکام لسلیم، مادة ۴۹۵ ص ۲۷۴ الکتاب الثانی فی الاجارة ۔ الباب الرابع فی المسائل التی تتعلق بمدة الاجارة) ؎

مجہول الوقت کا عقدِ اجارہ

سوال :۔ ایک ملازم نے مالک مکان سے پانچسو روپیہ کرایہ پر مکان لے لیا، چند ماہ بعد اس نے مالکِ مکان ماہانہ سے کہا کہ میں تین ماہ کی چھٹی پر اپنے گھر جا رہا ہوں واپس آکر اس مکان کو دوبارہ کرایہ پر لوں گا اور ملازم اپنا سامان اسی مکان میں رکھ کر چلا گیا، اب ان دونوں کے درمیان تنازع پیدا ہو گیا ہے، مالک مکان کا مؤقف یہ ہے کہ چونکہ تمہارا سامان اسی مکان میں پڑا رہا ہے اور جاتے وقت تم نے عقد کو ختم بھی نہیں کیا تھا لہٰذا تمہیں ان تین ماہ کا کرایہ بھی ادا کرنا پڑے گا جبکہ ملازم کا کہنا ہے کہ چونکہ میں نے جاتے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ واپس آکر نئے سرے سے کرایہ پر لوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجارہ ختم ہو گیا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کا مؤقف درست ہے؟ نیز کیا ملازم (کرایہ دار) ان تین ماہ کا کرایہ ادا کرنے کا شرعاً پابند ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق جب مدت کا تعین نہیں ہوا ہے صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ ماہانہ کرایہ پانچسو روپے ہوگا تو اس صورت میں کرایہ دار اور مالکِ مکان ہر ایک کو مہینہ کے اختتام پر ایک دوسرے کی موجودگی میں اجارہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا جب ملازم نے واضح طور پر مالکِ مکان سے یہ کہہ دیا کہ چھٹیوں کے بعد واپس آکر میں اس مکان کو

؎ قال العلامة قاضیخان : رجل استاجر اجیراً یوماً یعمل له کذا قالوا ان کان العرف بینهم انهم یعملون من طلوع الشمس الی العصر فهو علیٰ ذٰلك وان کان العرف انهم یعملون من طلوع الشمس الی غروب الشمس فهو علیٰ ذٰلك وان کان العرف مشترکاً فهو علیٰ طلوع الشمس الی غروبها اعتبار الذکرالیوم ۔ (الفتاوٰی قاضیخان مع السراجیة ج ۳ ص ۳۳ کتاب الاجارات فصل فی اجارة الدواب والضمان فیما یجب وفیما لا یجب) ۔

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوٰی الهندیة ج ۴ ص ۴۱۶ کتاب الاجارة ۔ الباب الثالث فی الاوقات التی یقع علیها عقد الاجارة ۔

دوبارہ کرایہ پرلوں گا تو یہ اجارہ ملازم کے گھر جانے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا ہے لہٰذا یہ ملازم ان تین ماہ کا کرایہ دینے کا پابند نہیں ہے۔

لما قال العلامة سليم رستم باز رحمہ اللہ: لو استوجر عقاراً كل شهر بكذا من دون بيان عدد الاشهر يصح العقد فى شهر واحد فقط و يفسد فى بقية الشهور لجهالتها والاصل انه متى دخلت لفظة كل فيما لا يعرف منتهاه تعين ادناه (در منتقى) لكن عند ختام الشهر الاول لكل من الآجر والمستاجر فسخ الاجارة فى اليوم وليلته من الشهر الثانى الذى يليه۔ (شرح مجلة الاحكام لسليم، مادة ۴۹۴ ص ۲۷۴ كتاب الذى فى الاجارات، باب الرابع فى المسائل التى تتعلق بمدة الاجارة) [1]

گاڑیوں کے ٹائر کرایہ پر دینا

سوال:۔ آجکل بعض دوکاندار لوگ گاڑی والوں کو ٹائر کرایہ پر دیتے ہیں، کیا اس طرح کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ اجارہ نام ہے کسی چیز کے منافع سے اجرت کے عوض فائدہ حاصل کرنا، بشرطیکہ اس میں جملہ شرائطِ اجارہ موجود ہوں، اسلیئے اگر صورتِ مسئولہ میں مدت اور کرایہ معلوم و متعین ہو تو گاڑیوں کے ٹائر کرایہ پر دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔

لما فى مجلة الاحكام: يشترط ان تكون الاجرة معلومة ــــ يشترط فى الاجارة ان تكون المنفعة معلومة بوجه يكون مانعا للمنازعة۔ (شرح المجلة لرستم باز، مادة ۴۵۰، ۴۵۱ ص ۲۵۴ الفصل الثالث فى شروط صحة الاجارة) [2]

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغينانى رحمه الله: ومن استاجر دارًا كل شهر بدراهم فالعقد صحيح فى شهر واحد فاسد فى بقية الشهور الا ان يسمى جملة الشهور معلومة۔

(الهداية ج ۳ ص ۳۰۲ كتاب الاجارات۔ باب الاجارة الفاسدة)

وَمِثْلُهٗ فى البحر الرائق ج ۸ ص ۱ كتاب الاجارة۔ باب الاجارة الفاسدة۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخارى رحمه الله: فى شرح الطحاوى عقد الاجارة لايجوز الا ان يبين البدل من الجانبين جميعًا اما بيان المنفعة فباحدى معان ثلاثة بيان الوقت وهو الاجل و بيان العمل و بيان المكان۔ (خلاصة الفتاوى ج ۳ ص ۱۰۳، الفصل السادس فى الاجارة)

وَمِثْلُهٗ فى الخانية على هامش الهندية ج ۲ ص ۱۰۳ كتاب الاجارة۔

اجارہ پر لی ہوئی زمین میں ہونے والے درختوں کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی سے اس کی مملوکہ زمین دس بارہ سال تک کاشت کرنے کے لیے اجارہ پر لی ہے، اب اس زمین میں درخت بھی ہیں تو کیا شرعاً یہ درخت مؤجر (مالکِ زمین) کے ہیں یا مستاجر (کاشتکار) کے؟

الجواب:۔ اگر یہ درخت مالکِ زمین نے لگائے ہوں اور خدمت کاشتکار نے کی ہو تو یہ درخت مالکِ زمین کے ہوں گے اور خدمت کرنے والے کو خدمت کا معاوضہ ملے گا اور اگر درخت اجارہ دار نے مالکِ زمین کی اجازت سے لگائے ہوں تب بھی یہی حکم ہے اور اگر بلا اجازتِ مالک لگائے ہوں تو درخت اجارہ دار کے ہوں گے اور مالکِ زمین کو زمین سے انتفاع کا اجرِ مثل دیا جائے گا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسی رحمہ اللہ:۔ وقد اطال صاحب التنقیح الکلام فی تحقیق ھٰذہ المسئلۃ قال فالحاصل ان من زرع ارض غیرہ بلا اذنہ علیٰ وجہ الغصب فان کانت الارض ملکاً اعدھا ربھا للزراعۃ اعتبر العرف فی الحصۃ ان کان ثمۃ عرف والا فان اعدھا للایجار فالخارج کلہ للزارع وعلیہ اجر مثلھا لربھا والا فان انتقصت فعلیہ النقصان والا فلا شیٔ علیہ۔ (فتاویٰ کاملیۃ ص۲۹ کتاب الاجارۃ)[۱]

اجارہ کردہ چیز کی مرمت کا خرچہ مستاجر کے ذمہ لگانے کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں زمیندار زمین کی کاشت کے لیے زرعی مشینری اجارہ پر لیتے ہیں، مالکِ مشین اور زمیندار کے مابین عقد ہوتا ہے کہ آمدنی کا تیسرا حصہ مالکِ مشین کا ہوگا اور اگر مشین خراب ہو جائے تو مرمت کا خرچہ زمیندار

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: فالحاصل ان من زرع ارض غیرہ بلا اذنہ ولو علیٰ وجہ المغصب فان کانت الارض ملکاً واعدھا ربھا للزراعۃ اعتبر العرف فی الحصۃ ان کان ثمۃ عرف والا فان اعدھا للایجار فالخارج کلہ للزارع وعلیہ اجر مثلھا لربھا والا فان انتقصت فعلیہ النقصان والا فلا شیٔ علیہ۔

(تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۱۷۲ کتاب الغصب)

ومثلہٗ فی ردّ المحتار ج۵ ص۱۹۵ کتاب الاجارۃ۔

کے ذمہ ہوگا، تو کیا اس طرح کا عقد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اس قسم کا اجارہ دو وجوہ کی بناء پر فاسد ہے (۱) اس میں اجرت متعین نہیں ہے (۲) یہ کہ مشین کی مرمت مستاجر (زمیندار) کے ذمے لگائی گئی ہے، اور اس شرط کا لگانا اجارہ کو فاسد کرتا ہے لہٰذا مستاجر پر اجرِ مسمّٰی واجب نہیں بلکہ اجرِ مثل واجب ہے، بشرطیکہ اجرِ مثل مقرر کردہ کرایہ سے زیادہ نہ ہو ورنہ بصورتِ دیگر مقرر کردہ کرایہ لازم ہوگا۔

قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: وکذا لو استاجر داراً او حانوتاً سنۃ بمائۃ درھم علیٰ ان یرمّھا المستاجر کان علی المستاجر اجر المثل بالغاً ما بلغ لانہ لما شرط المرمۃ علی المستاجر صارت المرمۃ من الاجر فیصیر الاجر مجھولاً فاما اذا کان فساد الاجارۃ بحکم شرط فاسد۔ (الفتاوی قاضیخان ج ۲ ص۲۱ کتاب الاجارات - باب الاجارۃ الفاسدۃ)[1]

تین ماہ سے قبل نوکری چھوڑی تو تنخواہ نہیں ملے گی۔ اجارہ فاسد ہے

سوال: ایک شخص نے اس شرط پر نوکر رکھا کہ اگر تین ماہ سے قبل نوکری چھوڑ دے گا تو تنخواہ نہیں دوں گا، مگر اس شخص (نوکر) نے تین ماہ سے پہلے ہی نوکری چھوڑ دی، تو کیا یہ شخص نوکری کے ایام کی تنخواہ کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب: اجارہ میں اس قسم کی شرائط لگانا صحیح نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ان دونوں کا اجارہ فاسد ہے، اس لیے نوکر کو اجرِ مثل دیا جائے گا بشرطیکہ اجرِ مسمّٰی سے کم ہو۔

---

[1] قال العلامۃ محمد کامل الطرابلسی رحمہ اللہ: سئلت عمن استاجر داراً باجر مجھول ھل تفسد الاجارۃ فالجواب نعم قال فی جامع الفصولین کل جھالۃ تؤثر فی البیع تؤثر فی الاجارۃ ویفسد بھا العقد سواء کانت الجھالۃ فی الاجرۃ والمدۃ او العمل المستاجر علیہ ویجب اجر المثل فی فاسدھا ولا یجاوز بھا المسمّٰی خ لا یجاوز المسمّٰی لو علم الاجر والا یجب بالغاً ما بلغ فلو استاجر بیتا سنۃ بمائۃ علیٰ ان یرمّھا المستاجر فعلیہ اجر مثلہ بالغاً ما بلغ اذ المرمۃ لما شرطت علی المستاجر صارت من الاجر فجھل الاجر۔ اھ (فتاوی کاملیۃ ص۱۹۹ کتاب الاجارۃ، مطلب تفسد الاجارۃ بجھالۃ الاجر)

ومثلہٗ فی ردّ المحتار ج ۵ ص۳۲ باب الاجارۃ الفاسدۃ۔

وفی الهندیة: وان تکاراها الیٰ بغداد علیٰ انها ان بلغته بغداد فله اجر عشرة دراهم والافلا شیٔ له فالاجارة فاسدة وعلیه اجر مثلها بقدر ما سار علیها۔
(الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۴۳ الفصل الثانی فیما یفسد العقد فیه لمکان الشرط) له

اجارۂ فاسد کی ایک اور صورت

سوال:- ایک شخص اپنا تجارتی مال بذریعہ ٹرک بنوں سے لاہور لے جانا چاہتا ہے، ٹرک کے مالک اور مال والے کے درمیان معاہدہ کچھ اس طرح ہوا کہ ٹرک کے مالک کو راستے میں ٹیکس والوں کو ادائیگی رقم کی ذمہ داری قبول کرنے پر دس ہزار روپے ملیں گے ورنہ بصورتِ دیگر صرف پانچ ہزار روپے کرایہ کے ملیں گے۔ کیا ایسا عقدِ اجارہ شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- یہ اجارہ فاسد ہے اور اجارۂ فاسد کا حکم یہ ہے کہ ایسی مزدوری جتنی اُجرت مروج ہو وہ دی جائے گی اور جو کچھ طے ہوا ہے وہ نہ دیا جائے گا، لیکن اگر مروج زیادہ ہو اور فریقین کے درمیان طے شدہ اجرت کم ہو تو طے شدہ اجرت ہی دی جائے گی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: (تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع) مما مر (یفسدها) کجهالة ماجور اواُجرة اومُدة اوعمل وکشرط طعام عبد وعلف دابة ومرمّة الدار اومغارمها وعشر او خراج اومؤنة۔ (رد المحتار ج۶ ص۴۶/۴۷ باب الاجارة الفاسدة) ۲ه

حیوان کو نصف پر رکھنا

سوال:- اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کو گائے یا بھینس کا بچہ اس شرط پر دے کہ وہ اس کی تربیت کرے اور پالے پوسے اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اسے فروخت کرکے قیمت آپس میں برابر برابر تقسیم کریں گے، کیا ایسا

له قال العلامة ابن نجیمؒ: وان بلغت بغداد فله کذا والافلا شیٔ له فهی فاسدة وعلیه اجر مثل ما سار علیها۔ (البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ باب الاجارة الفاسدة)
وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج۱ ص۳۱۷ باب الاجارة الفاسدة۔

۲ه وفی الهندیة: والاجارة تفسدها الشروط التی لایقتضیها العقد کما اذا شرط علی الاجیر الخاص ضمان ما تلف بفعله الخ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۴۴۲ الفصل الثانی فیما یفسد العقد فیه)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ باب الاجارة الفاسدة۔

عقد اجارہ کرنا شرعاً جائز ہے؟ اور اگر ناجائز ہے تو پھر جواز کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

الجواب:۔ یہ اجارہ قفیز الطحان کے حکم میں ہے، لہٰذا اس پر اجارۂ فاسدہ کا حکم لگایا جائے گا۔ لعدم تعیین الاجرۃ ولعدم تعیین المدۃ۔ جانبین کو چاہیئے کہ مدت اور اجرت کی تعیین کریں اور مدت ختم ہونے کے بعد اجیر کو متعین قیمت کے عوض نصف گائے دی جائے۔

وفی الھندیۃ: دفع بقرۃ الیٰ رجل علیٰ ان یعلفھا وما یکون من اللبن والسمن بینھما انصافاً فالاجارۃ فاسدۃ وعلیٰ صاحب البقرۃ للرجل اجر قیامہ وقیمۃ علفہ ان علفھا من علف۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۴۵ کتاب الاجارۃ۔ الفصل الثالث فی قفیز الطحان وما ھو فی معناہ) لہ

مزدوری میں زمین دینا

سوال:۔ کیا مزدور کو مزدوری کے عوض میں زمین دینا جائز ہے جبکہ عقد میں رقم دینا طے کیا گیا ہو؟

الجواب:۔ عقد اجارہ کی اجرت میں ہر وہ چیز دینا جائز ہے جو مالِ متقوم ہو لہٰذا مزدور کو مزدوری میں زمین دینا جائز ہے اگرچہ ابتداءِ عقد میں رقم دینے کا معاہدہ ہی ہو چکا ہو۔

وفی الھندیۃ: وماصلح ان یکون ثمناً فی البیع کالنقود والمکیل والموزون صلح ان یکون اجرۃ فی الاجارۃ ومالا یصلح ثمناً لایصلح اجرۃ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۱۱ کتاب الاجارۃ فی الباب الاول) ۲ہ

لہ قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی فتاوی النسفی رجل دفع بقرۃ الیٰ رجل بالعلف منھا صفۃ وھی التی بالفارسیۃ کاونیم سود بان دفع علیٰ ما یحصل من اللبن والسمن بینھما نصفان فھٰذا فاسد والحادث کلہ لصاحب البقرۃ والاجارۃ فاسدۃ۔
(خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۱۱۴ کتاب الاجارات، ومایتصل بھٰذا)

ومِثْلُہٗ فی الفتاوی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج۵ ص۳۷ کتاب الاجارۃ۔ النوع الثالث فی الدواب۔

۲ہ قال العلامۃ خالد الاتاسیؒ: ماصلح بدلاً فی البیع یصلح بدلاً فی الاجارۃ۔
(مجلۃ الاحکام مادۃ ۴۶۳ ص۲۶۰ فی بدل الاجارۃ)

ومِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۹۸ کتاب الاجارۃ۔

اجارہ میں زمیندار کو کاشت کی عام اجازت دینا

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنی زمین بایں طور عقدِ اجارہ پر دیدے کہ آپ جو چاہیں اس میں کاشت کریں، تو کیا از روئے شرع ایسا عقد کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ عقدِ اجارہ میں اگرچہ فصل وغیرہ کا تعین کرنا ضروری ہے بدون تعین کے اجارہ فاسد ہوگا، لیکن اگر مؤجر نے متاجر کو اس بات کی عام اجازت دی ہو کہ وہ جو چاہے اس میں کاشت کر سکتا ہے، تو اس صورت میں شرعًا یہ اجارہ صحیح اور درست متصور ہوگا۔

وفی الهندية: ولا بد فی اجارة الاراضی من بيان مايستاجر له من الزراعة والغرس والبناء وغير ذلك فان لم يبين كانت الاجارة فاسدة الا اذا جعل له ان ينتفع بما شاء هكذا فی البدائع۔ (الفتاوى الهندية ج۴ ص۴۴۰ كتاب الاجارة۔ الباب الخامس عشر فی بيان مايجوز من الاجارة ومالا يجوز) [1]

اجارہ علی الاجارہ جائز ہے بشرطیکہ اپنے مؤجر پر نہ ہو

سوال:۔ بعض علاقوں میں رواج ہے کہ ایک آدمی کسی زمیندار سے نصف آمدن پر زمین اجارہ کرتا ہے اور پھر اس زمین کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ دو تہائی پر اجارہ کرتا ہے، دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا اجارہ پر لی ہوئی زمین کسی دوسرے شخص کو اجارہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مستاجر کے لیے اجارہ علی الاجارہ جائز ہے بشرطیکہ اپنے مؤجر کے ساتھ نہ ہو اور اُجرتِ اولیٰ یا اس سے کم پر ہوں اور اگر اجرتِ اولیٰ سے زیادہ پر ہو تو اضافی رقم کو فقراء پر تصدق کر دے۔ ہاں دو صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: اوّل یہ کہ اجارہ ثانیہ خلافِ جنس

---

[1] قال العلامة برهان الدين المرغينانی رحمه الله: ولا يصح العقد حتى يسمى مايزرع فيها لانها قد تستاجر للزراعة ولغيرها ومايزرع فيها متفاوت فلابد من التعيين كی لايقع المنازعة او يقول ان يزرع فيها ماشاء لانه لما فوض الخيرة اليه ارتفعت الجهالة المفضية الى المنازعة ـ (الهداية ج۳ ص۲۹۶ كتاب الاجارات، باب مايجوز من الاجارة ومايكون خلافًا فيها)

ومثله فی فتاوى الكاملية ص۱۹۱ كتاب الاجارة۔

پر ہو، دوم یہ کہ مستاجر اجارہ کی ہوئی چیز کی اصلاح کرے، مثلاً اگر مکان ہو تو اس کی مرمت اور سفیدی وغیرہ کرے یا زمین ہو تو اس کی نالیوں وغیرہ کو ٹھیک کرے۔ ان دو صورتوں میں اجارۂ دوم اجارۂ اوّل سے زیادہ پر بھی جائز ہے۔

وفی الهندية: واذا استاجر دارًا وقبضها ثم اجرها فانه يجوز ان اجرها بمثل ما استاجرها او اقل وان آجرها باكثر مما استاجرها فهي جائزة ايضًا الا انه ان كانت الاجرة الثانية من جنس الاجرة الاولى فان الزيادة لا تطيب له ويتصدق بها وان كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة ولو زاد في الدار زيادة كما لو وتد فيها وتدًا او حفر فيها بيرًا او اصلح ابوابها او شيئًا من حوائطها طابت له الزيادة۔

(الفتاوی الهندية ج ۴ ص۴۲۵ کتاب الاجارہ۔ الباب السابع فی اجارۃ المستاجر) [۱]

مستاجر یا مؤجر کی موت سے اجارہ کا ختم ہونا

سوال:۔ اگر دو آدمیوں کے درمیان چند سالوں کے لیے کوئی عقدِ اجارہ ہو جائے لیکن اسی مدت کے اندر مؤجر یا مستاجر کی موت واقع ہو جائے تو کیا اس کے بعد بھی عقدِ اجارہ باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر متعاقدین نے عقدِ اجارہ اپنے لیے کیا ہو تو دونوں میں کسی ایک کی موت واقع ہو جانے سے عقدِ اجارہ فسخ ہو جائے گا لہٰذا ان کے پسماندگان کیلئے عقد کی تجدید ضروری ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ: واذا مات احد المتعاقدين وقد عقد الاجارة لنفسه انفسخت الاجارة۔ (الهداية ج ۳ ص۳۱۳ کتاب الاجارة۔ باب فسخ الاجارة) [۲]

---

[۱] قال ابن عابدينؒ: (قوله المستاجر ان يوجر الموجر الخ) اي ما استاجره بمثل الاجرة الاولى او بانقص فلو باكثر تصدق بالفضل الا في مسئلتين كما مر اوّل باب ما يجوز من الاجارة۔ (رد المحتار ج ۶ ص۹۱ مسائل شتی مطلب فی اجارة المستاجر ... الخ)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۳ ص۱۴۵ کتاب الاجارات فی الجنس الثانی۔

[۲] قال العلامة ابو البرکات النسفیؒ: وتنفسخ بموت احد المتعاقدين ان عقدها لنفسه وان عقدها لغيره لا۔ (کنز الدقائق ص۳۱۳ کتاب الاجارة)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۸۳ کتاب الاجارة۔

جعلی سندات پر بھرتی ہونے والے ملازم کی تنخواہ کا حکم

سوال:۔ حکومت نے سکولوں میں دینیات پڑھانے کے لیے اساتذہ کی بھرتی کا اشتہار شائع کیا اور یہ شرط لگائی کہ امیدوار کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو، اس پر ایک شخص نے کسی دینی مدرسے کے مہتمم کو پیسے دے کر اپنے نام کی جعلی سند لے لی اور انٹرویو کے دوران پیش کر کے بھرتی ہو گیا۔ تو کیا اس طرح بھرتی ہونے والے اس استاد کو حکومت کی طرف سے جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ اس کے لیے شرعاً حلال ہے یا حرام؟

الجواب:۔ عقد اجارہ سے ملنے والی اُجرت کی حلت کا دارومدار اس کام کا اہل ہونے پر ہے، لہٰذا مذکورہ شخص اگر مفوضہ ڈیوٹی کا اہل ہو تو تنخواہ حلال ہوگی ورنہ حرام، لیکن دھوکہ دہی رشوت دینے اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے گنہگار ضرور ہوگا۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: واما رکنها فهو الایجاب والقبول والارتباط بینهما واما شرط جوازها فثلاثة اشیاء اجر معلوم وعین معلوم وبدل معلوم ومحاسنها دفع الحاجة بقلیل المنفعة واما حکمها فوقوع الملك فی البدلین ساعة فساعة۔

(البحر الرائق ج ۸ ص۳ کتاب الاجارة) [1]

امام مسجد میں اہلیت نہ ہو تو اُسے معزول کیا جا سکتا ہے

سوال:۔ ایک شخص کافی عرصے سے ایک مسجد کا امام چلا آ رہا ہے لیکن اب اس کے مقتدیوں میں سے بعض لوگ اسے امامت سے معزول کرنا چاہتے ہیں، تو کیا ان کو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مسجد کی امامت اجارہ کے حکم میں ہے، اگر اجیر میں ذمہ داری ادا کرنے کی صلاحیت نہ رہے تو اجارہ فسخ کرنا جائز ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الفتاوی الصغری رجل استاجر

---

[1] قال العلامة ابن البزازؒ: لا یجوز عقدها حتی یعلم البدل والمنفعة وبیان المنفعة باحد ثلاث بیان الوقت وهو الاجل وبیان العمل والمکان فالاجر ببیان النقد۔

(البزازیة علی هامش الهندیة ج ۵ ص۱۱ کتاب الاجارات)

ومِثلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۳ ص۱۰۳ کتاب الاجارة۔

رَجُلاً لیعلّمہ حرفۃ کذا ھٰذہ السنۃ فمضی نصف السنۃ و لم یعلّمہ شیئاً فللمستاجر ان یفسخ الاجارۃ - (خلاصۃ الفتاوی ج ۳ ص ۱۲۱ کتاب الاجارۃ الفصل السابع فی فسخ الاجارۃ) لـه

امامتِ مسجد اور تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینے کا حکم

سوال:- کیا مسجد کی امامت اور تعلیم قرآن پر اُجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگرچہ امام ابوحنیفہؒ طاعات پر اجرت لینے کو ناجائز کہتے ہیں، لیکن یہ اُس دَور کی بات ہے جب اہلِ علم اور خادمینِ دین کی معاشی ضروریات بیت المال سے پوری کی جاتی تھیں لیکن بعد میں جب حکومتوں کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ سلسلہ بند ہو گیا تو فقہاء کرام نے تعلیمِ قرآن اور شعائر دینیہ کے ضائع ہونے کے اندیشہ سے اُجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دیدیا تاکہ دین کے یہ خادم دنیا کے دیگر کاموں سے ہٹ کر دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ دینی کام میں لگے رہیں۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ:- وبعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علیٰ تعلیم القرآن الیوم لانہ ظھر التوانی فی الامور الدینیۃ ففی الامتناع یضیع حفظ القرآن وعلیہ الفتوی - (الھدایۃ ج ۳ ص ۳۰۱ کتاب الاجارات) لـه

لـه وفی الھندیۃ: واذا استاجر استاذاً لیعلّمہ ھٰذا العمل فی ھٰذہ السنۃ فمضی نصف السنۃ فلم یعلّمہ شیئاً فللمستاجر ان یفسخ ما رأیت روایۃ فی ھٰذا لکن افتی الشیخ الامام علی الاسبیجابی فافتیت انا ایضاً، کذا فی الصغریٰ -

(الفتاوی الھندیۃ ج ۴ ص ۴۶۲ کتاب الاجارۃ - الباب التاسع عشر)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۵ ص ۳۹ کتاب الاجارۃ نوع فی تعلیم القرآن والحرف -

لـه قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اعلم ان عامۃ کتب المذھب من متون وشروح وفتاوی کلھا متفقۃ علیٰ ان الاستیجار علی الطاعات لا یصح عندنا واستثنی المتاخرون من مشائخ بلخ تعلیم القرآن فجوزوا الاستیجار علیہ و عللوا ذٰلک فی شروح الھدایۃ وغیرھا بما مر و بالضرورۃ وھی خوف ضیاع القرآن لانہ انقطعت العطایا من بیت المال وعدم الحرص علی الدفع بطریق الحسبۃ لیشتغلوا معلمون بہ بمعاشھم ولا یعلمون احداً ولیضیع القرآن فافتی المتاخرون بالجواز لذٰلک -

(تنقیح الحامدیۃ ج ۲ ص ۱۳۷ - الفتوی علیٰ جواز الاجارۃ علیٰ تعلیم القرآن)

وَمِثْلُہٗ فی کنز الدقائق ص ۳۶۲ کتاب الاجارۃ -

نکاح خوانی پر اُجرت لینے کا مسئلہ

سوال :- کیا نکاح پڑھانے پر اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب : نکاح پڑھنے پر اُجرت لینا فقہاءِ کرام کے ہاں مختلف فیہ ہے، چونکہ اس میں ایک گونہ تعلیم وتلقین بھی ہے اور تعلیم وتلقین پر اجرت لینا مفتیٰ بہ قول کے مطابق جائز ہے اس لیے فقہاءِ کرام نے اس میں اجرت کے جواز کو قولِ راجح قرار دیا ہے لہٰذا بناء بریں نکاح پڑھنے پر اُجرت لینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

قال العلامة قاضیخان رحؒ: اختلف المشائخ فی الدلالة فی النکاح هل یکون لها الاجر قال الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل رحؒ لا اجر لها لانه لا منفعة للزوج من کلامها بغیر عقد وانما منفعة الزوج فی العقد والعقد ما قام بها وقال غیره من المشائخ لها اجر مثلها لان معظم الامر فی النکاح یقوم بالدلالة فان النکاح لا یکون الا بمقدمات تکون من الدلالة فکان لها اجر المثل بمنزلة الدلال فی البیع فانه یستحق الاجر. (الفتاوی قاضیخان ج ۳ ص ۲۰ باب الاجارة الفاسدة) [1]

اجیرِ خاص کو ڈیوٹی کے اوقات میں کوئی دوسرا کام کرنا جائز نہیں

سوال :- زید ایک سکول ٹیچر ہے کیا وہ سکول ڈیوٹی کے دوران کسی قریبی مسجد میں امامت کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب : سکول ٹیچر چونکہ اجیرِ خاص ہوتا ہے اور اجیرِ خاص کے لیے ڈیوٹی کے اوقات میں دوسری ملازمت کرنا جائز نہیں، ورنہ اس کی تنخواہ سے بقدرِ غیر حاضری کے کٹوتی کی جائے گی۔ البتہ چھٹی یا تفریح کے وقت میں اگر وہ کوئی دوسرا کام کرنا چاہے تو بلا شک کر سکتا ہے، تاہم مذکورہ بالا صورت میں اگر اس کا عملِ تدریس متاثر نہیں

---

[1] وفی الهندیة : الدلالة فی النکاح لاتستوجب الاجر وبه یفتی الفضلی فی فتاواه وغیره من مشائخ زماننا کانوا یفتون بوجوب اجر المثل وبه یفتی کذا فی جواهر الاخلاطی ۔
(الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۴۵۱ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا کان المستاجر مشغولا لغیره)
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج ۳ ص ۱۱۷ کتاب الاجارة ۔

ہوتا ہو تو امامت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولیس للخاص ان یعمل لغیرہ ولو عمل نقص من اُجرتہ بقدر ما عمل فتاوی نوازل۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۷۰ باب ضمان الاجیر)[1]

اجیرِ خاص اپنا کام دوسرے آدمی سے نہیں کرا سکتا

سوال:۔ زید ایک سکول ٹیچر ہے لیکن بجائے زید کے اس کا بھائی عمرو سکول میں ڈیوٹی دیتا ہے، تو کیا زید کا ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں زید اجیرِ خاص ہے اور اجیرِ خاص شرعاً کسی دوسرے شخص سے اپنا کام نہیں کرا سکتا ورنہ کسی حادثہ کی صورت میں تمام تر ذمہ داری اس کی ہوگی، لہٰذا زید کے لیے ایسا کرنا ناجائز ہے۔

قال العلامۃ خالد اتاسیؒ: الاجیر الذی استوجب علی ان یعمل بنفسہ لیس لہ ان یستعمل غیرہ مثلاً لو اعطی احد جبۃ لخیاط علی ان یخیطھا بنفسہ بکذا دراھم فلیس للخیاط علی ان یخیطھا لغیرہ بل یلزم ان یخیطھا بنفسہ وان خاطھا بغیرہ وتلفت فھو ضامن۔ (مجلۃ الاحکام، مادۃ ۵۷۱ ص۳۰۶ الفصل الرابع فی اجارۃ الآدمی)[2]

اجیرِ خاص کا استحقاق

سوال:۔ اگر کسی علاقے کے سرکاری سکول میں طلباء نہ ہوں اور وہاں اساتذہ کا تقرر ہو چکا ہو جبکہ اساتذہ طلباء کی عدم موجودگی کی وجہ سے سکول حاضر نہیں ہوتے، تو کیا ان اساتذہ کو گورنمنٹ سے

---

[1] قال العلامۃ المرغینانیؒ: وانما سمی اجیر وحد لانہ لایمکنہ ان یعمل لغیرہ لان منافعہ فی المدۃ صارت مستحقۃ لہ والاجر مقابل بالمنافع ولھذا یبقی الاجر مستحقاً وان نقص العمل۔ (الھدایۃ ج۳ ص۳۱۱ کتاب الاجارات، باب ضمان الاجیر)

وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام لسلیم، مادۃ ۴۲۲ ص۲۳۲ الکتاب الثانی فی الاجارۃ۔ الباب الاول

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: واذا شرط علی الصانع ان یعمل بنفسہ فلیس لہ ان یستعمل غیرہ لان المعقود علیہ اتصال العمل فی محل بعینہ فیستحق عینہ کالمنفعۃ فی محل بعینہ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۹۶ کتاب الاجارات۔ باب الاجر متی یستحق)

وَمِثْلُہٗ فی العنایۃ علی ھامش فتح القدیر ج۸ ص۲۱

تنخواہ لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ سکولوں کے اساتذہ اجیرِ خاص کے حکم میں ہوتے ہیں لہٰذا سکولوں میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہونے کی وجہ سے ہی تنخواہ کے مستحق ہوں گے، بصورتِ دیگر عدم حاضری کی وجہ سے تنخواہ لینے کے حقدار نہیں ہوں گے۔

قال العلامة برهان الدین المرغیناني رحمه الله:۔ والاجیر الخاص الذی یستحق الاجرة بتسلیم نفسه فی المدة وان لم یعمل کمن استوجر شهراً للخدمة او لرعی الغنم۔
(الهدایة ج۳ ص۳۰۸ کتاب الاجارات۔ باب ضمان الاجیر)[1]

ملازم کے لیے مفوضہ ڈیوٹی کے علاوہ کوئی اور کام کرنا جائز نہیں

سوال:۔ ایک شخص فوج میں ملازم ہے، عموماً عصر کی نماز کے وقت افسرانِ بالا کی جانب سے گراؤنڈ میں حاضر ہونے کا حکم ہوتا ہے، چنانچہ ایک طرف نماز باجماعت کی فضیلت اور دوسری جانب افسروں کا حکم ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو نمازِ عصر سے پہلے گراؤنڈ میں پہنچنے کا حکم ملتا ہے، اس صورت میں اگر چند فوجی جوان مل کر کمرے میں ہی جماعت سے نماز پڑھ لیں تو عنداللہ گنہگار تو نہیں ہونگے؟

الجواب:۔ ایسے شخص کے لیے ڈیوٹی کے معین وقت پر پہنچنا ضروری ہے، تاہم اگر مسجد کی جماعت نہ ملے تو چند افراد مل کر کمرے میں ہی جماعت سے نماز پڑھ لیں تو درست ہے، لیکن فرض نماز چھوڑنا بھی جائز نہیں اور نہ ہی وقت سے پہلے نماز پڑھنا جائز ہے اس لیے کہ ملازم کو ڈیوٹی کے اوقات میں فرائض کے علاوہ دیگر امور میں مشغول رہنا صحیح نہیں ہے۔

وفی الهندیة: وفی الفتاوی الفضلی رحمه الله:۔ اذا استاجر رجلاً یوماً لیعمل کذا فعلیه ان یعمل ذلك العمل الی تمام المدة ولا یشتغل بشیء آخر سوی المکتوبة

---

[1] قال العلامة ابوالبرکات النسفی رحمه الله:۔ والخاص یستحق الاجر بتسلیم نفسه فی المدة وان لم یعمل کمن استوجر شهراً للخدمة اولرعی الغنم۔
(کنزالدقائق ص۳۶۷ کتاب الاجارات۔ باب ضمان الاجیر)
وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج۱ ص۳۲۳ کتاب الاجارة۔

وفی فتاوی اھل سمرقند قد قال بعض مشائخنا رحمھم اللہ تعالیٰ ان لہ یؤدی السنۃ ایضاً واتفقوا انہ لا یؤدی نفلاً وعلیہ الفتویٰ کذا فی الذخیرۃ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۴۱۶ کتاب الاجارۃ ۔ الباب الثالث فی الاوقات التی یقع علیھا عقد الاجارۃ) ۱؎

مال چوری ہونے کی صورت میں اجیرِ خاص پر ضمان کا حکم

سوال:۔ زید ایک دوکان کا مالک ہے اور دوکان کا کاروبار چلانے کیلئے اس نے ایک منشی رکھا ہوا ہے، منشی سے کسی نے دھوکے سے مال چوری کر لیا تو کیا منشی چوری ہونے والے مال کا ضامن ہوگا یا کہ زید یہ نقصان برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ اجیرِ خاص کے ہاتھوں میں مال بحکمِ امانت ہے اور چوری کی صورت میں امین پر ضمان نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں چوری ہونے والا مال کا منشی ضامن نہیں ہے بلکہ سارا بوجھ زید پر ہے۔ تاہم اگر اس چوری میں منشی ملوث ہو تو ضمان لیا جائے گا۔

قال العلامۃ خالد اتاسیؒ :۔ والاجیر الخاص امین حتیٰ انہ لا یضمن المال الذی تلف فی یدہٖ بغیر صنعہ وکذا لا یضمن المال الذی تلف بعملہٖ بلا تعد ایضاً ۔

(مجلۃ الاحکام، مادۃ نمبر ۶۱۰ ص۳۲۹ الفصل الثالث فی ضمان الاجیر) ۲؎

۱؎ قال العلامۃ ابن عابدینؒ :۔ (قولہ ولیس للخاص ان یعمل لغیرہ) بل ولا ان یصلی النافلۃ قال فی التتارخانیۃ وفی فتاوی الفضلی واذا استاجر رجلا یوماً یعمل کذا فعلیہ ان یعمل ذلک العمل الی تمام المدۃ ولا یشتغل بشیٔ آخر سوی المکتوبۃ وفی فتاوی سمرقند وقد قال بعض مشائخنا رحمھم اللہ تعالیٰ لہ ان یؤدی السنۃ ایضاً و اتفقوا انہ لا یودی نفلاً وعلیہ الفتویٰ ۔ (رد المحتار ج۶ ص۷۰ باب ضمان الاجیر، مطلب لیس للاجیر الخاص ان یصلی النافلۃ)

ومثلہٗ فی مجلۃ الاحکام مادۃ نمبر ۲۳۶ ص۱۲۰ کتاب الاجارۃ فی بیان ما یدخل فی البیع بدون ذکر صریح وما لا یدخل ۔

۲؎ قال العلامۃ ابن عابدینؒ :۔ قال فی جامع الفصولین استوجر رجل لحفظ خان او حوانیت فضاع منھا شیٔ قیل ضمن عند ابی یوسفؒ ومحمدؒ لو ضاع من خارج الحجرۃ لانہ اجیر مشترک وقیل لا فی الصحیح وبہ یفتی لانہ اجیر خاص ۔

(رد المحتار ج۶ ص۷۱ باب ضمان الاجیر، مطلب فی الحارس والخاناتی)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۳ ص۷۱ کتاب الاجارات، باب ضمان الاجیر۔

ٹیوب ویل کا پانی اجارہ پر دینے کا حکم

سوال:- اگر ٹیوب ویل کے مالک اور مالکِ زمین کے درمیان اس شرط پر عقد ہو جائے کہ مالکِ زمین اپنی زمین کے لیے پانی کے عوض ٹیوب ویل کے مالک کو پچاس روپے فی گھنٹہ دے گا، تو کیا ایسا عقد شرعاً جائز ہے؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں مدت اور اُجرت دونوں متعین ہے اور جب اجرت اور مدت متعین ہو تو ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لہٰذا ایسا معاملہ کرنا درست ہے۔

قال العلامة ابن بزاز الکردری: ولا یجوز عقدها حتی یعلم البدل والمنفعة وبیان المنفعة باحد ثلاث بیان الوقت وهو الاجل وبیان العمل والمکان فالاجر یبیان النقد وهو علیٰ غالب نقد البلد۔ (الفتاویٰ البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۵ ص۱۱ کتاب الاجارات الاول فی المقدمة) [1]

دینی مدارس کے لیے کمیشن پر چندہ کرنا جائز نہیں

سوال:- بعض دینی مدارس کے مہتممین حضرات کسی شخص کو چندہ کے لیے بھیجدیتے ہیں جبکہ ان کے درمیان یہ طے ہوتا ہے کہ جمع ہونے والے چندہ میں سے تیسرا حصہ اس سفیر کو ملے گا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- عقدِ اجارہ میں یہ ضروری ہے کہ اُجرت متعین ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ کے عقدِ اجارہ میں اُجرت متعین نہیں اس لیے یہ عقد فاسد ہے،
البتہ سفیر کو مدرسہ میں لازم رکھ کر اس کی تنخواہ مقرر کی جائے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله: تفسد الاجارة بالشروط المخالفة

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: فی شرح الطحاوی عقد الاجارة لایجوز الا ان یبین البدل من الجانبین جمیعاً اما بیان المنفعة فباحدی معان ثلاثة بیان الوقت وهو الاجل وبیان العمل و بیان المکان اما الاجر ان کان دراهم او دنانیر فالشرط بیان القدر۔
(خلاصة الفتاویٰ ج۳ ص۱۰۳ کتاب الاجارات، اما الاول فی المقدمة... الخ)
ومثلهٗ فی مجلة الاحکام، مادة ۴۵۰ ص۲۵۴ الفصل الثالث فی شروط صحة الاجارة۔

لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع مما مر یفسدها کجھالة ماجور او اجرة۔
(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۶ باب الاجارة الفاسدة) [1]

مدرسین دینی وعصری مدارس کیلئے چھٹیوں کی تنخواہ لینا جائز ہے

سوال: مدارس میں ایک معروف طریقہ ہے کہ مدرسین حضرات شعبان کے شروع سے لے کر شوال کے آخر تک چھٹیوں پر ہوتے ہیں، اس کے علاوہ سال کے درمیان میں بھی کبھی تو باجازتِ مہتمم اور کبھی بغیر اجازت کے چھٹی کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود مہتممین حضرات ان کو باقاعدہ تنخواہ دیتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب: ایام تعطیلات ایام عمل کے تابع ہوتے ہیں اس لیے چھٹیوں کی تنخواہ لینا ناجائز نہیں ہے، جب مدرسہ کے مہتمم اور معطین کے درمیان شرائط طے شدہ ہوں تو دونوں ان شرائط کے پابند ہوں گے لیکن اس میں معطین چندہ کی اجازت قولاً یا حالاً ضروری ہے اس لیے کہ مہتممین حضرات ان معطین کے وکیل ہوتے ہیں، اور اگر معطین کی اجازت و رضا نہ ہو تو مہتمم اپنے گھر سے تنخواہ دے گا۔ البتہ بیماری، عیدین اور دوسری ضروریات کی چھٹیوں کے بارے میں اگر مدرسہ کا کوئی مدون قانون ہو تو اس پر عمل درآمد ہوگا ورنہ جو عمل اور رویہ اہلِ مدارس کے نزدیک معروف ہو اُس پر عمل ہوگا اور معروف یہ ہے اساتذہ سے چھٹیوں کی تنخواہ نہیں کاٹی جاتی، تاہم جانبین پر لازم ہے کہ تنخواہ دیتے اور لیتے وقت اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں۔

قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: ومنھا البطالة فی المدارس کایام الاعیاد ویوم عاشوراء

---

[1] قال العلامة ابن نجیم المصریؒ: وقد ضبطه الشیخ ابوالحسن الکرخیؒ فی مختصره فقال اذا کان ما وقع علیه عقد الاجارة مجھولاً فی نفسه او فی اجرة او فی مدة الاجارة او فی العمل المستاجر علیه فالاجارة فاسدة وکل جھالة تدخل فی البیع فتفسده من جھة الجھالة فکذلك ھی فی الاجارة۔ اھ
(البحر الرائق ج ۷ ص ۳۱۲ باب الاجارة الفاسدة)
ومثله فی فتاوی کاملیة ص ۱۹۲ کتاب الاجارة۔

وشهر رمضان فی درس الفقه لما رھا صریحۃ فی کلامھم والمسئلۃ فیہا علی وجہین فان کانت مشروطۃ لم یسقط من المعلوم شئ والا فینبغی ان یلحق ببطالۃ القاضی و قد اختلف فی اخذ القاضی ما رتب من بیت المال فی یوم بطالتہ۔

(الاشباہ والنظائر ص۹۵) لہ

مسلمان کا کفّار کے ساتھ نوکری کرنے کا حکم

سوال:۔ آجکل اکثر مسلمان امریکہ، برطانیہ اور جاپان وغیرہ ممالک میں نوکری کی غرض سے جاتے ہیں اور وہاں کافروں کے ساتھ نوکری کرتے ہیں، کیا کسی مسلمان کو کفار کے ساتھ نوکری کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ اسلام نے ایک مسلمان کی عزت و عظمت کا بہت خیال رکھا ہے اس لیے مسلمانوں کو بھی اپنی عزتِ نفس کا خیال رکھنا چاہیئے، اس بناء پر جس نوکری میں ایک مسلمان کی تذلیل و تنقیص ہوتی ہو تو وہ اس کو نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر ایک مسلمان کو کسی کافر کے ہاں کوئی ایسی نوکری ملتی ہو جس میں اس کی اہانت اور ذلت نہ ہوتی ہو تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں اگرچہ خلافِ اولیٰ ضرور ہے۔

قال العلامۃ ابو بکر الکاسانیؒ:۔ ولو استأجر ذمی مسلما لیخدمہ ذکر فی الاصل انہ یجوز واکرہ للمسلم خدمۃ الذمی اما الکراھۃ فلان الاستخدام استذلال فکان اجارۃ المسلم نفسہ منہ اذلالا لنفسہ ولیس للمسلم ان یذل نفسہ خصوصاً بخدمۃ الکافر۔ (بدائع الصنائع ج۴ ص۱۸۹ فصل واما شرائط الرکن) ۲ہ

لہ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: حیث کانت البطالۃ فی یوم الثلاثاء والجمعۃ وفی رمضان والعیدین یحل الاخذ وکذا لو بطل فی یوم غیر معتاد لتحریر درس الا اذا نص الواقف علی تقیید الدفع بالیوم الذی یدرس فیہ۔ قال فی الفقیہ ابو اللیث من یأخذ الاجر من طلبۃ العلم فی یوم لا درس فیہ ارجو ان یکون جائزاً۔ (رد المحتار ج۳ ص۴۱۶ کتاب الوقف)

وَمِثۡلُہٗ فی شرح المجلۃ لرستم باز۔ المادۃ ۴۹۵ ص۲۷۲ الفصل الرابع فی اجارۃ الآدمی)

۲ہ قال العلامۃ قاضیخانؒ: مسلم آجر نفسہ من نصرانی ان استاجرہ لعمل غیر الخدمۃ جاز وان آجر نفسہ للخدمۃ قال الشیخ الامام ابو بکر محمد بن الفضل لا یجوز وذکر القدوری انہ یجوز یکرہ لہ خدمۃ الکافر۔ (الفتاوی قاضی خان ج۳ ص۱۸ کتاب الاجارات)

وَمِثۡلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج۳ ص۱۴۹ کتاب الاجارات، الفصل العاشر فی الحظر والاباحۃ۔

ریڈیو کی مرمت پر اُجرت لینے کا حکم

سوال:۔ ریڈیو جو کہ عموماً گانے بجانے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بسا اوقات اس میں قرآن مجید کی تلاوت، دینی تقاریر اور خبریں بھی نشر کی جاتی ہیں، اگر وہ خراب ہو جائے تو کیا اس کی درستگی پر مکینک کو اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ریڈیو اپنے اصل کے لحاظ سے ناجائز نہیں ہے اس کو اصلاحی، سائنسی، معلوماتی اور تربیتی مقاصد کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے اور جو چیز فی نفسہ برائی کے لیے نہ ہو مگر لوگ اس کو برائی کے لیے استعمال کرتے ہوں تو فقہاء نے اس کی خرید و فروخت اور اس پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، ہاں اگر کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ اس کو (ریڈیو کو) گانے بجانے اور خرافات کیلئے استعمال کرتا ہے تو اس کی مرمت بھی ناجائز ہے اور اس پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے۔

قال العلامۃ ابن بزاز الکردریؒ: ولا تجوز الاجارۃ علی الغناء والنوح ولو عمل لا اجر له۔ (البزازیۃ علی هامش الهندیۃ ج ۵ ص۱۵ نوع فی المتفرقات وفیه الاجارۃ علی المعاصی) [۱]

بیل کی گائے سے جفتی کرانے پر اُجرت لینا

سوال:۔ ہمارے علاقے میں بعض لوگ گائے کی جفتی کرنے کے لیے بیل پالتے ہیں اور اس پر متعین اُجرت لیتے ہیں، کیا یہ اُجرت لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ اُجرت کے جواز کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہو وہ اس شخص کی ملکیت ہو، چونکہ صورتِ مسئولہ میں گائے کا حمل ٹھہرانا کسی کے بس کی بات نہیں اس لیے اس پر اُجرت لینا ناجائز ہے، اس کے علاوہ احادیث مبارکہ میں بھی اس سے منع کیا گیا ہے۔

قال العلامۃ ابن نجیمؒ:۔ یعنی لا یجوز اخذ اُجرۃ عساب التیس لقوله علیه الصلوٰۃ والسلام

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: (لا تصح الاجارۃ لعسب التیس) وهو نزوۃ علی الاناث (و) لا (لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی) ولو اخذ بلا شرط یباح۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص۳۸ مطلب فی الاستیجار علی المعاصی)

ومثله فی بدائع الصنائع ج ۴ ص۱۸۹ کتاب الاجارۃ۔

ان من السحت عسب التیس ومهر البغی ولانہ عمل لا یقدر علیہ وھو الاحبال فلا یجوز اخذ الاجرۃ علیہ ولا اخذ المال بمقابلۃ الماء وھو نجس لا قیمۃ لہ فلا یجوز والمراد ھنا استیجار التیس لینزو علی الغنم ویحبلھا باجر

(البحر الرائق ج ۸ ص ۱۹ باب الاجارۃ الفاسدۃ) ؎۱

فوٹوگرافی پر اجرت لینا

سوال:۔ فوٹوگرافی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کو ذریعۂ معاش بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی جاندار کی تصویر بنانا یا بنوانا سخت گناہ کا کام ہے، البتہ اشد ضرورت (یعنی عمرہ یا حج کے لیے پاسپورٹ وغیرہ بنوانے کے لیے) کے موقع پر مرخص ہے مگر پھر بھی اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔

قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ:۔ ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وکذا سائر الملاھی لانہ استیجار علی المعصیۃ والمعصیۃ لا تستحق بالعقد۔

(الھدایۃ ج ۳ ص ۳۰۳ کتاب الاجارات) ؎۲

قلنگ وصول کرنا

سوال:۔ بعض علاقوں میں مال مویشی والے لوگ کسی کے پہاڑ یا زمین پر جا کر قیام کرتے ہیں اور اپنے مویشیوں کو چراتے ہیں جبکہ گاؤں والے یا مالکانِ اراضی "قلنگ" کے نام سے کچھ رقم ان سے وصول کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر قلنگ تو در و گھاس کا معاوضہ ہے تو پھر جائز نہیں کیونکہ اس میں مالک کی محنت کو کوئی دخل نہیں، اور اگر مملوکہ زمین یا پہاڑ پر رہائش اور قیام کرنے کا معاوضہ ہو تو باقاعدہ عقد اجارہ کی صورت میں یہ مال جائز رہے گا۔

؎۱ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: (قولہ لا تصح الاجارۃ لعسب التیس) لانہ عمل لا یقدر علیہ وھو الاحبال۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۵۵ مطلب فی الاستیجار علی المعاصی)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج ۳ ص ۳۰۳ کتاب الاجارات۔

؎۲ قال العلامۃ ابو البرکات النسفیؒ: ولا یجوز علی الغناء والنوح والملاھی۔

(کنز الدقائق ص ۳۶۴ کتاب الاجارات)

ومثلہٗ فی ردالمحتار ج ۶ ص ۵۵ مطلب فی الاستیجار علی المعاصی۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وتصح اجارۃ ارض لبناءٍ وغرس وسائر الانتفاعات کطبخ آجر وخزفٍ ومقیل ومراحٍ والمقیل مکان القیلولۃ والمراح بالضم مأوی الماشیۃ حتّٰی تلزم الاُجرۃ بالتسلیم امکن زراعتہا ام لا۔ (ردّ المحتار ج ۶ ص ۳۰ باب ما یجوز من الاجارۃ ومایکون خلافاً فیہا) [۱]

بینک کی چوکیداری کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا بینک کی چوکیداری کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بینکوں کا موجودہ نظام اگرچہ سودی نظام ہے جو شرعاً ممنوع ہے، مگر چوکیداری کا تعلق چونکہ براہ راست بینک کے سودی معاملات سے نہیں ہے، اس لیے بینک کی چوکیداری میں کوئی حرج نہیں تاہم اگر ہوسکے تو اجتناب ہی کیا جائے۔

وفی الھندیۃ: مسلم آجر من مجوسی لیوقد النار لا بأس بہ کذا فی الخلاصۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۴ ص ۴۵۰ الفصل الرابع فی فساد الاجارۃ اذا کان المستاجر ۔الخ) [۲]

بینک کی ملازمت کرنا

سوال:۔ کیا بینک کی ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ آجکل اکثر بینکوں میں سودی کاروبار کا طریقہ رائج ہے جبکہ قرآن وسنت میں سود کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں اور سودی معاملات کے لکھنے، لکھوانے اور شہادت دینے والوں کو بھی سود خوروں کے برابر قرار دیا ہے، اس بناء پر بینک کا ملازم یا تو کاتبین میں سے ہوگا یا شاہدوں میں سے ہوگا جو کہ لعنت کے زمرے میں

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ رحمہ اللہ: فاذا عرفت ذٰلک ظہر لک صحۃ الاجارات الواقعۃ فی زماننا من ان یستاجر الارض مقیلاً ومراحاً قاصداً بذلک الزام الاجر لتمکن منہا مطلقاً سواء شملہا الماء وامکن زراعتہا ام لا۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۱۱ باب مایجوز من الاجارۃ ومایکون خلافاً فیہا)

ومِثلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام، تحت المادۃ ۴۸۴ ص ۲۷۱ الباب الرابع فی المسائل ۔ بمدۃ الاجارۃ۔

[۲] قال العلامۃ سراج الدینؒ: آجر نفسہ من مجوسی لیوقد لہ النار لا بأس۔ (فتاوی سراجیۃ علٰی ھامش قاضیخان ص ۱۱۲ ج ۲ کتاب الاجارۃ۔ باب مایکرہ من الاجارۃ وما لا یکرہ)

ومِثلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوی ج ۳ ص ۱۴۹ کتاب الاجارۃ الفصل العاشر فی الحضر والاباحۃ۔

داخل ہے، اس لیے بینک کی ملازمت سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔

لما ورد فی الحدیث: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اکل الربٰوا وموکلہ قال قلت وکاتبہ وشاھدیہ قال انما نحدث بما سمعنا۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷ باب الربٰوا) [1]

خلافِ شرع کام کرنے کی اُجرت لینا

سوال:۔ کیا حجامت کا پیشہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس میں داڑھی کو مونڈنے اور انگریزی طرز کے بال بنانے پڑتے ہیں اور اس پر اجرت بھی لی جاتی ہے۔ اس مسئلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ حجامت کا پیشہ اختیار کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، البتہ سر کے بال خلافِ شرع بنانا اور داڑھی منڈھانا گناہ ہے اور گناہ کے کام پر کمائی حرام ہے، لہٰذا اس قسم کے ناجائز کاموں سے پرہیز ہی کیا جائے۔

قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولا یجوز الاستیجار علی شیء من الغناء والنوح والمزامیر۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۱۶ کتاب الاجارات جنس اٰخر فی المتفرقات) [2]

تعویذ پر اُجرت لینا جائز ہے

سوال:۔ اگر برکت، بیماری سے شفا یا کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے قرآنِ مجید کی کوئی آیت لکھ کر تعویذ بنا دیا جائے تو کیا اس پر اجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ احادیثِ نبوی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اور فقہاءِ کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ تعویذات پر اُجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ تعویذ خلافِ شرع امور کے لیے نہ ہو۔

---

[1] لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اکل الربٰوا وموکلہ قال قلت وکاتبہ وشاھدیہ قال انما نحدث بما سمعنا وقال ھم سواء۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۲۴۴ باب الربٰوا)
وَمِثْلُہٗ فی الصحیح البخاری ج ۲ ص ۸۸۱ کتاب اللباس، باب من لعن المصور۔

[2] قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وکذا سائر الملاھی لانہ استیجار علی المعصیۃ والمعصیۃ لا تستحق بالعقد۔ (الھدایۃ ج ۳ ص ۳۰۱ باب الاجارۃ الفاسدۃ)
وَمِثْلُہٗ فی ردالمحتار ج ۶ ص ۵۵ باب الاجارۃ الفاسدۃ۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: لان المتقدمین المانعین الاستیجار مطلقاً جوزوا الرقیة بالاجرة ولو بالقرآن کما ذکرہ الطحاوی لانها لیست عبادة محضة بل من التداوی۔ (رد المحتار ج۶ ص۵۷ باب الاجارة الفاسدة۔ مطلب تحریر مهم فی عدم جواز الاستیجار ۔۔الخ)[1]

دلالی کی اجرت لینا جائز ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آجکل کاروباری حلقوں میں دلالی کا رواج بہت زیادہ ہے اور اس پر اُجرت بھی لی جاتی ہے، تو کیا دلالی کی اجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دلالی پر اُجرت لینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک مختلف فیہ ہے مگر مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے قولِ جواز پر فتویٰ دیا گیا ہے بشرطیکہ اُجرت معیّن ہو اور دیگر مفاسد سے خالی ہو۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل وما تواضعوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذا فذاك حرام علیهم۔ وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن اُجرة السمسار فقال ارجوا انه لا بأس به وان کان فی الاصل فاسداً لکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة الناس الیه کدخول الحمام۔ (رد المحتار ج۶ ص۶۳ باب الاجارة الفاسدة۔ مطلب فی اُجرة الدلال)۔[2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واما حدیث الرهط الذین رقوا اللدیغ بالفاتحة واخذوا جعلا فسألوا النبی صلی الله علیه وسلم فقال احق ما اخذتم علیه اجراً کتاب الله فمعناه اذا رقیتم به کما نقله العینی فی شرح البخاری عن بعض اصحابنا وقال ان الرقیة بالقرآن لیست بقربة ای لان المقصود بها الاستشفاء دون الثواب۔

(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۳۹ کتاب الاجارة)

وَمِثْلُهٗ فی صحیح البخاری ج۲ ص۸۵۴ باب الرقی بالقرآن والمعوذات)

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: وفی الاصل اجرة السمسار والمغاری والحمامی والصکاك ومالا تقدیر فیه للوقت ولا مقدار لما یستحق بالعقد لکن للناس فیه حاجة جاز وان کان فی الاصل فاسداً۔ (خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۱۶ کتاب الاجارات۔ جنس اخر فی المتفرقات)

وَمِثْلُهٗ فی الاشباه والنظائر ج۳ ص۱۳ کتاب الاجارات۔

ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا جائز ہے

سوال: سکولوں کے اساتذہ نے حکومت کو اپنے کچھ مطالبات پیش کئے لیکن حکومت نے ان کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا، بار بار کی یاددہانی کے باوجود بھی حکومت نے نہ مانا تو اساتذہ نے مجبور ہو کر ہڑتال کر دی اور طالب علموں کو پڑھانا چھوڑ دیا لیکن خود سکولوں میں باقاعدگی سے حاضری دیتے رہے، تو کیا ان ہڑتالی اساتذہ کے لیے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: چونکہ جمہوری حکومتوں میں ملازمین کو ہڑتال کرنے کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ان ہڑتالی اساتذہ کے لیے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا جائز ہے، نیز اساتذہ چونکہ اجیرِ خاص کے حکم میں ہوتے ہیں اور اجیر صرف حاضری دینے سے بھی تنخواہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: لو استوجر استاذ لتعلیم علم او صنعة وسمیت الاجرة فان ذکرت مدة انعقدت الاجارة صحیحة علی المدة حتی ان الاستاذ یستحق الاجرة بوجوده حاضرا مهیئا للتعلیم تعلم التلمیذ او لم یتعلم۔ (مجلة الاحکام، مادة ۵۶۷ ص ۳۰۵ کتاب الاجارة۔ الفصل الرابع فی اجارة الآدمی) [1]

مریض کی تشخیص کرنے پر ڈاکٹروں کی فیس کا حکم

سوال: آجکل پرائیویٹ ہسپتالوں کی بہتات ہے جہاں ڈاکٹر حضرات مریض کی صرف تشخیص کی بھاری فیس لیتے ہیں، کیا مریض کی تشخیص پر ڈاکٹروں کا بھاری فیسیں لینا جائز ہے؟

الجواب: مریض کی تشخیص پر ڈاکٹروں کا فیس لینے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة خیر الدین الرملیؒ: سئل فی رجل داء فی انفه اتفق مع طبیب علی

---

[1] قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: وهو الموافق لتصریح المتون بانه یستحق الاجر بتسلیم نفسه فی المدة وان لم یعمل۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۷۰ باب ضمان الاجیر۔ مطلب لیس للاجیر الخاص ان یصلی النافلة)

ومثله فی الفتاوی الکاملیة ص ۱۹۵ کتاب الاجارة۔ مطلب فی الاجیر الخاص۔

من اواتہ وجعل لہٗ اجرۃ ولم یضرب لذٰلک مدۃ وداواہ فما الحکم (الجواب) للطبیب اجرۃ مثلہ وما انفق فی ثمن الادویۃ لفساد الاجارۃ علی الوجہ المذکور۔

(فتاویٰ خیریۃ علیٰ ہامش تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۱۸۲ کتاب الاجارۃ) [۱]

اجارہ پر لی ہوئی زمین میں افیون کاشت کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو اپنی زمین اجارہ پر دیدی، متاجر نے اس میں افیون کاشت کر دی، تو کیا اس پر اُجرت لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ کے مطابق اس طرح زمین پر اجرت لینا حرام نہیں ہے جیسا کہ فقہاء کی عبارات سے واضح ہے، کیونکہ مالکِ زمین نے ارتکابِ معصیت کے لیے زمین تو نہیں دی ہے جبکہ افیون کی ایک خاص مقدار کا ادویات میں استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

قال العلامۃ قاضی خانؒ: ولا بأس لمسلم ان یواجر دارہ من ذمی لیسکنھا وان شرب فیہ الخمر او عبد فیہ الصلیب او ادخل فیہ الخنازیر فذٰلک لا یلحق المسلم۔ (فتاویٰ قاضی خان مع سراجیۃ ج۳ ص۱۸ کتاب الاجارات، باب الاجارۃ الفاسدۃ) [۲]

عذر کی صورت میں اجارہ فسخ کرنا

سوال:۔ متاجر یا موجر میں سے اگر کوئی اجارہ فسخ کرنا چاہے تو شرعاً اس کی کیا تفصیل ہے؟

---

[۱] قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: سئل فی رجل بہ دار فی ظھرہ اتفق مع طبیب علیٰ مداواتہٖ وجعل اجرۃ ولم یضرب لہ مدۃ و داواہ ویرید الطبیب اجرۃ مثلہٖ وما انفقہ فی ثمن الادویۃ فھل لہٗ ذٰلک (الجواب) نعم والمسئلۃ فی الخیریۃ من الاجارۃ۔

(تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۱۵۱، ۱۵۲ کتاب الاجارۃ)

وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۸۱ باب فسخ الاجارۃ۔ مطلب فسق المستاجر لیس عذرًا فی الفسخ۔

[۲] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: واذا استاجر الذمی من المسلم دارًا لیسکنھا فلا بأس بہٖ وان شرب الخمر او عبد فیہ الصلیب لم یلحق المسلم شئ کما لو اجر دارہ من فاسق یعص اللہ فیھا۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۳ ص۱۵۱ کتاب الاجارات۔ للفصل العاشر فی الحظر والاباحۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۴ ص۴۵ الفصل الرابع فی فساد الاجارۃ اذا کان المستاجر۔ الخ

الجواب: مؤجر یا مستاجر میں سے کسی ایک کو بھی اگر واقعتاً عذر پیش آئے تو وہ یکطرفہ طور پر اجارہ فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے باربرداری کے لیے جانور کرایہ پر لیا تھا پھر اس کی آنکھیں ضائع ہوگئیں جس کی وجہ سے وہ جانور بیکار ہوگیا تو اس صورت میں میں مستاجر اجارہ فسخ کرسکتا ہے۔

وفی الہندیۃ: واذا تحقق العذر ومست الحاجۃ الی النقض ھل یتفرد صاحب العذر بالنقض او یحتاج الی القضاء والرضاء اختلف الروایات فیہ والصحیح ان العذر اذا کان ظاھر یتفرد وان کان مشتبھاً لا یتفرد کذا فی فتاوی قاضی خان۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۴ ص۴۵۸ کتاب الاجارۃ۔ الباب التاسع عشر فی فسخ الاجارۃ بالعذر) [۱]

نااہلی اجارہ فسخ کرنے کیلئے عذر ہے

سوال: کسی مدرسہ کا مہتمم اپنے ایک مدرس کو تعلیمی سال کے درمیان میں اس وجہ سے فارغ کرنا چاہتا ہے کہ تمہاری پڑھائی سے طلباء مطمئن نہیں ہیں، جبکہ مدرس کا کہنا ہے کہ مہتمم خود یا دوسرے مدرسین میرے درس میں آکر دیکھیں، اگر واقعتاً وہ میری تدریس میں نقص محسوس کریں تو بے شک مہتمم صاحب مجھے تدریس سے فارغ کردیں، ورنہ بصورتِ دیگر میری بے عزتی سے باز رہیں، اس قضیہ میں شرعی فیصلہ سے مستفید فرمائیں، مہربانی ہوگی؟

الجواب: اگر مدرس واقعی تدریس کرنے کا اہل نہ ہو تو مہتمم مدرسہ کو اجارہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے تاہم اس میں صرف مہتمم کے بیان کا اعتبار نہیں ہے کہ مدرس تدریس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس میں مدرس کی بات معقول نظر آتی ہے کہ خود مہتمم صاحب میری اہلیت کا جائزہ لیں یا کسی دوسرے مدرس سے فیصلہ کروائیں، عام مدارس کے قواعد وضوابط کی روشنی میں کسی مدرس کو دورانِ سال فارغ کرنا مروت کے خلاف ہے۔

وفی الہندیۃ: اذا استاجر استاذ لیعلمہ ھٰذا العمل فی ھٰذہ السنۃ فمضی نصف السنۃ فلم

---

[۱] قال العلامۃ ابن نجیمؒ: الاجارۃ عقد لازم لا تنفسخ بغیر عذر الا اذا وقعت علی استھلاک عین کالاستکتاب فلصاحب الورق فسخھا بلا عذر۔ (الاشباہ والنظائر ج۳ ص۱۱۱ کتاب الاجارۃ)

ومثلہٗ فی قاضیخان علی ھامش الہندیۃ ج۲ ص۳۵۲ کتاب الاجارۃ۔ فصل فیما تنتقض بہ الاجارۃ وما لا تنتقض بہ

يعلمه شيئاً فللمستاجر ان يفسخ۔ (الفتاوىٰ الهنديه ج۴ ص۴۶۱ كتاب الاجارة۔ فى الباب التاسع عشر فى فسخ الاجارة بالعذر) ؎۱

اجارہ پر دی ہوئی چیز کی بیع موقوف ہے

سوال:۔ زید نے ایک دوکان جو کہ دو بھائیوں کی ملکیت ہے، دس سال کیلئے اجارہ پر لی ہے اور سارا کرایہ پیشگی ادا کر دیا ہے اور فریقین کے مابین یہ شرط طے پائی ہے کہ ان دس سالوں کے درمیان مالکِ دوکان نہ تو دوکان فروخت کریں گے اور نہ ہی رہن پر دیں گے، لیکن پانچ سال کے بعد ایک بھائی نے اپنا نصف حصّہ زید کے ہاتھ فروخت کر دیا، اب زید یہ دعوٰی کرتا ہے کہ چونکہ طے شدہ دس سال کا معاہدہ ختم ہو چکا ہے اس لیے اب نئے سرے سے دوبارہ معاہدہ ہوگا اور مجھے آٹھ ہزار ماہانہ کرایہ دو گے، تو کیا اس طرح زید کو معاہدۂ اول فسخ کرنے اور کرایہ بڑھانے کا شرعاً حق پہنچتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق مالکِ دوکان کی بیع نافذ ہے لیکن دس سال ختم ہونے سے پہلے نہ تو مشتری اس پر قبضہ کر سکتا ہے اور نہ ہی مالکِ دوکان کرایہ دار کو نکال سکتا ہے اسی طرح از سرِ نو کرایہ بڑھانے کا معاہدہ کرنا بھی بے جا ہے۔ البتہ دس سال پورا ہونے کے بعد بیع بھی نافذ العمل ہوگی اور کرایہ بھی بڑھایا جا سکے گا۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: لو باع الآجر المأجور بدون اذن المستاجر كان البيع نافذاً بين البائع والمشترى وان لم يكن نافذ بحق المستاجر حتى انه بعد انقضاء مدة الاجارة يلزم البيع فى حق المشترى وليس له الامتناع عن اخذ المبيع الا ان يطلب تسليمه له من البائع قبل انقضاء مدة الاجارة الخ۔ (مجلة الاحكام، ماده ع۵۹۰ ص۳۱۵ الفصل الثانى فى تصرف العاقدين فى المأجور بعد العقد) ؎۲

؎۱ قال العلامة ابن بزازؒ: استاجر معلماً لتعليم ولده القرآن والحرفة فى سنة فمضت ستة اشهر ولم يعلم شيئاً له فسخ الاجارة۔ (الفتاوىٰ البزازية على هامش الهندية ج۵ ص۳۹ كتاب الاجارة۔ نوع فى تعليم القرآن والحرف)
وَمِثْلُهٗ فى الاشباه والنظائر ج۳ ص۱۳۹ كتاب الاجارة۔

؎۲ قال العلامة محمد كامل الطرابلسیؒ: سئلت عمن استاجر داراً ثم باعها الاخر حتى تبطل الاجارة بهذا البيع فالجواب انه رفع للتخيير الرملى عن مثل هذا السوال فاجاب عنه بما نصه لا يبطل الاجارة بهذا البيع بالاجماع وحكم البيع انه موقوف يصح ولا ينفذ وليس لغير المشترى فسخه والمشترى بالخيار علم اولم يعلم فى الاصح۔ وفى الخانية يتوقف على الاجارة المستاجر فى اصح الروايات۔
(فتاوىٰ كامليه ص۱۹۴ كتاب الاجاره، مطلب استاجر داراً ثم باعها كان البيع موقوفاً)
وَمِثْلُهٗ فى خلاصة الفتاوىٰ ج۳ ص۱۴۳ كتاب الاجارات۔

میوزک سنٹر کے لیے دوکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال:۔ آجکل اکثر مارکیٹوں میں میوزک سنٹروں کے لیے مخصوص دوکانیں بنائی جاتی ہیں اور پھر کرایہ پر دی جاتی ہیں، کیا یہ کرایہ لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ معاصی کے امور کے لیے مکان یا دوکان کرایہ پر دینے میں چونکہ گناہ میں اجیر بنات شریک نہیں اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مکان یا دوکان کے اجارہ لینے میں کوئی قباحت نہیں جبکہ صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک یہ اجارہ قبیح ہے تاہم چونکہ اس میں تعاون علی الاثم کا ایک گونا ہونا موجود ہے اس لیے اس قسم کے افعالِ قبیحہ کے لیے مکان یا دوکان کو اجارہ (کرایہ) پر دینا کراہت سے خالی نہیں۔

وفی الهندية: واذا استاجر الذمی من المسلم دارًا یسکنها فلا بأس بذلك وان شرب فيها الخمر اوعبد فيها الصليب او ادخل فيها الخنازير ولم يلحق المسلم فی ذلك بأس لان المسلم لا يؤاجرها لذلك انما آجرها للسكنی كذا فی المحيط۔ (الفتاوی الهندية ج۴ ص۴۵۰ الفصل الرابع فی فساد الاجارة اذا كان المستاجر مشغولاً بغيره)[1]

پگڑی دے کر دوکان یا مکان کرایہ پر لینے کا حکم

سوال:۔ آجکل کاروباری لوگوں میں یہ رواج عام ہوگیا ہے کہ ایک بھاری رقم (جس کو عرف میں پگڑی کہا جاتا ہے) دے کر دوکان کرایہ پر لیا جاتا ہے۔ کیا پگڑی دے کر دوکان کرایہ پر لینا جائز ہے؟

الجواب:۔ دوکانات یا دیگر کاروباری مکانات پر پگڑی دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں:
(۱) پگڑی اگر دوکاندار کو بصورتِ رشوت یا رہن دی جاتی ہو تو مالکِ دوکان اور کرایہ دار دونوں

---

[1] قال العلامة سراج الدين رحمه الله: آجر بيتًا ليتخذ فيه بيت نار او بيعة اوكنيسة او يباع فيه الخمر لا بأس به عند ابی حنيفةؒ خلافًا لهما۔ (فتاوی سراجية علی هامش قاضيخان ج۲ ص۱۴۱ كتاب الاجارة۔ باب ما يكره من الاجارة وما لا يكره)
ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۲۹ كتاب الاجارات۔ الفصل العاشر فی الحضر والاباحة۔

کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ (۲) اور اگر اجرتِ معجلہ کی صورت میں ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

قال العلامة محمد خالد اتاسی رحمه الله: تلزم الاجرة بالتعجيل يعنى لو سلم المستاجر الاجرة نقداً ملكها الآجر وليس للمستاجر استردادها سواء كانت الاجارة منجزة او مضافة۔ [البتہ]۔ (مجلة الاحکام، مادة ۴۶۷ ص۲۶۱ الفصل الثانی فی بیان المسائل المتعلقة بسبب لزوم الاجرة وكيفية استحقاق الاجرة) [۱]

آفات کی وجہ سے اجرت ساقط ہوتی ہے

سوال:۔ ایک شخص نے دس کنال زمین اجارہ پر لے کر اس میں گندم کاشت کی، اس کے بعد حکومت نے قریبی قصبے کو سیلاب سے بچانے کے لیے اس زمین سے بہت ساری مٹی اٹھالی جس سے زمین کو بہت نقصان پہنچا اور فصل بالکل تباہ ہوگئی، تو اس صورت میں اجارہ کی رقم مؤجر کو دینا پڑے گی یا کہ نہیں؟

الجواب:۔ حکومت کے مٹی اٹھانے کی وجہ سے اگر یہ زمین ناقابلِ کاشت ہو گئی ہو تو ناقابلِ کاشت ہونے کے بعد والی مدت کی اجرت ساقط ہو جائے گی اور ناقابلِ کاشت ہونے سے قبل کی اُجرت ساقط نہ ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: فاذا استاجرها للزراعة فاصطلم الزرع آفة وجب منها ما قبل الاصطلام وسقط ما بعده۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۷۱ باب ضمان الاجير۔ مبحث اختلاف المؤجر والمستاجر) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن نجيم رحمه الله: فی شرح الطحاوی الاجرة لا تخلو اما ان تكون معجلة او مؤجلة او منجمة او مسكوتا عنها فان كانت معجلة فان له ان يتملكها وله ان يطالب بها وان كانت مؤجلة فليس له ان يطالب الا بعد الاجل وان كانت منجمة فله ان يطالب عند كل نجم۔ (البحر الرائق ج۸ ص۵ کتاب الاجارات)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۳ ص۱۰۳ کتاب الاجارة۔

[۲] قال العلامة ابن البزاز الكردری رحمه الله: استاجر ارضا للزراعة فزرعها واصاب الزرع آفة او غرق الارض فعليه الاجر على الكمال ولو غرق قبل الزرع فلا اجر عليه قال فی المحيط والفتوى على انه اذا بقی بعد هلاك الزرع مدة لا يتمكن من اعادة الزراعة لا يجب الزراعة الاجر على المستاجر والا يجب اذا تمكن من زراعة مثل الاول۔

(البزازية على هامش الهندية ج۵ ص۵۹ الباب الثالث فی الضياع والعقار)

وَمِثْلُهٗ فی الهندية ج۴ ص۴۶۱ باب التاسع عشر فی فسخ الاجارة بالعذر۔

جن شروط سے بیع فاسد ہوتی ہے انہی شروط سے عقدِ اجارہ بھی فاسد ہوتا ہے

سوال:۔ ایک آدمی نے کسی دوسرے آدمی سے بیس ہزار روپے سالانہ اجارہ پر زمین لے کر پانچ ہزار روپے پیشگی دیئے اور یہ شرط لگائی کہ اگر مستاجر میعاد پوری ہونے سے قبل زمین چھوڑنا چاہے تو بھی مالکِ زمین کو پانچ ہزار روپے پورے دینے پڑیں گے، تو کیا ایسا اجارہ شرعاً درست ہے؟

الجواب:۔ یہ اجارہ شروطِ فاسدہ کی وجہ سے درست نہیں ہے کیونکہ اس میں تعیینِ مدت نہیں ہے، ہاں اگر اقالہ کا وعدہ صلبِ عقد میں ہوتا ہے تو ناجائز نہیں ہے لیکن بقدرِ مدت کے رقم ملے گی۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع) مما مر (یفسدها) کجهالة ماجور او اجرة او مدة او عمل وکشرط طعام عبد وعلف دابة ومرمة الدار او مغارمها وعشر او خراج او مؤنة۔ (ردّ المحتار ج۶ ص۴۶ باب الاجارة الفاسدة)[1]

گودام سے چوری ہونے والے مال میں چوکیدار پر ضمان نہیں

سوال: گودام جہاں مختلف لوگوں کا غلہ اور دیگر سامان رکھا ہوتا ہے وہاں سے اگر کسی کا سامان گم ہو جائے تو ضمان کس پر ہے جبکہ گودام کی حفاظت کے لیے چوکیدار بھی موجود ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں گودام کے چوکیدار پر ضمان نہیں ہے اور نہ ہی مستاجر ضامن ہے۔

قال العلامة سلیم رستم باز رحمه الله: قال فی جامع الفصولین استوجر

---

[1] قال العلامة محمد کامل الطرابلسیؒ، ففی التنویر وشرحه للعلائی تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع یفسدها کجهالة ماجور واجرة ومدة او عمل الخ (فتاوی کاملیة ص۱۹۲ کتاب الاجارة۔ مطلب تفسد الاجارة باشتراط الترمیم ونحوه)

ومثله فی البحر الرائق ج۷ ص۳۱۲ کتاب الاجارة۔ باب الاجارة الفاسدة۔

رجل لحفظ خان او حوانیت فضاع شئ قیل یضمن عند ابی یوسفؒ ومحمدؒ لوضاع من خارج الحجرة لانه اجیر مشترك وقیل لا فی الصحیح وبه یفتی لانه اجیر خاص الا یری انه لو اراد ان یشغل نفسه فی صنع آخر لم یکن له ذلك ولو ضاع من داخلها بان نقب اللص فلا یضمن۔

(شرح مجلة الاحکام مادة ۶۱۰ ص ۳۲۹ الفصل الثالث فی ضمان) [1]

کسی سفارتخانے سے ویزہ کے نکلوانے پر رقم لینا جائز نہیں

سوال:۔ایک شخص کسی غیر ملکی سفارت خانہ سے ویزہ لینا چاہتا ہے جس پر کل دس ہزار روپے خرچ آتا ہے، لیکن چند وجوہات کی بناء پر وہ ویزہ لینے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اب ایک دوسرا آدمی اُسے یہ کہتا ہے کہ اگر تم مجھے تیس ہزار روپے دے دو تو میں تمہارے لیے ویزے کا انتظام کر سکتا ہوں، اور دونوں کے درمیان تیس ہزار روپے پر معاہدہ ہوگیا، تو کیا اس صورت میں یہ رقم لینا اور دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔اگر ویزہ اس شخص کا حق بنتا ہو مگر بغیر رشوت کے حاصل نہیں کرسکتا ہو تو پھر دینے والے کے لیے رشوت حرام نہیں ہے البتہ لینے والے کے لیے حرام ہے ہاں اگر اس آدمی کو باقاعدہ طور پر ایک یا دو دنوں کے لیے اجیر بنا دیا جائے تو پھر لینے اور دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله:۔اهل بلدة ثقلت علیهم المؤنات فاستاجروا رجالاً باجر معلوم لیذهب الی السلطان ویرفع القصة لیخفف عنهم السلطان نوع تخفیف واخذ الاجر من عامة اهل البلدة من الاغنیاء والفقراء قالوا ان کان بحال لو ذهب الی بلدة السلطان یتهیأ له اصلاح الامر فی یوم او یومین

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: نقب حانوت رجل واخذ متاعه لا یضمن حارس الحوانیت علی ما علیه الفتوی لان الامتعة محروسة بابوابها وحیطانها والحارس یحرس الابواب۔

(البزازیة علی هامش الهندیة ج۵ ص۹۲ نوع المتفرقات)

ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۱۶ کتاب الاجارة۔

جازت الاجارۃ وان کان بحال لا یحصل المقصود فی یوم او یومین وانما یحصل فی مدۃ فان وقتوا الاجارۃ وقتاً جازت الاجارۃ ولہ کل المسمّٰی وان لم یوقتوا افسدت الاجارۃ وکان لہ اجر المثل علی اھل البلدۃ علی قدر مؤنتھم ومنافعھم۔ [1]

(فتاوٰی قاضی خان ج ۳ ص۱۸ باب الاجارۃ الفاسدۃ)

مسئلہ قفیز الطحان کا حکم

جناب مفتی صاحب! ہمارے علاقے میں آٹا پیسنے والی مشینیں عام ہیں، لوگ آٹا پسوانے کے لیے گندم وغیرہ لاتے ہیں اور مالکِ مشین نقد کی بجائے بیسواں یا تیسواں حصہ آٹا پیسنے کے عوض اجرت کے طور پر لیتے ہیں، کیا ایسا اجارہ شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ صورت قبیلہ قفیز الطحان سے ہے یعنی کسی ایسی چیز کو اُجرت میں متعین کرنا ہے جو اجیر کے عمل سے وجود میں آتی ہے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے اجارہ سے منع فرمایا ہے، اس کے صحیح یا ناجائز ہونے پر بہت سی صورتیں موقوف ہیں، ہاں اگر بغیر تعین کے اسی جنس سے پہلے یا بعد میں اُجرت دی جائے تو بالاتفاق جائز ہے۔ مشائخ بلخ نے اپنے علاقہ میں ابتلاء عوام وخواص کی بناء پر روٹی کے بارے میں جواز کا فتوٰی دیا ہے جیساکہ فتاوٰی عالمگیری میں اس کا ذکر ہے۔ لیکن آجکل چونکہ اکثر بلاد میں یہ طریقہ مروج ہے، مگر قفیز الطحان کا مسئلہ جوں کا توں رہے گا، عرف کی وجہ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

---

[1] وفی الھندیۃ: فی الکبرٰی اھل بلدۃ ثقلت علیھم مؤنات العمل فاستاجروا رجلاً باجرۃ معلومۃ لیذھب ویرفع امرھم الی السلطان الاعظم لیخفف عنھم بعض الحیف واخذ الاجرۃ من عامتھم غنیھم وفقیرھم ذکر ھٰھنا انہ ان کان بحال لو ذھب الی بلد السلطان تھیا لہٗ اصلاح الامر یوماً او یومین جازت الاجارۃ وان کان بحال لا یحصل ذٰلک الا بمدۃ فان وقتوا للاجارۃ وقتاً معلوماً فالاجارۃ جائزۃ والاجر کلہ لہ وانہ لو لم یوقتوا فھی فاسدۃ ولہٗ اجر مثلہ۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج۴ ص۵۲۶ الباب الثانی والثلاثون فی المتفرقات۔

ومثلہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام لسلیم رستم مادۃ نمبر ۵ ص۳۰۶ الفصل الرابع فی اجارۃ الآدمی۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ومن دفع الی حائک غزلاً لینسجه بالنصف فله اجر مثله وکذا اذا استاجر حماراً یحمل علیه طعاماً بقفیز منه فالاجارة فاسدة لانه جعل الاجر بعض ما یخرج من عمله فیصیر فی معنی قفیز الطحان وقد نهی النبی صلی الله علیه وسلم عنه۔

(الهدایة ج۳ ص۳۰۵ باب الاجارة الفاسدة کتاب الاجارات) [1]

شامی کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! شامی کی مندرجہ ذیل عبارت کی وضاحت مطلوب ہے:۔ عن المحیط ما اخذته الزانیة ان کان بعقد الاجارة فحلال عند ابی حنیفةؒ لان اجر المثل فی الاجارة الفاسدة طیبٌ۔ کیا واقعی امام صاحبؒ زنا پر اجرت کو حلال سمجھتے تھے؟

الجواب:۔ اولاً تو امام صاحبؒ کی طرف اس کی نسبت ہی صحیح نہیں، اس لیے کہ امام صاحبؒ جیسی متقی اور پاکباز شخصیت یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے کہ زنا جیسے قبیح عمل پر اجرت لینا حلال ہے۔

قال العلامة الرافعیؒ: لعل ارادته ولعید عن الامام المعروف بالورع۔ (التقریرات ج۲ ص۲۶۳ باب الاجارة الفاسدة) البتہ بصورت صحت توجیہ یہ ممکن ہے کہ اجارہ میں اصل معقود علیہ زنا نہیں بلکہ ایک امر مباح مثلاً گھر کا کام کاج ہے مگر اس کے ساتھ زنا بطور شرط ٹھہرائی جائے جیسے اجارۂ فاسدہ ہو جاتا ہے لیکن اصل عقد کی وجہ سے اُجرت حلال ہے اگرچہ اس کے ضمن میں زنا بھی ہوتا رہے۔

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمة الله: ولو دفع غزلاً لآخر لینسجه له بنصفه ای بنصف الغزل او استاجر بغلاً لیحمل طعامه ببعضه او ثوراً لیطحن بره ببعض دقیقه فسدت فی الکل لانه استاجره بجزء من عمله والاصل فی ذٰلک نهیه صلی الله علیه وسلم عن قفیز الطحان وقدمناه فی بیع الوفاء والحیلة ان یفرز الاجر اولاً او یسمی قفیزاً بلا تعیین ثم یعطیه قفیزاً منه فیجوز۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۵۶ باب الاجارة الفاسدة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۴ ص۴۴۴ الفصل الثالث فی قفیز الطحان۔

اجارہ پر جانور پالنے کا طریقہ

سوال :- جناب مفتی صاحب! آجکل یہ رواج عام ہے کہ مالدار آدمی کسی تنگدست کے لیے جانور خریدتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ تم اسے پالو اس کا جو بچہ ہوگا وہ دونوں کا مشترکہ ہوگا۔ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ اور اس کے جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب :- صورتِ مسئولہ میں چونکہ اُجرت مجہول ہے اس لیے یہ معاملہ درست نہیں، البتہ اس کے جواز کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مالدار آدمی جانور لے کر اس کی قیمت لگا دے اور پھر نصف نصف کرے اور چرانے والا اس کو قبول کر کے نصف قیمت ادا کرنے لگے تو اُسے نصف قیمت کی ادائیگی سے بری کر دے اور پھر اس سے کہے کہ تم اس کی پرورش کرو اور اس سے ہونے والا بچہ ہم دونوں کا مشترکہ ہوگا، اگر وہ منظور کرے تب تو دونوں اس جانور کے بچے میں برابر کے شریک ہوسکتے ہیں ورنہ نہیں۔

مشروط میعاد سے قبل دوکان خالی کرنے پر کل میعاد کے کرایہ کا حکم

سوال :- کسی شخص نے ایک دوکان تین سال کے لیے کرایہ پر لی، مالکِ دوکان نے کرایہ دار سے یہ طے کیا کہ چاہے تم اس میں پورے تین سال تک کاروبار کرو یا کم، کرایہ تین سال کا ہی ادا کرو گے، کرایہ دار نے یہ شرط قبول کر کے کاروبار شروع کر دیا، ایک سال کے اندراندر دو مرتبہ دوکان سے چوری ہوگئی، کرایہ دار مالکِ دوکان اور اس کے بیٹوں پر شک کرتا ہے جبکہ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں کہ دعویٰ کو ثابت کرسکے۔ اور اب وہ اس عذر کی بناء پر دوکان خالی کرنا چاہتا ہے مگر مالکِ دوکان پورے تین سال کا کرایہ لینے پر مصر ہے، یاد رہے کہ مقررہ میعاد پوری ہونے پر دو سال باقی ہیں۔ تو کیا مالکِ دکان بقیہ میعاد کے کرایہ کا حقدار ہے یا نہیں؟

الجواب :- حسبِ معاہدہ اگرچہ دوکان کا مالک جملہ میعاد کے کرایہ کا حقدار ہے مگر عذرِ شرعی کی بناء پر دوکان خالی کرنے کے بعد والی میعاد کا کرایہ وصول نہیں کرسکتا اور نہ اس کو یہ حق حاصل ہے۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانوی رحمہ اللہ : یہ خالی کرنا اگر کسی عذر سے ہے تو کل کرایہ وصول نہ کیا جاوے گا ورنہ وصول کیا جاوے گا۔

(امداد الفتاوٰی ج ۳ ص ۳۸۷ کتاب الاجارہ)

رشوت کے ذریعے حاصل کیے ہوئے ٹھیکہ کی کمائی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے رشوت دے کر کسی کام کا ٹھیکہ حاصل کیا، پھر شرعی حدود کی خلاف کیے بغیر وہ کام پورا کر کے کچھ کمایا، تو کیا یہ کمائی اس شخص کے لیے حلال اور جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ رشوت یا دیگر غیر شرعی طریقوں سے حاصل کیا ہوا ٹھیکہ یا کوئی بھی کام فی نفسہٖ جائز نہیں، اور پھر شرعی حدود کی خلاف ورزی کیے بغیر وہ عمل کر کے کچھ کمانا اس عامل کیلئے قابلِ اعتراض نہیں، اگرچہ رشوت دینا اور لینا حرام ہے۔

وفی الھندیۃ: سئل محمد بن مقاتل رحمہ اللہ تعالیٰ عن رجلٍ سرق ماءً واساله الیٰ ارضه وکرمه فأجاب انه یطیب لهٗ ما خرج بمنزلة رجل غصب شعیرًا او تبنًا وسمن به دابة فانه یجب علیه مثل ما غصب وما زاد فی الدابة طیب لهٗ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۳۷۴، ۳۷۵ کتاب الکراھیۃ، الباب الثلاثون فی المتفرقات)

کمیشن لینے کی شرعی حیثیت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! عصرِ حاضر میں کمیشن کا بہت رواج ہے، مثلاً ایک کاریگر کسی شخص کے لیے دوکان سے سامان لینے جاتا ہے، وہ شخص کاریگر پر اعتماد کرتا ہے کہ میرے لیے عمدہ سامان کم قیمت پر خریدے گا۔ جبکہ بائع (دکاندار) کاریگر کو کمیشن دے کر کم قیمت کا سامان اس پر مہنگے داموں فروخت کرتا ہے، شرعاً اس کمیشن کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ دوکاندار (بائع) طرف سے اس خریدار (کاریگر) کو کوئی رقم وغیرہ دینا ناجائز نہیں ہے، تجّار کی طرف سے یہ اکرام تجارت کو فروغ دینے کیلئے کیا جاتا ہے اور یہ اصولِ تجارت میں شمار ہے، البتہ اس کاریگر کے لیے یہ رقم لینا اُس وقت جائز ہے جبکہ وہ باقاعدہ تگ و دو سے وہ چیز خریدے اور پہلے سے کمیشن لینے کی شرط نہ لگائے اور طمع سے دل کو خالی کرے، یعنی دل میں یہ فیصلہ کرے کہ اگر یہ دوکاندار مجھے کمیشن نہ بھی دے تو میں سوائے طبعی بوجھ کے دیگر اثر سے متاثر نہ ہوں گا۔

قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ولو قضی حاجته بلا شرط ولا طمع فاھدی الیه بعد ذٰلك فھو حلال لا بأس به۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۲ فی اقسام الرشوۃ)

ولما قال العلامة الکاسانی: والقیاس فی استئجار الظئر بطعامها وکسوتها انہ لایجوز وھو قول ابی یوسف ومحمد لجہالۃ الاجرۃ وھی الطعام والکسوۃ الا ان ابا حنیفۃ رحمہ استحسن الجواز بالنص وھو قولہ عزوجل وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف من غیر فصل بین ما اذا کانت الوالدۃ منکوحۃ او مطلقۃ وقولہ عزوجل وعلی الوارث مثل ذلک ای الرزق والکسوۃ وذلک یکون بعد موت المولود..... وقولھا الاجرۃ مجھولۃ مسلم لکن الجہالۃ لاتمنع صحۃ العقد لعینھا بل لافضائھا الی المنازعۃ وجہالۃ الاجرۃ فی ھذا الباب لاتفضی الی المنازعۃ لان العادۃ جرت بالمسامحۃ مع الاظار والتوسیع علیھن شفقۃ علی الاولاد فاشبھت جہالۃ القفیز من الصبرۃ۔

(بدائع الصنائع ج۴ ص۱۹۳ کتاب الاجارۃ مطلب فیما یرجع الی المعقود علیہ)

کام میں رکاوٹ پیدا ہونے کے خوف سے ٹھیکیدار کا افسرانِ بالا کو رشوت دینا

سوال: جناب مفتی صاحب! درج ذیل مسئلہ کے متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(۱) ایک آدمی سرکاری ٹھیکہ لیتا ہے تو سرکاری آفیسر اس سے بارہ یا پندرہ فیصد ضرور کمیشن لیتے ہیں اور اگر کوئی ٹھیکیدار کمیشن نہ دے تو اس کے کام میں رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں، نیز سرکاری آفیسر اس کمیشن کو اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس کام کی نگرانی کرتے ہیں، اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ٹھیکیدار بامر مجبوری مذکورہ کمیشن دیتا ہے کیونکہ اس کا ذریعۂ معاش یہی ہے۔ تو کیا ٹھیکیدار کے لیے اس طرح ٹھیکہ لینا جائز ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں؟

(۲) روزہ کی خاطر اگر کوئی عورت ایسی گولی استعمال کرے کہ اس کا حیض رک جائے تو کیا روزہ کی خاطر حیض روکنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: (۱) ٹھیکہ دینے کے بدلے جو افسران ٹھیکیدار سے کمیشن کے نام پر پیسے لیتے ہیں وہ رشوت میں داخل ہے، کام کی نگرانی کرنا ان کا فریضۂ منصبی ہے، اس کے بدلے وہ حکومت سے تنخواہ لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر ٹھیکیدار ٹھیکہ لینے کا حقدار ہو اور بغیر رشوت کے اسے ٹھیکہ نہ دیا جاتا ہو تو بحالتِ مجبوری اس کو تو رشوت دینا مرخص ہے مگر افسران بالا کیلئے لینا ہرگز حلال نہیں۔
ٹھیکیداری کرنا ایک مباح کام ہے اصول اور دیانتداری سے کرنا چاہیئے۔

(۲) حیض بند کرنے کے لیے گولیاں استعمال کرنا کوئی ممنوع عمل نہیں اور نہ اس سے روزے پر کوئی فرق پڑتا ہے تاہم اگر طبی لحاظ سے ایسا کرنا مضر ہو تو اس سے اجتناب کرنا ہی مناسب ہے۔

امام مسجد کا حق امامت سے زیادہ چھٹیاں کرنا

سوال:۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب مہینے میں دس دن غائب رہتے ہیں اور بیس دن حاضر، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ اتنی غیر حاضری کیوں کرتے ہیں؟ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ میں تمہارا امام ہوں یہ میرا حق ہے، تمہیں مجھ سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ تو کیا اتنی زیادہ غیر حاضریاں کرنا واقعی شرعاً امام کا حق ہے، اگر ہے تو کتنے دن تک امام غیر حاضری کر سکتا ہے؟ تفصیلی جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب: تنخواہ دار شخص کی تعطیلات کا دارومدار عرف پر مبنی ہے عرف میں جتنے ایام اس کی تعطیل کے ہوں گے اتنے دن چھٹی کرنا اس کا حق ہے، باقی عرف سے زیادہ چھٹیاں کرنا قابلِ گرفت ہے۔ علامہ ابن عابدینؒ کے نزدیک سال بھر میں پندرہ دن تک کی چھٹی قابلِ معافی ہے۔[1] لہٰذا مذکورہ امام مسجد اگر سال یا مہینہ میں عرف (طے شدہ معاہدہ) کے مطابق غیر حاضر رہتا ہو تو اس کا مواخذہ کرنا درست نہیں اور اگر عرف سے زیادہ غیر حاضر رہتا ہو تو قابلِ گرفت ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: اما یترك الامامة لزیادة...... فی الرساتیق اسبوعاً او نحوه او لمصیبة او لاستراحة فلا بأس به ومثله عفو فی العادة والشرع۔ (رد المحتار بحوالہ عزیز الفتاویٰ ج۱ ص۶۶۵ کتاب الاجارات)

نمازِ جنازہ پڑھانے کی اُجرت لینا

سوال:۔ بعض علاقوں میں رواج ہے کہ جب کوئی امام مسجد کسی میت کا جنازہ پڑھائے تو میت کے ورثاء اس کو ایک جوڑا کپڑے اور کچھ نقدی بھی دیتے ہیں، اُمراء کے علاوہ فقراء اور نادار لوگ بھی اس رسم کو پورا کرنے پر مجبور ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: کسی مسلمان کی نماز جنازہ پڑھانا یا پڑھنا فرض کفایہ ہے اور اس کا حکم

---

[1] قال العلامة مفتی عزیز الرحمنؒ: اس کا حاصل یہ ہے کہ امام کو اپنی ضروریات یا راحت کیلئے ایک ہفتہ یا اس کے قریب یعنی پندرہ دن سے کم تک غیر حاضری عرفاً و شرعاً جائز ہے۔ پھر آگے تصریح کی ہے کہ ظاہراً مراد یہ ہے کہ اگر سال بھر میں ہفتہ دو ہفتے غیر حاضری ہو تو معاف ہے۔
(عزیز الفتاویٰ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) جلد ۱ ص۶۶۵ کتاب الاجارات)

تلاوتِ قرآن پر اُجرت لینے کی طرح ہے، جس طرح عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں ہے اسی طرح نمازِ جنازہ بھی چونکہ عبادات میں شمار ہے اس لیے اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ تاہم اگر میت کے ورثاء اپنی خوشی سے جنازہ پڑھانے والے کو بلا تعین اور بلا معروف اور مروج ہونے کے کچھ دینا چاہتے ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دینے اور لینے والے دونوں کی نیت بھی درست ہو۔ اور ورثاء میں کوئی نابالغ نہ ہو۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قال تاج الشریعة فی شرح الهداية ان القرآن بالاجرة لایستحق الثواب للمیت ولا للقاری ..... لولا اجرة ما قرأ احد لاحد فی هذا الزمان۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۳۵ کتاب الاجارة مطلب فی الاستیجار علی الطاعات) [1]

گولڈن ہینڈ شیک سکیم کی شرعی حیثیت

سوال:- جناب مفتی صاحب! آجکل بعض سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے اپنے ملازمین میں ایک سکیم متعارف کرائی ہے کہ جو افراد مقررہ مدت سے پہلے نوکری چھوڑ دیں تو ادارہ ان کو بقیہ مدت کا معاوضہ اور دیگر مراعات دے گا۔ تو کیا نوکری چھوڑنے کے عوض یہ معاوضہ لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- حقِ وظیفہ کا شمار حقوقِ مجردہ میں ہوتا ہے جس کے عوض مالی معاوضہ یا کسی قسم کی مراعات لینا حرام و ناجائز ہے، مگر موجودہ ملکی قوانین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا

---

[1] لما قال العلامة المفتی عزیز الرحمٰنؒ: (الجواب) نماز جنازہ پڑھانے کی وجہ سے روپیہ پیسہ لینا درست نہیں ہے کہ نماز جنازہ فرض کفایہ و عبادت ہے اور عبادت پر روپیہ پیسہ لینا جائز نہیں جیساکہ تلاوتِ قرآن مجید پر روپیہ پیسہ لینا درست نہیں ہے، اور دینے والا اور لینے والا اگرچہ معاوضہ اور اُجرت کا نام نہ لیویں لیکن بحکم المعروف کالمشروط جب کہ یہ لینا دینا بعد نماز جنازہ و تلاوتِ کلام اللہ معروف ہوگیا ہے اور نماز جنازہ پڑھنے پڑھانے والے اور قرآن شریف پڑھنے والے اسی خیال اور نیت سے پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ ہم کو روپیہ پیسہ ملے گا لہٰذا یہ لینا دینا ناجائز ہے۔ (عزیز الفتاویٰ دفتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد ۱ ص ۶۶۵ کتاب الاجارات)

ہے کہ اس قسم کی مراعات ملازمین کے ایسے حقوق ہیں کہ بغیر کسی ملازم کی اجازت و رضامندگی کے کوئی اور ان مراعات کو حاصل نہیں کر سکتا، نیز قانونی تحفظ کی وجہ سے یہ حقوق ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اس لیے متاخرین فقہاء کرام نے اس قسم کے (حق النزول) حقوق سے دستبردار ہو کر مالی معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے، حکومت کی گولڈن ہینڈ شیک سکیم کی حیثیت بھی انہی حقوق کی طرح ہے، اس لیے ملازمین کا اپنی مدتِ ملازمت ختم ہونے سے قبل استعفاء دینے کے عوض سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے پیسے لینا جائز ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: قوله ویفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال (قال العلامة العینیؒ: فی فتاوہ لیس للنزول شیٔ یعتمد علیه ولکن العلماء والحکام مشوا ذلك للضرورة واشترطوا امضاء الناظر مثلاً یقع فیه نزاع ..... فی باب القسم بین الزوجات انه سمع من بعض شیوخه الکبار انه یمکن ان یحکم بصحة النزول عن الوظائف الدینیة قیاساً علی ترك المرأة قسمها لصاحبتها لان کلاً منهما مجرد اسقاط ..... واستدل بعضهم للجواز بنزول سیدنا الحسن بن علی رضی الله عنه عن الخلافة لمعاویة رضی الله تعالیٰ عنه علی عوض وهو ظاهر ایضاً وهذا اولیٰ مما قدمنا فی الوقف عن الخیریة من عدم الجواز ومن ان للمفروغ له الرجوع بالبدل بناءً علی ان المذهب عدم اعتبار العرف الخاص وانه لایجوز الاعتیاض عن مجرد الحق لما علمت من ان الجواز لیس مبنیاً علی اعتبار العرف الخاص بل علی ما ذکرنا من نظائره الدالة علیه وأن عدم جواز الاعتیاض عن الحق لیس علی اطلاقه ورأیت بخط بعض العلماء عن المفتی ابی السعود انه افتی بجواز اخذ العوض فی حق القرار والتصرف وعدم صحة الرجوع وبالجملة فالمسئلة ظنیة والنظائر متشابهة للبحث فیها مجال۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۵۰۹، کتاب البیوع مطلب فی النزول عن الوظائف بالمال)

---

[1] لما قال العلامة خالد اتاسیؒ، اقول وعلی ما ذکروہ من جواز الاعتیاض عن الحقوق المجردة بمال ینبغی ان یجوز الاعتیاض عن حق التعلی وعن حق الشرب وعن حق المسیل بمال لان هذه الحقوق لم تثبت لاصحابها لاجل دفع الضرر عنهم بل تثبت لهم ابتداءً بحق شرعی ..... فاذا نزل عنه لغیرہ بمال معلوم ینبغی ان یجوز ذلك علی وجه الفراغ والصلح لا علی وجه البیع کما جاز النزول عن الوظائف۔

(شرح المجلة لخالد اتاسی ج ۲ ص ۱۲ کتاب البیوع قبل الفصل الثالث)

نائی (حجام) کو دوکان کرایہ پر دینے کا حکم

سوال :- کیا کسی نائی (حجام) کو دوکان وغیرہ کرایہ پر دینا جائز ہے ؟ جبکہ یہ لوگوں کے داڑھی مونڈتے اور بال یہودیوں کی طرح بناتے ہیں، حالانکہ ارشاد قرآنی ہے: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ الخ (یعنی گناہ کے کاموں میں کسی سے تعاون نہ کرو) اس لحاظ سے کسی نائی (حجام) کو دوکان وغیرہ کرایہ پر دینے والا تعاون علی المعصیت کا مرتکب تو نہیں ہوگا؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب :- حجامت کا پیشہ ایک ضروری عمل ہے، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، لیکن اس میں شرعی حدود وقیود کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، اگر اس میں خلافِ شرع عمل کیا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی ناجائز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس کام (حجامت وغیرہ) کے لیے دوکان یا مکان کرایہ پر دینا بھی تعاون علی المعصیت ہے جو بنصِ قرآنی حرام ہے لہٰذا خلافِ شرع حجامت بنانے والے نائی (حجام) کو مکان یا دوکان کرایہ پر دینا صحیح نہیں اور نہ اس کی آمدنی درست ہے۔

اجارہ فاسدہ کے جواز کی صورت

سوال :- ایک شخص نے اپنی ٹیکسی کسی ڈرائیور کو اس شرط پر دی کہ تم اس کو چلاؤ جو منافع ہوگا اس میں سے ۶۰ فیصد میرا ہوگا اور ۴۰ فیصد آپ کا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ اجارہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب :- اجارہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ مقدارِ اجرت اور مدت وغیرہ متعین ہو اگر کہیں اجرت یا مدت میں جہالت آجائے تو اجارہ فاسد ہو جائے گا اسلئے کہ جہالت مفضی الی النزاع ہوتی ہے اور عموماً جھگڑا اور فساد پیدا کرتی ہے۔ صورتِ مسئولہ میں اُجرت اگرچہ مجہول ہے جسکی وجہ سے اجارہ فاسد ہونا چاہیئے، مگر آجکل چونکہ اس طرح کے معاملات بکثرت ہوتے ہیں اور لوگ ایسے معاملہ کو مفضی الی النزاع نہیں بناتے، اسلئے مذکورہ معاملہ بھی درست ہے کیونکہ فساد نہ ہونے کی صورت میں معاملہ فی ذاتہٖ درست اور صحیح ہوتا ہے البتہ کسی فاسد وصف کی وجہ سے اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے اور جب اس فساد کی علت ختم ہو جائے تو وہ معاملہ اپنے حال پر باقی رہتا ہے۔ فقہی ذخائر میں اس قسم کی مثالیں موجود ہیں اور ویسے بھی عمومِ بلوٰی کی وجہ سے احکام تبدیل ہوتے ہی رہتے ہیں۔

لما قال العلامة الحصکفی رحمہ اللہ: الفاسد من العقود ما کان مشروعاً باصلہ دون وصفہ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۵ باب الاجارة الفاسدة)

بداخلاقی کی بناء پر مدرسے سے خارج کیے گئے مدرس کیلئے پورے سال کی تنخواہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:۔

(۱) کسی بھی دینی مدرسہ میں ایک مدرس سال بھر کا اجیر ہوتا ہے، کیا اس کا وظیفہ سالانہ اُجرت کی بنیاد پر ہوتا ہے یا ماہانہ اُجرت کی بنیاد پر، اس کی وضاحت فرمائیں؟

(۲) یہ کہ ایک مدرسہ کے مدرس کو مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ نے اخلاقی جرائم میں ملوث ہونے اور دیگر غیر اخلاقی حرکات کی وجہ سے مدرسہ سے نکال دیا ہے، تو کیا ایسا مدرس سال کے باقی دنوں کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ دینی مدارس کے مدرس کی حیثیت اجیرِ خاص کی ہے اور وہ اُجرت کا تب مستحق ہوتا ہے جب وہ مدرسہ کے عمل کے لیے اپنے آپ کو مدرسہ کے حوالے کر دے اور ساتھ ہی اس میں مدرسہ کی طرف سے تفویض کردہ کام کرنے کی صلاحیت بھی ہو، اگر کسی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت مفقود ہو جائے اور وہ نااہل ثابت ہو جائے اور مدرسہ کی انتظامیہ اس کو نااہلیت کی بناء پر ذمہ داری (ملازمت) سے سبکدوش کر دے تو وہ سال کے بقیہ دنوں کی تنخواہ کا حقدار نہ ہوگا اور اگر مدرسہ کی انتظامیہ بلاضرورت اور بغیر کسی معقول عذر کے اس کو قبل از وقتِ مقررہ سبکدوش کر دے تو وہ سال کے باقی دنوں یا مہینوں کی تنخواہ کا حقدار ہے۔

(۲) لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر مدرس کو اخلاقی جرائم اور دیگر ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے مدرسہ سے نکالا گیا ہو تو اس کو سال کے باقی دنوں یا مہینوں کی تنخواہ کا مستحق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگرچہ دینی مدارس میں عرف کی بناء پر ایک مدرس اپنی پوری صلاحیت اور اہلیت کے ساتھ سال بھر کا اجیر ہوتا ہے اور اگر مدرسہ کی انتظامیہ اس کو بلاضرورت و بلاعذر کے نکالنا چاہے تو اس مدرس کو بقیہ ایام کی تنخواہ دی جائے گی۔

لما فی مجلۃ الاحکام: الاجیر یستحق الاجرۃ اذا کان فی مدۃ الاجارۃ حاضراً للعمل ولا یشترط عملہ بالفعل ولکن لیس لہٗ ان یمتنع عن العمل واذا امتنع لا یستحق الاجرۃ۔ (درر الحکام فی شرح مجلۃ الاحکام ج ۱ ص ۴۵۸)

لما فی احسن الفتاویٰ: اگر مدرس کو واقعۃً نااہلیت کی بناء پر معزول کیا گیا ہے تو وہ شعبان تک کی تنخواہ کا مستحق نہیں۔ (احسن الفتاویٰ ج ۷ ص ۲۸۶)

وفی احسن الفتاوی : طلباء کم ہونے کا عذر قابل قبول نہیں، اگر مہتمم نے بلاضرورت مدرس رکھا ہے تو پورے سال کی تنخواہ اپنے پاس سے دے کیونکہ عقد تدریس مسانہہ ہے۔
(احسن الفتاوی ج ۷ ص۲۹۵)

وھٰکذا فی احسن الفتاوی : مدرسین سے عقد مسانہہ ہے لہٰذا بہر صورت ابتداء شوال سے انتہاء رمضان تک پوری تنخواہ دی جائے گی۔ (احسن الفتاوی ج ۷ ص۲۸۲)

یہاں یہ یاد رہے کہ احسن الفتاوی سے مؤخر الذکر حوالجات کا مقصد یہ ہے کہ مدرس میں صلاحیت اور اہلیت ہونے کے باوجود اہل اہتمام اس کو بلا وجہ شرعی معزول کریں تو مابعد کے مہینوں کی تنخواہ کا مدرس حقدار ہے، ورنہ نااہلیت کی وجہ سے برطرفی کی صورت میں مابعد کے مہینوں کی تنخواہ نہیں۔

ایامِ تعطیل کی تنخواہ کا حکم

سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ دینی مدرسہ کے ایک مدرس نے مدرسہ کی سالانہ تعطیلات کے بعد مدرسہ کی انتظامیہ کو اپنا استعفا پیش کر دیا۔ تو کیا عند الشرع اور قوانین مدارس دینیہ کی رُو سے یہ مدرس ایامِ تعطیل کی تنخواہ کا حقدار ہے یا نہیں ؟

الجواب :- فقہاء کرام نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرس ایامِ تعطیل کی تنخواہ کا مستحق ہے، مگر اس کے لیے فقہاء کی عبارتوں سے چند شرائط بھی معلوم ہوتی ہیں :

(۱) ایک یہ کہ مدرس کے ساتھ پہلے سے یہ طے نہیں کیا گیا ہو کہ آپ کو ایامِ تعطیل کی تنخواہ نہیں ملے گی، جو کچھ تنخواہ تمہارے لیے مقرر ہے وہ صرف ایامِ تدریس ہی میں تمہیں دی جایا کرے گی۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ مدرس ایامِ تعطیل کے بعد بھی کام کرنے (تدریس) کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی طرف سے کام کو چھوڑے بھی نہیں۔

تو جب یہ دو شرطیں موجود ہوں تو پھر مدرس ایامِ تعطیل کی تنخواہ کا مستحق ہے، کیونکہ یہ تعطیلات بھی ایک طرح سے تدریس ہی کے حکم میں ہیں کہ ان میں آئندہ تدریس کے لیے مدرس کو آرام اور استراحت ملتی ہے جو آئندہ کام کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر تقرری کے وقت ہی مدرس سے یہ طے کر لیا جائے کہ آپ کو صرف تدریس کے دنوں کی تنخواہ

ملے گی ایام تعطیل کی نہیں، تو اس صورت میں مدرس ایام تعطیل کی تنخواہ کا حقدار نہیں ہوگا، شرعی قانون یہ ہے کہ الشرط املک ۔۔۔۔ اسی طرح اگر عرف وہاں منتظمین مدارس کا یہ ہو کہ عام مدرسین اور ملازمین کو تعطیلات کے دنوں کی تنخواہ نہ ملا کرتی ہو تو اس صورت میں بھی ایام تعطیل کی تنخواہ نہیں ملے گی کہ المعروف کالشروط اور العادۃ محکمۃ۔

نیز اگر کوئی مدرس مزید کام کرنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوئے خود استعفا پیش کر کے کام کرنا چھوڑ دے تو پھر بھی وہ تنخواہ کا مستحق اس بناء پر نہیں ہے کہ نہ تو تدریس کا کام اس نے کیا ہے نہ تعطیلات آئندہ کے لیے کام کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

درمختار (جلد ۳ صفحہ ۵۲۵) میں ہے: وهل یأخذ المدرس ایام البطالة كعيد و رمضان؟ لم أره وینبغی الحاقه ببطالة القاضی واختلفوا فیها والاصح انه یأخذ لانها للاستراحة (اشباه عن قاعدة العادة محكمة اھ)

علامہ شامیؒ اس عبارت کے تحت لکھتے ہیں: قال فی الاشباه وقد اختلفوا فی اخذ القاضی ما فی بیت المال فی یوم البطالة فقال فی المحیط انه یأخذ لانه یستریح للیوم الثانی وقیل لا اھ وفی المنیة القاضی یستحق الكفایة من بیت المال فی یوم البطالة فی الاصح وفی الوهبانیة انه الاظهر فینبغی ان یکون کذلك فی المدرس لان یوم البطالة للاستراحة وفی الحقیقة تکون للمطالعة والتحریر عند ذوی الهمة۔ اھ (الدر المختار جلد ۳ صفحہ ۵۲۵)

ان عبارتوں میں استحقاق کے لیے علت استراحت بیان کی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ استحقاق اس وقت ہوتا ہے جب آئندہ کام کرنے کا ارادہ ہو اور کام کو خود نہ چھوڑے تو تعطیل کا حکم چونکہ تدریس کا ہوگا اور حکماً یہ سمجھا جائے گا کہ مدرس تعطیل کے ایام میں برسر کار ہے اور گویا وہ تدریس ہی میں مشغول ہے اس لیے وہ تنخواہ کا بھی مستحق ہوگا۔

صورت مسئولہ میں چونکہ مدرس نے خود استعفا دے کر آئندہ کام نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اس لیے تعطیل کے ایام اس کے حق میں آئندہ تدریس کے لیے ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتے ہیں اور حقیقتاً تدریس میں مشغول بھی نہیں ہے اس لیے ایام تعطیل کی تنخواہ کا بھی مستحق نہیں رہے گا۔

داخلہ و ماہانہ فیس کا حکم

سوال:- کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ آجکل بعض دینی مدارس میں بھی سالانہ یا ماہانہ فیس لی جاتی ہے۔ کیا یہ شرعاً جائز ہے جبکہ فیس کی رقم سے

طلبائ کی بود وباش اور مدرسہ کے مدرسین اور دیگر ملازمین کی تنخواہوں کا انتظام کیا جاتا ہے

الجواب :۔ یہ کوئی جبری معاملہ نہیں بلکہ داخلہ لینے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس شرط کو منظور کرکے داخلہ یا شرط نا منظور کرکے داخلہ نہ لے۔ اور نہ یہ اجرت ہے بلکہ اس کی حیثیت چندہ کی ہے اور چندہ میں شرط لگانا جائز ہے۔ کما فی امداد الاحکام ۳/۶۰۲ ۔ الجواب :۔ جائز ہے کیونکہ یہ اُجرت نہیں اور چندہ ہے اور چندہ میں شرط جائز ہے کیونکہ اس سے جبر لازم نہیں آتا جس کو منظور نہ ہوگی اس کو عدم داخلہ کا اختیار ہوگا۔

اُجرت الدلال پر اشکال کا جواب

سوال: جناب مفتی صاحب! فتاویٰ حقانیہ ۶/۲۶۰ میں دلالی پر اجرت لینے کو جائز لکھا گیا ہے۔ اس پر مجھے اشکال پیدا ہوا ہے کہ دلالی پر اُجرت قفیز الطحان کی طرح ہے اس لئے کہ ایک تو دلال جزاً من العمل لے رہا ہے۔ اور دوم دلال قادر بقدرۃ الغیر ہے کیونکہ جب تک اس چیز کو دوسرا شخص خریدے گا نہیں دلال فروخت کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ براہ کرم میری اس اشکال کو حل فرمائیں۔

الجواب :۔ دراصل دلالی کی اُجرت کے جواز کا فتویٰ خلاف القیاس ہے۔ اور یہ فتویٰ عوام کی سہولت اور حاجت کی وجہ سے دیا گیا ہے لما قال ابن عابدین (قولہ او مدۃ) الا فیما استثنی قال فی البزازیہ اجارۃ السمسار والمنادی والحمامی والصکاکی مالایقدر فیہ الوقت ولا قدر العمل تجوز لما کان للناس بہ حاجۃ ویطیب الاجر الماخوذ لو قدر اجر المثل۔ (رد المحتار ۵/۴۲ کتاب الاجارہ)

سفارش پر اجرت لینے کا حکم

سوال :۔ اگر ایک شخص اپنے کسی جائز کام کے لیے کسی سے افسران بالا کے ہاں سفارش کرائے تاکہ وہ اس کا کام کردیں، تو کیا سفارش کرنے والا شخص اپنے اس عمل (سفارش) پر اجرت کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی کے جائز کام کی سفارش کرنا کار ثواب ہے، اس کے علاوہ مال غیر متقوم بھی ہے، اس لیے ان دونوں وجوہ کی بناء پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: (الجواب) وجہ منع صرف اجرت علی الطاعۃ میں منحصر نہیں، یہ بھی احد الوجوہ ہے، دوسری وجہ منع کی اس عمل کا غیر متقوم عند الشرع ہونا ہے جیسا کہ فقہاء نے اجارہ اشجار التجفیف الثیاب کو منع کہا ہے، پس شفاعت بھی غیر متقوم ہے ۔۔۔ الخ (امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۳۴۲ کتاب الاجارہ)

زمین اجارہ پر دینے کی ایک قسم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ لوگ اپنی زمین کاشتکاروں کو اس شرط پر دیتے ہیں کہ مثلاً دس کنال زمین پر ہر چھ ماہ بعد فی کنال پانچ من گندم اور پانچ من مکئی کاشتکار مالکِ زمین کو دے گا اور فصل کی کاشت پر اٹھنے والے اخراجات کاشتکار کے ذمہ ہوں گے اور اسے مکمل اختیار حاصل ہوگا کہ وہ جو فصل چاہے کاشت کرے، مگر مالکِ زمین کو وہ فصلانہ کے طور پر گندم اور مکئی ہی دے گا۔ تو کیا ایسا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں بیان کردہ صورت مزارعت کی نہیں بلکہ اجارہ کی ہے اور اجارہ میں ہر وہ چیز اجرت بن سکتی ہے جس کا تجارت میں ثمن بننا صحیح ہو، چونکہ گندم اور مکئی دونوں مال متقوم ہیں اسلئے ان کو اجرت قرار دینا صحیح ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وما یصلح ثمناً یصلح اجرۃ۔ (الهدایة ج ص کتاب الاجارۃ)

اور اسی طرح زمین کو اجارہ پر دینا بھی شرعاً درست ہے اس لیے کہ اجارہ کا مقصد کسی چیز سے فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ یہاں موجود ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: ایضاً: ویجوز استیجار الارض للزراعة لانها منفعة مقصودة وللمستاجر الشرب والطریق۔ (الهدایة ج ص کتاب الاجارۃ)

مگر اس معاملہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ:۔

(۱) مدت اجارہ کا تعین ہو۔

(۲) جو چیز کاشت کرنی ہو وہ بیان کر دی جائے یا کاشتکار کو مکمل اختیار دیا جائے جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں درج ہے۔

(۳) اجرت میں گندم یا مکئی کے ساتھ اسی زمین کی پیداوار کی قید نہ لگائی جائے اور نہ اس زمین کے کسی خاص حصے کی پیداوار کی شرط لگائے البتہ جو گندم یا مکئی اجرت کے طور پر لینی ہو اس کی صفت اعلیٰ، ادنیٰ اور متوسط کا پہلے سے تعین کر لیا جائے تاکہ عقد اجارہ میں کوئی نامناسب حالات پیدا نہ ہو جائیں۔ (فقط واللہ اعلم)

کتاب
الشفعة

جار الدار احق بالدار من غيره

کتاب الشّفعة

(شفعہ کے احکام ومسائل)

شُفعہ کے حقدار

سوال: از روئے شرع شُفعہ کرنے کا حق کس کو حاصل ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے سب سے پہلے شریک فی نفس المبیعہ کو شُفعہ کا حقدار قرار دیا ہے، اس کے بعد شریک فی حقوق المبیع کو جبکہ آخر میں جار (ہمسایہ) کو شُفعہ کا حقدار ٹھہرایا ہے۔

لما قال الشیخ ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: الشُّفعة واجبةٌ للخلیط فی نفس المبیع ثمّ للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ثمّ للجار۔

(مُختصر القدوری ص۱۲۰ کتاب الشُّفعة) [1]

تبادلہ میں حقِ شفعہ کا اثبات

سوال: اگر کوئی شخص اپنی زمین کے کسی قطعہ کا دوسرے شخص کی زمین سے تبادلہ کرے تو کیا اس تبادلہ سے حقِ شفعہ ثابت ہوگا یا نہیں؟ اگر شفیع زمین کو لینا چاہے تو اس کے ذمہ زمین کی ادائیگی لازم ہوگی یا قیمت دینا ہوگی؟

الجواب: جہاں تک شفعہ کے اثبات کا مسئلہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ عقار کے تبادلہ میں ہر ایک کو شفعہ کا حق حاصل رہتا ہے، اس لیے کہ حقِ شفعہ کے تمامتر وجوہات یہاں بھی موجود ہوسکتے ہیں، تاہم زمین ذوات القیم ہونے کی وجہ سے زمین کی جگہ قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: ومن اشتریٰ دارًا بعوض

---

[1] قال العلامة ابوالبرکات محمود النسفیؒ: وتجب للخلیط فی نفس المبیع ثم فی حق المبیع کالشرب والطریق ان کان خاصًا ثمّ للجار الملاصق۔

(کنزالدقائق ص۴۰۲ کتاب الشّفعة)

ومِثْلُهٗ فی الدرالمختار علیٰ صدر ردالمحتار ج۶ ص۲۱۹، ۲۲۰ کتاب الشفعة۔

اخذها الشفیع بقیمته لانہ من ذوات القیم...... وان باع عقاراً بعقار اخذ الشفیع کل واحد منهما بقیمة الآخر لانه بدله وهو من ذوات القیم فیأخذه بقیمته ۔ (الهدایة ج۴ ص۳۹۶ کتاب الشفعة) ۱؎

حقِ شفعہ کو فروخت کرنا

سوال:۔ اگر شفیع مشتری سے حقِ شفعہ کے عوض مال طلب کر کے اپنا حقِ شفعہ چھوڑنے پر آمادگی ظاہر کرے تو شفیع کے لیے مشتری سے ایسی رقم لینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب:۔ حقِ شفعہ کے ساقط کرنے کے عوض رقم لینا حرام اور واجب الرد ہے کیونکہ یہ حق مجرد ہے جس کے ذریعے خود سے صرف ضرر دور کرنا ہے حصولِ منفعت نہیں تاہم اگر شفیع ایسی حرمت پر اقدام کرے تو اس سے حقِ شفعہ ساقط ہو کر مشتری کی ملکیت خریدی ہوئی جائیداد میں مؤکد ہو جاتی ہے۔

لما قال العلامة برهان الدین المرغینانیؒ: وان صالح من شفعته علی عوض بطلت شفعته ورد العوض ۔ (الهدایة ج۴ ص۴۰۴ کتاب الشفعة) ۲؎

قبل البیع مصالحت سے حقِ شفعہ ساقط نہیں ہوتا

سوال:۔ اگر باقاعدہ خرید و فروخت سے قبل ہی شفیع نے مشتری سے معاہدہ کر کے مصالحت کی ہو تو کیا بیع کے بعد دوبارہ شفیع کو دعویٰ شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: حقِ شفعہ کا ثبوت بیع پر مرتب ہوتا ہے، قبل البیع چونکہ اس کی

۱؎ قال الشیخ ابوبکر بن علی الحدادالیمنیؒ: ومن اشتری داراً بعوض اخذ الشفیع بقیمته لانه من ذوات القیم وان اشتری ها بمکیل او موزون اخذها بمثله لانهٗ من ذوات الامثال ۔ (الجوهرة النیرة ج۱ ص۳۴۱ کتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج۶ ص۲۳۱ کتاب الشفعة ۔

۲؎ قال العلامة ابوالبرکات محمود النسفیؒ: وتبطل بالصلح عن شفعته علی عوض وعلیه ردہ ۔ (کنز الدقائق ص۴۰۵ کتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۱۸۲ الباب التاسع فیما یبطل به حق الشفعة ۔

کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے اس لیے خرید وفروخت سے قبل ایسی مصالحت اسقاطِ شفعہ پر مؤثر نہیں بلکہ بیع کے بعد شفیع کو بدستورِ حقِ شفعہ حاصل رہے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین ابو بکر الکاسانیؒ: ولا یصح تسلیم الشفعة قبل البیع لانه اسقاط الحق واسقاط الحق قبل وجوبه ووجود سبب وجوبه محالٌ۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۱۹ کتاب الشفعة)[۱]

متعدد شفعاء میں سے بعض کے اسقاط سے دوسرے متاثر نہیں ہوتے

سوال: اگر متعدد افراد شفعہ کا حق رکھتے ہوں اور ان میں سے بعض اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں تو کیا اس سے دوسرے شرکاء پر کوئی اثر پڑے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ حقِ شفعہ میں ہر حقدار کا استحقاق مستقل ہوتا ہے، ان میں سے کسی ایک کے اپنے حق سے دستبردار ہونے سے دوسرے حقدار کا حق زائل نہیں ہوتا بلکہ قبل القضاء کسی ایک شریک کا اسقاط کرنے سے دیگر تمام شرکاء کو فائدہ ہوگا جس کی رو سے دوسرے شرکاء اس کے جملہ حقِ شفعہ کے حقدار ہوں گے۔

لما قال العلامة فخر الدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: ولو اسقط بعضهم حقه قبل القضاء لهم کان لمن بقی ان یأخذ الکل لان السبب لاستحقاق الکل قد وجد.... بخلاف ما اذا اسقط حقه بعد القضاء حیث لا یکون له ان یأخذ نصیب التارک لانهٗ بالقضاء قطع حق کل واحد منهم فی نصیب الآخر۔

(تبیین الحقائق ج۵ ص۲۴۱ کتاب الشفعة)[۲]

---

[۱] وذکر فی الهندیة: تسلیم الشفعة قبل البیع لا یصح وبعده صحیحٌ۔
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۱۸۲ الباب التاسع فیما یبطل به الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی شرح المجلة لشیخ سلیم رستم باز مادة ۱۰۲۳۔

[۲] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: (اسقط بعضهم حقه) من الشفعة (بعد القضاء) فلو قبله فلمن بقی اخذ الکل لزوال المزاحمة (لیس لمن بقی اخذ نصیب التارک) لانه بالقضاء قطع حق کل واحد منهم فی نصیب الآخر۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۲۰/۲۲۱ کتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج۸ ص۱۲۸ کتاب الشفعة۔

دھوکہ دہی سے حقِ شفعہ متاثر نہیں ہوتا

سوال:۔ بسا اوقات بائع اور مشتری باہم کسی ایک رقم پر اتفاق کرکے شفیع پر اتنی بڑی رقم ظاہر کرتے ہیں جس کی وجہ سے مبیعہ کا لینا شفیع کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اس صورت میں اگر شفیع ناقابلِ تحمل قیمت کی وجہ سے شفعہ چھوڑ دے اور بعد میں کسی معتبر ذریعہ سے ان کا دھوکہ ظاہر ہوکر اصل قیمت معلوم ہو جائے تو کیا سابقہ اسقاط کے بعد بھی شفیع اپنا حقِ شفعہ استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسے دھوکے سے حقِ شفعہ کے اسقاط پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جب بھی شفیع پر بائع اور مشتری کے دھوکہ کی حقیقت ظاہر ہو تو سابقہ اسقاط کا اعتبار نہیں رہتا اب بھی شفیع اپنا حق استعمال کرکے مشتری سے مبیعہ لے سکتا ہے۔

لما قال الامام ابوالحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: واذا بلغ الشفیع انها بیعت بالف فسلم الشفعة ثم علم انها بیعت باقل من ذٰلک او بحنطة او شعیر قیمتها الف او اکثر فتسلیمه باطل وله الشفعة۔ (مختصر القدوری ص۱۶۴ کتاب الشفعة)[1]

مشترکہ زمین کا کچھ حصہ خریدنے سے حقِ شفعہ ساقط نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک زمین جو کہ چند اشخاص کے مابین مشترکہ ہے، ان میں سے ایک نے دوسرے ساتھی کا حصہ خرید لیا تو باقی شرکاء نے اس پر حقِ شفعہ کا دعویٰ کر دیا، تو کیا ازروئے شرع یہ مشتری اپنے دیگر شرکاء کے ساتھ حقِ شفعہ میں شریک ہوگا یا بسبب شراء اس کا حق ساقط متصور ہوگا؟

الجواب:۔ مشترکہ زمین میں کسی شراکت دار کا حصہ خریدنا کوئی ایسا فعل نہیں جس سے مشتری کی بیزاری سمجھی جائے، بلکہ بسا اوقات کسی زمین یا گھر کی خریداری سے حقِ شفعہ کا اثبات مقصود ہوتا ہے اس لیے خریدار دوسرے شفعاء کے ساتھ شفعہ

---

[1] لما قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: واذا بلغ الشفيع انها بيعت بالف درهم فسلم ثم علم انها بيعت باقل او بحنطة او شعير قيمتها الف او اكثر فتسليمه باطل وله الشفعة۔ (الهداية ج۴ ص۴۰۵ كتاب الشفعة)
وَمِثْلُهٗ فی كنز الدقائق ص۴۰۵ كتاب الشفعة۔

میں شریک رہے گا۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: واذا اجتمع الشفعاء فالشفعة بينهم على عدد رؤسهم ولا يعتبر اختلاف الاملاك ۔

(الهداية ج۴ ص۳۸۹ کتاب الشفعة) [۱]

وقف شدہ زمین پر کسی کو شفعہ کا حق نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنی جائداد جزوی یا کلی طور پر کسی مسجد یا مدرسہ کے لیے باقاعدہ وقف کر دے تو کیا اس سے اس کے شرکاء یا ہمسایہ کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حقِ شفعہ کے ثبوت کے لیے مالی معاوضہ کا ہونا بنیادی شرائط میں سے ہے، وقف میں یہ حقیقت مفقود ہوتی ہے، اس میں واقف کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لیے مسجد، مدرسہ یا کسی دوسرے رفاہی ادارہ کے لیے وقف کی ہوئی چیز پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ۔

لما قال العلامة شمس الدين محمد بن عبد الله التمرتاشيؒ: الشفعة تمليك البقعة جبر على المشتري بما قام عليه .... ولا شفعة في الوقف ۔

(تنویر الابصار علیٰ صدر ردالمحتار ج۶ ص۲۱۶، ص۲۲۳ کتاب الشفعة) [۲]

برساتی نالے سے حقِ شفعہ ثابت نہیں ہوتا

سوال:۔ کیا وہ خشک نالہ جس میں صرف بارش کا پانی بہتا ہو، سے حقِ شفعہ ثابت

---

[۱] قال الشيخ ابوالحسن احمد بن محمد البغدادي القدوريؒ: واذا اجتمع الشفعاء فالشفعة بينهم على عدد رؤسهم ولا يعتبر باختلاف الاملاك ۔ (مختصر القدوري ص۱۶۴ کتاب الشفعة)

وَمِثْلُهٗ في شرح مجلة الاحكام للشيخ سليم رستم بازؒ ص۵۶۶ مادة ۱۰۱۳ ۔

[۲] لما قال الشيخ سليم رستم بازؒ: الشفعة هي تمليك الملك المشتري لما قام على المشتري من الثمن ۔ (شرح مجلة الاحكام مادة ۹۵۰ ص۵۳۷)

وقال ايضاً: ولا تجري الشفعة في السفينة وسائر المنقولات وعقار الوقف والاراضي الاميرية ۔ (شرح مجلة الاحكام مادة ۱۰۱۷ ص۵۶۸)

وَمِثْلُهٗ في كنز الدقائق ص۴۰۳ وتنقيح الحامدية ج۲ ص۱۸۲ کتاب الشفعة ۔

ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت نے جہاں کسی کو شریک فی حقوق المبیع میں شفعہ کا حق دیا ہے وہاں اس میں یہ شرط بھی رکھی ہے کہ حقوق خاص انہی کا منتفاع ہو۔ چونکہ خشک نالے میں یہ شرط مفقود ہے اس لیے اس سے حق شفعہ ثابت نہیں ہوتا۔

لما قال العلامۃ ابوالبرکات احمد بن محمود النسفیؒ: تجب للخلیط فی نفس المبیع ثم للخلیط فی حق المبیع کالشرب والطریق ان کان خاصاً۔ (کنز الدقائق ص۳۷۴ کتاب الشفعۃ) [۱]

تاخیر سے حق شفعہ کا بطلان

سوال:۔ طلب مواثبت واشہاد کی جملہ ذمہ داریوں کے نباہنے کے بعد طلب خصومت میں کتنی مدت تک تاخیر سے ایسے حق پر اثر نہیں پڑتا؟

الجواب:۔ مفتی بہ قول کی رُو سے بغیر کسی معقول عذر کے ایک مہینہ تک تاخیر کرنا قابل تحمل ہے، اتنی مدت میں اپنے حق کے حصول سے غفلت اختیار کرنا حق چھوڑنے کے مترادف ہے، نیز بلاوجہ اتنی تاخیر کرنا بسا اوقات مشتری کی ایذاء رسانی کا باعث بنتی ہے۔

لما قال العلامۃ فخرالدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: قال شیخ الاسلام الفتوٰی الیوم علیٰ أنہ اذا أخر شہراً اسقطت الشفعۃ لتغیر احوال الناس فی قصد الاضرار بالغیر۔ (تبیین الحقائق ج۵ ص۲۴۴ کتاب الشفعۃ) [۲]

---

[۱] لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: والثانی ان یکون خلیطاً فی حق المبیع کالاشتراک فی حق الشرب الخاص والطریق الخاص۔

(شرح مجلۃ الاحکام مادۃ ۱۰۰۸ ص۵۶۳)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۲ کتاب الشفعۃ۔

[۲] وذکر فی الھندیۃ: عن محمدؒ وزفرؒ رحمھما اللہ وھو روایۃ عن ابی یوسفؒ ان أسھل وترک المخاصمۃ شھراً من غیر عذر تبطل شفعتہ والفتوٰی علیٰ قولھما۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۵ ص۱۴۳ الباب التاسع فیما یبطل بہ الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی تنقیح الحامدیۃ ج۲ ص۱۸۴ کتاب الشفعۃ۔

غیر مسلم کو حقِ شفعہ حاصل ہے

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں ایک عیسائی صاحب جائیداد ہے اس کے قریب ایک مسلمان نے اپنی زمین کسی دوسرے مسلمان پر فروخت کی، اب اس غیر مسلم عیسائی نے اُس زمین پر شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہے، تو کیا کسی غیر مسلم کو مسلمان کی زمین پر شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے جس طرح ایک مسلمان کو شفعہ کا حق دیا ہے تو اسی طرح کافر (غیر مسلم) کو بھی شراکت یا جوار کی وجہ سے مبیعہ پر شفعہ کا حقدار قرار دیا ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اُس عیسائی کا دعویٰ شفعہ درست ہے۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: أما اسلام الشفیع فلیس بشرط لوجوب الشفعة فتجب لاھل الذمة فیما بینھم وللذمی علی المسلم لان ھٰذا حق التملك علی المشتری بمنزلة الشراء منه والکافر والمسلم فی ذٰلك سواء لانه من الامور الدنیویة۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۶ فصل شرائط الشفعة)[1]

حمل کو بھی حقِ شفعہ حاصل ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! آج سے تقریباً ۱۴، ۱۵ سال پہلے میں نے ایک قطعہ زمین خریدا تھا، اب اس پر ایک نوجوان (جس کی عمر بھی ۱۴، ۱۵ سال کے لگ بھگ ہے) شفعہ کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اور میرا غالب گمان یہ ہے کہ جس وقت میں نے زمین خریدی تھی یہ لڑکا اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا، کیا اس لڑکے کو حقِ شفعہ حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ آپ کی خریداری کے وقت اگر یہ لڑکا پیدا ہو چکا تھا تو اس کو بالغ ہونے تک شفعہ کا حق حاصل ہے، اور اگر پیدا نہیں ہوا تھا لیکن ماں کے پیٹ میں تھا پھر بھی شریعتِ اسلامی اس کو شفعہ کا حق دار قرار دیتی ہے بشرطیکہ آپ کے زمین خریدنے

---

[1] قال الشیخ وھبة الزحیلی: وتثبت الشفعة عند المالکیة والشافعیة والظاھریة للذمی الکافر علی المسلم کما قال الحنفیة..... واتفق الفقھاء علی ان الشفعة تثبت للذمی علی الذمی۔ (الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج۵ ص۸۰۳ المبحث الثالث الشفیع)
ومِثلُهٗ فی اللباب شرح الکتاب (المیدانی) ج۲ ص۴۴ کتاب الشفعة۔

اور بچے کی ولادت میں کم ازکم چھ ماہ کی مدت ہو اور اگر اس سے زیادہ ہو تو پھر حقِ شفعہ باطل ہے۔

وفی الهندیة : والحمل فی استحقاق الشفعة والکبیر سواء فان وضعت لاقل من ستة اشهر منذ وقع الشراء فله الشفعة وان جاءت به لستة اشهر فصاعدا منذ وقع الشراء فانه لاشفعة له لانه لم یثبت وجوده وقت البیع ۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۱۹۱ الباب الثانی عشر فی شفعة الصبی) [1]

حقِ شفعہ سنِ بلوغ تک موقوف ہوگا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! میری صغرسنی میں میری زمین کے قریب کچھ زمین فروخت ہوئی تھی، اُس زمانے میں میرا کوئی ولی نہیں تھا اور اب میں بالغ ہو چکا ہوں تو کیا اس زمین پر مجھے شرعاً حقِ شفعہ حاصل ہے یا نہیں؟ جبکہ ایک صاحب نے مجھے کہا ہے کہ مدتِ طویلہ گذر جانے کی وجہ سے آپ کا حقِ شفعہ باطل ہو چکا ہے مہربانی فرماکر شریعت کے مطابق میری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب :۔ شریعتِ اسلامی میں یہ ہے کہ جب شفیع نابالغ ہو تو اُس کے باپ دادا کو شفیع کے لیے حقِ شفعہ کا مطالبہ کرنا چاہیئے لیکن جس کا کوئی بھی ولی نہ ہو تو تو یہ حق اُس کے سنِ بلوغ تک باقی رہے گا۔ اسی طرح اگر حقیقتاً اُس وقت آپ کا کوئی ولی نہیں تھا اور آپ اب بالغ ہوئے ہیں تو آپ کو شفعہ کا حق حاصل ہے، ایسی صورت میں مدتِ طویلہ کا گذرنا آپ کے حقِ شفعہ کو باطل نہیں کرتا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : الجواب نعم وفی الاصل الوصی یطلب الشفعة للصغیر ویقوم مقامه فی لوازمها کالاب والجد...... فان لم یکن له احد من هؤلاء فهو علی شُفعته اذا ادرك فاذا ادرك وقد

---

[1] قال العلامة محمد الشهیر الطوروی رحمه الله : صح تسلیمهم الشفعة من الاب والوصی والوکیل یعنی ان الحمل والصغیر فی استحقاق الشفعة کالکبیر لاستوائهما فی سببه فیقوم بالطلب والاخذ والتسلیم من یقوم مقامهما الخ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۴۶ فی اخر کتاب الشفعة)

ثبت له خیار البلوغ والشفعة ۔اھ (تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۸۴ کتاب الشفعة) [۱]

بیع فاسد پر شفعہ کرنا

سوال:۔کیا بیع فاسد میں شفیع کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔شفعہ کے لیے ضروری ہے کہ مبیعہ بائع کی ملکیت سے کلی طور پر نکل چکا ہو، بیع فاسد میں مبیعہ چونکہ بائع کی ملکیت میں حقِ فسخ کے اسقاط تک باقی رہتا ہے اس لیے حقِ فسخ یا مبیعہ کو واپسی کے اسقاط تک شفیع کو شفعہ کرنے کا شرعاً اختیار نہیں۔

لما فی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۲۶ : یشترط ان یزول ملك البائع عن المبیع بناء علیہ لا تجری الشفعة فی البیع الفاسد مالم یسقط استرداد البائع۔

(درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۸۴۷ الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعة) [۲]

شفعہ کا ہبہ صحیح نہیں

سوال:۔کیا کوئی شخص اپنا حقِ شفعہ کسی پر فروخت یا بلا عوض ہبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔شفعہ ایک ایسا حق ہے جو نہ تو فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بطور ہبہ کسی کو دیا جا سکتا ہے، اگر کسی نے ایسی کر دیا تو اس کا حقِ شفعہ اس سے ساقط ہو جائے گا۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ : ویبطلها صلحه منها علیٰ عوضٍ...ویبطلها

---

[۱] قال العلامة علی بن محمد الجماعیؒ: ذکر فی الخانیة ان الخصم ھو الصغار فی طلب الشفعة لهم وعلیهم الاباء والاجداد......علی الترتیب السالف فی فصل البیع وفی الاصل الوصی یطلب الشفعة للیتیم ویقوم بلوازمها کالاب والجد وان لم یکن واحد منهم فهو علیٰ شفعته اذا ادرك ......وقال محمدؒ لا تبطل الشفعة ویقدر علی الاخذ بعد البلوغ فاذا بلغ وقد ثبت له خیار البلوغ ۔ (آداب الاوصیاء علیٰ هامش جامع الفصولین ج۲ ص۲۴۱ فصل فی الشفعة)

[۲] قال الشیخ وهبة الزحیلی : الشرط الثالث ان یکون العقد صحیحاً اتفق الفقهاء علیٰ هذا الشرط لان المطلوب هو زوال حق البائع فی المبیع فلا تثبت الشفعة فی المشتری شراءً فاسداً ۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۲۱ المبحث الخامس شروط الشفعة)

ومثله فی الهندیة ج۵ ص۱۶۱ کتاب الشفعة ۔ الباب الاول۔

بیع شفعتہ لمال۔قال ابن عابدینؒ لانہا لیست بحق متقرر فی المحل بل مجرد حق التملک فلا یصح الاعتیاض عنہ۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۲۴۲ کتاب الشفعۃ۔باب مایبطلہا) [1]

بیع وفاء پر شفعہ کا حکم

سوال:۔ کیا بیع الوفاء میں شفیع مبیعہ پر شُفعہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شُفعہ کے لیے ضروری ہے کہ مبیعہ بائع کی ملکیت سے مکمل طور پر نکل جائے، چونکہ بیع الوفاء میں مبیعہ ابھی تک بائع کی ملکیت میں ہے اس لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ بیع الوفاء میں شفیع کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلیؒ: الشرط الاول: خروج العقار عن ملک صاحبہ خروجًا باتًا یجب ان یزول ملک البائع عن العقار المبیع من طریق البات النہائی۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص ۸۱۸ المبحث الخامس، شروط الشفعۃ) [2]

اموالِ منقولہ پر شفعہ صحیح نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا اموالِ منقولہ میں حقِ شفعہ ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شفعہ وہ حق ہے جو ایک شخص کو اموالِ غیر منقولہ میں خریداری یا تبادلہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے لہٰذا اموالِ منقولہ میں حقِ شفعہ ثابت نہیں اس لیے کہ حقِ شفعہ کی مشروعیت جس فلسفہ ضرر کی وجہ سے ہوتی ہے وہ یہاں مفقود ہے۔

وفی مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۰۱۷: یشترط ان یکون المشفوع ملکًا عقاریًا

---

[1] قال العلامۃ المیدانی رحمہ اللہ: وان صالح من حق شفعتہ علی عوض اخذہ اوباعہ ایاہ بطلت الشفعۃ لوجود الاعراض ویرد العوض لبطلان الصلح والبیع لانہا مجرد حق التملک فلا یصح الاعتیاض عنہ لانہ رشوۃ۔

(اللباب شرح الکتاب (الشہیر بمیدانی) ج ۲ ص ۴۷ کتاب الشفعۃ)

[2] وفی الھندیۃ: ومنہا زوال ملک البائع عن المبیع فاذا زال فلا تجب الشفعۃ کما فی البیع بشرط الخیار۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص ۱۶۰ کتاب الشفعۃ۔الباب الاوّل)

بناءً علیہ لاتعتری الشفعۃ فی السفینۃ وسائر المنقولات وعقار الوقف والاراضی الامیریۃ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۶۷۲ الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعۃ) [1]

قتلِ عمد کے عوض لی گئی زمین پر شفعہ کرنا

سوال:۔ ایک شخص نے کسی آدمی کو قتل کر دیا، علاقائی جرگہ نے راضی نامہ کرتے ہوئے قاتل کی طرف سے کچھ زمین اور ایک لاکھ روپے نقد مع سوڑہ مقتول کی اولاد کو دینے کا فیصلہ کیا۔ اب اس زمین کے قریب ایک مال دار آدمی کی زمین ہے اور اس نے عدالت میں شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہے اور کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے اس زمین کی قیمت ۶۰ ہزار روپے ظاہر کی جبکہ حقیقت میں وہ زمین تین چار لاکھ روپے کی ہے۔ تو کیا اس طرح قتلِ عمد پر صلح کے عوض لی گئی زمین پر کسی کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ثبوتِ شفعہ کے لیے چونکہ مشفوع زمین کے عوض معاوضہ کا ہونا ضروری ہے جو صورتِ مسئولہ میں مفقود ہے، اس بناء پر فقہاءِ کرام نے قتلِ عمد کی صلح میں دی ہوئی زمین پر حقِ شفعہ کو معدوم قرار دیا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی اس زمین پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامۃ علی حیدر رحمہ اللہ: والصلح عن دم العمد فلا تثبت الشفعۃ لانہ لو تثبت الشفعۃ فیہ للزم ان یأخذہ الشفیع اما بقیمتہ او مجاناً ولا یمکن الاخذ بالقیمۃ لأن المالک لذلک العقار لم یملکہ بقیمتہ

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: اتفق المسلمون علی ان الشفعۃ حق فی العقار من دور وارضین وبساتین وبئر وما یتبعھا من بناء وشجر واختلفوا فیما عداھا فقررت المذاھب الاربعۃ انہ لاشفعۃ فی منقول کالحیوان والثیاب والعروض التجاریۃ اھ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۷۹۵ المبحث الثانی، محل الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی اللباب شرح الکتاب ج۲ ص۴۴ کتاب الشفعۃ۔

حتیٰ یستطیع الشفیع اخذہ بالقیمۃ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۷۲ المادۃ ۱۰۲۱، الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعۃ) [1]

حق مہر میں دی گئی زمین پر شفعہ کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص بوقتِ نکاح اپنی بیوی کو حق مہر میں کچھ زمین بدے دے تو کیا اس زمین پر کسی کو حقِ شفعہ حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:- حقِ شفعہ کے ثبوت کے لیے معاوضۂ مالی ہونا ضروری ہے جو یہاں مفقود ہے اس لیے احناف کے ہاں حقِ مہر میں دی گئی زمین پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے۔

قال العلامۃ ابوالحسن القدوری رحمہ اللہ: ولا شفعۃ فی الدار التی یتزوج الرجل علیہا او یخالع المرأۃ بہا۔ (الکتاب الشہیر بمختصر القدوری علیٰ صدر اللباب ج۲ ص۴۵ کتاب الشفعۃ) [2]

صلح میں دی گئی جائیداد پر شفعہ کا حکم

سوال:- ایک شخص نے کسی آدمی پر ایک لاکھ روپے کا دعویٰ کیا جبکہ مدعا علیہ اس سے منکر ہے، لیکن مدعی کچھ زور آور ہے، اس پر علاقائی جرگہ نے دونوں کے

---

[1] قال الشیخ وہبۃ الزحیلی: لکن اختلفوا فی التملک بعوض غیر مالی فالمہر وبدل الخلع واجر طبیب وحمام مثلاً او اجرۃ دار او عوض فی الصلح عن دم عمد فقال الحنفیۃ والحنابلۃ یشترط ان یکون عقد المعاوضۃ مال بمال فلا شفعۃ اذا کان العوض غیر مال کما فی ھٰذہ الاحوال لان الشئ فی المعاوضۃ غیر المالیۃ یشبہ الموہوب والموروث۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۵ ص۸۲۰ المبحث الخامس شروط الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیۃ ج۵ ص۱۶۰ کتاب الشفعۃ۔ الباب الاوّل۔

[2] وفی الہندیۃ: ولا تجب الشفعۃ فی دار جعلت مہر امرأۃ او اجرۃ او عوض عتق اھ۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۵ ص۱۶۱ کتاب الشفعۃ۔ الباب الاوّل۔

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۳۶ کتاب الشفعۃ۔ باب ما تثبت ھی فیہ اولا تثبت۔

درمیان اس طرح فیصلہ کیا کہ مدعا علیہ مُدعی کو پانچ کنال زمین دے گا، جو کہ مدعا علیہ نے مدعی کو دیدی ہے۔ اب ایک تیسرا آدمی اس زمین پر شفعہ کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: حقِ شفعہ کے ثبوت کے لیے اموال غیر منقولہ کا باہمی معاملہ مال کے عوض ہونا ضروری ہے، صورتِ مسئولہ میں معاملہ مالی ہے اگرچہ ایسا مصالحتاً ہی ہُوا ہے لیکن اس کے باوجود تیسرے شخص کو شفعہ کا حق حاصل ہے۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ: ومنها عقد المعاوضة وهو البيع اوما هو فی معناه فلا تجب الشفعة فيما ليس ببيع ولا بمعنى البيع حتى لا تجب بالهبة والصدقة والميراث والوصية .... وتجب الشفعة فی الدار التی هی بدل الصلح سواء كان الصلح على الدار عن اقرار او انكار اوسكوت لوجود معنی المعاوضة۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱ کتاب الشفعة وجوب الشفعة)[1]

طلب اشہاد کے وقت حدود اربعہ بیان کرنے کا حکم

سوال: اگر کوئی شخص طلب اشہاد گواہوں کے سامنے کر رہا ہو تو کیا اس کو مبیعہ پر حقِ شفعہ کے اثبات کی وجہ اور مبیعہ کا حدود اربعہ بیان کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ جب شفیع طلبِ مواثبت کے بعد گواہوں کے سامنے طلبِ اشہاد کر رہا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مبیعہ کا حدود اربعہ اور اپنا تعلق بیان کرے تاکہ بات میں کوئی پوشیدگی باقی نہ رہے۔

قال العلامة عبد الرحمٰن شیخ زادہ رحمہ اللہ: او يشهد على المشتری ولو غير ذی يد بان يقول له اطلب منك الشفعة فی دار اشتريتها من فلان حدودها كذا وانا شفيعها بالشركة فی الدار او الطريق لم بالجوار بدار حدودها كذا فسلمها

---

[1] وفی الهندية: منها عقد المعاوضة وهو البيع اوما هو بمعناه فلا تجب الشفعة بما ليس ببيع ولا بمعنى البيع ..... وكذا تجب فی الدار المصالح عنها عن اقرار۔

(الفتاوٰی الهندية ج۵ ص۱۶۰ کتاب الشفعة۔ الباب الاول)

لی فلا بدان یبین حدود الدار مع کل واحدة من مراتب الثبوت ۔
(مجمع الانہر ج ۲ ص۴۷۳ کتاب الشفعۃ) لہ

طلبِ اشہاد میں تعدادِ شہداء کا حکم

سوال :۔ جناب مفتی صاحب ! کیا طلبِ اشہاد کے لیے گواہوں کا ہونا ضروری ہے یا نہیں، اور کیا اس میں بھی دیگر معاملات کی طرح تعدادِ شہداء و دیگر شرائط کا ہونا ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ طلبِ مواثبت کے بعد شفیع کے لیے ضروری ہے کہ وہ گواہوں کے سامنے مبیعہ کے پاس یا بائع و مشتری میں سے کسی کے سامنے اپنے شفعہ کو طلب کرے مگر گواہوں کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ دو شرطوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے : (۱) یا تو دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہے ۔ (۲) یا پھر عدالت کی شرط لازمی ہے ۔

اور صاحبینؒ کے نزدیک کوئی شرط ضروری نہیں، متاخرین نے امام صاحبؒ کی رائے کو مفتی بہ قرار دیا ہے ۔

قال الشیخ وھبۃ الزحیلی : ویشترط فی ھذا الطلب ان یکون علی فور الطلب الاول والاشھاد علیہ بان یشھد الشفیع علی رغبتہ بالشفعۃ رجلین اورجل وامرأتین۔
(الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۵ ص۸۲۹ مراحل طلب الشفعۃ) ۲ہ

لہ قال العلامۃ علی حیدرؒ : اویقول خطاباً للمشتری سواء کان المشتری قابضاً المشفوع ام کان غیر قابضٍ فی حضور نصاب الشھادۃ من الشھود انک اشتریت العقار المحدود بالحدود الفلانیۃ وبما انی خلیط فی حق المبیع مثلاً فانا شفیعھا وقد طلبت المواثبۃ وانی اطلبھا الآن ایضاً وانتم ایھا الشاھد ان اشھد ا ۔ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج۲ ص۷۹۴ تحت المادۃ ۱۰۳۲ الفصل الثالث)

۲ہ قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ : ھل تشترط فیہ العدد والعدالۃ اختلف اصحابنا فقال ابوحنیفۃؒ یشترط احد ھذین اما العدد فی المخبر رجلان او رجل وامرأتان واما العدالۃ. وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ لایشترط فیہا لعدد ولا لعدالۃ ۔
(بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۷ فصل بیان مایتأکد بہ حق الشفعۃ)
ومثلہ فی مجموعۃ قوانین اسلام ج ۶ ص۲۲۲۴ کتاب الشفعۃ ۔

حقِ شفعہ میں شریک فی الشرب مقدم ہے

سوال :- ایک جگہ زمین کا ایک ٹکڑا فروخت ہوا، اس پر دو آدمیوں نے حقِ شفعہ دائر کر دیا ہے مگر دونوں کے اسباب مختلف ہیں، ان میں سے ایک آدمی بائع کے ساتھ راستے میں شریک ہے اور دوسرا پانی میں شرکت کا دعویٰ کرتا ہے۔ تو ان دونوں میں سے کس کو شفعہ کا صحیح حقدار سمجھا جائے گا؟

الجواب:۔ شفعہ کے ثبوت کے لیے اگرچہ دونوں اسباب مساوی ہیں لیکن باعتبار ضرر راستے کا شریک زیادہ مقدم ہے۔ اس لیے علماء نے شریک فی حق الشرب کو راستے کے حق میں شریک پر مقدم کیا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں پانی کا شریک حق شفعہ میں دوسرے پر مقدم ہے۔

فی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۱۶: حق الشرب مقدم علیٰ حق الطریق۔

قال العلامة علی حیدرؒ: تحتها یعنی حق الشرب وحق الطریق وان کانا متساوبین من حیث کونهما من اسباب الشفعة لکن فی حال اجتماعها یقدم حق الشرب علیٰ حق الطریق۔ (دررالحکام شرح مجلة الاحکام ج ۲ ص ۷۶۶ قبل الفصل الثانی فی بیان شرائط الشفعة) [1]

مہر مسمّٰی کے عوض میں ملنے والی زمین شفعہ کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! ... نے شادی کے وقت بیوی کو حق مہر میں پچاس ہزار روپیہ لکھوا دیا، اب عورت نے حقِ مہر کا مطالبہ کیا ہے تو شوہر نے نقدی نہ ہونے کی وجہ سے بیوی کو کچھ زمین دے دی، اِس پر اُس کے شوہر کے بھائی نے جو اُس کے ساتھ اِس زمین میں شریک ہے حق شفعہ کا دعویٰ کر دیا ہے، تو کیا اس کو شرعاً شفعہ کا حق حاصل ہے؟

---

[1] قال العلامة ابراهیم الحلبی رحمه الله : لو شارکه احد فی الشرب و آخر فی الطریق فصاحب الشرب اولیٰ من صاحب الطریق۔

(الدر المنتقی علیٰ هامش مجمع الانهر ج ۲ ص ۴۷۲ کتاب الشفعة)

ومِثلُهٗ فی شرح المجلة لخالد الاتاسی ص ۸۵۲ المادة ۱۰۱۶ قبل الفصل الثانی۔

الجواب:۔ حق مہر میں بیوی کو جو زمین دے دی جائے اگرچہ شرعاً اس پر شفعہ ثابت نہیں ہوتا، مگر صورتِ مسئولہ میں معاملہ الگ ہے، یہ زمین عورت کو اُس پچاس ہزار روپے نقد حق مہر کے عوض دی گئی ہے جو کہ ایک مالی معاملہ ہے، اس لیے شوہر کے بھائی کو شفعہ کا حق حاصل ہے۔

وفی الهندیة: ولو تزوجها علی مهر مسمّٰی ثمّ باعها بذلك المهر داراً تجب للشفیع فیها الشفعة وكذلك اذا تزوجها علی غیر مهر وفرض لها القاضی مهرا ثمّ باعها بذلك المفروض تجب للشفیع فیها الشفعة ۔

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۱۶۲ كتاب الشفعة۔ الباب الاوّل) [1]

تحفہ کے عوض میں ملنے والی زمین پر شفعہ کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص اپنے دوست کیلئے تحفہ میں امریکہ کا ویزہ لایا تو دوست نے شکریہ کے طور پر اپنی جائیداد میں سے کچھ اس کے نام ہبہ کردی، واہب کے بھائی کو جب اس کا علم ہوا تو اُس نے اِس پر شفعہ کردیا، تو کیا واہب کے بھائی کو شفعہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہبہ کی ہوئی زمین پر اگرچہ شفعہ صحیح نہیں مگر صورتِ مسئولہ میں چونکہ معاملہ مالی ہے اس لیے فقہاء کرام نے شفعاء کو حقِ شفعہ کے ثبوت کی تصریح کی ہے بشرطیکہ جانبین نے اپنے اپنے موہوبہ پر قبضہ کر لیا ہو۔

قال العلامة الكاسانیؒ: لاتجب بالهبة والصدقة والمیراث والوصیة ...... وان كانت الهبة بشرط العوض فان تقابضا وجبت الشفعة لوجود معنی المعاوضة عند التقابض۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۱۱ فصل شرائط وجوب الشفعة) [2]

---

[1] قال العلامة ابن عابدینؒ: اذ لوجعلت بدل مهر المثل او المسمّٰی عند العقد او بعده تثبت فیه الشفعة لأنه مبادلة مال بمال لأنه بدل عما فی ذمته من المهر۔ (ردالمحتار ج ۶ ص۲۳۷ كتاب الشفعة۔ باب ما تثبت هی فیه اولا تثبت)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۲ كتاب الشفعة، فصل فی شرائط وجوب الشفعة۔

[2] وفی مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۲۲: الهبة بشرط العوض فی حكم البیع بناء علیه لو ذهب وسلم احد دار المملوكة لآخر بشرط العوض یكون جار الملاصق شفیعا۔

(درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج ۲ ص۷۲۴ الفصل الثانی فی شرائط الشفعة)

وَمِثْلُهٗ فی درر الحكام شرح مجلة الاحكام ج۲ ص۷۲۴ الفصل الثانی فی شرائط الشفعة۔

زمین کا تبادلہ کرنے پر حقِ شفعہ ثابت ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! دو آدمیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زمینوں کا تبادلہ کیا اور دونوں کے شفعاء بھی موجود ہیں، اب ان دونوں میں سے کس زمین پر شفعہ کیا جاسکتا ہے؟

الجواب:۔ چونکہ دونوں بدلین اموالِ غیر منقولہ ہیں اور معاملہ بھی مالی ہے اس لیے دونوں کی زمین قابلِ شفعہ ہے لہٰذا دونوں کے شفعاء کو حقِ شفعہ حاصل ہے۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: منها معاوضة المال بالمال فلا تجب فی معاوضة المال بغیر المال ..... ومنها معاوضة عین المال بالمال فلا تجب فی معاوضة عین المال بمالیس بعین المال۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۲ فصل شرائط وجوب الشفعة) [۱]

بحیثیت کرایہ دار کسی کا حقِ شفعہ ثابت نہیں ہوتا

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنا مکان کسی ایسے شخص پر فروخت کرے جو بداخلاق اور بدکردار ہو تو کیا اس کا پڑوسی جو کہ اس کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہتا ہو اس پر شفعہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہ حنفی میں شفعہ کے استحقاق کے لیے شفیع کا اپنے ذریعہ شفعہ کا مالک کا مالک ہونا ضروری ہے۔ صورتِ مسئولہ میں شفیع چونکہ مکان کا اصلی مالک نہیں بلکہ کرایہ دار ہے اس لیے اس کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: ملک الشفیع وقت الشراء فی الدار التی یأخذها بالشفعة لأن سبب الاستحقاق جوار الملک والسبب إنما ینعقد سبباً عند وجود الشرط۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۱۴ فصل شرائط وجوب الشفعة) [۲]

---

[۱] قال الشیخ وهبة الزحیلی: وان بیع عقار بعقار (مقایضة) وکان شفیعهما واحداً اخذ الشفیع کل واحد من العقارین بقیمة الآخر لانه بدل وهو من ذوات القیم فیاخذه بقیمته وان اختلف شفیعهما یاخذ شفیع کل منهما ماله فیه الشفعة بقیمة الآخر۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۱۱ المبحث الرابع فی احکام الشفعة)

[۲] قال الشیخ وهبة الزحیلی: اتفق الفقهاء علی شرط کون الشفیع مالکاً ما یشفع به قبل البیع واختلفوا فی استمرار الملک حتی القضاء بالشفعة علی رأیین فقال الحنفیة یشترط استمرار ملک الشفیع حتی یقضی له بالشفعة اھ۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۲۲ المبحث الخامس شروط الشفعة الشرط الرابع)

رجسٹری یا انتقال نہ ہونے کی صورت میں شفعہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی دوسرے پر اپنی دس کنال زمین فروخت کی لیکن ابھی تک قانونی طور پر باضابطہ رجسٹری نہیں ہوسکی، تو کیا شفعہ کا حق دار اس زمین پر شفعہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلامی نقطہ نظر سے بیع ایجاب وقبول سے تام ہوجاتی ہے، مروجہ قانون کے مطابق رجسٹری یا انتقال کی ضرورت نہیں، شفعہ کے لیے نفس ایجاب وقبول ہی کافی ہے۔

وفی مجلة الاحکام تحت المادة ۱۰۲۱: الشفعة لا تثبت الا بعقد البیع البات الصحیح۔
(درر الحکام شرح مجلة الاحکام ج۲ ص۷۷۲ الفصل الثانی فی شرائط الشفعة)[۱]

مشتری کے مرنے سے شفیع کا حقِ شفعہ باطل نہیں ہوتا

سوال:۔ ایک آدمی مثلاً زید نے عمرو کے متصل کچھ زمین خریدی مگر عمرو کو اس کی خبر نہ ہوئی اور اس دوران میں زید کا انتقال ہوگیا، ایک ہفتہ بعد عمرو کو زمین خریدنے کی خبر ہوئی، اب عمرو شفعہ کرنا چاہتا ہے تو کیا وہ میت پر شفعہ کرے یا اس کے وارثوں پر؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ مشتری (خریدنے والے) کے مرنے سے شفیع کا حقِ شفعہ باطل نہیں ہوتا بلکہ شفعہ کا دعویٰ کرنا بدستور باقی ہے، البتہ مشتری کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء سے حقِ شفعہ کا مطالبہ کیا جائے گا۔

قال الامام القدوریؒ: واذا مات المشتری لم تسقط الشفعة۔
(مختصر القدوری ص۹۲ کتاب الشفعة)[۲]

---

[۱] قال الشیخ وهبة الزحیلی: الشرط الاول خروج العقار عن ملک صاحبه خروجاً باتاً یجب ان یزول ملک البائع عن العقار المبیع من طریق البیع البات النهائی اللازم الذی لاخیار فیه۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج۵ ص۸۱۸ المبحث الخامس شروط الشفعة)

[۲] وفی الهندیة: ولا تبطل بموت المشتری وللشفیع ان یأخذ من ورثته۔ الخ
(الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۱۸۲ الباب التاسع فیما یبطل به حق الشفعة بعد ثبوته وما لا یبطل)
ومثله فی الهدایة ج۴ ص۴۰۲ کتاب الشفعة، باب ما تبطل به الشفعة۔

شفیع برابر ہوں تو دونوں شفعہ کا حق رکھتے ہیں

سوال:۔ ایک گھر دو گھروں کے درمیان واقع ہے، تینوں گھروں کی پشت اور دروازے بھی ایک طرف ہیں اور راستہ بھی سب کا ایک ہے، اب درمیان والا گھر ایک پڑوسی نے خرید لیا ہے تو کیا دوسرا پڑوسی شفعہ کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مسئولہ میں دوسرے پڑوسی کو شفعہ کرنے کا حق حاصل ہے اور شفعہ کرنے کے بعد یہ خریدا ہوا گھر دونوں پڑوسیوں کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا جائے گا۔

وفی الھندیۃ: ولو انّ رجلاً اشتریٰ داراً وھو شفیعھا ثمّ جاءَ شفیع مثلہٗ قضی القاضی بنصفھا وان جاء لہٗ شفیع اٰخر اولیٰ منہ فان القاضی یقضی لہٗ بجمیع الدار وان جاءَ شفیع دونہ فلا شفعۃ لہٗ۔

(الفتاوٰی الھندیۃ ج۵ ص۱۷۸ الباب السادس فی الدار اذا بیعت ولھا شفعاء)

کسی کے حقِ شفعہ کو ختم کرنے کے لیے اصل رقم سے زائد لکھوانا

سوال:۔ آجکل مکان یا زمین کی خرید و فروخت میں یہ بات عام ہے کہ مشتری بلیعہ پر کسی کے شفعہ کرنے کے خوف سے بائع سے اصل رقم سے کئی گنا زائد رقم مثلاً دو لاکھ کی بجائے چار لاکھ روپے لکھوالیتا ہے اور بائع بھی اس پر راضی ہوتا ہے۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مشتری کا ایسا کرنا شفیع کے حقِ شفعہ کو دھوکہ اور فریب سے ساقط کرنے کے مترادف ہے اس لیے اس کا یہ عمل موجب گناہ ہے۔

لما قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: اس طرح کرنا جائز نہیں ہے۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۱۶۴)

---

[۱] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وکذا لو کان الشریک غائباً فطلب الحاضر یقضی لہٗ بالشفعۃ (کلھا ثمّ اذا حضر وطلب قضی لہٗ بھا) فلو مثل الاوّل قضی لہٗ بنصفہ ولو فوقہ فبکلہ ولو دونہ منعہ الخ ۔ قال العلامۃ ابن عابدینؒ: تحت قولہ (فلو مثل الاوّل) ای لو کان الذی حضر مثل الاوّل کشریکین او جارین الخ۔ (الدر المختار علیٰ صدر ردّ المحتار جلد۶ ص۲۲۲ کتاب الشفعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی خلاصۃ الفتاوٰی ج۴ ص۲۵۵ کتاب الشفعۃ، الفصل الثانی فی المقدمۃ۔

مسودۂ قانونِ شفعہ پر مجلسِ شوریٰ میں کی گئی تقریر

قانونِ شفعہ کا مسودہ ایوان میں پیش ہونے پر ۱۰ اپریل ۱۹۸۲ء کو دن بھر اس مسئلہ پر گرما گرم بحث ہوئی کہ اس مسودہ کو عوام کی رائے سے حاصل کرنے کے لیے مشتہر کیا جائے اور آئندہ کسی موقعہ پر اسے زیرِ غور لایا جائے۔ مولانا سمیع الحق صاحب نے اس ضمن میں ایوان میں مختصر مگر پُرمغز اور مدلل تقریر کی جسے قانونِ شفعہ کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔

مُرتّب

جناب چیئرمین | مولانا سمیع الحق

مولانا سمیع الحق | یہ ایک اسلامی قانون کا مسودہ ہے اور یہ پہلا اسلامی قانون ہے جو اس ایوان میں آیا ہے، اصولی طور پر مجلسِ شوریٰ کا اہم مقصد اس ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنا ہے، اور اس سمت میں یہ ایک اہم آئٹم ہے۔ مجلسِ شوریٰ کے لیے جو راہنما اصول مقرر کیے گئے ہیں ان میں یہ ہے کہ ہم نے اسلامی نظام کے نفاذ کو تیز کرنے میں مدد دینا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کے علاوہ بھی دو اور اسلامی قانون قاضیوں کے کورٹ اور دیت و قصاص کے متعلق تھے وہ بھی سٹینڈنگ کمیٹی کی نظرِ کرم سے مؤخر کر دیئے گئے ہیں۔ اور اگر اب اس مسودہ کی تاخیر اور التواء کے لیے بھی آج تحاریک پیش کی جا رہی ہیں، تو اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو یہ افسوسناک معاملہ ہوگا اور اس کا بڑا خراب اثر پڑے گا۔ ہماری حالت تو اسلامی نظام کے نفاذ کے بارہ میں یہ ہوگئی ہے کہ ؎

عُمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

یہاں کچھ حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس مسودہ کو عوام کی استصوابِ رائے کے لیے مشتہر کیا جائے، اگرچہ یہ مقصد پہلے بھی حاصل ہو چکا ہے، لیکن اس سلسلے میں میں عرض کرتا ہوں کہ کیا اسلام ہمیں یہ حق دیتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو نافذ کرنے کے لیے عوام سے

اجازت لی جائے اور اس کے بارے میں عوام سے استصواب کریں؟ خدا اور رسولؐ کے طے شدہ قوانین اور احکام کے بارے میں اسلام ہمیں ہرگز یہ اجازت نہیں دیتا کہ ہم اس کے بارے میں عوام سے پوچھیں۔ ہمارے عوام بہت اچھے ہیں لیکن اگر خدانخواستہ عوام نے استصواب کے نتیجے میں کسی اسلامی قانون کو مسترد کر دیا، تو کیا یہاں حاکمیت عوام کی ہے یا حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، یہ عوام والی بات کے دور سے تو ہم گذر چکے ہیں اور اس کا خمیازہ بھی ہم نے بہت بھگت لیا ہے۔ یہ اہم ترین مسئلہ ہے۔ تو اس لحاظ سے میری گذارش یہ ہے کہ اسے اہم ترین مسئلہ سمجھا جائے۔ یہاں ایک بزرگ نے کہا تھا کہ یہ اسلام کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ اس میں جان و مال اور جائیداد کے حقوق کے تحفظ اور اوروں کے ظلم و تعدی اور زیادتی سے بچنے کا سوال ہے۔ اسلام کی نگاہ میں مال اور جائیداد کا تحفظ اور کسی کے ظلم و زیادتی سے بچانا اور بچنا یہ ایک اہم ترین سوال ہے۔ تو اس لحاظ سے میں تمام معزز ممبران سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ دینی جذبہ اور پوری گرمجوشی کے ساتھ اس مسودے کا خیر مقدم کریں اور اس پر بحث کریں۔ یہ پہلا مسودہ ہے جو عرصہ دراز کے بعد اسلامی قوانین پر مبنی یہاں آیا ہے۔ آپ سب خوش قسمت ہیں کہ آپ کے سامنے ایسا مسودہ آیا ہے، اس میں اگر کچھ خامیاں، خرابیاں اور اختلافات ہیں بھی تو وہ ترامیم کی شکل میں پیش کی گئی ہیں یا پیش کی جائیں گی اور ان کا ازالہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان معروضات کے ساتھ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(رپوٹنگ وفاقی کونسل سیکرٹریٹ)

۱۲ اپریل ۱۹۸۲ء کی شام کی نشست میں مولانا سمیع الحق نے شفعہ کے مسودہ پر تقریر کی، وفاقی کونسل کے سیکرٹریٹ کی قلمبند شدہ تقریر حسب ذیل ہے۔ (مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

جناب چیئرمین! میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا، کافی حضرات اس موضوع پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ شفعہ کے اس قانون کے بارے میں کچھ بنیادی نکتے اٹھائے گئے ہیں، میں ان کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ مجھ سے پہلے فاضل مقرر کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ قرآن مجید میں

شفعہ کے بارے میں احکام نہیں ہیں، تو یہ ایک بنیادی غلط فہمی ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے، حالانکہ شریعت کا بنیادی ماخذ جس طرح قرآن کریم ہے اسی طرح سنتِ نبوی بھی ہے۔ اگر ہم ہر چیز کو قرآن میں تلاش کریں گے تو ہمیں پانچ وقت کی نمازوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ قرآن کی کسی آیت میں یہ تفصیل نہیں ہے کہ مغرب کے تین رکعت فرض ہیں اور کسی آیت میں یہ نہیں کہ فجر کے دو فرض ہیں اور عصر کے چار ہیں نہ ان مخصوص اوقات کا تفصیلات کے ساتھ ذکر ہے ـــ اسی طرح زکوٰۃ کی تفصیلات بھی قرآن کریم میں نہیں ہیں لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی ہے اور مقادیر بیان کئے ہیں۔

تو جناب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چھوٹی سی چھوٹی بات جو حضورؐ نے فرمائی اور ہمیں مستند طریقہ سے پہنچ گئی اسے ہم قرآنِ کریم اور دین ہی کا حکم سمجھیں گے۔ ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے، ایک صحابی سے کسی خاتون نے دریافت کیا کہ جسم کو کھرچ کھرچ کر اس میں رنگ بھرنے کا مسئلہ کیسا ہے؟ صحابی نے کہا کہ یہ سختی سے منع ہے، قرآن میں اس کا حکم موجود ہے، خاتون نے کہا میں الٓمٓ سے لیکر والناس تک قرآنِ کریم پڑھتی ہوں اس میں تو اس چھوٹے سے مسئلہ کا کہیں ذکر نہیں ہے، صحابی نے کہا کہ لو قرأتیہ لوجدتیہ اگر تم نے قرآن کو غور سے پڑھا ہوتا تو اس حکم کو وہاں پایا ہوتا۔ صحابی نے فرمایا قرآنِ کریم میں ہے: مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا کہ جو حکم تمہیں رسول نے دیا اس پر سختی سے عمل کرو اور جن باتوں سے آپؐ نے منع کیا ان سے منع ہو جاؤ۔ یہ ایک اصول ہمیں قرآن نے دیا ہے۔ اب اس مسئلہ میں حضورؐ نے جو راہنمائی دی ہے وہ بھی گویا قرآن ہی کا حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الحمدللہ قرآن کے ساتھ سُنّت کو بھی ہمارے آئین میں بنیادی ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد چونکہ کچھ ارکان نے شفعہ کے سلسلہ میں واضح احادیث کا مطالبہ کیا ہے تو ایوان کے سامنے بھی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے الفاظ لانا چاہتا ہوں جن میں ان افراد کی تفصیل موجود ہے جنہیں شفعہ کا حق دیا گیا ہے۔

مولانا سمیع الحق: جناب والا! جائیداد میں شریک خلیط کا سب سے پہلا درجہ ہے، اس کے بعد جو حقوق میں شریک ہے اس کا درجہ ہے، تیسرے نمبر پر جار ہے یعنی پڑوسی۔ تو یہاں سب سے پہلے میں شریک کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادِ گرامی حدیث کی مشہور کتاب مسلم شریف سے نقل کرتا ہوں، یہ امام مسلم کی کتاب ہے اور صحیح بخاری کی طرح اس کا درجہ ہے۔

عن جابرؓ قال قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالشفعۃ فی کل شرکۃ لم تقسم ربعۃ او حائطاً لایصلح ان یبیع حتی یؤذن شریکہ فان شاء اخذ وان شاء ترک فاذا باع ولم

يؤذنه فهو احق به - (الدراية فى تخريج احاديث الهداية - حديث ص ۸۸۸ كتاب الشفعة)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ حضورؐ نے فیصلہ دیا شفعہ میں مشترک حصہ میں جب تک وہ تقسیم نہ ہوا ہو خواہ وہ مکان ہو یا باغ تو اس میں شفعہ کا حق ہوگا شریک کو جو ملکیت میں شریک ہو۔" پھر اس میں قضٰی رسول اللہ کا لفظ ہے کہ صرف فرمایا نہیں بلکہ فیصلہ دیا حضورؐ نے، قضٰی کا مطلب فیصلہ دینا ہے جس کا ایک فاضل رکن نے مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح امام بخاریؒ نے بھی ایک روایت نقل کی ہے،۔

لقوله عليه السلام: بالشفعة فى كل مالم يقسم فاذا وقعت الحدود و صرفت الطرق فلا شفعة۔ (الهداية ج ۴ ص ۳۸۷ كتاب الشفعة)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شفعہ کا ہر اس چیز میں فیصلہ کیا جو ہنوز تقسیم نہ کی گئی ہو اور شرکت باقی ہو لیکن جب اس کی حدود متعین اور راستے علیحدہ علیحدہ ہو جائیں تو اب (بر بنائے شرکت) شفعہ نہیں رہا۔"

شفعہ ان تمام جائیدادوں میں ہے جب تک وہ تقسیم نہ ہوئی ہوں۔ آگے حضورؐ نے ایک جملہ فرمایا، فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق فلا شفعة۔ مثلاً اگر چار بھائیوں کی مشترکہ زمین ہے اور انہوں نے اسے تقسیم کر لیا اور اس کی حد بندی کر دی یا حقوق میں اشتراک ہے اور راستے الگ کر دیئے گئے تو پھر اس پر شفعہ کا کوئی حق نہیں ۔۔۔ اس سے ایک دوسری بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ دو بھائیوں میں زمین مشترک تھی، اب اس ملکیت میں شراکت کی وجہ سے ان کو شفعہ کا حق تھا لیکن جب زمین تقسیم ہو گئی تو ان کا حق شفعہ نہیں رہا اب اگر رشتہ داری کی وجہ سے بھی ان کو شفعہ کا حق مل سکتا ہوتا تو حضورؐ یہ نہ فرماتے کہ اب حق شفعہ نہیں رہا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دو سگے بھائیوں میں یا باپ اور بیٹے میں بھی اگر زمین تقسیم ہو گئی تو پھر (بر بنائے شراکت) شفعہ کا حق نہیں ہوگا کیونکہ ملکیت میں اب شراکت نہیں ہے، پھر جوار (پڑوسی) کی وجہ سے اگر وہ چاہے گا تو حق جوار کی وجہ سے اس کو شفعہ کا حق حاصل ہوگا جس میں اجنبی اور رشتہ دار سب برابر ہیں۔ یہ تو شریک کے بارے میں حدیث ہے، اسی طرح جار (پڑوسی) کے حق شفعہ کو دیکھئے۔ امام ابو داؤدؒ کی کتاب (سنن ابی داؤد) صحیح اور مستند ہے تمام مسلمانوں کے نزدیک، اس میں حضورؐ سے روایت ہے کہ جار الدار اَحَقّ بدار الجار والارض جو مکان کا پڑوسی ہے یا جو زمین کا پڑوسی ہے وہ اس پڑوسی ہونے کی وجہ سے حقدار ہے اگرچہ شریک فی الملک نہ ہو اور شریک فی الحقوق بھی نہ ہو مگر اس کا حق ہوگا۔ اب ترتیب کیا ہے تینوں کی؟ وہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعین فرما دی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الشريك احق من الخليط

والخلیط احق من الشفیع۔ (او کما قال)۔ (الھدایۃ ج ۴ ص ۳۸۸ کتاب الشفعۃ)

یہاں اجتہاد کی باتیں ہو رہی ہیں مگر یہ اجتہاد کی باتیں نہیں، اجتہاد تو وہاں ہوگا جہاں حضور اکرمؐ سے پوری راہنمائی نہ حاصل ہوتی ہو۔ تو حضورؐ نے تو سب کچھ فرما دیا، حقدار اور ان کی ترتیب بھی متعین کر دی کہ ملکیت میں شراکت دار جو ہوگا اس کا پہلا نمبر ہے خلیط سے، خلیط وہ ہے جس کے صرف حقوق ہوں۔ پھر فرمایا کہ الخلیط احق من الشفیع، جب خلیط اور پڑوسی کا مقابلہ آئے گا تو جو حقوق میں شریک ہے، جو ملکیت میں شریک ہے ان کا حق پہلے ہوگا، اس کے بعد جو جوار والا ہے اس کا حق ہے۔

اسی طرح سنن اربعہ ابوداؤد و ترمذی وغیرہ حدیث کی کتابوں میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت مذکور ہے:۔

عن جابرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجار احق بشفعۃ جارہ ینتظر بہا وان کان غائبًا اذا کان طریقہما واحدًا۔ (ابوداؤد، مسند احمد، ابن ماجہ، ترمذی، دارمی)۔ (الدرایۃ فی تخریج احادیث، رقم حدیث ۸۸۹ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پڑوسی اپنے شفعہ کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے، اگر وہ غائب (غیر موجود) ہو تو شفعہ کے لیے اس کا انتظار کیا جائے مگر یہ شفعہ اس وقت ہوگا جبکہ دونوں ہمسایوں کا راستہ ایک ہو۔"

جو پڑوسی ہے اور اس کا تیسرے نمبر پر حق بنتا ہے تو اب وہ حقدار ہوگا اجنبی لوگوں سے، رشتہ داروں سے اور مختلف طبقہ کے لوگوں سے اس کا انتظار کیا جائے اگر وہ موجود نہ ہو۔ ینتظر بہا وان کان غائبًا۔ آگے یہ بھی فرمایا کہ جب راستہ ایک ہے تو اسے ترجیح دی جائے گی۔

دوسری روایت حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی ہے جو کہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

عن ابی رافع مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول الجار احق بسقبہ قیل یا رسول اللہ ماسقبہ قال شفعتہ۔ (الھدایۃ ج ۴ ص ۳۸۷ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "یعنی پڑوسی اس زمین کا قرب اور نزدیک ہونے کی وجہ سے زیادہ حقدار ہے، صحابہؓ نے سقب کے بارہ میں دریافت کیا تو فرمایا کہ اس سے مراد شفعہ میں اس کا استحقاق ہے، وہ قرب کی وجہ سے زیادہ حق دار ہے۔

اسی طرح ترمذی میں روایت ہے الجار احق بشفعتہ ـــــــ یہ میں نے مختصراً حضورؐ کی چند روایات پیش کی ہیں کہ حضورؐ نے ان تین شفعا ہی میں حق شفعہ کو مخصوص، محدود اور محصور کیا ہے اب یہاں ایک سوال اٹھایا گیا کہ جس وقت یہ مسودہ عوام میں مشتہر کیا گیا تھا کہ ان تینوں میں ہم کیوں محدود کریں جبکہ اوروں کی صریح مخالفت تو نہیں۔

جناب والا! یہاں مختلف حضرات تقریریں کرتے ہیں، ان کی تمہید عجیب جوش و خروش کی ہوتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری تائید کی طرف آ رہے ہیں، دلائل ہمارے حق میں دیتے ہیں اور آخر میں یکدم پلٹ جاتے ہیں، ان کی تقریروں میں تضادات ہوتے ہیں، آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ شفعہ کے اس مسئلے میں کوئی ابہام یا کوئی پریشانی ہے ہی نہیں، کبھی وہ کہتے ہیں کہ یہ ان تین سے بھی زیادہ کو دیا جائے، کچھ حضرات کہتے ہیں کہ ان تین میں سے بھی کم کر کے ان کو محدود کیا جائے، تو سمجھ نہیں آتی کہ یہ ابہام اور پریشانیاں کس چیز سے پیدا ہو گئی ہیں؟ اب کچھ لوگوں نے یہ کہا کہ چونکہ حضورؐ نے اوروں کی نفی تو نہیں کی اور انّما کا کلمہ نہیں آیا۔ حالانکہ یہ ایک علمی اصطلاح ہے اور قواعدِ لغت کی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ کلمۂ حصر نہیں ہے یعنی حضورِ اقدسؐ نے یہ تو نہیں فرمایا انما الشفعة للشریك الخ کہ شفعہ ان تین تک محدود ہے کیونکہ انّما حصر کا ہے اور وہ کلمہ نہیں اوروں کو بھی ملنا چاہیئے۔ اور دلیل ان لوگوں نے یہ پیش کی ہے کہ آیتِ زکوٰۃ میں ہے کہ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ مصارفِ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے اِنَّمَا کے کلمہ سے مخصوص کر دیئے ہیں، اب جو آٹھ مصارف ہیں ان میں ہم نویں اور دسویں مصرف کا اضافہ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے، ایک چیز کو محصور کرنے کے لیے انّما کا حرف اور حصر کے کلمات ضروری نہیں ہوتے، الف لام اختصاص وہ بھی تخصیص کے لیے آتا ہے، جیسے الحمد للّٰہ ہے، اب اس کا معنیٰ یہ ہے کہ حمد اور تعریف و ستائش ساری اللہ کے لیے ہے کسی اور کو ہم حمد میں شریک نہیں کر سکتے ورنہ وہ کفر ہو جائے گا حالانکہ یہاں انّما تو نہیں۔ اب الحمد میں "ل" اختصاص کے لیے ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ایک جملہ کا مقام مؤخر ہو جاتا ہے اور اس کو مقدم کر لیا جاتا ہے وہ بھی حصر کا فائدہ دیتا ہے اور تخصیص ثابت کرتا ہے، مثلاً نعبد ایاك ہونا چاہیئے تھا نماز میں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، مگر وہاں یہ کہا کہ ایاك نعبد ہم خاص تیری عبادت کرتے ہیں کسی اور کی نہیں کر سکتے۔ یہ حصر کس چیز سے ثابت ہوا؟ کسی جملہ کا حق دوسری جگہ تھا لیکن وہاں سے پہلے آیا اور اس کو پہلے کر دیا۔ یہ تقدیم ماحقه التاخیر کہلاتی ہے۔ اسی طرح اگر میں یہ کہوں کہ نہیں آیا اس ایوان میں مگر زید، تو یہ استثناء بھی حصر کے لیے مفید ہو گیا۔ ماجاءنی من القوم الا زیدٌ۔ اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضورِ اقدسؐ کے

زمانہ میں جب سارے حالات آپؐ کے سامنے تھے، حضورؐ اور صحابہؓ کے رشتہ دار بھی تھے اور مختلف طبقے موجود تھے، آپؐ کو پتہ تھا کہ تکلیف لاحق ہو سکتی ہے، مگر شفعہ کا حق ان لوگوں کو نہ دیا۔ آج کہا جاتا ہے کہ شفعہ کی وجہ یہ ہے کہ دوسروں کو نقصان سے بچایا جائے یعنی دفع ضرر مقصود ہے مگر یہ بھی ایک علمی اصطلاح ہے اسے حکمت کہتے ہیں علت نہیں کہتے، دفع ضرر حکمت ہے اور علت اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ حکمت کے طور پر ایک چیز پیش کر دے مگر وہ علت نہیں ہوتی حکمت و مصلحت ہوتی ہے، علت ہوتی تو ہم دفع ضرر کو عام کر دیتے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں کہا گیا کہ ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کی گواہی کے برابر ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وجہ بھی بیان کر دی کہ شاید ایک خاتون بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا سکتی ہے۔ فتذکر احدٰھما الاخریٰ مقصد بھول سے بچنا ہے، وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اب اگر ایک خاتون بہت بڑی عالمہ ہے، اس کا حافظہ مسلّم ہے ہمیں پتہ ہے کہ وہ نہیں بھولتی تو اس قانون کو بدل تو نہیں سکتے کہ اس ایک کی شہادت مرد کے برابر ہو جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو حکمت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نماز پڑھو تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ میں نماز نہیں پڑھتا اس لیے کہ میں متقی نہیں بن سکتا لہٰذا نماز ہی چھوڑ دوں۔ نماز کی علت اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہ خطرات اوروں نے ظاہر کئے ہوں گے لیکن حضور اکرمؐ نے کسی کو یہ حق نہیں دیا، حضورؐ کی نظر بڑی وسیع تھی اور شفقت بھی سب سے بڑھ کر تھی۔

اب اگر ہم اس موضوع کو لیں کہ ضرر سے بچانا مقصود ہے تو پھر میرے خیال میں شفعہ کے جو قوانین انگریزی دور کے جاری ہیں اُن کے تحت ایک دوکاندار اور کرایہ دار کو بھی حق ملنا چاہیئے کیونکہ اس کو بھی ضرر ہے، اگر وہ دکان خالی کرتا ہے تو اس کو ضرر پہنچے گا۔ تو کیوں نہ اس کو شفعہ کا حق دیا جائے، یا اگر کوئی کرایہ دار ہے اور وہ مکان خالی کرتا ہے تو اس کو بھی ضرر پہنچ سکتا ہے۔ آپ ایک ملازم رکھتے ہیں اور پھر کسی وجہ سے اپنا کاروبار چھوڑ دیتے ہیں تو نظریہ دفع ضرر کے تحت اس ملازم کو بھی شفعہ کا حق ہو گا؟ اسی طرح میں نے زمین بیچی تھی آج اس کا دوسرا شخص مالک ہے اس نے تیسرے کو بیچ دی، تو پہلا مالک یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا بھی حق ہونا چاہیئے کیونکہ میں بھی کسی وقت اس زمین کا مالک تھا۔ اس طرح یہ سلسلہ بڑا طویل ہو جائے گا، اسلئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر مزارعین کو حق دینے کا مسئلہ ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح فرض کر لیا گیا کہ اگر میں نے زمین بیچ دی تو اس سے مزارع کو نقصان پہنچے گا اور مشتری لازماً مزارع کو بے دخل کر دے گا، اگر مزارع محنت کرتا ہے، دیانتدار اور با اصول ہے تو جس طرح میں نے اُسے رکھا تھا اسی طرح دوسرا خریدار بھی اسکی ایمانداری کی وجہ سے اُسے رکھے

لے گا۔ محنتی اور ایماندار ملازم کی تلاش تو ہر وقت رہتی ہے، لیکن اگر وہ محنت نہیں کرتا تو پھر تو مالک کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے نکال سکتا ہے۔ اسلام کی نظر میں مالک کو بھی ضرر سے بچانا ضروری ہے اور ملازم کو بھی بچانا ضروری ہے، ضرر سے سب کو بچانا مقصود ہے کسی ایک طبقہ کو نہیں، قانون میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی خاص فرد کا کیا ہو گا، کسی ایک طبقے کا کیا بنے گا، مفادِ عامہ کو دیکھا جاتا ہے۔

مثال کے طور پہ آپ ایک مجرم کو ۱۴ سال قید کی سزا دیتے ہیں اور اسے جیل میں ڈال دیتے ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اہل و عیال پر کیا گذرے گی، وہ بھوکے پیاسے رہیں گے، ان کا کوئی کفیل نہیں ہو گا، پھر آپ کو یہ حق کہاں ہے کہ آپ اس کو جیل میں ڈالیں۔

ایک شخص قتل کرتا ہے اور عدالت کی طرف سے اُسے قصاص میں قتل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، تو آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ اس کے خاندان کا کیا بنے گا؟ اور انہیں کتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا؟ مفادِ عامہ کو دیکھا جاتا ہے، پھر تو آپ چور کے ہاتھ بھی نہیں کاٹ سکتے، اس لیے کہ اس کے اہل و عیال بھوکے رہیں گے اور اس کی ساری زندگی تکلیف میں گذرے گی، تو قانون مفادِ عامہ کے لیے بنایا جاتا ہے۔

یہاں اس ایوان میں مزارع اور غیر مزارع، رشتہ دار اور فلاں اور فلاں یہ ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے کہ گویا شریعت نے اس معاملہ میں کوئی راہنمائی کی نہیں! حالانکہ فقہ میں تمام تفصیلات موجود ہیں، خلافتِ راشدہ اور خلافتِ عباسیہ میں کئی کئی منزلہ مکانات اور عمارتیں موجود تھیں، یہ کوئی مسئلہ نہیں کہ آج اٹھایا جائے۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ یہ تین طبقے تو ہر دور میں شفعہ کے حقدار رہے ہیں، حضور اکرمؐ سے لے کر انگریزی دور کے آخر تک کسی قانون میں، کسی دورِ حکومت میں، خلافتِ عباسیہ، خلافتِ عثمانیہ اور ہندوستان میں خلافتِ مغلیہ میں کسی اور کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ جو حق حضورؐ نے دیا اس پر تمام صحابۂ کرامؓ اور ائمہ کرامؒ نے اتفاق کیا، اسے کہتے ہیں تعاملِ اُمت۔ اب اگر ایک امام نے جار کے حق کی مخالفت کر بھی لی لیکن دوسرے تو متفق ہیں۔ اس کو اصطلاح میں اجماعِ مرکب کہتے ہیں کہ ان تین سے زیادہ پر کسی کا اختلاف نہیں۔ پھر صحابۂ کرامؓ کا دور آیا، ائمہ کرامؒ کا دور آیا، اہلِ بیت کا دور آیا لیکن کسی اور کو یہ حق نہیں دیا گیا۔

بہرحال میں اپنی باتیں سمیٹ کر عرض کروں گا کہ یہاں حاجی سیف اللہ صاحب نے ایک بات کہی اور مجھے افسوس ہے کہ انہیں ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ اگر ہر مسئلہ میں شریعت اور قانون میں فرقہ وارانہ اختلافات

کو ابھارا جائے گا تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا، توجیہات اور تشریحات میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔ یہ تو آپ کے قانون دان اور وکلاء حضرات بھی ایک مقدمہ میں متفق نہیں ہو سکتے، جج صاحبان کسی مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں تو ہر ایک کا فیصلہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر تو آپ اس سارے نظام عدل کو دریا میں ڈال دیں، پھر تو آپ عدالتی نظام چلا ہی نہیں سکتے، تو اصول میں کبھی اختلاف نہیں رہا۔

ہمارے پاس اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ آئی ہے، اس کونسل میں شیعہ علماء، بریلوی اور دیوبندی علماء، جج، وکلاء اور جدید عالم موجود تھے، ان سب نے متفقہ طور پر یہ رپورٹ پیش کی، شیعہ اور سنی حضرات کے کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مجھ سے خود شیعہ عالم علامہ رضی نے کہا کہ ہم نے ایسا کوئی اختلافی جملہ نہیں کہا۔ ہم سنی تو ان باتوں میں بڑے وسیع النظر ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے اسلامی فقہ کی عظیم کتاب ھدایہ ہے جس کا انگریزی ترجمہ یورپ میں پڑھایا جاتا ہے، اس میں تمام تفصیلات موجود ہیں کہ حق شفعہ کس کو ہے کس کو نہیں ہے، منقولہ جائیداد میں ہے یا غیر منقولہ میں ہے، پانی کی صورت کیا ہوگی، لفٹوں کا نظام کیا ہوگا، اور ساری وضاحتیں اس میں موجود ہیں، مثلاً تین منزلہ عمارت کی صورت میں ایک شخص نچلی منزل پر رہتا ہے، اوپر والی منزل کا راستہ تیسری منزل پر ہے، اس کی سیڑھیاں تیسری منزل والے پر آتی ہیں اور دوسری منزل والے کی سیڑھیاں الگ راستہ پر ہوں تو شفعہ کا حق وہ کہتے ہیں کہ پہلے والے کو ہوگا، اگر نیچے والے نے بیچ دیا تو پہلے والے کو ہوگا، اور اگر اوپر والے نے بیچ دیا تو نیچے والے کو ہوگا، درمیان والا متصل ہے، لیکن وہ چونکہ جار ہے، پڑوسی ہے تو حقوق میں شریک نہیں ہے اس کا نمبر تیسرا ہے ــــ تو یہاں ایک جملہ اختلافات کا کہا گیا۔ اسلام کے قوانین کی نظروں میں فروعی اختلافات اور فرقے نہیں ہوتے، یہاں تک کہ مسلم اور غیر مسلم کی تمیز بھی نہیں کی جاتی۔ میرے سامنے ھدایہ کی کتاب ہے میں اس کتاب سے ایک جملہ پڑھ کر سناتا ہوں:۔

والمسلم والذمی فی الشفعۃ سواء "یعنی مسلمان اور غیر مسلم شفعہ کے تمام حقوق میں برابر ہیں"۔ اگر ایک عیسائی ہمارے پڑوس میں ہے اور جار کی ساری سہولتیں اسے حاصل ہیں اور دوسرا جو کہ مسلمان ہے اور ایک ڈگری درجہ اس کو بعد میں رہا ہے تو اس کو شفعہ کا حق نہیں ہوگا عیسائی کا درجہ پہلے ہوگا، کیونکہ احکام عام ہیں، سبب جو شفعہ کا ہے اس میں مسلمان اور غیر مسلم برابر ہیں ــــ صاحب ہدایہ کا قول ہے: للعمومات ولانهما يستويان فی السبب والحكمة فيستويان فی الاستحقاق، اس لیے استحقاق میں دونوں برابر ہیں ــــ اس سے قبل ایک دوست نے

اسلام میں غلامی کی بات چھیڑ دی تھی ، یہ عجیب بات ہے، کیا یہ غلامی اسلام کے لیے ایک دھبہ ہے ؟ بات شفعہ کی ہوتی ہے تو مسئلہ غلامی کا چھیڑ دیا جاتا ہے ،کل کوئی یہ کہے گا کہ اس زمانے میں حرمتِ خمر کی بات ؟ کوئی یہ کہے گا کہ اس زمانے میں مخلوط ڈانس کی بات ؟ (زور دار تالیاں) بھائی! اسلام نے تو غلاموں کو آسمان تک پہنچایا ہے، اسلام نے غلامی کو ختم کیا۔ اس شفعہ کے مسئلہ ہی کو لیجئے، اسی ھدایہ کا ایک اور جملہ شفعہ کے سلسلہ میں آتا ہے کہ ؛ ولھذا یستوی فیہ الذَّکَرُ وَ الاُنثیٰ والصغیر والکبیر والباغی والعادل والحر والعبد اذا کان ماذونًا اومکاتبًا ۔ اور چھوٹا اور بڑا اس کے حق میں برابر ہیں، اور سننے کی بات آگے ہے کہ آزاد انسان اور غلام انسان بھی اس میں بالکل برابر ہیں۔ یعنی اسلام نے تو غلام کو بھی ان تمام قوانین میں آزاد کے برابر حق دیا ہے۔

تو جناب! میں ان گذارشات کے ساتھ، چونکہ کافی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

مسوّدہ شفعہ آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء

اور

دارالعلوم حقانیہ کی سفارشات و ترامیم

حکومتِ پاکستان نے نمبر ۳ (۲۱) (۲۲)/۸۰ آر، سی، آئی آئی مجریہ ۱۳/دسمبر ۱۹۸۰ء کے تحت شفعہ آرڈیننس ۱۹۸۰ء کا مسوّدۂ قانون رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے مشتہر کیا، اسلامی نظریاتی کونسل نے اس مسودہ کو دارالعلوم حقانیہ کی تجاویز اور اصلاحی ترمیمات کے لئے بھیجا، چنانچہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحب، نائب مفتی حضرت مولانا غلام الرحمٰن صاحب نے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کی راہنمائی، مشورہ اور موجودگی میں اس مسودہ پر از روئے فقہ و شریعت نظرِ ثانی کی اور جہاں جہاں قابلِ اصلاح چیز نظر آئی اس کی اصلاح کر کے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی خدمت میں ارسال کیا، اور قانونِ شفعہ آرڈیننس میں کل ۱۳ سفارشات پیش کی گئیں۔ (مرتب)

بخدمت اقدس جناب چیئرمین صاحب اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کے مرسلہ مسوّدہ شفعہ آرڈیننس مجریہ ۱۹۸۰ء کی بعض دفعات کے متعلق چند اہم تجاویز اسلامی نقطہ نظر سے ارسالِ خدمت ہیں، لیکن واضح ہو کہ یہ تجاویز صرف اُن دفعات کے متعلق ہیں جو مفصل اور غیر مخدوش ہیں، ورنہ جو دفعات ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھیں ان کے متعلق ہم جواب دینے اور رائے ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔

مثال کے طور پر ص۲ پر دفعہ ۲ کی شق (۳) اور ایسے ہی ص۹ دفعہ ۲ میں شق ۲ محذوش اور مبہم ہیں جو ہمارے لیے قابلِ فہم نہیں ہیں اس لیے ان کے متعلق ہم رائے نہیں دے سکتے، نیز اُن دفعات کے متعلق بھی ہم رائے نہیں دے سکتے جن کا تذکرہ مسودہ میں اجمالاً ہے اور تفصیلی حوالہ تعزیراتِ پاکستان پر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ص۱۲ پر دفعہ ۳ کا مجموعہ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء کا ایکٹ ۴۳۔ اور اسی صفحہ کی دفعہ ۳۱ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء ایکٹ ۵۔ صفحہ ۱۳ پر دفعہ ۳۳ میں قانون میعاد سماعت ۱۹۰۸ء کے ایکٹ ۹ میں شامل امور۔ اور ص۱۴ کی دفعہ ۳۶ کی شق الف اور شق ۳۔ ان دفعات سے تعلق رکھتی ہیں جن کے مجمل ہونے کی وجہ سے ہم ان کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ سے رائے دینے سے قاصر ہیں، اس لیے کہ تعزیرات پاکستان اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر غیر مبہم اور تفصیلی دفعات کے متعلق تجاویز پیشِ خدمت ہیں:۔

(۱) اس مسودہ کے ص۲ پر دفعہ ۲ کی شق ۴ میں ہے کہ کسی جائیداد غیر منقولہ کے بہتر انتظام کی غرض سے یا جائز طریقہ سے ذاتی استعمال میں لانے کے لیے تبادلہ کرنے کی صورت میں اگر تملیک و تملک کی حیثیت اور غرض سے ہو تو پھر اس صورت کو حقِ شفعہ سے مستثنیٰ کرنا ازروئے شرع درست نہیں بلکہ یہ بھی ان صورتوں میں سے ہونا چاہیئے جن میں حقِ شفعہ شفیع کے لیے ثابت ہے۔

(۲) ص۲ پر دفعہ ۲ کی شق (د) کے آخر میں[1] یہ اضافہ بھی ضروری ہے کہ شُفعہ اُس جائیداد میں بھی واجب ہوگا جو کسی صلح کی صورت میں اقرار، انکار یا سکوت میں دی جائے اور یا کسی جائیداد غیر منقولہ سے اقرار کی صورت میں صلح ہو جائے، اس کے لیے حوالہ ملاحظہ ہو:۔

وتجب الشفعة في الدار التي هي بدل الصلح سواء كان الصلح عن الدار عن اقرار او انكار او سكوت وكذا تجب في الدار المصالح۔

(الفتاوى الهندية ج۵ ص۱۶۰ كتاب الشفعة۔ الباب الاول)

(ترجمہ) "اور شفعہ اس جائیداد غیر منقولہ میں بھی واجب ہوگا جو کسی صلح کے بدل میں دی جائے خواہ یہ صلح اقرار، انکار یا سکوت کی صورت میں ہو، اور نیز شفعہ اس جائیداد میں بھی واجب ہو گا جس سے اقرار کی صورت میں صلح ہو جائے۔"

۱؎ آرڈیننس کے مسودہ کی عبارت میں صلح کی وہ صورتیں جن میں شرعاً شُفعہ ثابت ہے مذکور نہیں ہیں۔

(۳) صٓ دفعہ ۱۳ پر طلب مواثبت کی تعریف "مجلس" کے ساتھ یہ اضافہ بھی ضروری ہے۔
"اگرچہ اس مجلس میں یہ شفیع اکیلا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ طلب مواثبت شفیع کیلئے اس کے مطلع ہونے کے فوراً بعد ضروری ہے، اس طلب میں اس کے لیے کسی دوسرے لوگوں کے سامنے موجود ہونا ضروری نہیں۔"

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: وفی القہستانی یجب الطلب وان لم یکن عندہ احد لئلا تسقط الشفعۃ دیانۃً ولیتمکن من الحلف عند الحاجۃ کما فی النہایۃ۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۳ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "(اور یہ طلب مواثبت اس کے لیے) ضروری ہے اگرچہ اس کے ہاں کوئی بھی موجود نہ ہو تاکہ اس کا حق شفعہ دیانۃً ساقط نہ ہوجائے اور بوقت ضرورت قسم کھانے میں بھی سچا ہو کر قسم کھا سکے۔"

(۴) ایسا ہی مذکورہ صٓ کی دفعہ ۱۳ کی شق ۳ میں یہ تصریح کرنی بھی ضروری ہے کہ "طلب اشہاد شفیع کی ذات سے خاص نہیں ہے بلکہ یہ طلب اشہاد شفیع بذات خود یا بوقت ضرورت رسالۃً یا وکالۃً بھی کر سکتا ہے۔"

لما قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ: اذا باع رجل وعلم بالشراء وھو فی طریق مکۃ فطلب طلب المواثبۃ وعجز عن طلب الاشہاد بنفسہ یوکل اٰخر حتی یطلب الشفعۃ فلو لم یفعل ومضی المدۃ بطلت شفعتہ۔

(خلاصۃ الفتاوٰی ج ۴ ص ۲۵۶ کتاب الشفعۃ)

قال العلامۃ الحصکفیؒ: وھٰذا الطلب لا بد منہ حتی لو تمکن ولو بکتاب او رسول ولم یشہد بطلت شفعتہ۔ (الدر المختار علی ہامش رد المختار ج ۵ ص ۱۴۳ کتاب الشفعۃ)

(ترجمہ) "یہ طلب اشہاد شفیع کے لیے ضروری ہے یہاں تک کہ یہ طلب اشہاد کسی خط یا کسی آدمی کو بھیج کر بھی ممکن ہو اور شفیع طلب نہ کرے تو اس کا حق شفعہ باطل ہوگا۔"

اور نیز اس دفعہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلب اشہاد بائع یا مشتری یا مبیعہ ہر تینوں میں سے کسی ایک کے ہاں جو بھی اس کو میسر ہو کر سکتا ہے البتہ بائع کے ہاں اس وقت طلب اشہاد کرے گا جب تک مبیعہ اس کے ہاں موجود ہو جبکہ مذکورہ دفعہ ۱۳ میں صرف مبیعہ (جائیداد غیر منقولہ) کے ہاں طلب اشہاد کی کفایت پر تصریح نہیں کی گئی ہے۔

لما قال العلامة الحصکفی رح : ثم یشهد علی البائع لو عند العقار فی یده اوعلی المشتری وان لم یکن ذا ید لانه مالك اوعند العقار۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۵ ص کتاب الشفعة)

(ترجمہ) "اور پھر شفیع یہ طلب اشہاد بائع کے ہاں کرے گا اگر مبیعہ اس کی ملکیت میں ہو۔ اور یا مشتری کے ہاں کرے گا اگرچہ یہ مبیعہ اس کے ہاں موجود نہ ہو کیونکہ وہ مالک ہے۔ اور یا جائداد غیر منقولہ کے ہاں کرے گا۔"

(۵) ایسا ہی اسی صفحہ ۷ کی دفعہ ۱۳ کے عنوان تشریح کی شق ۴ میں بھی یہ اضافہ ضروری ہے کہ "شفیع ہر دونوں کو طلب کرنے کے بعد جائیداد غیر منقولہ کے لینے کے لیے عدالت سے رجوع بغیر کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ کے اندر اندر ضرور کرے گا اور اگر بلا کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ میں دعوی دائر نہ کرے تو اس کا حق شفعہ اس ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی وجہ سے باطل ہوگا۔"

قال العلامة ابن عابدین رح : وفی الجامع الخانی الفتوی الیوم علی قول محمد رح لتغیر احوال الناس فی قصد الاضرار۔ (رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۴ کتاب الشفعة)

(ترجمہ) "لوگوں کے اپنے حقوق کے مطالبہ میں اصرار کو مد نظر رکھتے ہوئے آجکل فتوی امام محمد رح کے قول پر ہے کہ بغیر کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی وجہ سے حق شفعہ باطل ہو جاتا ہے۔"

تاہم بصورت کسی واقعی عذر کے ایک مہینہ سے زائد تاخیر کی صورت میں بھی حق شفعہ باطل نہیں ہوگا جیسا کہ رد المحتار جلد ۵ ص ۱۴۴ کی مذکورہ بالا عبارت سے چند سطر پہلے علامہ ابن عابدین رح رقمطراز ہیں :-

فلو عذر او سفر او عدم قاض یری الشفعة بالجوار فی بلده لا تسقط اتفاقاً۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۱۴۴ کتاب الشفعة)

(ترجمہ) "اور بصورت واقعی عذر ہونے کے مثلاً بیماری یا سفر یا اس علاقہ میں قاضی کے نہ ہونے کی وجہ سے جو شفعہ بالجوار کر سکے، تو ان صورتوں میں مہینہ سے زائد مدت بقدر عذر تاخیر کرنے سے بالاتفاق حق شفعہ باطل نہیں ہوگا۔"

بناء بریں صورت ص ۱۳ کی دفعہ ۳۳ پر میعاد سماعت جو کہ ساٹھ ۶۰ دن مقرر کی گئی ہے، اگر اس میعاد سماعت سے مراد طلب خصومت یعنی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کا وقت مراد ہو تو پھر ساٹھ ۶۰ دن تک تاخیر کرنے کے باوجود حق شفعہ کا باطل نہ ہونا مفتی بہ قول کے مخالف

ہے کیونکہ مفتی بہ قول صرف ایک ماہ تک ہے، اور اگر میعادِ سماعت سے مراد حاکم کے لیے فیصلہ کرنے کی مُدت مراد ہو تو پھر شریعت میں تحدید نہیں ہے بلکہ جتنا ممکن ہوسکے قاضی یا حاکم فیصلہ کرسکے گا۔[1]

(۶) صفحہ ۸ کی دفعہ ۱۶ کے آخر میں یہ اضافہ بھی ضروری ہے: "گویا اسے بہ اراضی بائع اور مشتری کے مابین معاہدۂ بیع کی صورت میں ملی ہے لہٰذا اس پر احکام بیع، خیارِ رؤیت، خیارِ عیب اور عندالاستحقاق شفیع کے لیے رجوع بالثمن کا حق بھی ثابت ہوگا البتہ ضمان غرور کا مطالبہ بصورتِ استحقاق شفیع نہیں کرسکتا۔" اس لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ:-

واذا قضی القاضی او اسلم المشتری تثبت بینہما احکام البیع من خیار رویتہ وخیار عیب والرجوع بالثمن عند الاستحقاق الا ان الشفیع لا یرجع بضمان الغرور۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص ۱۷۶ کتاب الشفعة الباب الخامس فی الحکم بالشفعة)

(ترجمہ) "اور جب قاضی یا حاکم شفیع کے حق میں فیصلہ کرے یا مشتری برضا خود مبیعہ شفیع کو چھوڑ دے تو اب شفیع اور بائع کے درمیان یہ ایک معاہدۂ بیع تسلیم ہوگا اور اس پر احکام بیع جاری ہونگے۔"

جس کی رُو سے شفیع کے لیے خیارِ رویت، خیارِ عیب اور بصورت استحقاق رجوع بالثمن کا حق حاصل ہے، البتہ شفیع بائع پر بصورتِ استحقاق ضمان غرور کا حق رجوع نہیں رکھتا ہے یعنی شفیع بائع سے ضمان غرور کے مطالبہ کا مجاز نہیں ہے۔[2]

(۷) صفحہ ۸ کی دفعہ ۷ میں شفیع کی موت کی صورت میں حق شفعہ شفیع کے قانونی ورثاء کو منتقل کرنا خلاف فقہ حنفی ہے[3] بلکہ قاضی یا حاکم کا اس شفیع کے حق میں فیصلہ کرنے سے قبل اگر شفیع مرجائے تو اس کا حق شفعہ باطل ہو کر شفیع کے ورثاء کو منتقل نہیں ہوگا، البتہ مشتری کی موت سے حق شفعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ:-

واما الضروری فنحو ان یموت الشفیع بعد الطلبین قبل الاخذ بالشفعة فتبطل شفعتہ

---

[1] سرکاری مسودہ میں سائٹھ دن کی میعاد سماعت مقرر کی گئی ہے جبکہ یہ میعاد نہ تو قرآن کی کسی آیت میں ہے نہ حدیث میں، اور نہ ہی یہ کسی فقیہ کا قول ہے، شرعاً اس کی یہ تفصیل ہے جو تبصرہ میں ذکر کی گئی ہے۔

[2] مسودہ میں معاہدۂ بیع کو مطلق رکھا گیا ہے جبکہ شرعاً ضمان غرور اس سے مستثنیٰ ہے۔

[3] جس ملک کی ۹۰ فیصد سے زائد آبادی حنفی المسلک ہو وہاں اسکے خلاف قانون سازی کرنا یقیناً مذہبی مداخلت کے مترادف ہے۔

وھذا عندنا ولا تبطل بموت المشتری وللشفیع ان یاخذ من وارثہ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۱۸۲ کتاب الشفعۃ الباب التاسع فیما یبطل بہ الخ) [1]

(ترجمہ) "اگر شفیع دونوں طلب (طلب مواثبت وطلب اشہاد) کر کے فیصلہ ہونے سے قبل فوت ہو جائے تو اس کی موت سے اس کا حق شفعہ باطل ہوگا اور اس کے قانونی ورثاء کو منتقل نہیں ہوگا، اور یہ ہمارا مذہب ہے، البتہ مشتری کی موت سے حق شفعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ شفیع مشتری کے ورثاء سے یہ جائیداد شفعہ کر کے لے سکتا ہے۔"

نیز مذکورہ آرڈر کے ص۹ کی دفعہ ۲ سے بھی یہ دفعہ متصادم ہے کیونکہ اس دفعہ میں وہاں پر تصریح ہے کہ حق شفعہ ناقابل انتقال اور ناقابل تقسیم ہے۔

(۸) صفحہ ۹ کی دفعہ ۲۳ کی شق ۲ میں کسی قانون کے ساتھ شرعی قانون کا اضافہ ضروری ہے لہٰذا یہ اصل عبارت یوں ہوگی: "اور یا مقام مقتدرہ نے کسی شرعی قانون کے تحت حاصل کرلی ہو اُس پر شفعہ کا دعویٰ نہیں ہوگا۔"

(۹) صفحہ ۱۰ دفعہ ۲۴ میں مدعی سے زرِ شفعہ جمع کرانے کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور زرِ شفعہ جمع نہ کرانے کی صورت میں شفعہ کا دعویٰ خارج کرنا شریعت کے موافق نہیں ہے کیونکہ زرِ شفعہ شفیع سے جمع کرانا شریعت میں تو مطلوب نہیں اور برائے اعتماد عدالت استصواب رائے میں ممنوع نہیں ہے لیکن اعتماد کی صورت صرف زرِ شفعہ کے جمع کرنے سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر شفیع کسی اور طریقے سے عدالت کو مطمئن کر کے اسے صرف کفیل (ضامن) دیدے تو پھر بھی دعویٰ شفعہ صحیح ہوگا، قاضی یا حاکم اسکی باقاعدہ سماعت کر کے فیصلہ کر سکتا ہے اور زرِ شفعہ جمع نہ ہونے کی صورت میں دعویٰ خارج نہیں ہوگا تاہم شفیع کو عقار کا قبضہ بغیر زرِ شفعہ کی وصولی کے نہیں دیا جائے گا۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ الہندیہ)

ولا یلزم الشفیع احضار الثمن وقت الدعوی بل یجوز المنازعۃ وان لم یحضر الثمن الی مجلس القاضی فاذا قضی لہ بالشفعۃ لہ احضار الثمن۔ ولو دفع الثمن بعد ما قال ادفع الثمن الیہ لا تبطل بالاجماع۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۱۶۷ کتاب الشفعۃ۔ الباب الخامس الخ)

---

[1] قال العلامۃ الکاسانی رحمہ اللہ: اما الضروری فنحو ان یموت الشفیع بعد الطلبین قبل الاخذ بالشفعۃ فتبطل شفعتہ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۲۲ کتاب الشفعۃ۔ فصل بیان ما یبطل بہ حق الشفعۃ)

(ترجمہ) "شفیع پر دعویٰ شفعہ کے وقت زرِ شفعہ قاضی یا حاکم کے ہاں جمع کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ بغیر زرِ شفعہ کے حاضر کرنے کے دعویٰ کی سماعت کر سکتا ہے، البتہ فیصلہ کے بعد شفیع پر زرِ شفعہ جمع کرنا ضروری ہے۔ (اور چند سطر کے بعد فرماتے ہیں) اور اگر شفیع وعدہ کر کے وقتی طور پر زرِ شفعہ جمع نہ کرائے تو پھر بالاتفاق اس کا حق شفعہ باطل نہیں ہوگا"

(۱۰) صفحہ ۱۲ کی دفعہ ۲۹ پر مذکورہ اداروں کو حق شفعہ کے اسقاط کا جو حق دیا گیا ہے اس میں چونکہ حق تلفی کا بہت قوی امکان ہے، لہٰذا یہ اختیار مذکورہ اداروں کو نہیں دینا چاہیئے بلکہ صفحہ ۹ پر دفعہ ۲۲ کے تحت جو استثناء کیا گیا ہے اس پر ہی اکتفاء کرنا چاہیئے۔

(۱۱) صفحہ ۱۳ دفعہ ۳۴ کے مطابق اطلاع نامہ کی صورت میں صرف اطلاع عامہ کو کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اطلاعِ عامہ کے علاوہ رجسٹری منظور کرنے والا رجسٹرار یا انتقال کی تصدیق کرنے والا افسرِ مال اکنالجمنٹ (واپسی رسید) رجسٹری یا انتقال کی اطلاع شریک خلیط اور جار کو خصوصی طور پر رجسٹری یا ہرکارے کی وساطت سے دینا ضروری قرار دیا جائے۔ کیونکہ صرف اطلاع عامہ کی صورت میں حق تلفی کا قوی امکان موجود ہے۔ نیز مذکورہ اطلاع کو ایک ہفتہ تک محدود رکھنا صرف عدالت کی رائے ہے ورنہ شریعت میں یہ تحدید نہیں ہے۔

(۱۲) صفحہ ۱۵ کی دفعہ ۳۶ کی شق ۶ میں اس آرڈیننس کے اجراء سے قبل کئے ہوئے معاہدۂ بیع کے قابلِ سماعت ہونے کے لیے صرف ۶۰ دن مقرر کرنا بھی عدالت کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے، اس طرح غیر شرعی قانون کو شرعی قانون کا نام دینا بہت ہی خطرناک ہے۔

(۱۳) مذکورہ صفحہ ۱۵ کی دفعہ ۳۶ کی شق ۴ (۵) کے تحت اس قانون سے جن مقدمات کو مستثنیٰ کیا گیا ہے یہ بھی محض عدالت کی اپنی رائے ہو سکتی ہے ورنہ بہتر تو یہی ہے کہ تمام مقدمات کا فیصلہ شرعی لحاظ سے ہو جائے

کتاب
الشرکة

فان كانوا اكثر
من ذالك فهم
شركاء فى الثلث

کتاب الشّرکۃ

(شراکت کے احکام و مسائل)

موروثی جائیداد کے منافع کی تقسیم کا حکم

سوال: چند بھائی موروثی جائیداد بطور مشترکہ طور پر اس طرح محنت کررہے ہیں کہ ان کی کمائی میں تمیز کرنا مشکل ہے، اب ان میں سے ایک بھائی دوسرے بھائیوں کی کمائی سے انکار کررہا ہے اور ان کو رأس المال کے نفع سے محروم کرنا چاہتا ہے تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر تمام بھائی آپس میں ایسا کاروبار کر رہے ہوں کہ ان کی محنت میں تمیز نہ ہوتی ہو بلکہ مکمل طور پر مشترکہ ہو تو اس محنت کے ذریعے حاصل ہونے والے منافع میں تمام بھائی برابر کے حصہ دار ہوں گے کوئی بھی شریک پورے مال کا دعویدار نہیں ہوسکتا، لہٰذا صورتِ مذکورہ میں کسی ایک بھائی کو شرعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے دیگر بھائیوں کو ان کی محنت سے محروم کرے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ: لو اجتمع اخوۃ یعملون فی ترکۃ ابیھم ونما المال فھو بینھم سویۃ ولو اختلفوا فی العمل والرأی۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکۃ۔ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)

مشترکہ مال بذریعہ بولی خریدنے کا حکم

سوال: چند آدمی مشترکہ طور پر کسی چیز کو خریدتے ہیں پھر آپس میں اس پر بولی کرتے ہیں کہ جو شریک زیادہ بولی دے گا تو وہ اس چیز کا مالک ہوگا، اس کے بعد زیادہ بولی دینے والا شریک دیگر شرکاء کو

لہ وقال العلامۃ سلیم رستم باز: فاذا کان سعیھم واحداً ولم یتمیز ما حصلہ کل واحد منھم بعملہ یکون ما جمعوہ مشترکاً بینھم بالسویۃ ان اختلفوا فی العمل والرأی۔

(شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۳۶۱ ص۷۲۵ الکتاب العاشر)

ومثلہ فی تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۹۵ کتاب الشرکۃ۔

اپنے اپنے حصہ کی رقم مع منافع کے واپس کرتا ہے، تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ صورت مذکورہ میں چونکہ تمام شرکاء مشترکہ طور پر کوئی چیز خرید کر پھر آپس میں نیلام کرتے ہیں اور جو زیادہ بولی دیتا ہے مال اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے، لہٰذا اگر اس نیلام سے حاصل ہونے والی رقم کامیاب بولی دہندہ کے اپنے حصہ کے علاوہ دیگر شرکاء کے حصص کا عوض ہو تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہوگا اور اگر اپنا حصہ بھی بولی میں قیمتاً لینا پڑے تو پھر جائز نہ ہوگا۔

لما قال العلامة سليم رستم بازؒ: الشريك مخير ان شاء باع حصته من شريكه و ان شاء باعها عن اجنبي بدون اذن شريكه راجع الى المادة ۲۱۵ لكن في صور خلط الاموال واختلاطها التي بيناها في الفصل الاول لايسوغ لاحد الشريكين الخ

(شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۸۸ ص۶۰۸ الكتاب العاشر) [۱]

شریک کی موت سے شرکت کا ختم ہونا

سوال:۔ دو آدمی آپس میں مشترکہ کاروبار کرتے تھے کہ ان میں ایک کا انتقال ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ کیا شریک کی موت سے شرکت ختم ہو جاتی ہے یا برقرار رہتی ہے؟ شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ شراکت کے دوران جب کسی ایک شریک کا انتقال ہو جائے تو شرکت خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور دوسرا شریک فوت شدہ کے مال میں تصرف کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔

لما قال العلامة فخرالدين عثمان بن على الزيلعيؒ: وتبطل الشركة بموت احدهما ولو حكماً...... ولا فرق بين ان يعلم موت صاحبه اولا يعلم لانه عزل حكمي۔

(تبيين الحقائق ج۳ ص۳۲۳ كتاب الشركة) [۲]

---

[۱] قال العلامة الحصكفيؒ: وكل من شركاء الملك اجنبي في مال صاحبه فصح له بيع حصته ولو من غير شريكه بلا اذن إلا في صورة الخلط لماليهما كحنطة بشعير وبناء وثمر وزرع۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۴ ص۳۰۰ كتاب الشركة)

وَمِثْلُهُ في شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۸۸ ص۶۰۸ الكتاب العاشر۔

[۲] وقال في الهندية: وتبطل الشركة بموت احدهما علم به الشريك اولا۔

(الفتاوى الهندية ج۲ ص۳۳۵ الباب الخامس في الشركة الفاسدة)

وَمِثْلُهُ في الشلبي على تبيين الحقائق ج۳ ص۳۲۳ كتاب الشركة۔

مشترکہ کاروبار کے منافع کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ دو آدمیوں نے آپس میں مشترکہ کاروبار شروع کیا، دونوں نے اپنا اپنا راس المال جمع کیا، کاروبار شروع کرتے وقت ایک دوسرے کے ساتھ یہ شرط نہیں لگائی گئی کہ آپس میں منافع کس نسبت سے تقسیم ہوگا، جبکہ دورانِ کاروبار ایک شریک نے دوسرے کی نسبت کم مشقت برداشت کی، تو اس صورت میں مشترکہ کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع کی تقسیم شرعاً کس طرح ہوگی؟

الجواب:۔ صورتِ مذکورہ شرکتِ عنان کی صورت ہے اور یہ شرکت درست اور صحیح ہے اور چونکہ بوقتِ عقد کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے لہٰذا فقہاء کی تصریحات کے مطابق جب ایک شریک نے کام بھی نہیں کیا ہو اور ربح کے متعلق کسی کمی اور زیادتی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہو تو ربح (منافع) راس المال کے مطابق تقسیم ہوگا اور اگر راس المال دونوں کا برابر ہو تو منافع برابر ہوگا ورنہ راس المال کی کمی بیشی کی صورت میں منافع بھی کم و بیش ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: والربح بینهما علی قدر رأس مالهما۔ (تنقیح الحامدیة ج ۱ ص۹۴ کتاب الشرکة)[1]

مشترکہ زمین میں سے اپنا حصہ فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر دو آدمیوں کے مابین زمین مشترکہ ہو اور غیر منقسم ہو تو اگر ان میں سے ایک آدمی اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو کیا شرعاً اس کو اپنا حصہ فروخت کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ایسی زمین جو دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہو تو ان میں سے ہر ایک کو اپنے حصہ میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ہر ایک حصہ دار اپنا حصہ

---

[1] وقال فی الهندیة: واما شرط جوازها تکون راس المال عیناً حاضراً او غائباً عن مجلس العقد لکن مشار الیه والمساواة فی رأس المال لیست بشرط ویجوز التفاضل فی الربح مع تساویهما فی رأس المال کذا فی محیط السرخسی۔

(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۱۹ الباب الثالث فی شرکة العنان)

ومثله فی رد المحتار ج۴ ص۳۱۲ کتاب الشرکة۔

قبل از تقسیم فروخت کر سکتا ہے۔

لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ:۔ یصح بیع حصة شائعة معلومة کالنصف والعشر من عقار مملوك قبل الاقرار۔ (شرح مجلة الاحکام تحت المادة ۲۱۴ ص۱۰۳۔ الکتاب العاشر) لے

شرکاء کی غیر حاضری میں مشترکہ زمین پر کاشت کا حکم

سوال:۔ ایک زمین چند آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے اور ہر سال بعض لوگ اس میں مختلف فصلیں کاشت کرتے ہیں جبکہ ان شرکاء میں سے چند غائب ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ بعض شرکاء کے غائب ہونے کی صورت میں اس مشترکہ زمین میں کاشت کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ زمین شرعی ملک سے مشترکہ ہو تو غائبین کے حصص میں کاشت کرنا اُن کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہر ایک اپنے اپنے حصۂ ملکیت میں کاشت کرے گا، تاہم اگر دلالتاً غائب کی اجازت موجود ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی القنیة عن واقعات الناطفی ارض بدیهما فغاب احدهما فلشریکه ان یزرع نصفها ولو اراد ذٰلك فی ذٰلك العام الثانی یزرع ماکان زرع۔ (تنقیح الحامدیة ج۱ ص۹۱ کتاب الشرکة) ۲ے

لے قال العلامة محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوةؒ: اما بیعه فقسمان قبل القسمة اوکل قسم علیٰ وجهین اما ان باع عن اجنبیٍ او من شریکه فالوجه الاول وهو البیع من اجنبیٍ علی صنفین واما ان کان الکل له فباع نصفه او کان بین اثنین فباع احدهما نصیبه فالبیع جائز فی المواضع کلها۔ (جامع الفصولین ج۲ ص۸۲ الفصل الحادی والثلاثون فی مسائل البیع واحکامه)
وَمِثْلُهٗ فی تنقیح الحامدیة ج۱ ص۲۷۶ کتاب البیوع باب الخیار۔

۲ے وقال فی الهندیة: وفی الارض له ان یزرعها کلها علی المفتی به ان کان الزرع ینفعها فاذا جاء شریکه زرعها مثل تلك المدة وان کان الزرع ینقصها او الترك ینفعها فلیس له ان یزرعها۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۴۱ کتاب الشرکة۔ الباب السادس فی المتفرقات)
وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۵ ص۱۶۷ کتاب الشرکة۔

مشترکہ مال کسی کو عاریۃً دینے کا حکم

سوال:۔ یہاں ہمارے علاقہ میں ایک عالم دین کا انتقال ہو گیا ہے اور ترکہ میں کچھ اموال رہ گئے ہیں، ورثاء میں اس کے چند بیٹے ہی ہیں، کیا ان میں سے کوئی ایک اپنے باپ کے متروکہ مال سے کسی کو عاریۃً کچھ دے سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کے دوسرے بھائی اِس وجہ سے اُس پر ناراض ہیں؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں باپ کے متروکہ اموال چونکہ اس کے تمام بیٹوں کے مابین مشترکہ ہیں اس لیے کوئی بھی شریک مشترکہ اموال میں سے دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر کوئی چیز کسی کو عاریۃً نہیں دے سکتا، کیونکہ شرکاء کے حصّے ایک دوسرے کے ساتھ ودیعت (امانت) ہوتے ہیں۔

قال العلامة سليم رستم بازؒ: حصة احد الشريكين فى حكم الوديعة فى يد الآخر فاذا اودع احدهما المال المشترك عند اٰخر بدون اذن فتلف كان ضامنا حصة شريكه۔ (شرح مجلة الاحكام، تحت المادة ۱۰۸۷ ص۶۰۸ الكتاب العاشر)[1]

مُشترکہ جائیداد میں بلا اجازتِ شریک تصرّفات کرنے کا حکم

سوال:۔ دو حقیقی بھائیوں کی کچھ مشترکہ زمین تھی، ان میں سے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی غیر موجودگی میں ساری زمین فروخت کر دی، جب دوسرے بھائی کو پتہ چلا تو اس نے زمین فروخت کرنے سے انکار کر دیا، تو کیا اس دوسرے بھائی کا انکار شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ جائیداد ان کی زرخرید ہو یا اِرث کے ذریعہ انہیں ملی ہو تو اس میں کسی ایک بھائی کا تصرّف دوسرے کی اجازت کے بغیر درست نہیں، اس لیے یہ بیع ناراض بھائی کے حصہ کی اراضی میں نافذ العمل نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغينانيؒ: فشركة الاملاك العين يرثها رجلان او يشتريانها

---

[1] قال العلامة ابن عابدينؒ: نعم والسر فى ذٰلك ان الشريك حكمه فى حصة شريكه حكم المودع۔ (تنقيح الحامدية ج۱ ص۸۷ كتاب الشركة)
وَمِثْلُهٗ فى فتاوىٰ الكاملية ص۵۰ كتاب الشركة۔

فلا يجوز لاحدهما ان يتصرف فی نصيب الأخر الا باذنه وكل واحد منهما فی نصيب صاحبه كالاجنبی ۔ (الهداية ج ۳ ص۶۲۴ كتاب الشركة) [1]

مشترکہ دیوار کی تعمیر کے اخراجات کا حکم

سوال:۔ دو آدمیوں کے مابین ایک مشترکہ دیوار تھی جس کی مخدوش حالت کے پیشِ نظر اس کو گرادیا گیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کی دوبارہ تعمیر کا خرچہ مشترکہ ہوگا یا گرانے والے پر ہوگا؟

الجواب:۔ قواعدِ فقہیہ کی رُو سے مشترکہ دیوار کی تعمیر کے جملہ اخراجات اور تاوان دونوں کے ذمہ ہوگا کوئی ایک فریق اس کے اخراجات کا ذمہ دار نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : وفی جامع الفصولين حائط بينهما وخيف سقوطه فاراد احدهما نقضه وابى الأخر يجبر على نقضه .... ونصف قيمة البناء لو انفق بلا امر القاضی ونقل هذا الحكم فی شرح الوهبانية عن الذخيرة فی مسئلة انهدام السفل وقال انه الصحيح المختار للفتوى ۔

(رد المحتار ج۴ ص۳۳۳ كتاب الشركة۔ مطلب فيما اذا ... من العمارة) [2]

اقرار سے شرکت کا ثبوت

سوال:۔ ایک آدمی کا کسی کے ساتھ زمین کا تنازعہ عدالت میں چل رہا تھا اُس نے اپنے ایک خاص آدمی سے کہا کہ تم بھی اس دعوٰی میں میرے ساتھ شریک ہوجاؤ اور جب میں مقدمہ جیت لوں گا

---

[1] وقال العلامة ابن نجيم المصری رحمه الله : ای وكل واحد من الشريكين ممنوع من التصرف فی نصيب صاحبه لغير الشريك الا باذنه لعدم تضمنها الوكالة ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۶۷ كتاب الشركة)

وَمِثْلُهٗ فی فتح القدير ج ۵ ص۳۸۷ كتاب الشركة ۔

[2] وقال العلامة سليم رستم باز اللبنانی رحمه الله : فلطالب البناء ان يبنی باذن الحاكم ويرجع على شريكه بحصة من نفقة البناء ۔

(شرح مجلة الاحكام ۔ المادة ۱۳۱۸ ص۷۰۳ الكتاب العاشر)

وَمِثْلُهٗ فی جامع الفصولين ج ۲ ص۲۱۴ الفصل الرابع والثلاثون فی الاحكام ۔

تو اس میں تمہیں بھی حصہ دوں گا، اب جبکہ مقر نے مقدمہ جیت لیا ہے تو کیا مقرلہٗ اس کے ساتھ زمین میں شریک متصور ہوگا یا نہیں ؟

الجواب:- واضح رہے کہ مذکورہ صورت میں اس شخص نے خود ہی اپنے مقابل کے لیے ان الفاظ سے اقرار کیا ہے کہ "تم بھی اس میں میرے ساتھ شریک ہو" لہٰذا اس اقرار کی وجہ سے اس کا شریک کہ وہ شخص مذکورہ قطعہ اراضی میں شریک متصور ہوگا۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا اقر الحر العاقل البالغ بحق لزمه اقراره مجهولاً کان ما اقر به اومعلوماً۔ (الهداية ج۳ ص۲۳۱ کتاب الاقرار)[1]

مشترکہ زمین میں کسی ایک شریک کا پھلدار درخت لگانا

سوال:- ایک شخص کے چند بیٹے تھے، ان میں سے ایک نے باپ کی وفات کے بعد مشترکہ زمین میں ایک باغ لگایا، اب یہ باغ لگانے والا اس میں دوسرے بھائیوں کا حصہ نہیں مانتا، تو کیا ازروئے شریعت اس باغ میں دوسرے بھائیوں کا حصہ بنتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں باپ کی وفات کے بعد مشترکہ زمین میں جس بیٹے نے باغ اور درخت لگائے ہوں تو یہ باغ اور درخت وغیرہ اسی کی ملکیت سمجھے جائیں گے خواہ دوسرے بھائیوں کی اجازت سے لگایا ہو یا بغیر اجازت کے، کیونکہ اجازت کی صورت میں زمین کی تقسیم کے دوران اگر یہ پھلدار درخت کسی دوسرے بھائی کے حصہ میں آئیں تو اسے ان درختوں کی قیمت ادا کرنی پڑے گی ورنہ اکھاڑنا ہوں گے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: (بنیٰ احدهما) ای احد الشریکین (بغیر اذن الآخر) فی عقار مشترك بینهما (فطلب شریکه رفع بنائه قسم) العقار (فان وقع البناء) فی نصیب الباقی فبها ونعمت (والاهدم) البناء

---

[1] وقال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: المرأ مؤاخذ باقراره۔ (شرح مجلة الاحکام۔ المادة ۷۹ ص۵۳ المقالة الاولیٰ)

ومثله فی جامع الفصولین ج۲ ص۴۴ الفصل الثالث والعشرون۔

وحکم الغرس کذلك ۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۶۸ کتاب القسمۃ) [۱]

مشترکہ کتب شرکاء کی اجازت کے بغیر کسی کو عاریۃً دینا جائز نہیں

سوال: ۔ ایک عالمِ دین کا انتقال ہوگیا اور اس نے ترکہ میں کافی کتابیں چھوڑیں، ورثاء میں بالغ اور نابالغ دونوں موجود ہیں، ان میں ایک بڑا بیٹا گھر کے اخراجات کا ذمہ دار ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کوئی کتاب مطالعہ کے لیے مانگے تو اس کے لیے مشترکہ ترکہ میں سے کوئی کتاب دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ ورثاء میں نابالغ اولاد بھی موجود ہے اور تمام ورثاء اس ترکہ کتب میں شریک ہیں جبکہ نابالغ اولاد کا مال باپ بھی کسی کو عاریۃً نہیں دے سکتا تو بڑا بھائی تو بطریقِ اولیٰ نہیں دے سکتا۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لیس للاب اعارۃ مال طفلہ لعدم البدل وکذا القاضی والوصی۔ (شرح مجلۃ الاحکام، المادۃ ۸۳۲ ص۴۶۱ الکتاب السادس) [۲]

مشترکہ ٹیوب ویل کے پانی سے کسی شریک کو روکنا جائز نہیں

سوال: ۔ چند آدمیوں نے مشترکہ ٹیوب ویل نصب کرنے کے لیے کچھ پیسے اکٹھے کئے لیکن بدقسمتی سے جو جگہ انہوں نے ٹیوب ویل کے لیے منتخب کی تھی وہاں پانی نہ نکلا، ان میں سے ایک آدمی نے دوسری جگہ ٹیوب ویل کے لیے منتخب کی تو وہاں سے پانی نکل آیا، اب یہ آدمی باقی شرکاء کو پانی سے منع کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ یہ جگہ وہ نہیں جس کا انتخاب باہمی مشورہ سے

---

[۱] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: واذا بنی فی الارض المشترکۃ بغیر اذن الشریک لہٗ اَنْ یَنْقُضَ بناءَہٗ۔ (تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۱۰۰ کتاب الشرکۃ)
وَمِثْلُہٗ فی فتاوی الکاملیۃ ج ص۵۳ کتاب الشرکۃ۔

[۲] وقال العلامۃ محمد بن محمودؒ: ذکر فی النوازل لیس لوالد الصغیر ان یعیر متاع ولدہ الصغیر۔ (احکام الصغار علیٰ ہامش جامع الفصولین ج۱ ص۱۷۰ فی مسائل العاریۃ)
ومِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۴ ص۳۷۲ الکتاب التاسع المتفرقات۔ کتاب العاریۃ۔

ہوا تھا تاہم اس کے جملہ اخراجات مشترکہ رقم سے ادا کیے گئے ہیں، تو کیا اس کا یہ اقدام شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: بشرط صحتِ سوال جب مشترکہ مال سے ٹیوب ویل لگایا گیا ہے تو جملہ شرکاء اس سے استفادہ کے حقدار رہیں گے جگہ کی تبدیلی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لما قال العلامة سليم رستم باز اللبناني رحمه الله: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً في الملك المشترك باذن الآخر لكن لا يجوز له ان يتصرف تصرفاً مضراً بالشريك۔ (شرح مجلة الاحكام تحت المادة ۱۰۷۱ صـ۶۱۰ الكتاب العاشر)[1]

مچھلی کا شکار کرنے میں شرکت کا حکم

سوال: چند آدمی باہمی طور پر مچھلی کا شکار کرنے کے لیے معاہدہ کرتے ہیں، معاہدہ کے مطابق ضروری نہیں کہ جملہ شرکاء محنت کریں تاہم آلاتِ شکار کی خریداری مشترکہ مال سے ہوتی ہے اور ملازم کا ماہانہ خرچہ بھی مشترکہ طور پر برداشت کرتے ہیں، تو کیا شرکت کا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: چونکہ مچھلی پکڑنے کی شراکت اور استیجار شرعاً ناجائز معاملہ ہے، لہٰذا مذکورہ صورت کا معاملہ بھی جائز نہیں اور اس میں مچھلی اُس کا حق ہے جس نے پکڑی ہو۔ تاہم اگر وقتی طور پر چند افراد اکٹھے ہو کر مچھلی کا شکار کریں اور آخر میں باہمی طور پر تقسیم کریں تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما قال العلامة الشيخ البزاز رحمه الله: اشتركا في الاصطياد و نصبا شبكة او ارسلا كلباً لهما فالصيد بينهما انصافاً۔

(فتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ صـ۲۲ كتاب الشركة)

لما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله: لا تصح شركة في احتطاب و

---

[1] وقال في الهندية: ولا يجوز لاحدهما ان يتصرف في نصيب الآخر الا بامره وكل واحد منهما كالاجنبي في نصيب صاحبه۔

(الفتاوى الهندية ج۲ صـ۳۰۱ كتاب الشركة۔ الباب الاول۔

وَمِثْلُهٗ في تنقيح الحامدية ج۱ صـ۸۷ كتاب الشركة۔

احتشاش و اصطیاد و استقاء وسائر مباحات۔

(۱ـه تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکۃ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)

مشترکہ ایئر کنڈیشنر فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ چند ساتھیوں نے مشترکہ طور پر ایک ایئر کنڈیشنر خرید ا اور تمام ساتھی ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے تھے، اب ان میں سے کچھ ساتھی اس گھر کو چھوڑتے ہیں اور ایئر کنڈیشنر کو فروخت کرنا چاہتے ہیں، تو کیا اس کی اول قیمت معتبر ہوگی یا مستعمل کی؟ کیونکہ ایئر کنڈیشنر غیر قابل قسمت چیز ہے؟

الجواب:۔ چونکہ ایئر کنڈیشنر غیر قابل قسمت چیز ہے اور مشترکہ طور پر خرید اگیا ہے اس لیے یہ تمام ساتھیوں کے مابین مشترکہ ہوگا، کچھ مدت گذرنے کے بعد اب اگر چند ساتھی اس گھر کو چھوڑنا چاہتے ہوں تو انہیں مستعمل ایئر کنڈیشنر کی قیمت کے لحاظ سے حصہ دیا جائے گا۔

لما قال العلامۃ فخر الدین حسن بن منصور الشھیر بقاضیخانؒ: والعبد الواحد والدابۃ الواحدۃ یباع ویقسم ثمنھا لانھا لا تحتمل القسمۃ۔

(۲ـه فتاوی خانیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۱۵ کتاب القسمۃ)

مشترکہ مال سے حج کرنے کا حکم

سوال:۔ زید اور عمرو دو بھائی ہیں اور مشترکہ گھر میں رہائش پذیر ہیں، جب ان پر حج فرض ہوا تو

۱ـه لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا یجوز الشرکۃ فی الاحتطاب والاصطیاد واما اصطادہ کل واحد منھما او احتطبہ فھو لہ دون صاحبہ۔ (الھدایۃ ج۲ ص۵۹۷ کتاب الشرکۃ)

وَمِثْلُہٗ فی فتح القدیر ج۵ ص۴۰۹ کتاب الشرکۃ۔

۲ـه لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وفی الجوھرۃ لا تقسم الکتب بین الورثۃ ولکن ینتفع کل بالمھایاۃ ولا تقسم بالاوراق ولو برضاھم وکذا لوکان کتاباً ذا مجلدات کثیرۃ ولو تراضیا ان تقوم الکتب ویأخذ کل بعضھا بالقیمۃ لوکان بالتراضی جاز والا لا۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۶۱ کتاب القسمۃ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۱۴۲ ص۶۶۳ الکتاب الاشرفیۃ۔

زید چونکہ بڑا بھائی تھا اس لیے اس نے مشترکہ مال سے فریضۂ حج ادا کیا، بعد میں دونوں جُدا ہو گئے ہیں تو اب عمرو زید سے حج پر صرف شدہ رقم سے اپنے حصّے کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا عمرو کا یہ مطالبہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مذکورہ صورت چونکہ شرکتِ ملک کی ایک صورت ہے لہٰذا اس کا حکم یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کے حصہ میں تصرّف کرنے میں اجنبی ہے اس لیے زید عمرو کا ضامن ہو گا اور اس کے ذمہ عمرو کا نصف دَین شرعاً لازم ہے، لہٰذا عمرو زید سے اپنے حصے کا شرعاً مطالبہ کر سکتا ہے، تاہم اگر اس کی اجازت سے حج کیا ہو تو تبرع ہونے کی صورت میں دوبارہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: ان کل واحدٍ من الشریکین شرکة ملكٍ ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبه کغیر الشریك من الاجانب الا باذنه لعدم تضمنها الوکالة۔

(تنقیح الحامدیة ج ۱ ص۸۸ کتاب الشرکة)[1]

مشترکہ زمین میں چشمہ کے پانی سے شریک کو منع کرنا جائز نہیں

سوال:۔ زید اور عمرو کے مابین ایک زمین مشترکہ تھی جس میں سے کچھ زمین بنجر اور کچھ قابلِ کاشت تھی، کچھ وقت تک دونوں اس سے فائدہ حاصل کرتے رہے، نیز اس زمین میں پانی کا ایک چشمہ بھی تھا، حال ہی میں زید نے عمرو کو اس چشمہ کے پانی سے منع کر دیا ہے، تو کیا زید کا عمرو کو چشمہ کے پانی سے منع کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ زمین کا مشترکہ ہونا مبرہن اور مسلّم ہو تو زید کا عمرو کو چشمہ وغیرہ سے منع کرنا از روئے شریعت جائز نہیں ہے کیونکہ اس چشمہ میں جس طرح زید کا حق بنتا ہے اسی طرح عمرو کا بھی حق بنتا ہے، لہٰذا زید کا عمرو کے ساتھ یہ رویہ

---

[1] لما قال العلامة سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملك المشترك باذن الأخر لکن لا یجوز له ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریك۔ (شرح مجلة الاحکام، تحت المادة ۱۰۷۲ ص۶۰ الکتاب العاشر)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۲ ص۵۹۹ کتاب الشرکة۔

شرعاً درست نہیں ۔

لما ورد فی الحدیث : المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء والکلاء والنار ۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص۱۳۶ کتاب البیوع ۔ باب فی منع الماء) [۱]

اموالِ مشترکہ میں سے زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال :۔ دو آدمیوں کے مابین مشترکہ کاروبار ہے، ان مشترکہ اموال میں سے زکوٰۃ دینے کا کیا طریقہ ہے ؟ نیز اگر ایک شریک ان اموال میں سے جن میں زکوٰۃ واجب ہو زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو تو اس کا دوسرا ساتھی اس کے زکوٰۃ نہ دینے سے گنہگار ہوگا یا نہیں ؟

الجواب :۔ جب دو آدمیوں کی آپس میں کاروباری شراکت ہو تو ہر ایک اپنے حصہ سے زکوٰۃ دینے کا ذمہ دار ہے کسی ایک کی ذمہ داری دوسرے پر عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی ایک شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر زکوٰۃ دینے کا مجاز ہے اور بلا اجازت شریک زکوٰۃ نکالنے کی صورت میں دوسرا شریک ضامن قرار دیا جائے گا، لہٰذا اگر دوسرا شریک زکوٰۃ ادا نہ بھی کرتا ہو تو کاروبار میں شریک رکھنے سے کوئی حرج لازم نہیں آتا، تاہم اگر زکوٰۃ نہ دینے والے کی محفل و مجلس اور باہمی اشتراک سے اس کے اعمال و اخلاق متأثر ہوتے ہوں تو پھر ایسی حالت میں اس شخص کے ساتھ کاروبار میں شرکت کرنے سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے ۔

لما قال العلامة ابن نجیمؒ : ولم یزك مال الآخر الا باذنہ ای احدھما لانہ لیس من جنس التجارۃ فلا یکون وکیلاً عنہ فی ادائھا الا ان یأذن لہ ۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۸۷ کتاب الشرکۃ) [۲]

---

[۱] قال العلامة سلیم رستم بازؒ : الماء والکلاء والنار مباحۃ والناس فی ھذہ الاشیاء الثلاثۃ شرکاء ۔ (شرح مجلۃ الاحکام ۔ المادۃ ۱۲۳۴ ص۶۷۹ الکتاب العاشر)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۲ ص۴۸۵ کتاب الشرکۃ ۔

[۲] قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ : (ولم یزك مال الآخر) لایزکی کل واحد منھما نصیب صاحبہ لانہ لم یأذن لہ فیھا لان الاذن بینھما وقع فی التجارۃ والزکوٰۃ لیست منھا ۔ (تبیین الحقائق ج ۳ ص۳۲۳ کتاب الشرکۃ ۔ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۲ ص۳۳۶ کتاب الشرکۃ ۔ الباب السادس فی المتفرقات ۔

اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی فوت ہوگیا، اس کے ۲ دو بیٹے رہ گئے، ایک بالغ جبکہ دوسرا نابالغ ہے، تو کیا یہ بالغ اور بڑا بھائی اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اموالِ مشترکہ میں سے مہمان نوازی کرنا شرعاً درست نہیں، البتہ اگر دیگر بھائی بالغ ہوں تو اُن کی اجازت سے مشترکہ اموال سے مہمان نوازی اور دیگر تبرعات کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ان کل واحدٍ من الشریکین شرکۃ ملكٍ ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبہ کغیر الشریك من الاجانب الّا باذنہ لعدم تضمنها الوکالۃ۔ (تنقیح الحامدیۃ ج ۱ ص ۸۸ کتاب الشرکۃ)

شریک کو شرکت ختم کرنے کا اختیار ہے

سوال:۔ چند آدمیوں نے مل کر مشترکہ کاروبار شروع کیا اور سامانِ تجارت کی خرید و فروخت کرتے رہے، ان میں سے اچانک ایک شریک نے شرکت سے انکار کر دیا کہ میں آپ کے ساتھ شرکت کا معاملہ جاری نہیں رکھ سکتا۔ تو کیا دیگر شرکاء کے مشورہ کے بغیر کسی شریک کے لیے شرکت کو فسخ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرکاء میں سے ہر کسی شریک کو ہر وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دوسرے شرکاء کی اجازت اور مشورہ کے بغیر جب چاہے اپنی شرکت کو ختم کر دے، اس صورت میں اشیاءِ مشترکہ کی قیمت لگا کر اصل زر بقدرِ حصّہ اور منافع بقدرِ شرح تقسیم کرلیں۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: اشترکا واشتریا امتعۃ ثم قال احدهما لا اعمل

لہ قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملك المشترك باذن الاٰخر لکن لا یجوز لهٗ ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریك۔
(شرح مجلۃ الاحکام تحت المادۃ ۱۰۷۱ ص ۶۰۰ الکتاب العاشر)
ومثلہٗ فی الهدایۃ ج ۲ ص ۵۹۹ کتاب الشرکۃ۔

معك بالشركة وغاب فباع الحاضر الامتعة فالحاصل للبائع وعليه قيمة المتاع لان قوله لا اعمل معك فسخ للشركة معه واحدهما يملك فسخها وان كان المال عروضًا بخلاف المضاربة وهو المختار۔ (رد المحتار ج۴ ص۳۲۷ کتاب الشرکة) [1]

باپ اور بیٹے کی مشترکہ کمائی کا حکم

سوال :۔ ایک شخص نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا اور اس میں کافی پیسے کمائے اب سوال یہ ہے کہ یہ پیسے باپ اور بیٹے کے مابین مساوی تقسیم ہوں گے یا صرف باپ کی ملکیت شمار ہوں گے ؟

الجواب :۔ صورتِ مسئولہ میں باپ اور بیٹے نے مشترکہ کاروبار سے جو پیسے کمائے ہیں وہ باپ کی ملکیت شمار ہوں گے کیونکہ بیٹا باپ کا معین اور مددگار ہوتا ہے لہٰذا باپ اپنی زندگی میں اس میں جو بھی تصرف چاہے کر سکتا ہے، تاہم اگر رأس المال دونوں کا مشترکہ ہو اور معاہدہ بھی یہی ہوا ہو تو منافع بھی دونوں میں مساوی تقسیم ہوگا۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : الابّ والابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شئ فالکسب کله للاب ان کان الابن فی عیالهٗ لکونه معینا له الا تری انه لوغرس شجرة تکون للابّ۔
(ردالمحتار ج۴ ص۳۲۵ کتاب الشرکة۔ فصل فی الشرکة الفاسدة) [2]

---

[1] لما قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : وصورته اشترکا واشتریا امتعة ثم قال احدهما لا اعمل معك بالشرکة۔۔۔۔۔۔۔ لان قولهٗ لا اعمل معك فسخ للشرکة معهٗ احدهما یملك فسخها۔
(البحر الرائق ج۵ ص۱۸۵ کتاب الشرکة)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۲ ص۳۳۵ کتاب الشرکة۔

[2] وقال فی الهندیة : ابٌ وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما مال فالکسب کله للابّ اذا کان الابن فی عیال الابّ لکونه معینًا لهٗ۔
(الفتاوی الهندیة ج۲ ص۳۲۹ الباب التاسع فی شرکة الوجوه)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوی الکاملیة ج۱ ص۵۱ کتاب الشرکة۔

مشترکہ زمین میں بلا اجازتِ شریک کے باغ لگانا

سوال:۔ ایک زمین دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے جس میں ایک شریک نے دوسرے کی اجازت کے بغیر مالٹا کے پودے لگا دیئے، چند سال کے بعد جب پودے پھل دینے لگے تو شریکِ ثانی نے کہا کہ یہ پودے چونکہ مشترکہ زمین میں لگائے گئے ہیں اس لیے ان میں میرا بھی مکمل حصہ ہے لیکن شریکِ اوّل انکار کر رہا ہے، تو آیا اس کا یہ انکار شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ زمین دونوں شرکاء کے مابین تقسیم کی جائے گی، پودے لگانے والے کے حصہ میں اس کے پودے برقرار رہیں گے اور دوسرے شریک کے حصہ میں پودے لگانے والا اپنے پودے اکھاڑے اور اگر زمین کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو تو پودے نہیں اکھاڑے جائیں گے اور دوسرا شریک پہلے والے کو ان پودوں کی قیمت ادا کرے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: بنی احدهما ای احد الشریکین بغیر اذن الآخر فی عقار مشترك بینهما فطلب شریکه رفع بنائه قسم العقار فان وقع البناء فی نصیب البانی فبها ونعمت والا هدم البناء وحکم الغرس۔

{الدر المختار علی صدر رد المختار
ج ۶ ص ۲۶۸ کتاب القسمة}

کسی کی گائے بطورِ شرکت پالنا

سوال:۔ ایک شخص نے گائے خرید کر کسی دوسرے شخص کو اس شرط پر پالنے کے لیے دے دی کہ دودھ سب تمہارا ہوگا اور اس سے جو بچے پیدا ہوں وہ میرے ہوں گے، تو کیا اس قسم کی شرط لگانا اور ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

لہ وقال الشیخ محمد الکامل الطرابلسیؒ: ان الارض تقسم بینهما فما وقع فی نصیب غیر البانی یرفع...... وافتی شیخ آفندی فی غرس الاشجار من احد الشریکین فی الارض المشترکة بمثل ذٰلك۔

(فتاوٰی کاملیة ج ۱ ص ۵۳ کتاب الشرکة)

وَمِثْلُهٗ فی سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۲۷ باب فی زرع ارض قوم بغیر اذن صاحبها۔

الجواب:۔ مذکورہ صورت میں گائے کا دودھ اور اس کے بچے سب مالک کے ہیں اور پالنے والے کو اُجرت مثل دی جائے گی کیونکہ یہ اجارہ فاسدہ ہے اور اجارۂ فاسد میں کام کرنے والے کو اجرِ مثل ملتا ہے۔

لما قال الشیخ محمد کامل الطرابلسی رحمہ اللہ: لا یصح ذٰلک وما حدث فہو لصاحب البقرۃ وللآخر مثل علفہ واجر مثلہ کما فی الرد۔

(فتاوٰی کاملیۃ ص۵۵ کتاب الشرکۃ) لہ

مشترکہ زمین میں شرکاء کی اجازت کے بغیر مکان بنانا

سوال:۔ ایک غیر آباد قطعہ اراضی چند افراد میں مشترکہ ہے، ان میں سے ایک شریک نے بلا اجازت شرکاء کے اور تقسیم سے پہلے ہی اس میں ایک مکان تعمیر کیا، تو کیا اس شخص کا بغیر شرکاء کی اجازت کے مکان تعمیر کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مشترکہ زمین میں کسی ایک شریک کا تصرف کرنا دیگر شرکاء کی اجازت پر موقوف ہے، اور صورتِ مذکورہ میں اس شخص نے چونکہ شرکاء کی اجازت کے بغیر اور قبل از تقسیم مکان بنایا ہے اس لیے اس کا یہ اقدام شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامۃ سلیم رستم باز: اذا بنی احد الشرکاء لنفسہ فی الملک المشترک القابل للقسمۃ بدون اذن الآخرین ثم طلب الآخرون القسمۃ تقسم فان خرج ذٰلک البناء فی نصیب بانیہ فبہا وان خرج فی نصیب الآخر فلہ ان یکلف بانیہ ہدمہ ورفعہ۔ (شرح مجلۃ الاحکام المادۃ ۱۰۷۳ ص۶۲۴) لہ ۲

لہ وقال فی الہندیۃ: وعلیٰ ہٰذا اذا دفع البقرۃ الی انسان بالعلف لیکون الحادث بینہما نصفین فما حدث فہو لصاحب البقرۃ ولذٰلک الرجل مثل العلف الذی علفہا واجر مثلہ فیما قام علیہا۔ (الفتاوٰی الہندیۃ ج۲ ص۳۳۵ الباب الخامس فی الشرکۃ الفاسدۃ)

ومثلہ حاشیۃ منحۃ الخالق علی ہامش البحر الرائق ج۵ ص۱۸۳ کتاب الشرکۃ۔

لہ۲ وقال الشیخ محمد کامل الطرابلسیؒ: واذا بنی فی الارض المشترکۃ بغیر اذن الشریک لہ ان ینقض بناءہ۔ (فتاوٰی کاملیۃ ج ص۵۱ کتاب الشرکۃ)

ومثلہ فی تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۸۸ کتاب الشرکۃ۔

خودرو گھاس مشترک ہوتا ہے

سوال :- ایک مشترکہ زمین جو کسی کی خاص ملکیت نہیں، گاؤں والوں میں سے ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ اس مشترکہ زمین میں اُگے ہوئے خودرو گھاس کو رہن پر دے دے یا فروخت کرے تو کیا اس شخص کا یہ اقدام شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- خودرو گھاس خواہ مملوکہ زمین میں ہو یا غیر مملوکہ زمین میں، ہر حال میں وہ کسی کی ملک نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ بالا شخص کا یہ اقدام شرعاً درست نہیں ۔

لما ورد فی الحدیث : المسلمون شرکاء فی ثلٰث فی الماء والکلاء والنار ۔

(سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۳۶ کتاب البیوع ۔ باب فی منع الماء)

آمدن واخراجات میں شریک بھائیوں کی کمائی کا حکم

سوال :- دو بھائی آپس میں آمدنی اور گھر کے تمام اخراجات میں شریک تھے، ان میں سے ایک بھائی انگلینڈ چلا گیا وہاں اس نے کافی مال جمع کیا اور واپس آکر ایک مکان خریدا، اس بھائی کی عدم موجودگی میں دوسرا بھائی گاؤں میں ہی محنت مزدوری کر کے خود بھی کھاتا رہا اور اس کے اہل وعیال کو بھی کھلاتا رہا، لیکن جس بھائی نے مکان خریدا ہے اب وہ اس میں دوسرے بھائی کے حصہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے، تو کیا شرعاً یہ دونوں بھائی اس مکان میں برابر کے شریک ہوں گے یا جس بھائی نے خریدا ہے اس کا ہی ہوگا ؟

الجواب :- مذکورہ صورت میں جو شرکت ہے وہ شرکتِ فاسدہ ہے، لہٰذا اگر دونوں بھائیوں کے اموال آپس میں غیر متمیز ہوں تو ان میں مساوی انداز میں تقسیم ہوں گے اور اگر دونوں کے اموال متمیز ہوں تو ہر ایک بھائی اپنے اپنے حصے کا حقدار ہوگا، اور اس بھائی کے مکان میں دوسرے بھائی کو حصہ دینا کوئی شرعی امر نہیں بلکہ محض

---

[1] وقال العلامة سلیم رستم باز اللبنانی رحمه الله : الماء والکلاء والنار مباحة والناس فی هذه الاشیاء الثلاثة شرکاء ۔

(شرح مجلة الاحکام، المادة ۱۲۳۴ ص ۶۷۹ الکتاب العاشر)

ومثله فی الهدایة ج ۴ ص ۴۸۵ کتاب احیاء الموات ۔

رواجی امر ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ : یؤخذ من ھذا ما افتی بہ فی الخیریۃ فی زوج امرأۃ وابنھا اجتمعا فی دار واحدۃ واخذ کل منھا یکتسب علی حدۃ ویجمعان معاً کسبھما ولا یعلم التفاوت ولا التساوی ولا التمییز فاجاب بانہ بینھما سویۃ۔
(رد المحتار ج۳ ص۳۲۵ کتاب الشرکۃ۔ فصل فی الشرکۃ الفاسدۃ) [1]

مشترکہ ندی سے انتفاع کا حکم

سوال:۔ ایک ندی دو آدمیوں کے مابین مشترکہ ہے، ان میں سے ایک شریک دوسرے کو منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ اس ندی سے نفع نہیں اٹھا سکتے اور میں آپ کا اس میں حق نہیں مانتا، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ شریک اپنے ساتھی کی اجازت کے بغیر اس ندی سے نفع حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مذکورہ ندی کا مشترک ہونا مبرہن اور مسلم ہو تو ان شرکاء میں سے ہر ایک اپنے اپنے حصہ میں مستقل تصرف کرنے کا مالک ہے اور ملکِ مشترک میں دوسرے ساتھی کی اجازت سے تصرف کرنے کا مجاز ہے۔

قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: لاحد اصحاب الحصص التصرف مستقلاً فی الملک المشترک باذن الآخر لکن لا یجوز لہ ان یتصرف تصرفاً مضراً بالشریک۔
(شرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۰۷۱ ص۶۰۱ الکتاب العاشر)

---

[1] وقال الشیخ محمد کامل الطرابلسیؒ: فاذا کان سعیھم واحداً ولم یتمیز ما حصلہ کل واحد منھم بعملہ یکون ما جمعوہ مشترکاً بینھم بالسویۃ وان اختلفوا فی العمل والرأی کثرۃ وصواباً کما افتی بہ فی الخیریۃ وما اشترلہ احدھم لنفسہ یکون لہ ویضمن حصۃ شرکائہ من ثمنہ اذ دفعہ من المال المشترک۔ (فتاوی کاملیۃ ج۱ ص۵ کتاب الشرکۃ)
وَمِثْلُہٗ فی تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۹۶ کتاب الشرکۃ۔

[2] وقال العلامۃ ابن عابدینؒ: ان کل واحد من الشریکین شرکۃ ملک ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبہ کغیر الشریک من الاجانب الا باذنہ لعدم تضمنھا الوکالۃ۔
(تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۸۸ کتاب الشرکۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۲ ص۵۹۹ کتاب الشرکۃ۔

مزدور جو کچھ کمائے وہ اسی کی ملکیت خاص ہوتا ہے

سوال:۔ ایک آدمی کے پانچ بیٹے ہیں جن میں سے ایک بیرونِ ملک چلا گیا اور وہاں چند سال مزدوری کرنے کے بعد پھر اپنے وطن واپس آگیا اور کچھ مدت گزرنے کے بعد اپنے بھائیوں اور والدین سے جدا ہوگیا، اس موقع پر اس نے یہ کہا کہ جو کچھ میں نے کمایا ہے وہ خاص میری ملکیت ہے جبکہ اس کے بھائیوں نے یہ کہا کہ نہیں تمہاری کمائی میں ہمارا بھی حصہ بنتا ہے تو کیا اس کے دوسرے بھائیوں کا یہ کہنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعت کی رو سے کسی مزدور کی کمائی ہوئی رقم اُسی کی ملکِ خاص ہوتی ہے اور اُس کی اِس کمائی میں کوئی بھی شریک نہیں، کیونکہ کمائی اور مزدوری کمانے والے کی ملکِ خاص ہوتی ہے، البتہ اُس پر مشترکہ مال سے جو کچھ خرچ کیا گیا ہو تو وہ واپس لیا جاسکتا ہے۔

لما قال الشیخ محمد کامل الطرابلسیؒ: وان اختلفوا فی العمل والرأی کثرۃ وصواباً کما افتی بہ فی الخیریۃ وما اشتراہ احدھم لنفسہ یکون لہٗ ویضمن حصۃ شرکائہ من ثمنہ اذا دفعہ من المال المشترک۔ (فتاویٰ کاملیۃ ج۱ ص۸۵ کتاب الشرکۃ)[1]

اولاد اور باپ کی مشترکہ تجارت میں اولاد کا حصّہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میری کپڑے کی دوکان ہے جس کا کل سرمایہ میرا اپنا ہے دوکان میں نے پچاس ہزار روپے کے سرمائے سے شروع کی اور اب دوکان کا سرمایہ دس لاکھ روپے تک بڑھ گیا ہے، اس کاروبار کو ترقی دینے میں میرے دو بیٹوں نے بھی میرا ساتھ دیا ہے، دونوں بیٹے اس وقت سے لے کر آج تک اکٹھے رہے ہیں، اب ان میں سے ایک بیٹا جدا ہونا چاہتا ہے اور مجھ سے اس دوکان میں حصہ داری کا مطالبہ کرتا ہے۔ آنجناب سے شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل مطلوب ہے؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق آپ کے بیٹے کاروبار میں آپ کے معاون تھے نہ کہ شریک، اس لیے ان میں سے کسی ایک بیٹے کو بھی دوکان میں حصہ داری کے دعویٰ کا

---

[1] لما قال العلامۃ سلیم رستم بازؒ: وما اشتراہ احدھم لنفسہ یکون لہٗ ویضمن شرکائہ من ثمنہ اذا دفعہ من المال المشترک وکل ما استدانہ احدھم یطالب بہ وحدہٗ۔
رشرح مجلۃ الاحکام۔ المادۃ ۱۳۶۱ ص۷۲۵ الکتاب العاشر)
ومثلہٗ فی تنقیح الحامدیۃ ج۱ ص۹۶ کتاب الشرکۃ۔

شرعاً کوئی حق نہیں، اور اگر آپ اس بیٹے کو کچھ بھی نہ دیں تو شرعاً آپ پر کوئی گناہ نہیں تاہم بہتر یہ ہے کہ اس بیٹے کو بھی احساناً کچھ نہ کچھ دے دیا جائے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: ابٌ وابنٌ یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ ولم یکن لھما شیٔ ثم اجتمع لھما مال یکون کلہ للاب اذا کان الابن فی عیالہ واجاب خیر الرملی عن سوال آخر بقولہ حیث کان من جملۃ عیالہ والمعینین لہٗ فی اُمورہٖ واحوالہٖ فجمیع ما حصلہ بکدہٖ وتعبہ فھو ملک خاص لابیہ لاشیٔ لہٗ فیہ حیث لم یکن لہٗ مالٌ ولو اجتمع لہٗ بالکسب جملۃ اموال لانہ فی ذٰلک لابیہ معین۔ (فتاویٰ حامدیۃ ج۲ ص۱۸ کتاب الشرکۃ)[۱]

اس صورت میں وہ سب باپ ہی کا خرچ ہوا اس سے زیادت کے رجوع کا حق کسی کو بھی نہیں۔ نیز اولاد کو اپنے سے علیحدہ کرنے کے لیے زید کو اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ اس سرمایہ کو ان میں تقسیم کرے بلکہ اولاد بالغین کو بدون کچھ سرمایہ دیئے بھی الگ کر سکتا ہے اور اگر ان کو کچھ سرمایہ دے کر الگ کرے تو یہ اچھا ہے اور اس صورت میں سب کو برابر سرمایہ دے اور نابالغوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے بلوغ سے پہلے ان کو الگ نہیں کر سکتا۔ (امداد الاحکام ج۳ ص۳۱۶ کتاب الشرکۃ)

---

[۱] قال العلامۃ ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) زید نے جو اپنے لڑکوں کو کاروبار میں اپنے ساتھ شریک کیا ہے تو اس کی صورت کیا تھی؟ آیا زید نے ہر بیٹے کو کچھ رقم یا سرمایہ ہبۃً دیدیا تھا، پھر وہ رقم یا سرمایہ کاروبار میں لگا کر لڑکا شریکِ تجارت ہوا یا باپ نے کسی بیٹے کو کچھ رقم ہبۃً نہیں دی نہ سرمایہ دیا اور نہ بیٹوں کے پاس اپنی ذاتی رقم یا سرمایہ تھا جس کو ملا کر وہ کاروبار میں شریک ہوئے ہوں بلکہ بیٹے ویسے ہی بدون رقم دیئے کام کرنے لگے اور اس شرکت سے کام کو ترقی ہوئی۔ پس صورتِ اُولیٰ میں تو یہ البتہ شرکت ہے اور ہر شخص اپنی رقم وسرمایہ کی نسبت سے اس وقت اصل ونفع میں مستحق ہوگا۔ اور صورتِ ثانی میں شرکت ہی نہیں بلکہ کل سرمایہ زید کی ملک ہے اور سب لڑکے اس کے معین شمار ہوں گے اور جس لڑکے پر زیادہ خرچ ہوا

کتاب
المضاربة

کتاب المضاربۃ
(مضاربت کے احکام و مسائل)

مضاربت کی حقیقت

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! مضاربت کی کیا حقیقت ہے؟

الجواب:۔ مضاربت رب المال اور مضارب کے باہمی اشتراک کا وہ فائدہ مند معاملہ ہے جس میں رب المال کو اس کے مال کی وجہ سے اور مضارب کو محنت کی وجہ سے حصہ دیا جاتا ہے، ایسی حالت میں دونوں کے لیے اس معاہدہ کی پابندی ضروری ہوتی ہے جو شرعی قواعد وضوابط کی روشنی میں ان کے درمیان طے پایا ہو۔

قال العلامۃ ابوالبرکات النسفیؒ: ھی شرکۃ بمال من جانب والمضارب امین وبالتصرف وکیل وبالربح شریک وبالفساد اجیر وبالخلاف غاصب وباشتراط کل الربح له مستقرض وباشتراطه لرب المال مستبضع وانما تصح بما تصح به الشرکۃ۔

(کنزالدقائق ص۳۳۹ کتاب المضاربۃ) [1]

مضاربت میں منافع کی تعیین کرنا

سوال:۔ عمرو نے بکر کو دس ہزار روپے تجارت کے لیے دیئے اور بکر پر شرط عائد کردی کہ آپ مجھے سالانہ ایک ہزار روپے دیں گے بقایا منافع جتنا بھی ہوگا وہ آپ کا ہوگا، تو کیا ایسا عقد کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مضارب یا رب المال کا کسی خاص مقدار میں منافع کا اپنے لیے متعین کرنا خواہ ماہانہ ہو یا سالانہ، مفسدِ عقد ہے، اس لیے ایسی صورت میں مضاربت فاسد رہے گی۔

قال العلامہ ابوبکر الکاسانیؒ:۔ ومنها ان یکون المشروط لکلِّ واحدٍ منهما

---

[1] قال العلامۃ القدوری رحمه الله:۔ المضاربۃ عقد یقع علی الشرکۃ فی الربح بمال من احد الشریکین وعمل من الآخر ولا تصح المضاربۃ الا بالمال الذی بیّنا ان الشرکۃ تصح به۔ (مختصر القدوری، کتاب المضاربۃ)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایۃ ج۳ ص۲۵۶ کتاب المضاربۃ۔

من المضارب ورب المال من الربح جزءاً شائعاً نصفاً او ثلثاً او ربعاً فان شرطا عدداً مقدراً بان شرطا ان یکون لاحدهما مائة درهم من الربح او اقل او اکثر والباقی للآخر لا یجوز والمضاربة فاسدة۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۸۵ فصل واما شرائط الرکن فبعضها یرجع الخ) [1]

عقدِ مضاربت میں رأس المال کا نقدی ہونا ضروری ہے

سوال:۔ زید نے عمرو کے ہاتھ بیس ہزار روپے کا مال فروخت کیا اور قیمت وصول نہیں کی بلکہ قرض رہنے دیا، بعد میں دونوں میں اس طرح کا عقد ہو گیا کہ زید نے عمرو سے کہا کہ اُن بیس ہزار روپوں کے ساتھ آپ تجارت کریں جو میرے آپ کے ذمے قرض ہے اور منافع کی صورت میں اولاً عمرو زید کو دو ہزار روپے ادا کرے گا اور بقایا رأس المال سے جو بھی نفع آئے گا وہ دونوں کے درمیان برابر برابر تقسیم ہو گا، کیا مضاربت کی یہ صورت شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ مضاربت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ عقدِ مضاربت میں مال کا نقد دینا ضروری ہے نہ کہ قرض کا مال، البتہ اس طرح کا عقد کرنا کہ رب المال کا کسی آدمی کے ذمے قرض ہو اور مضارب کو اجازت دے دے کہ آپ اُس قرض کو وصول کر کے اُس سے تجارت کریں تو یہ صورت درست ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ:۔ واما المضاربة بدینٍ فان علی المضارب لم یجز وان علی ثالث جاز وکره۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۵ ص ۶۴۷ کتاب المضاربة) [2]

---

[1] وفی الهندیة: ومنها ان یکون نصیب المضارب من الربح معلوماً علی وجه لا تنقطع به الشرکة فی الربح کذا فی المحیط۔ فان قال علی ان لك من الربح مائة درهم او شرط مع النصف او الثلث عشرة دراهم لا تصح المضاربة کذا فی محیط السرخسی۔ (الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۲۸۷ کتاب المضاربة۔ الباب الاول فی تفسیرها ورکنها وشرائطها)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج ۷ ص ۲۶۴ کتاب المضاربة۔

[2] وفی الهندیة: (ومنها) ان یکون رأس المال عیناً لا دیناً فالمضاربة بالدیون لا تجوز حتی ان من کان له علی آخر الف درهم فامره صاحب الدین ان یعمل بها مضاربة لا تجوز المضاربة کذا فی النهایة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۴ ص ۲۸۶ کتاب المضاربة۔ الباب الاول فی تفسیرها ورکنها وشرائطها)۔ وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص ۲۵۸ کتاب الصلوٰة۔

مضاربت کے نفقہ کا حکم

سوال:۔ دورانِ تجارت مضارب کی خوراک و پوشاک کا خرچہ کس کی ذمہ داری ہے؟

الجواب:۔ مضارب مال کی تجارت اپنے شہر میں کرے تو اُس کی خوراک وغیرہ کا خرچہ مالِ مضاربت سے نکالنا جائز نہیں، ہاں اگر اپنے شہر سے باہر تجارت کرے تو خوراک و پوشاک کا خرچہ اور دیگر ضروریاتِ زندگی مالِ مضاربت سے پورا کرنے کی اجازت ہے۔

قال العلامۃ ابوبکر الکاسانیؒ:۔ واما تفسیر النفقۃ التی فی مال المضاربۃ فالکسوۃ والطعام والادام والشراب واجر الاجیر وفراش ینام علیہ وعلف دابتہ التی یرکبھا فی سفرہ ویتصرف فی حوائجہ وغسل ثیابہ ودھن السراج والحطب ونحو ذلک ولاخلاف بین اصحابنا فی ھذہ الجملۃ لان المضارب لا بد لہ منھا فکان الاذن ثابتاً من رب المال دلالۃ۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۰۶ فصل واما بیان حکم المضاربۃ) [۱]

مضاربت میں خسارہ کی ذمہ داری کا مسئلہ

سوال:۔ مضارب کی محنت کے باوجود اگر معاملہ فائدہ مند نہ رہے اور مضارب کو آئے دن ناکامی کا سامنا کرتے ہوئے کاروبار میں نقصان ہو رہا ہو جس کے نتیجے میں اصل رقم سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں تو ایسے حالات میں تاوان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

الجواب: مضاربت رب المال اور مضارب کے باہمی اشتراکِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں ربّ المال کے ساتھ مضارب کی محنت شامل ہوتی ہے، نقصان کی صورت میں دونوں کا متاثر ہونا ظاہر ہے، اگر ربّ المال کو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے تو مضارب کی بھی دن رات کی محنت ضائع ہوتی ہے، مالی نقصان کا بوجھ مضارب پر ڈالنا بے انصافی کے مترادف ہے اسی لیے مضارب پر مالی نقصان کی ذمہ داری کی شرط کرنا مفسد ہے، جو نقصان ہو وہ پہلے منافع

---

[۱] قال العلامۃ طاھر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: وفی الاصل المضارب ما دام یعمل فی المصر فنفقتہ فی مالہ وان کان المصر کبیرا او ھو قائم فی جانب آخر للتجارۃ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص۱۸۹ الفصل الثالث فی نفقۃ المضارب ومؤنتہ)

وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام لرستم باز، مادۃ ۱۴۱۷ الفصل الثالث فی احکام المضاربۃ۔

سے منہا کیا جائے گا، اگر اس سے بھی متجاوز ہو تو پھر راس المال سے منہا کیا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: وفی الجلالیة کل شرط یوجب جهالة فی الربح او یقطع الشرکة فیه یفسدها والا بطل الشرط کشرط الخسران علی المضارب۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص۶۴۸ کتاب المضاربة) [1]

مضاربت میں فریقین منافع کے حقدار کب بنتے ہیں

سوال: رب المال اور مضارب کے درمیان معاہدہ ہوا کہ مضارب دوسرے شہروں سے مال فروخت کرے گا اور منافع نصف نصف ہوگا، اب رب المال نے مضارب سے مال فروخت ہونے سے پہلے کہا کہ یہاں کے بھاؤ کے حساب سے درآمد کردہ مال میں بیس ہزار روپے منافع ہوتا ہے لہٰذا آپ مجھے دس ہزار روپے دے دیں، تو کیا رب المال کا ایسا مطالبہ کرنا شرعاً درست ہے؟

الجواب: جب تک منافع کا ظہور نہ ہو جائے رب المال کو ایسا مطالبہ کرنا جائز نہیں اور منافع مال بیچنے کے بعد ہوتا ہے، اور اگر فریقین کے مابین اس طرح کا معاہدہ ہو چکا ہو تو یہ مضاربت فاسدہ ہے اس کو فوراً توڑ دینا چاہیئے۔

قال العلامة ابن نجیمؒ: واشار المصنف الی ان للمضارب ان ینفق علی نفسه من مال المضاربة فی السفر قبل الربح والی انه لو لم یظهر الربح لاشئ علی المضارب۔

(البحر الرائق ج ۷ ص۲۷ کتاب المضاربة) [2]

---

[1] قال العلامة سلیم رستم بازرحمہ اللہ: الضرر والخسار یعود فی کل حال علی رب المال واذا شرط کونه مشترکا بینه وبین المضارب فلا یعتبر ذلك الشرط۔ (شرح مجلة الاحکام مادة ۱۴۲۸ ص۷۵۷ الفصل الثالث فی بیان احکام المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج ۳ ص۲۵۸ کتاب المضاربة۔

[2] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: فاذا ظهر الربح فهو شریکه بحصته من الربح۔ (خلاصة الفتاوی ج ۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربة۔ الفصل الاول فی المقدمة)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۵ ص۶۵۵ کتاب المضاربة۔

حکومتی جرمانہ رب المال پر آئے گا یا مضارب پر

سوال:۔ زید نے عمرو کو دس ہزار روپے افیون کی تجارت کے لیے دیئے، عمرو افیون خرید کر بڑی احتیاط کے ساتھ آ رہا تھا کہ راستے میں پولیس نے اُسے گرفتار کر کے مال بھی ضبط کر لیا اور تین ہزار روپے جرمانہ بھی لے لیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ تین ہزار روپے رب المال (زید) کے ذمے ہے یا مضارب (عمرو) کے ذمے، جبکہ افیون کی تجارت حکومت کی طرف سے سخت جرم ہے؟

الجواب:۔ نقصانِ جرم کی اگر مالک نے ذمہ داری قبول کر لی ہے تو مالک پر ضمان لازم ہے ورنہ مضارب پر آئے گا۔ البحر الرائق جلد ۲ ص۲۶۷ میں ہے، ولا رُجُوع له فیما انفقه فی الخصومة لتقاضی الدَّیْن۔ جب دَین (قرض) کے مقدمے کا خرچ مالک پر نہیں آتا ہے تو جرم کا ضمان کس طرح مالک پر آئے گا۔

وفی الھندیة: الاصل ان ما یفعله المضارب ثلاثة انواع نوع یملکه بمطلق المضاربة وھو ما یکون من باب المضاربة وتوابعھا ومن جملته التوکیل بالبیع والشراء للحاجة والرھن والارتھان والاجارة والاستئجار والایداع والابضاع والمسافرة ونوع لا یملکه بمطلق العقد ویملکه اذا قیل له اعمل برأیك وھو ما یحتمل أن یلحق به فیلحق به عند وجود الدلالة وذلك مثل دفع المال مضاربة اوشرکة الی غیره وخلط مال المضاربة بماله او بمال غیره ونوع لا یملکه لا بمطلق العقد ولا بقوله اعمل برأیك الا ان ینص علیه رب المال وھو کالاستدانة۔ (الفتاوی الھندیة ج۴ ص۲۹۱ الباب الرابع فیما یملك المضارب من التصرفات ولا یملك)[1]

---

[1] قال العلامة برھان الدین المرغینانی رحمه الله: والاصل ان ما یفعله المضارب ثلاثة انواع نوع یملکه بمطلق المضاربة وھو ما یکون من باب المضاربة وتوابعھا الخ (الی ان قال) ونوع لا یملکه لا بمطلق العقد ولا بقوله اعمل برأیك (الا ان) ینص علیه ربّ المال۔

(الھدایة ج۳ ص۲۲۵ فصل فیما یفعله المضارب)

وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۸۹ الفصل الثانی فیما یملك المضارب۔

دوکان کے اخراجات مضارب پر عائد کرنا

سوال:۔ رب المال اور مضارب کے درمیان ایسا معاہدہ کرنا کہ نفع نقصان میں باہم شریک ہوں یعنی ایک تہائی رب المال کا اور دو تہائی مضارب کا ہوگا، اس کے علاوہ دوکان کے اخراجات بھی مضارب کے ذمے ہوں گے، کیا ایسا معاہدہ کرنا شرعاً جائز ہے؟

الجواب:۔ دوکان کے اخراجات رأس المال سے ادا کرنا جائز ہیں البتہ مضارب کو تاوان میں شریک کرنا ناجائز ہے اور مضارب پر تاوان کی ادائیگی مشروط کرنا بھی باطل ہے، تاوان کی صورت میں اگر مضارب قصور وار نہ ہو تو منافع سے منہا کیا جائے گا اور اگر منافع سے پوری ادائیگی ممکن نہ ہو تو رأس المال سے ادا کیا جائے گا۔

قال العلامة سلیم رستم باز: واذا تلف بعض مال المضاربة یحسب فی اول الامر من الربح ولا یسری الی رأس المال واذا تجاوز مقدار الربح وسری الی رأس المال فلا یضمنه المضارب سواء کانت المضاربة صحیحة او فاسدة۔

شرح مجلة الاحکام۔ المادة نمبر ۱۴۲۷ ص۷۵۶/۷۵۷)[۱]

مضاربت کے قواعد وضوابط پر عرف کا اثر

سوال:۔ مروجہ کرنسی نوٹ مضاربت کے لیے کافی ہیں یا سونا چاندی خرید کر دینا ضروری ہے؟

الجواب:۔ مروجہ کرنسی نوٹ چونکہ ثمن عرفی کے حکم میں ہیں اور معاشرہ میں ان سے خرید وفروخت کی جاتی ہے اس لیے مضاربت کے لیے ان کا دینا ہی کافی ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: المضاربة لا تجوز بغیر الدراھم والدنانیر مکیلاً کان او موزوناً او عروضاً فی قول ابی حنیفة وابی یوسف رحمھما اللہ تعالیٰ وقال محمد رحمہ اللہ تجوز بالفلوس الرائجة عدداً ولا

---

[۱] قال العلامة المرغینانیؒ: من مال المضاربة فھو من الربح دون رأس المال لان الربح تابع (الی ان قال) فان زاد الھالک علی الربح فلا ضمان علی المضارب لانه امین۔ (الھدایة ج۳ ص۲۶۴ فصل فی العزل والقسمة، کتاب المضاربة)

ومثلهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۶۵۸ فصل فی المتفرقات، کتاب المضاربة۔

تجوز بالذهب والفضة اذا لم تكن مضروبة في رواية الاصل)
(فتاوی خانیة علی هامش الهندية ج ۳ ص۱۶۱ کتاب المضاربة) ^۱

حیوان کو مضاربت میں دینے کا حکم

سوال: مضارب کا رب المال سے جانور لینا بایں شرط کہ میں اس کو پالوں گا اور اس کی نسل پیدا ہونے کی صورت میں موافق شرط تقسیم کریں گے، کیا مضاربت کی یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: حیوان کو مضاربت پر دینا عقد فاسد ہے، ہاں اگر حیوان کو دیتے وقت یہ کہدے کہ اس جانور کو بیچ دو اور اس رقم پر عمل مضاربت کرو تو یہ جائز ہے۔

قال العلامة سليم رستم باز رحمه الله: بشرط ان يكون رأس المال مالا تصح به الشركة فلا يجوز ان يكون العقار والعروض والدين في ذمة رأس مال في المضاربة لكن رب المال اذا اعطى شيئا من العروض الى المضارب وقال بع هذا واعمل بثمنه مضاربة وقبل المضارب وقبض ذلك المال وباعه واتخذ نقود ثمنه رأس المال للتجارة كانت المضاربة صحيحة۔ (مجلة الاحكام، مادة ۱۴۰۹ ص۲۴۵ الفصل الثاني في شروط المضاربة) ^۲

مال مضاربت سے خریدی ہوئی بکری کے دودھ کا حکم

سوال: مضارب نے باجازت رب المال بکری

---

^۱ قال العلامة ابو بكر الحداد اليمني رحمه الله: (قوله ولا يصح المضاربة الا بالمال الذي بينا ان الشركة تصح به) يعني انها لا تصح الا بالدراهم والدنانير فاما الفلوس فعلى الخلاف الذي بيناه في الشركة وهو عند محمد تجوز المضاربة بها وعندهما لا تجوز۔
(الجوهرة النيرة ج ۱ ص۳۵ کتاب المضاربة)
وَمِثْلُهٗ في عيني شرح كنز ص۵۰۲ كتاب المضاربة۔

^۲ وفي الهندية: لو دفع اليه عرضا او عبدا فقال بعه واقبض ثمنه واعمل به مضاربة فباعه بدراهم او دنانير وتصرف فيها جازت المضاربة كذا في محيط السرخسي ۔
(الفتاوى الهندية ج ۴ ص۲۶۸ کتاب المضاربة. الباب الاول في تفسيرها وركنها وشرائطها وحكمها۔
وَمِثْلُهٗ في خلاصة الفتاوى ج ۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربة ۔

خریدی، اب اس کا دودھ مضارب کی ملکیت ہوگی یا کہ رب المال کی؟

الجواب:۔ دودھ، اون وغیرہ تمام کے تمام مالِ مضاربت یا ربح میں داخل ہے، ان کا استعمال بغیر اجازت کے ممنوع ہے۔ ان چیزوں کی قیمت حسب ضابطۂ فقہاء کبھی تو رأس المال میں داخل ہوتی ہے اور کبھی ربح (منافع) ہیں۔

قال العلامة سلیم رستم بازؒ: المضارب امین فرأس المال فی یدہ فی حکم الودیعة اما من حیث تصرفه فی رأس المال فهو وکیل رب المال واذا ربح کان شریکًا فیه۔ (مجلة الاحکام۔ مادة ۱۴۱۳ ص۲۸۷ الفصل الثانی فی احکام المضاربة) [له]

مضارب کا معاہدہ کے خلاف کام کرنا

سوال:۔ زید نے بکر کو بیس ہزار روپے عقدِ مضاربت پر کپڑوں کی تجارت کے لیے دیئے، بکر نے خلافِ معاہدہ تیل کی تجارت شروع کردی اور اس میں خسارہ اٹھانا پڑا، از روئے شرع شریف نقصان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

الجواب:۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے پر نقصان کی تمام ذمہ داری بکر (مضارب) پر عائد ہوتی ہے لہٰذا بکر زید کو تمام رأس المال یعنی بیس ہزار روپے ادا کرے گا۔

وفی الهندیة: ان خص له رب المال التصرف فی بلد بعینه او فی سلعته بعینها تتقید به ولم یجز له ان یتجاوز ذٰلك (الیٰ ان قال) فان اخرج الیٰ غیر ذٰلك البلد فاشترٰی ضمن وکان ذٰلك له وله ربحه۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۲۹۷ الباب السادس فیما یشترط علی المضارب من الشروط) [۲ه]

[له] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: فاذا ظهر الربح فهو شریکه بحصته من الربح۔ (خلاصة الفتاوٰی ج۴ ص۱۸۸ کتاب المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی الجوهرة النیرة ج۱ ص۳۵۰ کتاب المضاربة۔

[۲ه] قال العلامة سلیم رستم بازؒ: اذا خالف المضارب رب المال بعد ما نهاہ بقوله لاتذهب بمال المضاربة الی المحل الفلانی اولاتبع بالنسیئة فذهب بمال المضاربة الیٰ ذٰلك المحل فتلف المال او باع بالنسیئة فهلك الثمن کان المضارب ضامنًا۔

(مجلة الاحکام مادة ۱۴۲۲ ص۲۵۵ الفصل الثالث فی احکام المضاربة)

وَمِثْلُهٗ فی الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۵ ص۶۵۰/۶۵۱ کتاب المضاربة۔

مدرسے کا فنڈ چندہ دہندگان کی اجازت سے مضاربت پر دینا

سوال:۔ کیا مدرسے کا فنڈ بمشورہ متولیان و اراکین مدرسہ مضاربت پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر مدرسے کا فنڈ ضروریات مدرسہ سے زائد ہو تو چندہ دہندگان کی اجازت اور متولیانِ مدرسہ کے مشورہ سے اس سے تجارت کرنا مرخص ہے۔

وفی الهندیة: القیم اذا اشتری من غلة المسجد حانوتاً او داراً ان یستغل ویباع عند الحاجة جاز ان کان ولایة الشراء۔ (الفتاوی الهندیة ج۲ ص۴۶۲ الباب الثانی فی الوقف علی المسجد وتصرف القیم وغیره فی مال الوقف علیه) [1]

مال کی موجودگی میں مضاربت کو ختم کرنے کا حکم

سوال:۔ زید نے خالد کو مضاربت کے لیے ایک لاکھ روپے دیئے اب کچھ وقت گذرنے کے بعد زید اپنے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا ہے جبکہ خالد کے پاس ابھی کچھ مال باقی ہے، تو کیا مال کی موجودگی میں زید اپنی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر عاقدین مضاربت کو ختم کرنا چاہتے ہوں تو جب تک مالِ مضاربت ختم نہیں ہوتا اس وقت تک رب المال اپنے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ نہیں کر سکتا اور نہ مضارب کو معزول کرنے سے اس کے تصرفات ختم ہوں گے۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمه الله: واعلم المضارب بعزله والمال عروض فله ان یبیعها ولا یمنعه العزل من ذلك لأن حقه قد ثبت فی الربح انما یظهر بالقسمة وهی تبتنی علی رأس المال وانما ینض بالبیع۔

(الهدایة ج۳ ص۲۶۷ کتاب المضاربة)

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: الفاضل عن وقف المسجد یشتری مستغلاً للمسجد حانوتاً او داراً۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۲۳ الفصل الرابع فی المسجد واوقافه ومسائله)

ومثله فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۱۳ فصل فی وقف المنقول۔

مضاربت ختم کرنے سے روکنے اور عقدِ مضاربت کیلئے تعین مدت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک دو مسئلوں کی وضاحت مطلوب ہے، مہربانی فرما کر قرآن وسنت کی رو سے جواب عنایت فرمائیں؟

(۱) دو آدمیوں نے مل کر مضاربت کے عنوان سے کاروبار شروع کیا، ان دونوں کا معاملہ چار سال تک جاری رہا، اب ایک ساتھی دوسرے سے جدا ہونا چاہتا ہے جبکہ دوسرے ساتھی کا یہ کہنا ہے کہ جب تک میں اجازت نہ دوں تم مجھ سے جدا نہیں ہوسکتے، کیا واقعی دوسرے ساتھی کو منع کرنے کا اختیار ہے؟

(۲) ان دونوں نے عقد مضاربت کرتے وقت چار سال کی مدت بھی مقرر کی تھی۔ تو کیا مضاربت میں مدت مقرر کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ (۱) عقدِ مضاربت فریقین میں سے جو بھی چاہے اور جس وقت چاہے ختم کر سکتا ہے مگر عقد فسخ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے ساتھی اُس سے مطلع کر دیا جائے۔ لیکن اس فسخ کا اطلاق اس وقت صحیح ہوگا جب مال نقدی کی شکل میں موجود ہو، اگر مال اثاثہ (عروض) کی صورت میں ہو تو پھر مضارب کو اثاثہ فروخت کرنے کا موقع دیا جائے گا تاکہ اصل نفع متعین ہو جائے جس کیلئے عقد ہوا تھا۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: وأما صفة هذا العقد فهو انه عقد غیر لازم ولکل واحد منهما اعنی رب المال والمضارب الفسخ لکن عند وجود شرطه وهو علم صاحبه ویشترط ایضاً ان یکون رأس المال عیناً وقت العقد دراهم او دنانیر حتی لو نهی رب المال المضارب عن التصرف ورأس المال عروض وقت النهی لم یصح نهیه وله ان یبیعها لانه یحتاج الی بیعها بالدراهم والدنانیر لیظهر الربح فکان النهی والفسخ ابطالاً لحقه فی التصرف فلا یملك ذلك وان کان رأس المال دراهم او دنانیر وقت الفسخ والنهی صح الفسخ والنهی۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۰۹ کتاب المضاربة)

(۲) اسی طرح عقدِ مضاربت کیلئے احناف کے ہاں وقت متعین کرنا بھی صحیح ہے۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: ولنا ان المضاربة توکیل والتوکیل یحتمل التخصیص بوقت دون وقت۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص ۹۶ کتاب المضاربة)

لہٰذا اگر صورتِ مسئولہ میں عقدِ مضاربت کا وقت بھی مقرر ہو اور سرمایہ بھی نقدی کی شکل میں ہو تو پھر دوسرے ساتھی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ساتھی کو عقد مضاربت کے فسخ کرنے سے منع کرے یا روکے۔

كتاب
الوكالة
الحوالة

فتقبلها ربها بقبولٍ
حسن وانبتها نباتا
حسناً وكفلها زكريا

قال اجعلني خزائن
الارض اني حفيظ عليم

كتاب الوكالة والكفالة

(وکالت کے احکام و مسائل)

نابالغ کو وکیل بنانا

سوال :۔ مساجد، مدارس یا دوسرے رفاہی کاموں کے لیے چندہ کرتے وقت بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ گھروں سے عورتیں چھوٹے بچوں کو چندہ دے کر بھیجدیتی ہیں، تو کیا ایک نابالغ بچہ والدہ یا والد کی طرف سے کچھ رقم لے جا کر وکیل بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اگر بچہ سمجھدار ہو تو اس کو وکیل بنانے میں کوئی حرج نہیں تاہم مذکورہ صورت میں بچہ وکیل نہیں بلکہ صرف نمائندہ ہے جس کو فقہاء کرام رسول کے نام سے یاد کرتے ہیں اس لیے نابالغ بچوں کے ہاتھ خیرات وغیرہ بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة المرغيناني : قال و يجوز ان يقبل في الهدية والاذن قول العبد والجارية والصبي لان الهدايا تبعث عادة على ايدي هؤلاء وكذا لا يمكنهم استصحاب الشهود على الاذن عند الضرب في الارض والمبايعة في السوق فلو لم يقبل قولهم يؤدي الى الحرج ۔ (الهداية ج ۴ ص ۴۵۲ كتاب الكراهية) [1]

وکالت میں علم ہونا ضروری ہے

سوال :۔ بعض علاقوں میں نکاح پڑھاتے وقت لڑکی سے باقاعدہ اجازت لینے کی بجائے کسی ایسے شخص کو وکیل مقرر کر کے ایجاب و قبول کرایا جاتا ہے کہ جس کے بارے میں لڑکی کو علم تک نہیں ہوتا ہے، کیا کسی ایسے شخص کے ایجاب و قبول کو اعتبار دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب :۔ کسی کا وکیل بننے کے لیے مؤکل کی طرف سے باقاعدہ اجازت کا ہونا

---

[1] قال العلامة الحصكفي : و يقبل قول المملوك ولو انثى والصبي في الهدية سواء اخبر باهداء المولى غيره او نفسه والاذن سواء كان بالتجارة او بدخول الدار ۔ قال ابن عابدين تحته قال في المنح بان قال عبد او جارية او صبي هذه هدية اهداها اليك سيدي او ابي ..... انما يقبل قول هؤلاء فيها لان الهدية تبعث عادة على ايدي هؤلاء ۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۴۵ كتاب الكراهية)

ضروری ہے، صورتِ مذکورہ میں ایسا نکاح نکاحِ فضولی کے حکم میں ہے، اگر لڑکی علم ہوجانے کے بعد اجازت دے دے تو نکاح منعقد ہوگا ورنہ نہیں۔

لما قال العلامة الکاسانیؒ: واصل هٰذا ان تصرفات الفضولی التی لها مجیز حالة العقد منعقدة موقوفة علی اجازة المجیز من البیع والاجارة والنکاح والطلاق ونحوها فان اجاز ینفذ والا فیبطل۔ (بدائع الصنائع ج ۵ ص۱۴۸ کتاب الوکالة۔ الفصل الثالث)[1]

نکاح میں نابالغ کی وکالت کا حکم

سوال:۔ ہمارے علاقے میں رواج ہے کہ شادی کے وقت جب نکاح پڑھایا جاتا ہے تو لڑکی سے اجازت لینے کے لیے کسی نابالغ لڑکے کو بھیجا جاتا ہے اور پھر اس لڑکے کا والد یا کوئی دوسرا رشتہ دار وکیل بن کر ایجاب وقبول کر لیتا ہے، تو کیا ایسی وکالت از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً وکالت کے لیے وکیل کا عاقل وبالغ ہونا ضروری ہے بنابریں نابالغ لڑکے کی وکالت درست نہیں ہے، صورتِ مسئولہ میں نابالغ لڑکا چونکہ اخبار عن الوکالت کرتا ہے اس لیے لڑکے کا یہ اخبار عن الوکالت درست ہوتا ہے، اور اسی طرح یہ لڑکا رسول کے حکم میں ہے اور رسالت میں احکام مرسل کو راجع ہوتے ہیں نہ کہ رسول کو۔

قال العلامة محمد بن محمود الاستروشنیؒ: والحاصل ان الوکالة تثبت باخبار رجل واحدٍ حراً کان عبداً عدلاً کان اوفاسقاً صبیاً او بالغاً۔ (جامع احکام الصغار علی هامش جامع الفصولین ج ۱ ص۲۸۰ مسئلة الوکالة)[2]

توکیل میں فریقِ مخالف کی رضامندی کا حکم

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کرنا چاہے تو

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: وفی کل موضع لاینفذ فعل الوکیل فالعقد موقوف علی اجازة المؤکل۔ (رد المحتار ج ۲ ص۳۴۴ کتاب الکفاءة)

[2] وقال العلامة سلیم رستم بازؒ: تعود حقوق العقد فی الرسالة الی المرسل ولا تتعلق بالرسول اصلاً۔ (شرح المجلة الاحکام۔ م ۱۴۶۲ ص۷۸۳ کتاب الوکالة)

کیا اس میں فریقِ مخالف کی رضامندی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ وکیل مؤکل کا نمائندہ ہوتا ہے اور یہ اس کا ذاتی حق ہے، اس لیے توکیل کا جواز فریقِ مخالف کی رائے پر موقوف نہیں۔ تاہم امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وکیل کے ذریعہ کسی حق کے لزوم کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تقرری میں فریقِ مخالف کی رائے شامل ہو جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک اس کی ضرورت نہیں۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ:۔ قال ابوحنیفہ رحمہ اللہ لا یجوز التوکیل بالخصومة من غیر رضاء الخصم الا ان یکون المؤکل مریضاً او غائباً مسیرة ثلاثة ایام فصاعداً وقالا یجوز التوکیل بغیر رضاء الخصم وهو قول الشافعی رحمہ اللہ ولا خلاف فی الجواز انما الخلاف فی اللزوم۔ (الهدایہ ج۳ ص۱۷۷ کتاب الوکالة) [1]

وکیل سے رقم ضائع ہونے کی صورت میں ذمہ دار کون ہوگا

سوال:۔ کسی چیز کی خریداری پر مقرر کردہ شخص سے اگر رقم گم ہو جائے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ کیا وکیل اس مال کا ضامن ہوگا یا سارا نقصان مؤکل کے ذمے آئے گا؟

الجواب:۔ کسی چیز کی خریداری پر مقرر کردہ شخص سے رقم اگر مطلوبہ چیز خریدنے کے بعد گم ہو جائے اور بائع کو ابھی روپے نہ دیئے ہوں تو اس کی ذمہ داری مؤکل پر عائد ہوگی اور وہ وکیل پر رجوع کا حق نہیں رکھتا ہے، اور اگر مؤکل نے وہ چیز خریدنے کے بعد رقم وکیل کو دی ہو اور بائع کو دینے سے قبل وہ گم ہو جائے تو اس کی ذمہ داری وکیل پر عائد ہوگی۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: اذا رفع الثمن الی انسان الف درهم فأمره ان یشتری بها جاریة فاشتری ثم هلك ثمن قبل ان ینقض البائع یهلك من مال الآمر فان رفع الآمر الالف الی الوکیل بعد

---

[1] وقال العلامة سلیم رستم باز اللبنانیؒ: لکل من المدعی والمدعیٰ علیہ ان یوکل من شاء بالخصومة ولا یشترط رضاء الآخر۔ (شرح المجلة الاحکام۔ م۱۵۱۶ ص۸۲۰ الفصل الخامس فی الوکالة بالخصوم)

ومثلہ فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۵۴ الفصل الرابع فی الوکالة بالبیع۔

ما اشتری فهلك قبل ان ینقض البائع یهلك من مال المامور ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۵۹ الفصل الرابع فی الوکالة بالشراء) ؎۱

وکیل پر ضمان کا حکم

سوال :۔ وکیل کا مبیعہ خریدنے کے بعد اگر مبیعہ راستہ میں کہیں ضائع ہو جائے تو یہ کس کا نقصان متصور ہوگا؟ وکیل یا مؤکل کا؟

الجواب :۔ وکیل چونکہ مؤکل کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ تمامتر ذمہ داری مؤکل کے فائدے کے لیے اٹھاتا ہے اس لیے مبیعہ کی ہلاکت کا نقصان مؤکل کو اٹھانا پڑے گا۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ : فان هلك المبیع فی یدہ قبل حبسه هلك من مال المؤکل ولم یسقط الثمن لان یدہ کید المؤکل فاذا لم یحبسه یصیر المؤکل قابضًا بیدہ ۔ (الهدایة ج۳ ص۱۸۱/۱۸۲ کتاب الوکالة بالبیع والشراء) ؎۲

وکیل کا مدعی پر اقرار کرنا

سوال :۔ اگر مدعیٰ علیہ کی طرف سے وکیل نے نمائندگی کرتے ہوئے مدعی کا حق تسلیم کر لیا لیکن مدعیٰ علیہ اب بھی اس سے انکار کر رہا ہے ، تو کیا وکیل کا کسی کے حق پر اقرار کرنا مؤکل (مدعیٰ علیہ) کے حق میں لازم متصور ہوگا یا نہیں ؟

الجواب :۔ وکیل کا کسی کی نمائندگی کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف مؤکل کے دنیاوی مفادات کا تحفظ کرے بلکہ شرعی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اسکے جائز حق کے بارے

؎۱ وقال العلامة ابن نجیم رحمه الله : ولم یذکر المؤلف هنا حکم ما اذا وکله بشراء شئ ودفع الثمن الیه فهلك فی یدہ قال فی البزازیة وفی جامع الفصولین دفع الیه الفا لیشتری به فاشتری وقبل ان ینقدہ للبائع هلك فمن مال الآمر وان اشتری ثم نقدہ المؤکل فهلك الثمن قبل دفعه الی البائع عند المؤکل یهلك من مال الوکیل ۔

(البحر الرائق ج۷ ص۱۵۶ باب الوکالة بالبیع والشراء)

؎۲ وقال العلامة ابن نجیمؒ : فلو هلك فی یدہ قبل حبسه هلك من مال المؤکل ولم یسقط الثمن لان یدہ کید المؤکل فاذا لم یحبس یصیر المؤکل قابضًا بیدہ ۔

(البحر الرائق ج۷ ص۱۵۶ باب الوکالة بالبیع والشراء)

ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۱۵۸ الفصل الخامس فی الوکالة بالشراء ۔

میں اقرار بھی کر سکتا ہے، اس لیے مذکورہ صورت میں وکیل کا اقرار کرنا مدعیٰ علیہ کے حق میں لازم متصور ہوگا بشرطیکہ یہ اقرار قاضی کے حضور میں ہو لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ حکم عام ہے خواہ قاضی کے حضور میں ہو یا کسی دوسری محفل میں ہو۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا اقر الوکیل بالخصومة علی مؤکله عند القاضی جاز اقراره علیه ولا یجوز عند غیر القاضی عند ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله استحساناً الا انه یخرج من الوکالة وقال ابو یوسفؒ یجوز اقراره علیه وان اقر فی غیر مجلس القضاء۔ (الهدایة ج ۳ ص ۱۹۵ باب الوکالة بالخصومة والقبض) [1]

توکیل بالنکاح میں شہادت ضروری نہیں

سوال:۔ لڑکی کی طرف سے نکاح کے معاملہ میں وکیل مقرر کرنے کے لیے دو آدمی بھیجے جاتے ہیں جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ فلاں عورت نے اس کو وکیل مقرر کیا ہے، ایسی حالت میں اگر ایک آدمی اجمالی گواہی پر اکتفاء کرے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ توکیل شہادت پر موقوف نہیں بلکہ وکیل کو جب باعتماد ذرائع سے وکالت کی خبر پہنچے تو وکیل مؤکل کے لیے تصرف کر سکتا ہے، صورت مذکورہ میں ایک وکیل کا بیان ہی کافی ہے تاہم اگر دونوں گواہی دیدیں تو مؤکل کو کسی وقت بھی انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: واعلم انه لایشترط الشهادة

---

[1] وقال العلامة ابن نجیمؒ: ولو اقر الوکیل بالخصومة عند القاضی صح والا لا ان اقر علی مؤکله عند غیر القاضی لا یصح عندهما استحساناً وخرج به عن الوکالة وصحح ابو یوسفؒ اقراره مطلقاً وابطله زفر مطلقاً وهو القیاس لکونه ماموراً بالخصومة وهی منازعة والاقرار ضدها لانه مسالمة والامر بالشئ لایتناول ضده ووجه الاستحسان ان التوکیل صحیح وصحته تتناول مایملك وذلك مطلق الجواب دون احدهما عیناً فیصرف الیه تحریاً للصحة۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۱۸۱ باب الوکالة بالخصومة والقبض)
وَمِثْلُهٗ فی خلاصة الفتاوی ج ۴ ص ۱۰۱ کتاب الدعوی، الفصل الخامس۔

علی الوکالۃ بالنکاح ۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۳۵۲ کتاب النکاح، باب الاولیاء الخ) ۱؎

مروجہ وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرنا

سوال:۔ موجودہ دور میں وکلاء ملکی قوانین کی رو سے مُدّعی اور مُدّعیٰ علیہ کی نمائندگی کرتے ہوئے طرفین سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں، تو کیا وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ واضح رہے کہ موجودہ ملکی قوانین میں سے جو قوانین شریعتِ اسلامیہ سے متصادم ہوں تو ان کے مطابق مقدمات کی پیروی کرنا اور فیصلہ کرنا اور ان پر معاوضات لینا تمام کے تمام غیر اسلامی ہیں، شریعتِ مقدسہ میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تاہم ان کے ذریعے سے اپنے جائز حقوق لینا اور ظالم کے ظلم سے نجات حاصل کرنا مرخص ہے اور جو قوانین شریعت سے متصادم نہ ہوں تو ان کے مطابق فیصلہ کرنا اور اس پر وکیل کا معاوضات لینا مرخص ہے اور جوازِ اُجرت توکیل کے لیے یہ تاویل کافی ہے کہ واقعی وکیل جو اُجرت لیتا ہے وہ ایک خاص وقت اور خاص دن میں محبوس رہنے کی اُجرت لیتا ہے جو کہ فقہاء کرام نے جائز قرار دیا ہے۔ الحاصل یہ کہ پیشۂ وکالت فی نفسہٖ جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ وکیل جائز مقدمات کی پیروی کرتا ہو۔

لما قال الدکتور الشیخ وھبۃ الزحیلی: تصح الوکالۃ باجر وبغیر اجرٍ لان النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم کان یبعث عمالہ لقبض الصدقات ویجعل لھم عمولۃ فاذا تمت الوکالۃ باجرٍ لزم العقد یکون للوکیل حکم الاجیرای انہٗ یلزم الوکیل بتنفیذ العمل ولیس لہ التخلی عنہ بدون عذر یبیح لہٗ ذٰلک واذا لم یذکروا الاجر صراحۃً حکم العرف فان کانت ماجورۃً عادۃً کتوکیل المحامین وسماسرۃ البیع والشراء لزم اجر المثل وید فعہٗ احد العاقدین بحسب العرف وان کانت غیر ماجورۃ عرفاً کانت

۱؎ وفی الھندیۃ: یصح التوکیل بالنکاح وان لم یحضرہ الشھود کذا فی التاتارخانیۃ ناقلاً عن خواھر زادہ ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۱ ص ۲۹۴ الباب السادس فی الوکالۃ بالنکاح وغیرھا) ومِثلُہٗ فی البحر الرائق ج ۳ ص ۱۳۷ کتاب النکاح، فصل فی بعض مسائل الوکیل والفضولی الخ

مجاناً او تبرعاً عملاً بالاصل فی الوکالات وھو ان تکون بغیر اجر علی سبیل التعاون فی الخیر وھٰذا النوع لا یلزم فیہ المضی فی العمل بل للوکیل التخلی عنہ فی ای وقت وھٰذا مذھب الحنفیۃ والمالکیۃ والحنابلۃ۔

وقال الشافعیۃ الوکالۃ ولو بجعل جائزۃ ای غیر لازمۃ من الجانبین۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ج۴ ص۱۵۱ تعریف الوکالۃ ومشروعیتھا)

وکیل کا دوسرے کو وکیل بنانے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنا مال لاہور منڈی میں فروخت کرنے کے لیے کسی کو وکیل بنایا اور اس نے اپنی طرف سے ایک دوسرے شخص کو وکیل بنا کر مال فروخت کرنے کے لیے لاہور روانہ کر دیا، تو کیا وکیل اوّل کا دوسرے شخص کو وکیل بنانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ اگر مؤکل نے اس کو عمومی وکیل مقرر کیا ہو کہ میرا مال فروخت کرو چاہے تم خود جاؤ یا کسی اور کو بھیجو، تو اس صورت میں وکالتِ عمومی کی وجہ سے وکیلِ اوّل کا دوسرے کو وکیل بنانا درست ہے، اور اگر مؤکل کی طرف سے عمومی وکالت نہ ہو تو پھر وکیلِ اوّل کا یہ اقدام صحیح نہیں۔

قال العلامۃ الکاسانیؒ: فان کانت عامۃ یملک ان یؤکل غیرہ بالقبض لان الاصل فیما یخرج مخرج العموم اجراؤہ علی عمومہ وان کانت خاصۃ فلیس لہٗ ان یؤکل غیرہ بالقبض لان الوکیل یتصرف بتفویض المؤکل فیملک قدر ما فوض الیہ۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۲۵ فصل فی حکم التوکیل) [1]

---

[1] قال الشیخ وھبۃ الزحیلی: ان کانت الوکالۃ خاصۃ او مقیدۃ بان یعمل الوکیل بنفسہ لم یجز لہٗ توکیل غیرہ فیما وکل فیہ۔ وان کانت الوکالۃ مطلقۃ او عامۃ بان قال لہٗ اصنع ما شئت جاز لہٗ توکیل الغیر ویکون ھٰذا الغیر وکیلاً مع الاوّل عن المؤکل۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج۴ ص۱۶۰ ھل للوکیل توکیل غیرہ)

گارنٹی سے کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص مثلاً زید عمارتی سازوسامان (ہارڈ ویئر) کی خریدوفروخت کا کاروبار کرتا ہے اور بعض کمپنیاں اپنا مال اس پر گارنٹی سے فروخت کرتی ہیں مثلاً پانی کی ٹینکیاں، ٹونٹیاں، پانی کے پائپ، بیلچے، کدال وغیرہ۔ ان میں سے بعض اشیاء کی گارنٹی پانچ سال، بعض کی دس سال اور بعض کی گارنٹی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جب زید کسی پر مذکورہ چیزیں بیچتا ہے تو اسی گارنٹی سے بیچتا ہے، گارنٹی کی مدت میں اگر فروخت کردہ چیز خراب ہوجائے تو مشتری وہ چیز زید کو واپس کردیتا ہے اور زید وہ چیز کمپنی کو بھیجدیتا ہے اور کمپنی والے اس کے عوض میں یا تو نئی چیز دیدیتے ہیں یا اس کو ہی بالکل درست کردیتے۔ اس طرح کرنے سے عام لوگ گارنٹی شدہ چیزیں خریدنے میں زیادہ رغبت ظاہر کرتے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس قسم کی بیع از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہم نے ایک مولوی صاحب سے سُنا ہے کہ یہ بیع مشروط ہونے کی بناء پر فاسد ہے۔ لہٰذا شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلہ کی تفصیلاً وضاحت فرمائی جائے۔

الجواب:۔ دورِ حاضر میں بعض کمپنیاں اپنی مصنوعات کی خریداری پر گاہک کو سال دوسال یا لائف ٹائم کی گارنٹی دیتی ہیں، یہ گارنٹی صورت کے لحاظ سے کفالہ بدرک ہے۔ (درک کے معنٰی حصولِ صاحب یعنی پانے کے ہیں۔ یعنی اگر مشتری مبیعہ میں کوئی عیب پائے تو بائع اس کا کفیل ہوگا۔ (مصباح اللغات ص۲۳۶) جبکہ کفالہ بدرکہ بالاجماع صحیح ہے۔ اسی طرح خود کفالہ میں بھی فقہاء کے ہاں توسع پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کفالہ بلکہ اکثر معاملات کا تعلق عرف کے ساتھ ہے۔ آجکل کوئی چیز فروخت کرتے وقت گارنٹی دینا کاروبار کا ایک اہم جُزء بن گیا ہے، چونکہ آجکل دو نمبر (نقلی) چیزیں عام تیار ہوتی ہیں جس کی وجہ سے گارنٹی دینا اور لینا ناگزیر ہوگیا ہے، اور ویسے بھی عام طور پر عالمی اور ملکی منڈیوں میں ایک رواج سا بن گیا ہے کہ لوگ گارنٹی والی چیز بلا کسی حیل وحجت کے خرید لیتے ہیں، لہٰذا آجکل گارنٹی پر خرید وفروخت کرنا عرف اور عموم بلوٰی کی وجہ سے جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

كما في البدائع الصنائع : ولان الكفالة جوازها بالعرف ۔ (جلد ۶ ص۳)

وكما في الهداية : واما الكفالة بالمال فجائزة معلوماً كالمكفول به الى ان قال اوبما يدركك في هذا البيع لان مبنى الكفالة على التوسع فيتحمل فيها الجهالة وعلى الكفالة بدرك اجماع ۔ (جلد ۳ ص۱۱۶) وكما في العناية : تكفلت عنه بمالك

عليه او بما يدركك فى هذا البيع يعني من الضمان بعد ان كان دينًا صحيحًا لان مبنى الكفالة على التوسع فانها تبرع ــ وبعد اسطر : وعلى الكفالة بدرك بفتح الراء وسكونها وهو التبعة دليل على جوازها بالمجهول لايصح. وفيه اشارة الىٰ نفى قول من يقول ان الضمان بالمجهول لا يصح لانه التزام مال فلا يصح مجهولاً كالثمن فى البيع وقلنا الضمان بدرك صحيح بالاجماع وهو ضمان بالمجهول. الخ (العناية على هامش فتح القدير ج ٦ ص ٢٩٩،٢٩٨) ــ وكما فى فتاوىٰ قاضيخان : رجل باع دارًا وكفل رجل المشتري بما ادركه فيها من درك فاخذ المشتري بذلك عنه رهنًا ذكر فى الاصل اَنَّ الرّهن باطل ولاضمان على المرتهن والكفالة جائزة - (فتاوىٰ قاضيخان على هامش الهندية ج ٣ ص ٦٤)

وکیل کا منصب وکالت کے خلاف کرنے کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! ہم نے ایک آدمی کو اپنی طرف سے گاڑی خریدنے کا وکیل بنایا تھا کہ ہمارے لیے گاڑی خرید لو، اس نے کسی اور سے ہمارے لیے گاڑی خریدنے کی بجائے اپنی ہی گاڑی ہم پر بیچ دی۔ تو کیا یہ وکیل اپنی چیز ہمارے اوپر فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ ہمارے علم میں بھی نہ ہو اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے اپنی گاڑی آپ کو دی ہے اور ہم اس سے انکاری ہیں؟

الجواب :- وکالت ایک ایسا معاملہ ہے جس میں مؤکل اپنے وکیل پر اعتماد کر کے اپنی ذمہ داری اس کو سونپتا ہے، اس لیے وکیل کا اس معاملہ میں ایسا قدم اٹھانا جو منصب وکالت کے خلاف ہو اور اس میں دھوکہ دہی کا شبہ ہو جائز نہیں، لہٰذا اس میں جو معاملہ سامنے آجائے وہ منعقد نہیں ہوگا۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی دھوکہ دہی اور غرر کا عنصر موجود ہے اس لیے یہ معاملہ کالعدم ہے۔

لما فى الدر المختار : حيث لم يكن مخالفاً دفعاً للغرر۔ قال ابن عابدينؒ : تحت قوله دفعاً للغرر...... وفيه الوكيل بالبيع لايملك شراءه لنفسه لان الواحد لايكون مشتريًا وبائعًا فيبيعه من غيره ثم اشتريه منه -(رد المحتار ج ٤ ص ٤٥٠ كتاب الوكالة)

تاہم اگر مؤکل کی طرف سے کُلی اجازت ہو تو پھر ایسا کرنا جائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدينؒ : وان امر الموكل أنهُ يبيعه من نفسه او اولاده الصغار او ممن لاتقبل شهادته فباع منه جاز۔ (رد المحتار ج ٤ ص ٤٥٠ كتاب الوكالة)

کتاب الحوالۃ

(حوالہ کے مسائل واحکام)

محیل کو قرض کی ادائیگی کے لیے دی ہوئی مہلت کا محتال علیہ میں اعتبار

سوال:۔ ایک شخص پر قرض کی ادائیگی کے لیے قرض دہندہ کی طرف سے ایک سال کی مہلت دی گئی تھی، قرض خواہ نے وہ رقم ایک دوسرے شخص کے حوالہ کی، لیکن اب دائن محتال علیہ (دوسرے شخص) سے فوری ادائیگی کا مطالبہ مطالبہ کرتا ہے، کیا اس کو یہ اختیار حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو مہلت اور وقت مدیون (قرض خواہ) کو قرض کی ادائیگی کے لیے دی گئی تھی اُسی مہلت کا اعتبار ہوگا لہٰذا دائن (قرض دہندہ) کا قبل از وقت قرض کی ادائیگی کا محتال علیہ سے مطالبہ کرنا بلا جواز اور بے جا ہے۔

لما قال العلامة کمال الدین محمد بن عبد الواحدؒ: والمطلقة المؤجلة له علی رجل الف الی سنةٍ فأحال الطالب علیه الی سنةٍ کانت علیه الی سنةٍ ولو حصلت الحوالة مبهمة لم یذکرہ محمد رحمه الله وقالوا ینبغی ان تثبت مؤجلة کما فی الکفالة لانه تحمل ما علی الاصیل بای صفة کان۔ (فتح القدیر ج ۶ ص ۳۵۵ کتاب الحوالة)[1]

حوالہ میں دائن کی رضامندی ضروری ہے

سوال:۔ کیا کسی دوسرے شخص کو قرض کی ادائیگی کے لیے حوالہ کرنے

---

[1] وقال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی الفتح تنقسم الحوالة المطلقة الی حالة ومؤجلة فالحالة ان یحیل الطالب بالف هی علی المحیل حالة فتکون علی المحتال علیه حالة لان الحوالة تحویل الدّین فیتحول بصفة التی علی الاصیل والمؤجلة ان تکون الف الی سنة ولو ابهمها ما یذکر محمد وقالوا ینبغی ان تثبت مؤجلة کما فی الکفالة۔
(رد المحتار ج ۵ ص ۳۴۹ کتاب الحوالة)
ومِثْلُهٗ فی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ج ۶ ص ۲۴۸ کتاب الحوالة۔

میں دائن کی رضامندی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ قرض کی وصولی میں تمام لوگ یکساں نہیں ہوتے اس لیے مدیون کا دائن کو کسی دوسرے آدمی کے حوالہ کرنے میں یہ ضروری ہے کہ اس کی رائے شامل ہو ایسا نہ ہو کہ کسی ایسے آدمی کو حوالہ کرے جس سے وصولی پر دائن قدرت نہیں رکھتا ہو جو اس کی رقم ضائع ہونے کے مترادف ہے ۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وتصح الحوالة برضاء المحیل والمحتال والمحتال علیہ ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۲۹ کتاب الحوالۃ) لہ

حوالہ کرنے کے بعد مدیون سے قرض کے مطالبہ کا حکم

سوال :۔ اگر ایک شخص اپنے قرض کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص پر ڈال دے، کچھ مدت تک تو وہ دائن کے مطالبہ سے بے فکر رہا لیکن جب اس کو احساس ہوا کہ متعلقہ شخص بھی ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے تو کیا دائن مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ جب دین کی ادائیگی کی ذمہ داری دائن کی رضامندی سے کسی دوسرے شخص پر ڈال دی جائے اور اس شخص نے یہ ذمہ داری قبول بھی کر لی ہو تو اب دائن مدیون سے قرض کے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا بلکہ محتال علیہ سے (جس نے ذمہ داری قبول کر لی ہے) قرض کا مطالبہ کرے گا اور مدیون بری الذمہ متصور ہوگا ۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: واذا تمت الحوالة بری المحیل من الدّین بالقبول وقال زفرؒ لا یبرء اعتبارًا بالکفالة اذ کل واحد منهما عقد توثق وقال ولا یرجع المحتال علی المحیل الا ان یتوی حقه ۔ (الھدایۃ ج۳ ص۱۲۹ کتاب الحوالۃ) لہ

لہ وقال العلامة التمرتاشیؒ: وشرط لصحتها رضاء الکل بلا خلاف الا فی الاول ۔ (تنویر الابصار علی ہامش رد المحتار ج۵ ص۳۴۱ کتاب الحوالہ) ــــ ومِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج۴ ص۱۷۱ کتاب الحوالۃ ۔

لہ قال العلامة الزیلعیؒ: وبریٔ المحیل بالقبول من الدّین وقال زفرؒ لا یبرء لان المقصود بها التوثیق وقال ثم اختلفوا فی البراءة فقال ابو یوسفؒ یبرأ عن المطالبة والدّین وقال محمدؒ یبرء عن المطالبة لا عن الدّین ۔ (تبیین الحقائق ج۴ ص۱۷۱ کتاب الحوالۃ)

ومِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۷ کتاب الحوالۃ ۔

مجہول چیز کی ذمّہ داری لینا

سوال:۔ ایک شخص کسی دوکاندار سے قرض پر سودا خریدتا ہے لیکن دوکاندار کو اس پر اعتماد نہیں ہے ایک دوسرا شخص دوکاندار کو اعتماد دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس شخص کو قرض پر سودا دیدیا کرو، اِس کی جتنی رقم ہوگی اُس کی ادائیگی کا میں ذمہ دار ہوں گا، تو کیا ایک مجہول چیز کی ذمہ داری اٹھانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ کسی شخص کی طرف سے مال کی ذمہ داری لینا "کفالہ" ہے جس میں بنیادی محرک اور عمل ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے ایسے امور میں معمولی جہل قابلِ برداشت ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں دوسرے شخص کا پہلے کی ذمہ داری قبول کرنا درست ہے۔

لماقال العلامة المرغینانیؒ: اما الکفالة بالمال فجائزة معلوماً کان المکفول به مجهولاً اذا کان دَیناً صحیحاً مثل ان یقول تکفلت عنه بألف او بمالك علیه او بما یدرکك فی هٰذا البیع لان مبنی الکفالة علی التوسع فیتحمل فیه الجهالة وعلی الکفالة بالدرك اجماعٌ وکفیٰ به حُجّةً۔ (الهدایة ج ۳ ص۱۱۲ کتاب الکفالة) [1]

کفیل اور مکفول عنہ کے مابین ثمن میں اختلاف

سوال:۔ ایک شخص نے اپنے قرض دہندہ کو قرض کی ادائیگی کے لیے جو شخص کفیل مقرر کیا تھا اس کا مالک سے اس بات پر جھگڑا پیدا ہُوا کہ مالک اُس سے دس ہزار روپے مانگتا ہے جبکہ کفیل پانچ ہزار روپے کی ادائیگی پر مقر ہے، کیا ایسی حالت میں مدیون کے دس ہزار روپے کے اقرار کرنے سے کفیل سے زیادہ رقم لی جاسکتی ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مدیون پر دس ہزار روپے کی رقم اگر شواہد سے ثابت ہو جائے اور کفیل نے تمامتر رقم کی ذمہ داری قبول ہو تو تمام رقم کی ادائیگی کفیل پر لازم ہوگی،

---

[1] وقال العلامة الکاسانیؒ: وکون المکفول به معلوم الذات فی انواع الکفالات او معلوم القدر فی الدین لیس بشرط حتی لو کفل باحد شئین غیر عین بان کفل بنفس رجل او بما علیه وهو الف جاز وعلیه احدهما ایهما شاء لان هٰذه جهالة مقدور الدفع بالبیان فلا تمنع جواز الکفالة۔ (بدائع الصنائع ج ۶ ص۹ کتاب الکفالة)

وَمِثلُهٗ فی البحر الرائق ج ۶ ص۲۰۶ کتاب الکفالة۔

اور اگر گواہ نہ ہوں تو کفیل کے قول کو اعتبار دیا جائے گا، تاہم مکفول عنہ کا دعویٰ کفیل پر لازم نہیں بلکہ خود اس سے حسبِ اقرار رقم وصول کی جائے گی۔

لما قال العلامة المرغيناني ؒ: فان قال تكفلت بما لك عليه فقامت البينة بالف عليه ضمنه الكفيل لان الثابت بالبينة كالثابت معاينة فيتحقق ما عليه فيصح الضمان به وان لم تقم البينة فالقول قول الكفيل مع يمينه فى مقدار ما يعترف به لانه منكر للزيادة فان اعترف المكفول عنه باكثر من ذلك لم يصدق على كفيله لانه اقرار على الغير ولا ولاية له عليه ويصدق فى حق نفسه لولايته عليها۔

(الهداية ج ۳ ص ۱۱۸ كتاب الكفالة) [1]

محتال علیہ کی رضامندی کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا بھائی کچھ مقروض ہے اور اس نے قرض کی ادائیگی بغیر میری رضامندی کے میرے حوالے کر دی ہے، تو کیا دائن مجھ سے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حوالہ میں چونکہ محتال علیہ کی رضا ضروری ہے اس لیے بدون رضا اس پر قرض کے لیے رجوع کرنا درست نہیں لہٰذا یہ حوالہ صحیح نہیں اور دائن کا آپ سے قرض کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفي ؒ: شرط لصحتها رضا الكل بلا خلاف۔ قال ابن عابدين ؒ: قوله رضا الكل واما رضا الثالث وهو المحتال عليه فلانها الزام الدين ولا لزوم بلا التزام۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۳۲۲ كتاب الحوالة)

---

[1] وقال العلامة ابن نجيم المصري ؒ: فان كفل بماله عليه فبرهن على الف لزمه لان الثابت بالبينة كالثابت عياناً ولا يكون قول الطالب حجة عليه كما لا يكون حجة على الاصيل لانه مدع ـ ولا صدق الكفيل فيما اقر بحلفه ولا ينفذ قول المطلوب على الكفيل اى وان لم يبرهن فالقول للكفيل فيما يقر به مع يمينه على نفى العلم لا على البينات كما فى الايضاح ولا يكون قول المطلوب حجة عليه لانه اقرار على الغير۔ (البحر الرائق ج ۶ ص ۲۲۳ كتاب الكفالة)

وَمِثْلُهٗ فى فتح القدير ج ۶ ص ۳۰۳ كتاب الكفالة۔

کتاب
الهبة

تهادوا تحابوا

كِتَابُ الهِبَة

(ہبہ کے مسائل واحکام)

ہبہ میں عرف کا اعتبار ہے

سوال :۔ عمرو کے تین بیٹے ہیں اور تینوں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور تینوں مختلف شہروں میں ملازمت کے سلسلہ میں رہائش پذیر ہیں اور اپنی تنخواہوں میں سے ہر ماہ ایک مخصوص رقم اپنے والد کے نام بھیجدیتے ہیں اور والد اس رقم کو گھر کے مشترکہ کھانے میں خرچ کرتے ہیں، تو بیٹوں کی یہ کمائی باپ (عمرو) کی ملکیت ہے یا کہ اس کے بیٹوں کی ملکیت تصوّر کی جائے گی؟

الجواب :۔ اگر بیٹوں نے اپنی رقومات کے متعلق ہبہ وغیرہ کی تعیین نہ کی ہو تو قواعد کی رُو سے المعروف کالمشروط کے تحت چونکہ عموماً اسی طرح بیٹے والدین کو بطور ہبہ رقم دیا کرتے ہیں اس لیے یہ رقم والد کی ملکیت متصوّر ہوگی۔

قال العلامة خیرالدین الرملیؒ : سئل فیما یرسله الشخص الیٰ غیره فی الاعراس ونحوها هل یکون حکمه حکم القرض فیلزم الوفاء به ام لا (اجاب) ان کان العرف قاضیاً بانهم ید فعونه علیٰ وجه البدل یلزم الوفاء به ان مثلیا فبمثله وان قیمیا فبقیمته وان کان العرف بخلاف ذٰلك بان کانوید فعونه علیٰ وجه الهبة ولا ینظرون فی ذٰلك الیٰ اعطاء البدل فحکمه حکم الهبة فی سائر احکامه فلا رجوع فیه بعد الهلاك والاستهلاك والاصل فیه ان المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً۔ واللّٰہ اعلم (فتاویٰ خیریة علیٰ هامش الفتاویٰ الحامدیة ج۲ ص۱۷۳ مطلب وهب ابنه وابن ابنه محدودا) [1]

---

[1] قال العلامة محمد خالد الاتاسیؒ رقی الفتاویٰ الخیریة مانصه سئل فیما یرسله الشخص الیٰ غیره فی الاعراس ونحوها هل یکون حکمه حکم القرض فیلزم الوفاء به ام لا اجاب ان کان العرف بانهم یدفعونه علیٰ وجه البدل یلزم الوفاء به ان مثلیا فبمثله ان قیمیا فبقیمته وان کان العرف بخلاف ذٰلك بان کانوا یدفعونه علیٰ وجه الهبة ولا ینظرون فی ذٰلك الیٰ اعطاء البدل فحکمه حکم الهبة فی سائر احکامه فلا رجوع فیه بعد الهلاك والاستهلاك والاصل فیه ان المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً۔ (شرح مجلة الاحکام ج۳ ص۳۰۲۔ الباب الثالث فی بیان احکام الهبة)

ومِثْلُهٗ فی فتاویٰ کاملیة ص۱۸۱ کتاب الهبة۔

تملیک بھی ہبہ کے مترادف ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص ہبہ کرتے وقت تملیک کا لفظ استعمال کرے تو کیا اس صورت میں ہبہ اور تملیک الگ الگ ہیں یا دونوں ایک ہیں ؟

الجواب:۔ لغت کے اعتبار سے تملیک عام ہے اور ہبہ خاص ہے لیکن موجودہ عرف میں تملیک اور ہبہ دونوں ایک دوسرے کے مترادف استعمال ہوتے ہیں اسلئے صرف لفظِ تملیک سے بھی ہبہ ہی متصور ہوگا۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: هي تمليك العين مجاناً اى بلاعوض۔
(الدّر المختار على صدر رد المحتار جلد ۵ ص۶۸۷ كتاب الهبة) [1]

ناقابلِ تقسیم اشیاء کے ہبہ کا حکم

جو اشیاء ناقابلِ تقسیم ہوں ان کا ہبہ کرنا کیسا ہے ؟ مثلاً ایک شخص نے اپنے جانور کو اس طرح ہبہ کیا کہ ایک حصہ اپنے لیے رکھا، تین حصے بیوی کو ہبہ کیے اور تین حصے بھائی کو ہبہ کئے، کیا اس شخص کا یہ ہبہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: اشیاء کی دو قسمیں ہیں ۱ ناقابلِ تقسیم ۲ قابلِ تقسیم۔ اس لیے جو اشیاء قابلِ تقسیم ہیں ان کا ہبہ کرنا قبل التقسیم صحیح نہیں، البتہ جن اشیاء کی تقسیم ممکن نہ ہو ان کا ہبہ کرنا شرعاً جائز ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس شخص کا ہبہ صحیح ہے۔

قال العلامه خوارزمیؒ: هبة المشاع فيما لا يقسم جائزة يعني به مالا يحتمل القسمة اى لايبقى منتفعاً بعد القسمة اصلاً كعبد واحد اودابة واحدة۔

(الكفاية فى ذيل فتح القدير ج ۷ ص۴۸۸ كتاب الهبة) [2]

---

[1] قال العلامة محمد اتاسیؒ: الهبة تمليك مال لآخر بلا عوض۔
(مجلة الاحكام مادة ۸۳۳ ص۴۶۲ الكتاب السابع فى الهبة)
ومثله فى كنز الدقائق ص۳۵۲ كتاب الهبة۔

[2] قال العلامة قاضی خانؒ: وفيما لا يقسم كالعبد والدابة والثوب والحمام يجوز هبة المشاع من الشريك وغيره فى قولهم۔ (الفتاوى قاضيخان على هامش الهندية ج۳ ص۲۶۷ كتاب الهبة فصل فى هبة المشاع)
ومثله فى الهداية ج۳ ص۲۸۵ كتاب الهبة۔

قابلِ تقسیم اشیاء میں قبل از تقسیم ہبہ درست نہیں

سوال:- زید کے آٹھ بیٹے، تین بیٹیاں اور دو بیویاں ہیں، اس نے اپنی زندگی ہی میں بیویوں اور بیٹیوں کو کچھ دیئے بغیر اپنی کل جائیداد کا ۲/۳ حصہ پانچ بیٹوں کو اور ۱/۳ حصہ باقی لڑکوں کو ہبہ کر دی جو کہ الگ الگ ماؤں کی اولاد ہیں، کیا اس کے ۱/۳ حصہ والے تین بیٹے دوبارہ بطریقِ شرعی میراث کی تقسیم کا حق رکھتے ہیں؟

الجواب:- چونکہ کسی شخص کا اپنی زندگی میں اپنی اولاد پر مال تقسیم کرنا ہبہ ہوتا ہے اور تمام فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ قابلِ تقسیم اشیاء میں قبل از تقسیم ہبہ درست نہیں، پس صورتِ مسئولہ میں اگر زید تے سب بیٹوں کا حصہ جدا کیا ہو اور قبضہ بھی دے دیا ہو تو یہ ہبہ درست اور نافذ ہے ورنہ مشترکہ جائیداد کا ۲/۳ حصہ پانچ بیٹوں کو اور ۱/۳ حصہ تین بیٹوں کو ہبہ کرنا درست نہیں لہٰذا زید کے مرنے کے بعد جملہ جائیداد دوبارہ تمام ورثاء پر تقسیم کی جائے گی جس میں بیٹیاں، بیٹے اور دونوں بیویاں بھی شریک ہوں گی۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله : وفي الاصل ومن شرائطها الهبة الافراز حتى لا يجوز هبة المشاع فيما يحتمل القسمة كالبيت والدار والارض ونحوها وان كان لا يحتمل القسمة يجوز كالبئر والحمام والرحى - (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۹۰ كتاب الهبة - الفصل الثالث فيما يكون خطباء وفيما لا يكون) [1]

اجارہ پر دی ہوئی زمین کا ہبہ کرنا

سوال:- ایک شخص نے اپنی ایسی زمین بیٹے یا بیٹی کو ہبہ کی جس پر مُدتوں سے مزارع (کاشتکار) خیمہ زن ہیں اور کاشتکار سے کیے ہوئے معاہدہ میں بھی ابھی کافی وقت باقی ہے، کیا ایسی صورت میں مَوہُوب لَہٗ مزارع کو زمین سے بیدخل کرسکتا ہے یا نہیں؟

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : وذكر قبله هبة المشاع فيما يقسم لا تفيد الملك عند ابى حنيفة وفى القهستاني لا تفيد الملك وهو المختار كما فى المضمرات - (رد المحتار ج ۵ ص۶۹۲ كتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فى بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۲۳ كتاب الهبة -

الجواب: کسی بالغ یا نابالغ بچے کو جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ ہبہ کرنا صحیح اور درست ہے اور ہبہ سے ان کی ملکیت میں بھی داخل ہو جائے گی، مگر اجارہ پر دی ہوئی زمین کے ساتھ مزارع (کاشتکار) کا حق متعلق ہونے کی وجہ سے زمین ناقابلِ تملیک ہوتی ہے جو کہ ہبہ کی صحت کے لیے بنیادی شرط ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس زمین کا ہبہ شرائط کے فقدان کی وجہ سے صحیح نہیں لہٰذا عدم صحت کی بناء پر موہوب لہٗ کاشتکار کو بیدخل نہیں کرسکتا۔

قال العلامة محمد کامل الطرابلسی رحمه الله: سئلت عن رجل وهب لابنه الصغیر داراً وفیها ساکن باجر هل تجوز هٰذه الهبة فالجواب انها لا تجوز قال فی الهندیة رجل وهب داراً لابنه الصغیر وفیها ساکن باجر قال یعنی محمد لا تجوز۔ (فتاوٰی کاملیة ص۱۸۱ کتاب الهبة)[۱]

موہوبہ جائیداد کا سرکاری کاغذات میں انتقال کا حکم

سوال: زید نے اپنی ملکیتی دس کنال زمین بکر کو ہبہ کردی لیکن سرکاری کاغذات میں ابھی تک انتقال نہیں ہوا ہے، تو کیا بکر کو موہوبہ زمین کا مالک سمجھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: ہبہ کی صحت کے لیے تین امور کا ہونا ضروری ہے (۱) ایجاب (۲) قبول (۳) قبض۔ لہٰذا اگر باقاعدہ طور پر ان تین امور کا لحاظ رکھتے ہوئے ہبہ ہو چکا ہو تو بلا شک وشبہ وہ زمین کا مالک ہے، سرکاری کاغذات میں انتقال ہونے یا نہ ہونے سے شرعاً ہبہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قال العلامة خالد اتاسیؒ: تنعقد الهبة بالایجاب والقبول وتتم بالقبول۔
(مجلة الاحکام مادۃ ۸۳۷ ص۴۶۲ الفصل الاول فی بیان المسائل المتعلقة برکن الهبة وقبضها)[۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ: وفی المنتقی عند محمدؒ رجل وهب داراً لابنه الصغیر وفیها ساکن باجر قال لا یجوز ولو کان بغیر اجر او کان فیها یعنی الواهب فالهبة جائزة کذا فی التتارخانیة۔
(منحة الخالق علی البحر الرائق ج ۷ ص۲۸۸ کتاب الهبة)
وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضیخان علی هامش الهندیة ج ۶ ص۲۳۸۔

[۲] قال الامام قدوریؒ: الهبة تصح بالایجاب والقبول وتتم بالقبض۔ (مختصر القدوری ص۱۴۳ کتاب الهبة)
وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص۳۵۲ کتاب الهبة۔

ہبۂ عمریٰ ناقابل رجوع ہے

سوال:۔ تین بھائیوں نے بوقتِ تقسیم جائیداد اپنے حصّہ سے اپنی والدہ کو ضروریات پوری کرنے کیلئے دو کنال زمین دی تھی، والدہ نے مذکورہ دو کنال زمین اپنے نواسے خالد کو ہبہ کر دی، اب والدہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے زمینِ مذکورہ خالد سے واپس لینا چاہتے ہیں، تو کیا ان کو ایسا کرنا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ یہ معاملہ ہبۂ عمریٰ کا ہے، معمرلہٗ (والدہ) مذکورہ دو کنال زمین کی خود مختار مالکہ بن گئی ہے لہٰذا نواسے کو اُن کا ہبہ کرنا جائز ہے اور بیٹوں کا رجوع کرنا مردود ہے۔

قال العلامة ابن نجيمؒ: (واعمرتك هذا الشئ) لان العمرىٰ تمليك للحال فتثبت الهبة ويبطل ما اقتضاه من شرط الرجوع وكذلك لو شرط الرجوع صريحًا يبطل شرطه ايضًا۔ (البحر الرائق ج ۷ ص ۲۸۵ كتاب الهبة)[1]

موت اور عوض کی وجہ سے حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے

سوال:۔ زید نے بکر کو اپنی زمین عوضاً ہبہ کر دی، بعد میں اس کی وفات ہو گئی، اب تیس سال بعد زید کے ورثاء بکر سے اس زمین کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، کیا ان کو شرعاً رجوع کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عوض لینے یا متعاقدین میں سے کسی ایک کی موت کی وجہ سے حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے، لہٰذا صورتِ مرقومہ میں زید کے ورثاء کو زمین واپس لینے کا حق نہیں پہنچتا بلکہ زمین بکر کی ملکیت رہے گی۔

قال العلامة ابو البركات النسفي رحمه الله: صح الرجوع فيها ومنع الرجوع دمع خزقه فالدال الزيادة المتصلة كالغرس والبناء والسمن

---

[1] قال العلامة ابو بكر ابن حداد اليمني رحمه الله: والعمرىٰ جائزة للمعمر فى حال حياته ولورثته من بعد موته ومعناه ان يجعل داره له عمره واذا مات يردها عليه فيصح التمليك ويبطل الشرط والهبة لا تبطل بالشروط الفاسدة۔ (الجوهرة النيرة ج ۲ ص ۱۸ كتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فى الهداية ج ۳ ص ۲۸۴ كتاب الهبة۔

والميـم موت احد المتعاقدين والعين العوض ۔

(کنز الدقائق ص۳۵۴ کتاب الھبۃ) ؎۱

متعدد آدمیوں کا کسی ایک شخص کو کوئی چیز ہبہ کرنا

سوال:۔ جاوید اور خالد کا ایک مشترکہ گھر ہے، دونوں بخوشی و رضا عامر کے نام ہبہ کرنا چاہتے ہیں، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مشترکہ جائیداد میں بوجہ اشتراک کسی ایک شریک کا اپنا حصہ بغیر تقسیم کے کسی کو ہبہ کرنا صحیح نہیں لیکن جب شیوع کی یہ صورت درمیان سے نکل جائے تو پھر مشترکہ جائیداد کو اتفاق رائے سے ہبہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں، اس لیے صورتِ مسئولہ میں ہبہ کرنا درست اور صحیح ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: (وهب اثنان دارا لواحد صح) لعدم الشيوع ۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۵ ص۶۹۷ كتاب الهبة) ؎۲

ہبہ کے لیے ایجاب و قبول پر تلفظ ضروری نہیں بلکہ قرائن ہی کافی ہے

سوال:۔ زید کے پانچ بیٹے ہیں جن میں سے تین بیٹوں عمر، بکر اور خالد کو حینِ حیات میں شادیاں کرا کے ہر ایک کو رہائش کے لیے الگ الگ گھر دے دیئے، زید کی عادت ہے کہ جو کچھ وہ کسی کو دے دیتا ہے تو واپس نہیں لیتا ہے، زید کے مذکورہ تینوں بیٹوں کے پاس اُس کے کچھ زیورات بھی ہیں، جب عمر نے اپنے والد (زید) کو وہ زیور واپس کرنا چاہا تو اس نے یہ کہہ کر زیور عمر کو واپس کر دیا کہ یہ

؎۱ قال الامام القدوری رحمه الله: او اذا وهب لاجنبى هبة فله الرجوع فيها الا ان يعوضه عنها او يزيد زيادة متصلة او يموت احد المتعاقدين ۔

(مختصر القدوری ص۱۴۴ کتاب الھبۃ)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار ج۵ ص۶۹۹ كتاب الهبة ۔

؎۲ قال العلامة المرغينانیؒ: واذا وهب اثنان من واحد دارًا جاز لانهما سلّماها جملة وهو قد قبضها جملة فلا شيوع وان وهبها واحد من اثنين لا يجوز عند ابی حنيفة ۔ (الهداية ج۳ ص۲۸۸ كتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی كنز الدقائق ص۳۵۴ كتاب الهبة ۔

زیور آپ کا ہی ہے اور جو زیور دوسرے بھائیوں کے پاس ہے وہ اُن کا ہے۔ اندریں صورت شرعی نقطہ نگاہ سے مذکورہ مکانات اور زیور وغیرہ پانچوں بھائیوں کے مشترکہ متصور ہوں گے یا صرف عمرو، بکر اور خالد کی ملکیت ہوگی؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں جبکہ زید نے اپنے تین بیٹوں (عمر، بکر اور خالد) کو علیحدہ علیحدہ مکانات دیدیئے ہیں تو اگرچہ زید نے صراحتاً ہبہ کا لفظ نہیں کہا ہے لیکن ظاہر قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ ہبہ ہے اور ہبہ میں تملیک قریبہ کے لیے کافی ہے لہٰذا یہ شرعاً ہبہ ہے اس لیے زید کی وفات کے بعد اس میں بقایا ترکہ کی طرح میراث جاری نہ ہوگی بلکہ یہ ان تینوں بھائیوں کی ملکیت ہوگی اور اپنے والد (زید) کے باقی ترکہ میں پانچوں بھائی برابر کے شریک ہوں گے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله: قلتُ فقد افاد ان التلفظ بالایجاب والقبول لا یشترط بل تکفی القرائن الدالة علی التملیک کمن دفع لفقیر شیئاً وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشیٔ۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۶۸۸ کتاب الهبة)[1]

والدین کا اولاد کے مال کو ہبہ کرنا جائز نہیں ہے

سوال: سلمیٰ نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی تمام زمین اپنے دو بھائیوں کو ہبہ کر دی اور اپنی اکلوتی نابالغ لڑکی سکینہ کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، اب جبکہ سکینہ بالغ ہو گئی ہے تو وہ اپنے والد کے ترکہ میں سے اپنے حصۂ شرعی کا مطالبہ کرتی ہے، تو کیا سکینہ کا یہ مطالبہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کی ماں اپنے شوہر کی جملہ زمین ہبہ کر چکی ہے؟

الجواب: ہبہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ موہوبہ چیز واہب کی ذاتی ملکیت ہو اس میں کسی اور کا حصہ نہ ہو، شرعاً کسی دوسرے کا حصہ بغیر اس کی اجازت کے ہبہ کرنے کا کسی کو اختیار

---

[1] قال العلامة الکاسانی رحمه الله: (والاذن نوعان صریح ودلالة (الیٰ ان قال) واما الدلالة فهی ان یقبض الموهوب له العین فی المجلس ولا ینهاه الواجب فیجوز قبضه استحساناً۔ بدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۲۴ کتاب الهبة فصل واما الشرائط فانواع بعضها یرجع الی نفس الرکن)
وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، ماده ۸۴۲ ص ۴۶۴ کتاب الهبة۔

حاصل نہیں اگرچہ وہ اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو، بنا بریں صورت مسئولہ میں سلمٰی اپنا حصّہ میراث تو بھائیوں کو ہبہ کر سکتی ہے اپنی بیٹی (سکینہ) کا حصہ ہبہ نہیں کر سکتی، اس لیے سکینہ کا مطالبہ جائز اور صحیح ہے۔

قال العلامة قاضی خانؒ: ولا یجوز للاب ان یهب شیئاً من مال ولده الصغیر بعوض و غیر عوض لانها تبرع ابتداءً۔ (فتاویٰ قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۸۰ فصل فی هبة الوالد لولده والعصبة للصغیر، کتاب الهبة)[1]

شروطِ فاسدہ سے ہبہ فاسد نہیں ہوتا

سوال:۔ بہن نے بھائیوں کو اپنی زمین بایں شرط ہبہ کر کے دیدی کہ اس موہوبہ زمین کے عوض بھائی اُسے کچھ زمین دیں گے، کیا یہ ہبہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ عوض مجہول القدر ہے اور شرط فاسد ہے لہٰذا ہبہ درست ہے اور بھائیوں پر عوض میں بہن کو کوئی زمین دینا لازم نہیں۔

قال العلامة الحصکفیؒ: (و) حکمها انها لا تبطل بالشروط الفاسدة (فهبة عبد علی ان یعتقه تصح و یبطل الشرط۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۵ ص۶۸۹ کتاب الهبة)[2]

مشروط ہبہ کا حکم

سوال:۔ زید نے بکر کو اس شرط پر زمین ہبۃً دیدی کہ وہ تاحیات زید کی خدمت کرے گا، لیکن بکر نے کچھ عرصہ کے بعد زید کی خدمت کرنا چھوڑ دی، تو کیا خدمت نہ کرنے کی وجہ سے زید کو موہوبہ زمین کے واپس

---

[1] قال العلامة ابن البزازؒ: لا یجوز الهبة لابنه الصغیر ایضاً کما لا یجوز للبائع۔ (البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۲۳۸ کتاب الهبة الجنس الثالث فی هبة الصغیر)
ومِثلُهٗ فی ردّ المحتار علی الدر المختار ج۵ ص۶۸۷ کتاب الهبة۔

[2] قال العلامة ابن نجیمؒ: والهبة لا تبطل بالشروط الفاسدة فدخل فیه کل عقد لا یبطل بالشروط الفاسدة کالنکاح والخلع والصدقة والصلح عن دم العمد والعتق فیصح و یبطل الاستثناء۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۹۶ کتاب الهبة۔ فصل ومن وهب امة الا حملها)
ومِثلُهٗ فی بدائع الصنائع ج۶ ص۱۱۷ کتاب الهبة۔

لینے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ حنفیہ کے نزدیک اگرچہ ہبہ میں رجوع کرنا جائز ہے مگر کراہت سے خالی نہیں لیکن جب ہبہ کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا گیا تو عدم شرط کی صورت میں رجوع کرنا بلا کراہت جائز ہے اگرچہ بالفاظ دیگر ہبہ منعقد ہی نہیں ہوتا ہے۔

قال العلامة قاضی خان رحمہ اللہ: والدلیل علیٰ ھٰذا ما ذکر فی کتاب الحج اذا ترکت المرأة مهرها علی الزوج علی ان یحج بها وقبل الزوج ذٰلك ولم یحج بها کان المهر علیه علیٰ حاله والفتویٰ علیٰ ھٰذا القول.

[فتاویٰ قاضی خان علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۸۲ کتاب الهبة فصل فی هبة المرأة مهرها من الزوج ۔] [1]

ہبہ سے رجوع کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ کیا واہب موہوب لہٗ سے ہبہ کی ہوئی چیز کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے یا کہ نہیں؟

الجواب:۔ واہب اور موہوب لہٗ کی رضامندی سے یا حاکم واپسی کا حکم کرے اور دوسرے موانع بھی موجود نہ ہوں تو رجوع جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں ورنہ بصورتِ دیگر رجوع کرنا حرام ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: (صح الرجوع فیها بعد القبض) اما قبله فلم تتم الهبة (مع انتفاع مانعه) الآتی (وان کره) الرجوع

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: والهبة لاتصح بدون الرضا وعلیٰ ھٰذا لو قال وهبت مهری منك علیٰ ان لاتظلمنی وعلیٰ ان یحج بی اوعلیٰ ان یهب لی کذا وان لم یکن ھٰذا شرطاً فی الهبة لایعود المهر۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۳۹۶ کتاب الهبة ۔ فی الجنس الثانی)

ومثله فی شرح المجلة للعلامة محمد خالد اتاسیؒ ج۳ ص۳۶۸ کتاب الهبة الفصل الاول فی بیان المسائل المتعلقة برکن الهبة وقبضها ۔

(تحریماً) وقیل تنزیہا نہا۔ (رد المحتار ج۵ ص۶۹۸ کتاب الهبة۔ باب الرجوع فی الهبة) ؂۱

موہوبہ زمین کے فروخت کرنے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! کیا موہوب لہٗ موہوبہ زمین کو فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر باقاعدہ طور پر شرعی ہبہ ہو چکا ہے تو موہوب لہٗ اس کا خود مختار مالک ہے اور اس میں اس کو ہر قسم کے مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہے۔

قال العلامة ابوبکر الکاسانی رحمه الله: واما اصل الحکم فهو ثبوت الملك للموهوب لهٗ فی الموهوب من غیر عوض۔ (بدائع الصنائع ج۶ ص۱۲۷ فصل واما حکم الهبة فالکلام فیه فی ثلاث مواضع) ؂۲

رشتہ داروں کو ہبہ کرنے سے حقِ رجوع ساقط ہو جاتا ہے

سوال: والد نے اپنی کل جائیداد اپنے بیٹے کے نام ہبہ کر دی ہے، تو کیا اب والد کو شرعاً رجوع کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب: کسی رشتہ دار کو اگرچہ ہبہ تملیک بلاعوض ہو چکا ہو تو اس صورت میں بھی رجوع جائز نہیں لہٰذا والد کو اپنی اولاد سے ہبہ واپس لینے کا حق حاصل نہیں۔

؂۱ قال العلامة محمد خالد اتاسیؒ: للواهب ان یرجع عن الهبة والهدیة بعد القبض برضی الموهوب لهٗ وان لم یرض الموهوب له راجع الواهب الحاکم وللحاکم فسخ الهبة ان لم یکن ثمة مانع من موانع الرجوع۔ (شرح مجلة الاحکام مادة ۸۶۴ ص۴۷۵ الباب الثالث فی احکام الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۵ فصل فی الرجوع فی الهبة۔

؂۲ قال العلامه ابن عابدینؒ رحمه الله: (هی تملیك العین مجاناً) ای بلاعوض۔ (ردّ المحتار ج۵ ص۶۸۷ کتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی کنز الدقائق ص۳۵۲ کتاب الهبة۔

قال العلامة المرغینانی رحمه الله : وان وهب هبة لذی رحم محرم لم یرجع فیها لقوله علیه السلام اذا کانت الهبة لذی رحم محرم لم یرجع فیها رواه البیهقی (الهدایة ج ۳ ص۲۸۷ کتاب الهبة - باب ما یصلح رجوعه ومالا یصلح) ۱؎

اولاد کے ہبہ میں تفاضل کا حکم

سوال :- کسی شخص کا اپنی اولاد کو ہبہ دینے میں کمی بیشی کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں بحالتِ صحت و ہوش و حواس اپنی تمام جائیداد بعض اولاد کو ہبہ کر دی اور بعض کو محروم رکھا اور اس سے دوسروں کا اضرار اور ان کو بلا وجہ محروم کرنا مقصود ہو تو اگرچہ قضاءً یہ ہبہ نافذ رہے گا لیکن دیانتاً گنہگار ہوگا۔ اور اگر کسی شرعی عذر مثلاً ایذا رسانی، ظلم و زیادتی اور نافرمانی کی وجہ سے محروم رکھا تو گنہگار نہ ہوگا بلکہ بقدرِ قوت سے زیادہ نہیں دینا چاہیئے تاکہ اعانت علی المعصیت لازم نہ آئے لیکن قضاءً ہر صورت میں ہبہ نافذ رہے گا، اور اگر کوئی وجہ تفاضل موجود نہ ہو تو مرد و زن کے درمیان تسویہ کرنا افضل ہے۔

قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله : الافضل فی هبة الابن والبنت التثلیث کالمیراث وعند الثانی التنصیف وهو المختار ولو وهب جمیع ماله من ابنه جاز وهو آثم نص علیه محمد رحمه الله ولو خص بعض اولاده لزیادة رشده لا بأس به وان کانا سواء لا یفعله وان اراد ان یصرف ماله الی الخیر وابنه فاسق فالصرف الی الخیر افضل من ترکه له لانه اعانة علی المعصیة وکذا لو کان ابنه فاسقا لا یعطیه اکثر من قوته۔ (البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۲۳۷ الجنس الثالث فی هبة الصغیر) ۲؎

۱؎ قال العلامة ابو البرکات النسفی رحمه الله : فلو وهب الذی رحم محرم منه لا یرجع فیها۔ (کنز الدقائق ص۳۵۵ کتاب الهبة)

وَمِثْلُهٗ فی مجلة الاحکام، مادة ۸۶۶ ص۴۷۶ کتاب الهبة الباب الثالث فی احکام الهبة۔

۲؎ قال العلامة القاضی خان رحمه الله : وروی المعلی رحمه الله عن ابی یوسف رحمه الله انه لا بأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوی بینهم یعطی للابنة مثل ما یعطی للابن۔

(الفتاوی القاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ فصل فی هبة الوالد لولده)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۷ ص۲۸۸ کتاب الهبة۔

ہبہ کے لیے واہب کی رضامندی ضروری ہے

سوال:- باپ نے اپنی بیٹی کو ہبہ میں کچھ سامان اور نقدی دیدی، بیٹی نے بقدر ضرورت اس میں سے لے لیا اور جو باقی بچا وہ باپ کو ہبہ کر دیا، کیا شرعاً یہ ہبہ صحیح ہے؟

الجواب:- اگر یہ ہبہ بلا جبر و اکراہ کے اپنی خوشی اور رضامندی سے ہو تو شرعاً صحیح ہے کیونکہ مہر مسمّیٰ معجل بعد القبض عورت کی ملک ہے اور اس میں اس کا تصرف نافذ ہے۔

قال العلامة محمد خالد اتاسی رحمه الله: یلزم فی الهبة رضا الواهب فلا تصح الهبة التی وقعت بالجبر والاکراه۔

(مجلة الاحکام، مادة ۸۶۰ ص۴۷۲ الباب الثانی فی شرائط الهبة) [1]

مرض الموت میں کیا گیا ہبہ درست نہیں

سوال:- ایک شخص نے مرض الموت میں اپنی کل جائیداد اپنی بیٹیوں اور بیوی کو دیئے بغیر اپنے چھ بیٹوں میں تقسیم کر دی جبکہ بیٹوں میں سے ایک بیٹا تقسیم جائیداد کے وقت نابالغ اور غیر موجود تھا، نابالغ لڑکا جو کہ اب بالغ ہو گیا ہے اِس تقسیم سے راضی نہیں ہے۔ تو شریعت اس کو اجازت دیتی ہے کہ باقی بھائیوں سے جائیداد کی ازسرِ نو تقسیم کرائے؟

الجواب:- یہ تقسیم میراث نہیں ہے بلکہ یہ ہبہ ہے اور مرض الموت میں کیا گیا ہبہ کالعدم ہے، جب تک کہ سب ورثاء اس پر راضی نہ ہوں۔ اور یہاں تو ایک دوسرا مانع بھی موجود ہے کہ ایک لڑکا ان میں سے نابالغ ہے اور نابالغ رضا کا

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردی رحمه الله: قال لها وهی لا تعلم العربیة قولی وهبت مهری منك فقالت وهبت لا تصح بخلاف الطلاق والعتاق لان الرضا شرط جواز الهبة۔ (البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۲۳۵ نوع فی هبة المهر وغیره)

وَمِثْلُهٗ فی الخانیة علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۸۱ فصل فی هبة المرأة مهرها من الزوج۔

اہل نہیں ہے، اس لیے یہ تقسیم اور ہبہ درست نہیں ہے لہٰذا تمام وارثوں پر ترکہ از سرِ نو قاعدہ میراث سے تقسیم کیا جائے گا۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : وهب فی مرضه ولم یسلم حتی مات بطلت الهبة لانه وان کان وصیة حتی اعتبر فیه الثلث فهو هبة حقیقة فیحتاج الی القبض۔ (ردّ المحتار علی الدر المختار ج۵ ص۷۰۷ باب الرجوع فی الهبة) [فروع] ؎۱

پوتے کو زمین ہبہ کرنے کے بعد خود اس پر قابض رہنے کا حکم

سوال: میرے باپ کا میرے دادا کی زندگی میں ہی انتقال ہو گیا تو دادا نے ۱۰ کنال زمین میرے نام کر دی لیکن یہ زمین دادا کی وفات تک اُن کے قبضہ میں ہی رہی، تو کیا اب میں اپنے چچوں سے زمین کا مطالبہ کر سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب: ہبہ کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ واہب موہوبہ شئے کو موہوب لہ کے قبضہ میں دے دے، جب تک ہبہ شدہ چیز پر قبضہ نہ کر لیا جائے اس وقت ہبہ تام نہیں ہوتا، صورتِ مسئولہ میں چونکہ ہبہ تام نہیں ہوا ہے اسلئے دادا کی وفات کے بعد جملہ مال ان کے بیٹوں یعنی آپ کے چچوں کا ہے آپ کو شرعاً رجوع کا حق حاصل نہیں۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله : وان وهب له اجنبی تتم بقبض ولیه وهو احد اربعة الاب ثم وصیه ثم الجد ثم وصیه۔ وقال ایضاً وتتم الهبة بالقبض الکامل فیشترط القبض قبل الموت۔ (الدر المختار علی صدر ردّ المحتار ج۵ ص۶۹۵،۶۹۶ کتاب الهبة) ؎۲

؎۱ قال العلامة محمد خالد اتاسی رحمه الله : واذا وهب واحد فی مرض موته شیئاً لاحد ورثته وبعد وفاته لم یجز سائر الورثة لاتصح تلک الهبة۔ (شرح مجلة الاحکام - مادة ۸۷۹ ص۳۸۳ الفصل الثانی فی هبة المریض) ومثله فی الهدایة ج۴ ص۶۵۷ کتاب الوصایا۔

؎۲ قال المفتی عزیز الرحمٰنؒ : اس صورت میں ہبہ صحیح نہیں اور ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ (عزیز الفتاویٰ الشهیر بفتاویٰ دار العلوم دیوبند ج۱ ص۶۷۸ کتاب الهبة)

چوری کا ہبہ شدہ مال اصل مالک کو لوٹانا واجب ہے

سوال:۔ ایک شخص نے کسی کو چوری کا مال ہبہ کیا، کچھ مدت کے بعد اس مال کا اصلی مالک بھی آ گیا اور اس نے موہوب لہ سے اپنے مال کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر اس نے یہ کہہ کر واپس کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ مال فلاں شخص نے مجھے ہبہ کیا ہے لہٰذا تم اسی سے مطالبہ کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس شخص (اصلی مالک) کا موہوب لہ سے اپنے مال کا مطالبہ کرنا درست ہے اور کیا اس کے ذمے مال واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر کسی نے چوری کا مال اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو ہبہ کیا ہوا اور بعد میں اس کا اصلی مالک آ جائے تو چوری کا موہوبہ مال اس کے اصلی مالک کو واپس کیا جائے گا اور اس کا دونوں سے مطالبہ کرنا درست ہے، البتہ جس کے پاس وہ مال موجود ہے اس پر واپس کرنا واجب ہے۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: (سوال) زید نے عمرو کی ایک چیز چرائی اور بکر کو ہبہ کر دی اور بکر نے خالد کو ہبہ کر دی، اب معلوم ہوا کہ زید نے چوری کی تھی، اس حالت میں شئے مسروقہ کا ادا کرنا کس کے ذمے واجب ہوگا؟

(الجواب) جس کے پاس اب ہے اس پر رد واجب ہے اور اگر اس کو خبر نہ ہو تو جس کو خبر ہو اُس پر خبر کرنا واجب ہے اور اگر اس صاحب خبر کو ہبہ میں بھی دخل ہے تو اس پر استخلاص اور استرداد میں بھی سعی واجب ہے۔ (امداد الفتاویٰ جلد۳ ص۴۷۵ کتاب الہبہ)

قرائن بھی تکمیلِ ہبہ کے لیے کافی ہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے بڑے بھائی نے بیٹی کی شادی کے لیے مجھے کچھ رقم دی، میں نے وہ رقم بیٹی کی شادی پر خرچ کر دی، اس بات کو تقریباً بیس سال گذر چکے ہیں اور اس دوران بڑے بھائی نے رقم کی واپسی کا تقاضا نہیں کیا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ جب بڑے بھائی نے مجھے رقم دی تھی تو اس نے قرض یا واپسی کی کوئی تصریح یا وضاحت وغیرہ نہیں کی تھی اور نہ اس کو واپسی کی کوئی امید تھی، اب ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد مجھ سے اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ تو کیا شرعاً بھائی کی اولاد کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ہبہ کی تکمیل کے لیے ایجاب وقبول یعنی ہبہ کی تصریح ضروری نہیں قرائن بھی تلفظ کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔ صورتِ مذکورہ کے مطابق بیس سال تک بھائی کا مطالبہ نہ کرنا،

اور رقم دے کر واپسی کی امید نہ رکھنا اور نہ ہی قرض کی تصریح کرنا، یہ سب چیزیں اس بات پر دال ہیں کہ آپ کو بڑے بھائی نے بیٹی کی شادی کے لیے جو رقم دی تھی وہ بطور ہبہ تھی، اس لیے اب اس کی اولاد کو رقم کی واپسی کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفيؒ: قلت فقد افادان التلفظ بالایجاب والقبول لایشترط بل تکفی القرائن الدالة علی التملیك لکن دفع الی الفقیر شیئًا وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشیء۔ (الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج۴ ص۵۰۸ کتاب الهبة)[1]

بیوی کا ہبہ کردہ حقِ مہر میں رجوع کرنا

سوال:۔ ایک عورت نے اپنا حقِ مہر شوہر کو ہبہ کر دیا، چند سال کے بعد کسی گھریلو ناچاکی کی وجہ سے اب وہ عورت شوہر سے حقِ مہر کا مطالبہ کرتی ہے، تو کیا شرعاً اس کا یہ مطالبہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ زوجین کا رشتہ قرابت داری کا رشتہ ہے، ان میں سے جو بھی دوسرے کو ہبہ کر دے تو بعد میں اس کو رجوع کرنے اختیار نہیں۔ اسی طرح صورتِ مسئولہ میں بھی جب بیوی نے ایک بار اپنا حق مہر شوہر کو ہبہ کر دیا تو اب اس کو رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامة المرغینانیؒ: وکذلك ما وهب احد الزوجین للآخر لان المقصود فیها الصلة کما فی القرابة۔ (الهدایه جلد۳ ص۲۷۴ کتاب الهبه)[2]

بچوں کے مال میں تصرف کرنا

سوال:۔ بعض یورپی ممالک مثلاً برطانیہ میں نابالغ بچوں کے لیے حکومت کی طرف سے کچھ وظیفہ مقرر ہوتا ہے جو صرف بچے کی تعلیم و تربیت پر خرچ کرنے کے لیے ہوتا ہے، اب اگر والدین اس پر

---

[1] قال العلامة داماد آفندیؒ: قالوا لو وضع ماله فی طریق لیکون ملکاً لرافع جاز فلا یشترط التصریح بالهبة۔ (الدر المنتقی فی شرح الملتقی فی ذیل مجمع الانهر ج۳ ص۴۹ کتاب الهبة)
وَمِثْلُهٗ فی امداد الفتاوی ج۳ ص۴۶۶ کتاب الهبة۔

[2] لما فی الهندیة: اذا وهب احد الزوجین لصاحبه لایرجع فی الهبة وان انقطع النکاح بینهما۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۸۶ کتاب الهبة، فصل رجوع فی الهبة)

قبضہ کرکے اس سے کوئی چیز خرید کر اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو تحفہ کے طور پر دیدیں تو کیا شرعاً والدین کو یہ حق ہے یا نہیں؟ اگر وہ اس طرح کریں تو کیا وہ ضامن ہوں گے یا نہیں؟

الجواب:۔ جو وظیفہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے حکومت مقرر کرتی ہے وہ صرف بچوں ہی کا حق ہے، اس کو صرف بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم پر خرچ کیا جائے گا، وظیفہ کی یہ رقم والدین کے ہاتھوں میں امانت ہوتی ہے، والدین کے لیے جائز نہیں کہ بلا عذر شرعی اس کو اپنے اوپر خرچ کریں یا اپنے کسی رشتہ دار یا احباب کو تحفہ کے طور پر دیں، اگر وہ اس طرح کریں گے تو ضامن ہوں گے۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: ولا یجوز ان یھب شیئاً من مال طفلہ ولو بعوض۔ (الدر المختار علیٰ ھامش رد المحتار ج۴ ص۷۰۷ کتاب الھبۃ قبل باب الرجوع فی الھبۃ) لہ

بے اولاد شخص کا زندگی میں اپنا مال تقسیم کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میں ایک بیمار اور عمر رسیدہ آدمی ہوں، میری کوئی اولاد نہیں صرف بوڑھی بیوی ہے، جبکہ میرے دو بھتیجے ہیں، ایک بڑے بھائی کا بیٹا ہے اور دوسرا چھوٹے بھائی کا بیٹا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہی اپنا سرمایہ ان میں تقسیم کر دوں۔ آپ سے استدعا ہے کہ شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اس بارے میں میری راہنمائی کریں؟

الجواب:۔ اگر آپ اپنا سرمایہ اپنی زندگی میں ہی اپنے ورثاء میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو شرعاً آپ کو اس کا اختیار ہے کہ جتنا جتنا چاہیں ورثاء میں تقسیم کر سکتے ہیں، لیکن اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے کل مال کا ۱/۴ حصہ اپنی بیوی کے نام کر دیں اور باقی مال کے دو برابر حصے کر کے ہر ایک بھتیجے کو ایک ایک حصہ دیدیں، اور اگر اس مال سے اپنے لیے بھی کچھ رکھنا چاہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ دونوں بھتیجوں کا

لہ لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: ماں باپ وغیرہ کو بچے کا مال کسی کو قرض دینا بھی صحیح نہیں بلکہ خود قرض لینا بھی صحیح نہیں۔ (بہشتی زیور ص۳۹۹ بچوں کو دینے کا بیان، کتاب الھبۃ والاجارۃ)

ان کے قبضہ میں دینا ضروری ہے ورنہ ہبہ تام نہ ہوگا۔

لما قال العلامة ابراھیم الحلبیؒ: ھی تملیك عین بلا عوض وتصح بایجاب و قبول وتتم بالقبض الکامل فان قبض فی المجلس بلا اذن صح وبعدہ لابد من الاذن۔ (ملتقی الابحر علی ھامش مجمع الانھر ج ۳ ص ۴۸۹ کتاب الھبة)

صرف انتقال کردینے سے ہبہ تام نہیں ہوتا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب نے سرکاری ملازمت کے دوران کچھ زمین خریدی تھی لیکن بعض قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے انہیں اس زمین کا انتقال اپنے دو بیٹوں کے نام کرانا پڑا مگر آخری دم تک زمین ان کے قبضہ میں نہیں دی، موت تک خود متصرف رہے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد اب وہ دونوں بھائی اپنے نام انتقال شدہ زمین کو اپنی موہوبہ زمین سمجھتے ہیں اور دوسرے بہن بھائیوں کو اس میں سے حصہ دینے کو تیار نہیں۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا شرعاً واقعی یہ انتقال شدہ زمین ان کی موہوبہ زمین ہے اور اس میں کسی دوسرے وارث کا کوئی حق نہیں؟

الجواب:۔ ہبہ میں جس طرح ایجاب وقبول ضروری ہے اسی طرح ہبہ تام ہونے کے لیے موہوبہ چیز پر قابض ہونا بھی لازمی عمل ہے، بغیر قبضہ کے صرف ایجاب وقبول یا کاغذی قانونی کاروائی سے ہبہ تام نہیں ہوسکتا۔ بعینہٖ اسی طرح آپ کے والد صاحب نے خریدی ہوئی زمین قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے مصلحتاً اپنے دو بیٹوں کے نام انتقال کرادی اور آخری دم تک ان کے قبضے میں نہیں دی اس لیے ہبہ تام نہیں ہوا، موصوف کی وفات کے بعد سب ورثاء حصہ شرعی کے مطابق برابر کے شریک ہیں، جن دو بھائیوں کے نام صرف زمین کا انتقال ہوچکا ہے وہ دیگر ورثاء (بہن بھائیوں) کو ان کے حق سے محروم کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ: (الجواب) اس صورت میں عمرو نے محفوظی جائیداد کے واسطے ایک حیلہ کیا ہے، پس زید کسی طرح اس جائیداد کا مالک نہیں ہوسکتا کیونکہ نہ تو استیلاءِ حاکم اس جائیداد پر پایا گیا کہ یوں کہیں کہ حاکم کی طرف سے زید کی ملکیت ہوگی اور نہ قبضہ زید کا اس جائیداد پر مالکانہ

پایا گیا۔ (امداد الفتاویٰ جلد ۳ ص۴۱۴ کتاب الدعویٰ) [1]

صرف منافع کے حصول کیلئے دی ہوئی چیز کا ہبہ تام نہیں ہوتا

سوال:۔ زید کے باپ نے ایک ٹیکسی موٹر کار خرید کر اس شرط پر زید کے حوالے کی کہ تم اس کے ذریعے مزدوری کر کے اپنے اہل و عیال کے لیے نان و نفقہ پیدا کرو مگر گاڑی میری ہوگی، اس معاہدے پر گواہ بھی موجود ہیں، اب جبکہ زید کے باپ کا انتقال ہوگیا ہے تو وہ گاڑی پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو اس کا اصلی مالک قرار دے رہا ہے اور دوسرے ورثاء کو حصہ دینے سے انکاری ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بیان مذکورہ بالا کے مطابق کیا واقعی زید اس گاڑی کا واحد مالک ہے یا دوسرے ورثاء کا بھی اس میں حصہ شرعی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بشرط صحتِ سوال زید اس گاڑی کا واحد مالک نہیں، والد کے انتقال کے بعد جملہ ورثاء اس میں برابر کے حصہ دار ہیں، اس لیے کہ والد نے ٹیکسی اس کو صرف منافع حاصل کرنے کے لیے خرید کر دی تھی، رأس المال کو اس کے قبضے میں نہیں دیا تھا کہ جس کی بناء پر زید کو گاڑی کا مالک تصور کیا جا سکے، لہٰذا زید کا والد کے انتقال کے بعد اپنے آپ کو گاڑی کا واحد مالک سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

---

[1] لما قال المفتی عبد الرحیم: (الجواب) والد اگر کسی مصلحت سے اپنے کسی بیٹے کے نام مکان خریدے تو وہ بیٹا محض اس کے نام پر خریدنے کی وجہ سے شرعی طور پر اس مکان کا مالک شمار نہ ہوگا۔
(فتاویٰ رحیمیہ جلد ۹ ص۲۸۶ کتاب الہبۃ)

كتاب
الغصب
والوديعة
والعارية

ليس على المستعير غير المغل ضمان ولا على المستودع غير المغل ضمان

کتاب الغصب

(غصب کے مسائل واحکام)

غاصب کا قبضہ

سوال: کیا غاصب کا قبضہ از روئے شرع قبضہ سمجھا جائیگا؟

الجواب: غاصب کے قبضے کا شریعت میں کچھ وزن نہیں اسی طرح جائیداد مغصوبہ میں غاصب کا تصرف کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ہاں جب مالِ مغصوبہ کا نام تبدیل ہو جائے یا اس کا اعظم منافع ختم کر دیا جائے تو اس وقت وہ غاصب کا مال کہلائے گا جیسے کسی نے گندم چرائی اور اس سے روٹی پکائی، لیکن غاصب کو ضمان ادا کرنا پڑے گا اور ضمان ادا کرنے سے قبل مالِ مغصوبہ سے انتفاع لینا جائز نہیں ہے۔

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله:۔ واذا تغيرت العين بفعل الغاصب حتى زال اسمها واعظم منافعها زال ملك المغصوب منه عنها وملكها الغاصب وضمنها ولا يحل له الانتفاع بها حتى يؤدي بدلها۔

(الهداية ج ۳ ص۳۷۴ کتاب الغصب۔ فصل فيما يتغير بفعل الغاصب)[1]

مالک کو اطلاع کیے بغیر ادائے حق سے برأت کا حکم

سوال: زید بکر کے ہاں محنت مزدوری کرتا ہے، اس دوران اُس نے بکر کی ایک قیمتی گھڑی چرالی، زید اب اپنے اس فعل پر نادم ہے اور بکر بھی زندہ

---

[1] قال العلامة خالد اتاسی رحمه الله: اذا غير الغاصب المال المغصوب على بصورة يتبدل بها اسمه يكون ضامناً ويبقى المال المغصوب له مثلاً لو كان المال المغصوب حنطة وجعلها الغاصب بالطحن دقيقاً فانه يضمن مثل الحنطة ويكون الدقيق له كما ان من غصب حنطة غيره وزرعها فى ارضه يكون ضامناً للحنطة والمحصول له۔

(شرح مجلة الاحكام، مادة ۸۹۹ ص۴۹۵ ج۳ الباب الاول فى احكام الغصب)

ومثله فى الهندية ج ۵ ص۱۲۱ کتاب الغصب، الباب الثانى فى احكام المغصوب اذا تغير بفعل الغاصب او غيره۔

ہے، لیکن واپس کرنے میں اگر بکبر کو پتہ چل گیا تو زید کو خدشہ ہے کہ وہ میری بے عزتی کرے گا، اب زید کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ بے عزتی بھی نہ ہو اور آخرت کے مواخذہ سے بچ سکے؟

الجواب:۔ کسی مسلمان کا مال اس کی اجازت کے بغیر لینا یا اس کو چوری کرنا حرام اور ناجائز ہے اور اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہے، اس لیے زید کو ہر حال میں گھڑی واپس کردینی چاہیئے اور اگر ظاہراً واپس کرنے میں بے عزتی کا خطرہ ہو تو کسی خفیہ تدبیر سے پہنچا دی جائے، مالک کو اطلاع دینا ضروری نہیں۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه الله :۔ (قوله ویبرأ برده) ای ردّ العین المغصوبة الی المغصوب منه ۔ (رد المحتار ج۶ ص۱۸۲ کتاب الغصب، مطلب فی ردّ المغصوب ... الخ) لہ

بلا اذن دوسروں کے جانور ذبح کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر بوقت ضرورت کسی دوسرے شخص کے جانور کو بغیر اس کی اجازت کے ذبح کر لیا جائے اور بعد میں قیمت طے کر کے دے دی جائے تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مالک کی اجازت کے بغیر ایسا کرنا شرعاً ناجائز اور غصب ہے، مالک کو اختیار ہے کہ وہ زندہ جانور کی قیمت لے اور مذبوح جانور ذابح کے حوالہ کرے یا مذبوح جانور کو لے کر ذبح کی وجہ سے اس کی قیمت میں جو کمی آئی ہے وہ غاصب سے پوری کرے۔ البتہ اگر اذنِ عرفی موجود ہو تو ایسا کرنا جائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: قال فی العمادیة فی فصل ۳۲ ومن ذبح شاة غیره فمالکها بالخیار ان شاء ضمنه قیمتها وسلمها الیه وان شاء اخذها وغرمّها النقصان ۔

(تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۷۵ کتاب الغصب) لہ

لہ قال العلامة قاضیخانؒ: غصب دراهم انسان من کیسه ثم ردّها فی کیسه وهو لا یعلم یبرأ۔ (فتاویٰ خانیة علیٰ هامش الهندیة ج۶ ص۱۷۹ جنس آخر فی المتفرقات) ــــ ومثلهٗ فی مجلة الاحکام لرستم باز، المادة ۸۹۲ ص۴۹۲ ۔

لہ قال العلامة قاضیخانؒ: رجل ذبح شاة انسان ظلماً فصاحبها بالخیار ان شاء ترک المذبوح علیه وضمنه قیمتها وان شاء اخذ المذبوح وضمنه النقصان ۔ (فتاویٰ خانیة علیٰ هامش الهندیة ج۳ ص۲۴۵ کتاب الغصب) ومثلهٗ فی الهدایة ج۴ ص۳۷۸ کتاب الغصب ۔

مغصوبہ زمین کی واپسی کے بعد حاصل کردہ منافع کا حکم

سوال:۔ زید نے بکر کی زمین غصب کرلی اور اس سے دس سال تک پیداوار حاصل کرتا رہا جس کا ایک مخصوص حصہ مساجد اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کرتا رہا اور کچھ حصہ پیداوار کا اپنے استعمال میں لاتا رہا، کافی کوشش کے بعد بکر نے اپنی غصب کی ہوئی اپنی زمین زید سے واپس لے لی، تو کیا بکر زید سے رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً کسی کا مال غصب کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا حرام ہے، زمانۂ غصب میں جو کچھ بھی مغصوبہ سے حاصل ہوا ہو وہ مغصوب عنہ کا حق ہے۔ بنابرایں بکر اپنی مغصوبہ زمین کی جملہ پیداوار کا مطالبہ کرسکتا ہے، اسی طرح مغصوبہ زمین کی بازیابی کے بعد مساجد اور دیگر رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا بھی مطالبہ کرسکتا ہے مگر علاقے کے عرف کے مطابق غاصب کو اجرِ مزارعت دینا لازم ہوگا۔

وفی الهندية: وسئل شيخ الاسلام عطاء بن حمزة عمن زرع ارض انسان ببذر نفسه بغير اذن صاحب الارض هل لصاحب الارض ان يطالبه بحصة الارض قال نعم ان جرى العرف في تلك القرية انهم يزرعون الارض بثلث الخارج او ربعه او نصفه او بشيء مقدر شائع يجب ذلك القدر الذي جرى به العرف۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۴۴ الباب العاشر في زراعة الارض المغصوبة) [1]

---

[1] قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: فالحاصل ان من زرع ارض غيره بلا اذنه ولو على وجه الغصب فان كانت الارض ملكاً واعدها ربها للزراعة اعتبر العرف في الحصة ان كان ثمة عرف والا فان اعدها للايجار فالخارج كله للزارع وعليه اجر مثلها لربها والا فان انتقصت فعليه النقصان والا فلا شيء عليه۔

(تنقيح الحامدية ج۲ ص۱۷۲ كتاب الغصب)

ومثله في الفتاوى الكاملية ص۲۰۹ كتاب الغصب۔

بغیر اجازت کے کسی کی زمین سے مٹی لانا

سوال :- زید کی مملوکہ زمین میں ایک ٹیلہ ہے لوگ اس سے مٹی لے آتے ہیں، زید کسی کو منع بھی نہیں کرتا، تو کیا زید کی اجازت کے بغیر اُس ٹیلے سے مٹی لانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- اصول یہ ہے کہ کسی کی مملوکہ زمین سے مٹی وغیرہ لانا بغیر اس کی اجازت کے جائز نہیں، لیکن اجازت کے لیے صراحتاً کہنا ضروری نہیں قرینہ اجازت بھی کافی ہے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ زید اپنی زمین سے مٹی لینے سے کسی کو منع نہیں کرتا تو یہ اجازت پر دال ہے، اس لیے اُس سے اجازت لیے بغیر بھی مٹی لائی جا سکتی ہے۔

قال العلامة الحصکفیؒ: ولا سقی ارضه وشجره وزرعه ونصب دولاب ونحوها من نهر غیره وقناته وبئره الا باذنه لان الحق له فیتوقف علی اذنه۔ (الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۱ ص ۴۳۹ فصل الشرب) [1]

بلا کرایہ سفر کرنے پر ذمہ سے فارغ ہونے کا طریقہ

سوال :- میں دو تین بار کراچی سے پشاور تک ریل میں بغیر ٹکٹ کے آیا ہوں، اُس وقت مجھے کوئی خیال نہیں تھا کہ میں یہ کام ناجائز کر رہا ہوں، اب میں چاہتا ہوں کہ اس حقِ غیر سے کسی طرح اپنا ذمہ فارغ کر سکوں، مہربانی فرما کر اس سلسلہ میں میری راہنمائی فرمائیں ؟

الجواب :- بس یا ریل میں بغیر کرایہ ادا کیے سفر کرنا جائز نہیں، کرایہ کے پیسے ادا کرنا واجب ہے اور اگر کبھی بغیر کرایہ کے سفر کیا گیا تو اس کی ادائیگی اور ذمہ سے فارغ ہونے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس ادارے سے اتنی مسافت کا ٹکٹ خرید کر استعمال میں لائے بغیر اُسے ضائع کر دیا جائے تو اس سے حق ادا ہو جائے گا۔ جہاں تک آپ کے مسئلہ کا تعلق ہے تو آپ اس طرح کریں کہ جتنی بار آپ کراچی سے پشاور بغیر کرایہ ادا کیے آئے ہیں اتنی دفعہ کرایہ کا حساب کر کے اتنی مالیت کی ٹکٹ خرید کر اُسے ضائع کر دیں، اس طرح آپ کا ذمہ فارغ ہو

---

[1] لما قال العلامة اشرف علی التھانویؒ : اس سے معلوم ہوا کہ بغیر اجازتِ مالک کے اپنے کھیت کو پانی دینا یا مٹی لانا جائز نہیں ہے۔ (امداد الفتاوی ج ۳ ص ۴۵۲ کتاب الغصب)

جائے گا۔

لما قال العلامۃ اشرف علی التھانویؒ: (الجواب) زید کو یہ دیکھنا چاہئیے کہ میرے ذمہ کتنا کرایہ واجب ہے، اسی قدر داموں کا ایک ٹکٹ اسی ریلوے کا خرید کر اس ٹکٹ کو ضائع کرے اس سے کام تہ ہے، حق واجب کمپنی کا ادا ہوجاوے گا۔ (امداد الفتاوی ج ۳ ص ۴۴۶ کتاب الغصب)

پرنالہ بند کرنے کا مسئلہ

سوال:۔ ایک صاحب کے مکان کے عقب (پچھواڑے) میں میری مملوکہ زمین ہے اب میں اس پر مکان بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس شخص کے مکان کا پرنالہ میری زمین کی طرف ہے میں نے اس کو پرنالہ بند کرنے کا کہا تو اس نے انکار کردیا اور اصلاحی جرگہ میں میرے خلاف شکایت کردی۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا مجھے شرعاً اس کا پرنالہ بند کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اگر یہ جگہ واقعی آپ کی ملکیت ہے اور پرنالے کا پانی آپ ہی کی مملوکہ زمین پر گرتا ہو تو آپ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ آپ اس پرنالہ کو بند کردیں، اور اگر پرنالہ کا پانی گرنے کی جگہ صاحبِ مکان کی ملکیت ہو تو پھر آپ کو پرنالہ بند کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ المرغینانیؒ: ومن اشتری بیتاً فی دارٍ ومنزلاً اومسکناً لم یکن لہٗ طریق الا ان یشتریہ بکل حق ھو لہ المرافقہ او بکل قلیل وکثیر وکذا الشرب والمسیل۔ (الہدایہ جلد۳ ص۸۸ کتاب البیوع، باب الحقوق)[1]

---

[1] لما قال الشیخ مولانا اشرف علی التھانویؒ: مسیل یعنی پرنالہ و بدرو وغیرہ نکالنا حقوق ملک سے ہے جو شخص اس جگہ کا مالک ہے اس کو ہر طرح تصرف کا حق پہنچتا ہے، پس یہ شخص جو حقِ پرنالہ ہمسایہ کو زائل کرنا چاہتا ہے، اگر وہ پرنالہ گرنے کی جگہ اس شخص کی مملوک ہے اور اب تک بطور تبرع واحسان ورعایت ہمسایہ کو پانی ڈالنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اب زائل کرنا چاہتا ہے اور پرنالہ بند کرنا چاہتا ہے تو یہ جائز ہے، اپنی ملک کا اختیار ہے اور اگر یہ جگہ ہمسایہ کی مملوک ہے تو اس شخص کو اس کا پرنالہ بند کرنا جائز نہیں کہ یہ غصب ہے۔
(امداد الفتاوی جلد۳ ص۴۴۵ کتاب الغصب)

کتاب الودیعۃ والعاریۃ
(امانت اور عاریت کے مسائل و احکام)

امین کو امانت میں تصرف کا حق ہے

سوال:۔ کسی امین کو امانت میں تصرفات کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟

الجواب:۔ امین پر امانت کی حفاظت لازمی ہے اس کی حفاظت کے لیے جو بھی تدبیر اختیار کرنا پڑے کر سکتا ہے مگر حفاظتی تدابیر کے علاوہ دیگر تصرفات کرنا ناجائز ہے بصورت ہلاکت ضامن ہوگا۔

وفی الهندیة: والودیعة لا تودع ولا تعار ولا توجر ولا ترهن وان فعل شیئاً منها ضمن کذا فی البحر الرائق ۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۳۸ کتاب الودیعة) [1]

امانت ضائع ہو جانے پر ضمان کا حکم

سوال:۔ زید نے عمرو کو کچھ رقم کاروبار کے لیے دیدی، عمرو کاروبار کے سلسلے میں سفر پر چلا گیا، سفر کے دوران اُس نے رقم اپنے رفیقِ سفر کو دے دی جس سے کسی نے وہ رقم چوری کرلی، تو کیا زید اب عمرو سے ضمان کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ محمود سے یہ رقم برفاقت عمرو ضائع ہوگئی ہے لہٰذا ان دونوں میں سے کسی پر ضمان نہیں ہے، تاہم اگر عمرو محمود سے جُدا ہو چکا تھا تو ہلاکت کی صورت میں عمرو زید کا ضامن ہوگا۔

قال العلامة سلیم رستم باز: ثم اعلم ان المستودع الاول انما یضمن اذا اودع الودیعة وهلکت بعد ان فارقها واما قبله فلا ضمان علی احد لان الثانی قبض المال من ید امین کما مر والاول لا یکون بالدفع ضمیناً مالم یفارق بحضوره

---

[1] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله: والودیعة لا تودع ولا تعار ولا تؤجر ولا ترهن وان فعل شیئاً منها ضمن ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۲۹۱ کتاب العاریة) ـــــ ومثله فی شرح مجلة الاحکام، ماده ۱۷۷، ص۳۲۶ الباب الاول فی عمومیة الامانات ۔

رایة فاذا فارق فقد ترک الحفظ اللازم بالتزامه فیضمن بترکه. (مجمع الانهر)

(شرح مجلة الاحکام، مادة ۷۹۰ ص۴۳۸) ۱؎

امانت پر اُجرت لینے کا حکم

سوال :- امانت کی حفاظت کرنے پر اُجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگر حفظِ ودیعت کو مودع پر شرط کرکے اجرت مقرر کر دی جائے تو جائز ہے اور اس صورت میں اگر مودع سے شئے امانت کسی ایسے عمل سے ضائع ہو جائے جس سے بچنا ممکن تھا تو مودع ضامن ہے ورنہ ضامن نہیں۔

وفی مجلة الاحکام : الودیعة امانة فی ید الودیع فاذا هلکت بلا تعدٍ منه وبدون صنعه وتقصیره فی الحفظ لایضمن ولکن اذا کان الایداع بأجرة فهلکت اوضاعت بسبب یمکن التحرز عنه لزم المستودع ضمانها۔

(شرح مجلة الاحکام۔ مادة ۷۷۷ ص۴۳۱ فی احکام الودیعة وضمانها) ۲؎

مودع کی وفات پر ورثاء کو مطالبہ کا حق ہے

سوال :- زید کی امانت بکر کے پاس رکھی ہوئی تھی کہ اچانک زید کی وفات ہوگئی، اس کے پسماندگان میں بیوی بچے ہیں لیکن نا قابلِ اعتماد ہیں، تو بکر یہ امانت کس کے حوالے کرے؟

الجواب : صورتِ مسئولہ میں زید کے ورثاء کے مطالبے پر امانت کی واپسی ضروری ہے

۱؎ قال العلامة ابن نجیم المصری رحمه الله : فافاد ان المودع لایودع فان اودع فهلکت عند الثانی ان لم یفارق الاول لاضمان علیٰ واحدٍ منهما وان فارقه ضمن الاول عند ابی حنیفة ولایضمن الثانی۔ (البحر الرائق ج۷ ص۲۷۴ کتاب الودیعة)

وَمِثْلُهٗ فی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج۴ ص۲۰۳ کتاب الودیعة۔ الثانی فیما یکون اضاعة۔ الخ

۲؎ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمه الله : وفی آخر کتاب الغصب من شرح الطحاوی المودع اذا شرط الاجر للمودع علیٰ حفظ الودیعة صح۔ (خلاصة الفتاویٰ ج۴ ص۲۸۹ الفصل السادس فی المتفرقات)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۴ ص۳۷۳ الباب التاسع فی المتفرقات۔

لیکن اگر یہ یقین یا غالب ظن ہو کہ ورثاء اس مال کو ضائع کر دیں گے تو پچیس سال کی عمر تک نہ دیا جائے۔

وفی الهندية: واذا مات رب الوديعة فالوارث خصم فی طلب الوديعة کذا فی المبسوط۔ (الفتاوی الهندية ج۴ ص۳۵۴ الباب السابع فی رد الوديعة)[1]

امانت کے ضائع ہونے کے خدشہ کی صورت میں فروخت کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کسی امانت کے بارے میں اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اور مالک تک رسائی بھی مشکل ہو تو ایسی صورت میں امانت کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے؟ کیا اسے فروخت کر کے رقم مالک کو دی جاسکتی ہے؟

الجواب:۔ امانت میں بنیادی طور پر مالک کے حقوق کی رعایت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ امانت میں خیانت حرام اور ناجائز ہے، امانت مالک کو اصل حالت میں واپس کرنا مودع کی ذمہ داری ہے، لیکن جہاں کہیں امانت کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو ایسی حالت میں مالک سے رابطہ کر کے اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے اور اگر کسی وجہ سے مالک سے رابطہ ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں حاکم وقت کو اطلاع دے کر تحفظِ امانت کی صورت تلاش کی جائے، اور اگر حاکمِ وقت سے بھی رابطہ کی صورت میسّر نہ ہو تو پھر اہل رائے سے مشورہ کر کے امانت کو فروخت کر کے اس کی قیمت مالک کے لیے محفوظ رکھی جائے۔ تاہم ان تمام صورتوں میں مالک سے ہمدردی کا جذبہ محرک رہے گا اور اگر حتی المقدور کوشش کے باوجود امانت ضائع ہوگئی تو محافظ پر کوئی تاوان لازم نہیں۔

قال العلامة خالد اتاسی رحمه الله:۔ اذا کان صاحب الوديعة غائباً غيبة منقطعة بحيث لا يعلم موته ولا حياته يحفظها المستودع الی ان يعلم موت صاحبها اما اذا کانت الوديعة ممّا يفسد بالمکث يبيعها المستودع باذن الحاکم ويحفظ ثمنها امانة عنده لکن اذا لم

---

[1] قال العلامة خالد اتاسی رحمه الله: واذا مات المودع تسلم الوديعة لوارثته (مجلة الاحکام مادة ۸۰۲ ص۲۴۶ الفصل الثانی۔ فی احکام الوديعة وضمانها)

ومثله فی رد المحتار ج۵ ص۶۶۶ کتاب الوديعة۔

یبیعھا ففسدت بالمکث لایضمن ۔ (مجلۃ الاحکام، مادۃ ۷۸۵ ص۳۵۴ الفصل الثانی فی احکام الودیعۃ) [1]

عاریتہً دی ہوئی چیز کے واپس لینے کا حکم

سوال:۔ زید نے عمرو کو اپنی زمین پھلوں کی کاشت کے لیے عاریتاً دیدی اور عمرو نو سال تک اس زمین سے پیداوار حاصل کرتا رہا، لیکن اب زید پیداوار میں حصہ مانگتا ہے اور زمین بھی واپس لینا چاہتا ہے۔ کیا از روئے شریعت زید کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی زمین واپس لے؟ اور کیا زید پیداوار میں حصہ لینے کا حق دار ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ زید نے عمرو کو زمین عاریتاً دی ہے اس لیے زید کو اپنی زمین واپس لینے کا حق تو حاصل ہے لیکن اسکی پیداوار میں حصہ لینے کا حقدار نہیں ہے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحؒ: (ولو اعار ارضاً للبناء والغرس صح) للعلم بالمنفعۃ (ولہ ان یرجع متی شاء۔ (رد المحتار ج۵ ص۶۸۳ کتاب العاریۃ) [2]

معیر یا مستعیر کی موت سے اعارہ فسخ ہوتا ہے

سوال:۔ رشید خان فرید خان کی خدمت کرتا ہے، فرید خان نے خدمت کے عوض میں رشید خان کو دس کنال زمین دیدی، رشید خان زمین کی پیداوار سے فائدہ اٹھاتا رہا، اب جبکہ رشید خان بوڑھا ہو گیا ہے اور خدمت کرنے کے قابل نہیں رہا تو فرید خان نے مذکورہ زمین رشید خان سے لے کر اس کے بیٹے جاوید خان کو دے دی، کچھ وقت گذرنے کے بعد فرید خان کی جائیداد کسی وجہ سے حکومت نے

---

[1] وفی الھندیۃ: اذا کانت الودیعۃ شیئاً یخاف علیہ الفساد وصاحب الودیعۃ غائب فان رفع الامر الی القاضی حتی یبیعہ جاز وھو الاولیٰ وان لم یرفع حتی فسدت لاضمان علیہ لانہٗ حفظ الودیعۃ علیٰ ما امر بہ کذا فی المحیط۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۴ ص۳۴۴ الباب الرابع، کتاب الودیعۃ)
ومثلہٗ فی فتاویٰ سراجیۃ علیٰ ھامش قاضی خان ج۴ ص۴۳۵ کتاب الودیعۃ۔

[2] قال العلامۃ المرغینانی رحؒ: واذا استعار ارضاً لیبنی فیھا او لیغرس جاز وللمعیر ان یرجع فیھا ویکلفہ قلع البناء والغرس۔ (الھدایۃ ج۳ ص۲۸۱ کتاب العاریۃ)
ومثلہٗ فی خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۲۹۳ کتاب العاریۃ۔

ضبط کر لی لیکن جاوید خان کی دس کنال زمین بدستور اس کے تصرف میں ہے۔ اب جاوید خان کا دوسرا بھائی سلیم خان دعویدار ہے کہ چونکہ یہ زمین ہمارے والد صاحب کی ملکیت ہے اس لیے میں بھی اس زمین میں حقدار ہوں۔ کیا ازروئے شرع سلیم خان کا اس زمین میں کچھ حق بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ معاملہ کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرید خان نے رشید خان کو جو زمین دی تھی وہ عاریتاً دی تھی نہ کہ بطورِ ملکیت، اس لیے کہ جب رشید خان بوڑھا ہو گیا تو زمین واپس لے کر اس کے لڑکے جاوید خان کو دے دی، لہٰذا معلوم ہو گیا کہ یہ دینا عاریتاً تھا نہ کہ بطور تملیکاً، اس لیے مذکورہ زمین اگر فرید خان زندہ ہو تو اس کی ملکیت ہے نہ کہ رشید خان اور بیٹوں کی، اور اگر فرید خان فوت ہو چکا ہے تو یہ زمین اس کے وارثوں کی ہے اور اعارہ بسبب اس کی وفات کے فسخ ہو چکا ہے۔

قال العلامة خالد اتاسی رحمه الله: تنفسخ الاعارة بموت المعير او المستعير۔

(مجلة الاحکام۔ مادة ۸۰۷ ص۴۲۸ الباب الثالث الفصل الاول) [۱]

معیر اور مستعیر کا اجارہ اور عاریت میں اختلاف

سوال: زید نے بکر سے مکان کے لیے لکڑیاں حاصل کیں اور لکڑیاں واپس کرتے وقت بکر نے دعویٰ کیا کہ لکڑیاں اجارہ پر دی گئی تھیں نہ کہ عاریتاً، جبکہ زید کا کہنا ہے کہ لکڑیاں عاریتاً حاصل کی گئی تھیں، اب اس اختلاف کو حل کرنے میں ہماری راہنمائی فرمائیں؟

الجواب:۔ اگر بکر گواہوں کے ذریعے سے یہ ثابت کر دے کہ زید نے لکڑیاں اجارہ پر حاصل کی تھیں تو زید اجرت دینے کا پابند ہوگا ورنہ عاریتاً پر محمول ہوگا اور کرایہ دینے سے بری ہوگا۔

---

[۱] قال العلامة قاضی خان رحمه الله: واذا مات المستعير او المعير تبطل الاعارة كما تبطل الاجارة بموت احد المتعاقدين۔

(فتاویٰ خانية علیٰ هامش الهندية ج ۳ ص۳۸۲ فصل فيما يضمن المستعير)

وَمِثْلُهٗ فی سراجية علیٰ هامش فتاویٰ قاضی خان ج۳ ص۸۲ کتاب العارية۔

وفی الهندیة: واذا قال اعرتنی دابتك وهلكت وقال المالك غصبتها منی فلاضمان علیه ان لم یكن ركبها فان كان قد ركبها فهو ضامن وان قال اعرتنی وقال المالك اجرتكها وقد ركبها وهلكت من ركوبه فالقول قول الراكب ولاضمان علیه كذا فی المحیط۔ (الفتاوی الهندیة ج۴ ص۳۷۲ كتاب العاریة، الباب الثامن فی الاختلاف الواقع فی هذا الباب والشهادة فیه)[1]

امانت رکھنے والا واپس نہ آئے تو امانت کا حکم

سوال:- اگر کوئی شخص کسی کے پاس کچھ رقم بطور امانت رکھے اور وہ امانت لینے کے لیے واپس نہ آئے تو امین اُس رقم کے ساتھ کیا کرے؟

الجواب:- امین کو اگر امانت رکھنے والے کا اتہ پتہ معلوم نہ ہو پھر بھی اسے چاہیئے کہ کسی نہ کسی ذریعے سے امانت پہنچانے کی کوشش کرے ورنہ اسکی موت کی صورت میں اس کے ورثاء کے حوالے کر دے، اور اگر کوشش کے باوجود اس کا یا اس کے ورثاء کا علم نہ ہو سکے تو خود اس مال کو امانت رکھنے والے کی طرف سے صدقہ کردے یا صدقہ کی وصیت کر جائے، البتہ اگر امین فقیر ہو تو خود بھی کھا سکتا ہے، اور اگر صدقہ کرنے کے بعد مال کا مالک واپس آجائے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو امین سے اپنے مال کا مطالبہ کرے یا صدقہ رہنے دے۔

قال العلامة الحصكفی رحمه الله: فینتفع الرافع بها لو فقیرًا والا تصدق بها علی فقیر ولو علی اصله وفرعه وعرسه..... فان جاء مالكها بعد التصدق خیر بین اجازة فعله ولو بعد هلاكها وله ثوابها او تضمینه۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۴ ص۲۷۹-۸۰ كتاب اللقیط)

---

[1] قال العلامة خیر الدین الرملیؒ: وان قال اعرتنی وقال المالك اجرتكها وهلكت من ركوبه فالقول قول الراكب ولاضمان علیه كذا ذكره كثیر من علمائنا۔

(فتاوی خیریة علی هامش تنقیح الحامدیة ج۲ ص۱۷۱ كتاب العاریة)

وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۳ ص۳۱۴ كتاب الاجارات۔

مجبوری کے تحت امانت فروخت کرنے کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب! آج سے دو سال قبل ایک افغان مہاجر نے ہمارے پاس دو بوری گندم امانت رکھی تھی اور خود کہیں چلا گیا، اس کے بعد سے آج تک ہمارا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے اور نہ ہمیں اس کے گھر بار کا کوئی علم ہے، جبکہ اس کی گندم پڑی پڑی خراب ہو رہی ہے۔ ان حالات میں شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے اس کا کوئی حل بتائیں؟ کیا ہم اس گندم کو فروخت کر کے اس کی قیمت بطورِ امانت محفوظ رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب :- بلا ضرورتِ شدیدہ کسی کی امانت میں تصرّف کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا تاہم مجبوری کے تحت بہت سارے محظورات میں بھی گنجائش نکل آتی ہے۔ چونکہ صورتِ مسئولہ میں بھی ضرورتِ شدیدہ ہے اس لیے شرعاً آپ عدالت سے اجازت لیکر اس گندم کو فروخت کر کے اس کی قیمت کو اپنے پاس بطورِ امانت محفوظ رکھیں لیکن اگر عدالت تک رسائی ممکن نہ ہو اور گندم کے ضائع ہونے کا خوف ہو تو پھر چند مسلمانوں کے سامنے اسے فروخت کر کے رقم محفوظ رکھیں۔

لما فی الهندية : وان كانت الوديعة شيئاً لا يمكن ان يؤاجر فالقاضي يأمره بأن ينفق من ماله يوماً او يومين او ثلاثة رجاء ان يحضر المالك ولا يأمره بالانفاق زيادة على ذلك هل بل يأمره بالبيع و امساك الثمن۔

(الفتاوى الهندية ج ۵ ص ۳۲۲ كتاب الوديعة) [1]

---

[1] وقال مولانا عبدالكريم : وفي العالمگيرية : وان كانت الوديعة شيئاً لا يمكن ان يؤاجر فالقاضي يأمره بأن ينفق من ماله يوماً او يومين او ثلاثة رجاء ان يحضر المالك ولا يأمره بالانفاق زيادة على ذلك بل يأمره بالبيع و امساك الثمن۔ اھ

وفي ديارنا لا يمكن الرفع إلى القاضي فجماعة المسلمين قائمة مقامه۔

اس سے معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں بکرے کو فروخت کر کے اس کی قیمت امانت میں رکھنی چاہیئے، مگر خود تنہا فروخت نہ کرے بلکہ چند معتبر مسلمانوں کی رائے سے فروخت کرے۔ (امداد الاحکام ج ۳ ص ۶۱۳ کتاب الودیعۃ)

كتاب
احياء الموات
والمزارعة

من احيأ ارضا
ميتة فهي له

کتاب احیاء الموات

(بنجر زمین کو آباد کرنے کے احکام و مسائل)

ایسی زمین آباد کرنا جس کے مالکان لاپتہ ہوں

سوال:- ایک قطعۂ زمین قیام پاکستان سے قبل کا بیکار پڑا ہے، اس کے مالکان اسی وقت سے افغانستان چلے گئے تھے، اس کے بعد سے آج تک اس زمین کے ساتھ اُن کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اب اگر کوئی اس زمین کو آباد کرے تو کیا وہ اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- اگر واقعی یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں اور عرصۂ دراز سے غیر آباد پڑی ہے اور قریب کے دیہات کے مصالح و منافع اس سے متعلق نہیں تو حکومت کی اجازت سے جو بھی آباد کرے گا مالک بن جائے گا۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰی ارضًا میتۃ فھی لہٗ۔

(سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات) [1]

اگر اذنِ امام نہ ہو تو احیاء موات میں ملکیت کے ثبوت کا حکم

سوال:- امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک احیاء موات میں اذنِ امام شرط ہے، سوال یہ ہے کہ جہاں امام نہ ہو وہاں احیاء موات سے ملکیت کیسے ثابت ہو گی؟

الجواب:- احیاء موات کے لیے امام صاحبؒ کے نزدیک حکومت کی اجازت ضروری ہے لیکن صاحبینؒ کے نزدیک اذنِ امام شرط نہیں، اگرچہ اس مسئلہ میں راجح قول امام صاحبؒ کا ہے لیکن جہاں امام نہ ہو تو صاحبینؒ کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے گا، بہ

---

[1] اخرجہ الامام ابوداؤدؒ: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰی ارضًا میتۃ فھی لہ ولیس لعرق ظالم حق۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات)

وَمثلہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱ کتاب احیاء الموات۔

معاشرتی حالات کے زیادہ موافق ہوگا، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بھی اذنِ امام شرط نہیں، ظاہر حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

اخرجه الامام ترمذیؒ: قال النبیّ صلی الله علیه وسلم من احییٰ ارضاً میتة فهی له۔ (سنن ترمذی ج ا ص۲۵۶ باب احیاء الموات) ؎۱

احیاء موات میں راجح قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے

سوال:۔ ایک بنجر زمین کو چند افراد نے قابلِ کاشت بنایا ہے، بعض علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ افراد اس زمین کے مالک نہیں بن سکتے کیونکہ انہوں نے حکومت سے باضابطہ اجازت نہیں لی ہے، سوال یہ ہے کہ حکومت کی اجازت کے بغیر احیاء موات سے ملکیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے بادشاہِ وقت کی اجازت ضروری ہے یا نہیں، اس میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کا اختلاف ہے، امام صاحبؒ کے نزدیک بادشاہ کی اجازت ضروری ہے صاحبینؒ کے نزدیک ضروری نہیں لیکن امام صاحبؒ کا قول راجح ہے اور متونِ فقہ میں یہی قول مذکور ہے۔

قال العلامة ابن عابدینؒ: وقول الامام هو المختار ولذا قدمه فی الخانیة والملتقیٰ کعادتهما وبه اخذ الطحاوی وعلیه المتون۔

(ردالمحتار ج ۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات) ؎۲

لیکن جہاں کہیں امام نہ ہو تو صاحبینؒ کے مذہب پر فتویٰ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

؎۱ قال العلامة الزیلعی رحمه الله: وقالا یملکه من احیاه ولا یشترط فیه اذن الامام علیه الصلوٰة والسلام من عمر ارضاً لیست لاحد فهو احق بها۔

(تبیین الحقائق ج ۶ ص۳۵ کتاب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی الهندیة ج ۳ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔

؎۲ لمافی الهندیة: ومن احیاه باذن الامام ملکه وهذا عند ابی حنیفةؒ و قالا یملکه من احیاه ولا یشترط فیه اذن الامام .... والملک فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفةؒ وعند ابی یوسفؒ ومحمدؒ یثبت بنفس الاحیاء۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔ الباب الاول۔

سوال :۔ آبادی سے دور ایک | جنگل کو آپس میں تقسیم کرنے سے لوگ اس کے مالک نہیں بن سکتے

درخت دار جنگل ہے، اگر لوگ اس کو آپس میں تقسیم کرلیں تو کیا وہ اس کے مالک بن سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :۔ ایسا درخت دار جنگل جو کسی کی ملکیت نہ ہو تمام لوگوں کے لیے مباح ہوتا ہے، اس کے ساتھ تمام لوگوں کے منافع متعلق ہوتے ہیں، ہر ایک کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوتا ہے اور اگر کوئی اس کو قابلِ کاشت بنالے تو وہ اس زمین کا مالک نہیں بن سکتا۔

لما فی الهندیة : وکذا ما کان خارج البلدة من مرافقها محتطباً لاهلها ومرعی لهم لا یکون مواتاً۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۳۸۶ کتاب احیاء الموات) [1]

ایسی زمین جس میں جنگل ہو موات میں داخل نہیں۔

سوال :۔ بعض لوگ کسی غیر آباد | بنجر زمین پر محض نشانات لگانے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی

زمین کو اپنی ملکیت میں لانے کے لیے اس کے اردگرد پتھروں کی دیوار بنا دیتے ہیں تو کیا ایسی زمین پر صرف نشانات لگانے یا دیوار بنا دینے سے کوئی اس کا مالک بن سکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ بنجر اور غیر آباد زمین کی ملکیت اس وقت ثابت ہو گی جب اس کو قابلِ کاشت بنا لیا جائے، اس میں کھیتی باڑی کی جائے یا کسی قسم کی تعمیر کی جائے، کسی قسم کے نشانات لگانے یا پتھروں کی دیوار بنا کر حد بندی کرنے سے کوئی اس زمین کا مالک نہیں بن سکتا۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله : ومن حجر ارضاً ای منع غیره منها بوضع

---

[1] قال العلامة الحصکفی رحمه الله : ولا یجوز احیاء ما قرب من العامر بل یترک لهم مطرحاً لحصائدهم لتعلق حقهم به فلم یکن مواتاً وکذا لو کان محتطباً۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج ۵ ص ۲۷۸ کتاب احیاء الموات)
ومثله فی البدائع الصنائع ج ۶ ص ۱۹۴ کتاب الاراضی

علامته من حجر او غیرہ ثم امهلها ثلث سنین دفعت الی غیرہ قبلها هو احق بها وان لم یملکها لانه انما یملکها بالاحیاء والتعمیر لا بمجرد التحجیر۔
(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات) [1]

غیر مملوکہ مشترکہ چراگاہ کی زمین آباد کرنے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی

سوال: ایک زمین دو گاؤں والوں کے مابین صدیوں سے مشترکہ چراگاہ کے طور پر چلی آ رہی ہے اور یہ غیر آباد زمین کسی کی ملکیت بھی نہیں ہے، اس کا کچھ حصہ بعض لوگوں نے کافی عرصے سے آباد کر کے اُسے قابلِ کاشت بنایا ہوا ہے، اب اس مشترکہ زمین کی کل تقسیم ہو رہی ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا آباد شدہ زمین آباد کرنے والوں کی ملکیت ہو گی یا کل تقسیم میں اس کی تقسیم بھی ہو گی؟

الجواب:۔ اگر اس زمین سے دونوں گاؤں کے لوگوں کی ضروریات مثلاً چراگاہ یا محطبہ (جنگل) وغیرہ وابستہ ہوں تو یہ موات کے حکم میں نہیں، اُسے آباد کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں اور نہ ہی محض آباد کرنے سے کسی کی ملکیت ثابت ہو گی، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آباد شدہ زمین بھی کل تقسیم میں داخل ہو گی۔

لما فی الهندیة: وکذا ما کان خارج البلدة من مرافقها محتطبا لاهلها ومرعی لهم لا یکون مواتا حتی لا یملک الامام اقطاعها۔ انتهی
(الفتاوی الهندیة ج۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء موات) [2]

---

[1] قال العلامة المرغینانی رحمه الله: لان التحجیر لیس باحیاء لیملکه به لان الاحیاء انما هو العمارة التحجیر للاعلام۔ (الهدایة ج۴ ص۴۷۹ کتاب احیاء موات)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات۔

[2] قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: ولا یجوز احیاء ما قرب من العامر بل یترک مرعی لهم ومطرحا لحصائدهم لتعلق حقهم به فلم یکن مواتا وکذا لو کان محتطبا۔
(تنویر الابصار علی هامش رد المحتار ج۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)
وَمِثْلُهٗ فی البدائع الصنائع ج۶ ص۱۹۴ کتاب الاراضی۔

بنجر زمین کو آپس میں تقسیم کر کے آباد کرنا

سوال :۔ اگر کسی علاقہ کی زمین بنجر پڑی ہو اور وہاں کے سرکردہ افراد اس کو وہاں کے تمام افراد میں تقسیم کر دیں، اس کے بعد کچھ صاحبِ استطاعت اسے آباد کر لیں اور کچھ لوگ آباد نہ کر سکیں تو کیا آباد کنندگان کے لیے ان زمینوں کے حاصلات جائز ہیں یا نہیں ؟

الجواب :۔ ایسی تقسیم کے بعد جو آدمی بھی اپنے حصہ کی زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اُس کے حاصلات اس کے لیے جائز ہوں گے کیونکہ یہ زمین حقیقت میں غیر آباد ہے صرف برائے نام سب لوگ اس میں شریک ہیں کہ اس علاقہ کی زمین ہے ۔

واخرج الامام ابوداؤدؒ : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰ ارضًا میتۃً فھی لہٗ ۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات) [1]

احیاءِ موات کا حق ہر ایک کو حاصل ہے

سوال :۔ موجودہ معاشرہ میں بعض لوگ حجام، لوہار، ترکھان، جولاہا وغیرہ کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو گھٹیا تصور کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ کسی غیر آباد زمین کو آباد کر لیں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارا حق نہیں، کیا ایسا کرنا اور کہنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ احادیث اور کتبِ فقہ میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ جو کوئی بھی کسی غیر آباد زمین کو آباد کرے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، کسی بھی فقیہ نے اس مسئلہ میں اس قسم کی تخصیص بیان نہیں کی۔ احیاءِ موات کے حکم میں تعمیم ہے ۔ من احیٰی ارضًا میتۃً فھی لہٗ ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات) اس حدیث میں لفظ مَنْ عام ہے، اس عموم میں بلا دلیل تخصیص کرنا صحیح نہیں ۔ فقہاء کرام نے بھی لفظ مَنْ استعمال کیا ہے : ومن احیاء باذن الامام ملکہ (تبیین الحقائق ج ۶ ص۳۵) بلکہ ذمی غیر مسلم بھی احیاءِ موات سے مالک بن سکتا ہے جبکہ حجام، جولاہا اور لوہار، ترکھان وغیرہ تو مسلمان ہیں۔

قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحمہ اللہ : ویملکہ الذمی بالاحیاء

---

[1] اخرجہ الامام ترمذی رحمہ اللہ : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیٰ ارضًا میتۃً فھی لہٗ ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج ۴ ص۴۷۹ کتاب احیاء الموات ۔

لما یملکہ المسلم۔ (الھدایۃ ج ۴ ص۴۷۹ کتاب احیاء الموات) لہ

غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا بلا شرکت غیرے اس کا مالک ہوتا ہے

سوال:۔ ہم نے کچھ غیر آباد زمین کو سترہ سال قبل آباد کیا تھا، کیا شرعاً اس میں ہمارے ساتھ کوئی اور شریک ہو سکتا ہے؟

الجواب:۔ اگر یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں تھی اور نہ اہلِ قریہ کے منافع اس کے ساتھ وابستہ تھے تو آپ بلا شرکت غیرے اس زمین کے مالک ہیں بشرطیکہ حکومت کی اجازت سے آباد کی ہو، کیونکہ مردہ زمین کو آباد کرنے والا ہی اس کا مالک ہوتا ہے کسی کا بھی ایسی زمین کے ساتھ حق متعلق نہیں ہوتا۔

لما ورد فی الحدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیاء ارضاً میتۃً فھی لہٗ۔ (سنن ترمذی ج ۱ ص۲۵۶ باب ما ذکر فی احیاء ارض الموات) ۲ہ

(ترجمہ) "جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا یعنی قابلِ کاشت بنایا وہ زمین اسی کی ہے۔"

مفادِ عامہ سے خارج رقبے کو آباد کرنے والا مالک متصور ہوتا ہے

سوال:۔ اگر کسی علاقے میں پہاڑی اور غیر آباد بنجر زمین کو وہاں کے رہنے والے لوگ آباد کرلیں تو کیا وہ آباد کرنے سے اس کے مالک بن جاتے ہیں یا نہیں؟ جبکہ علاقہ کے بعض با اثر لوگ ان کی ملکیت کے ثابت ہونے کی مخالفت کرتے ہیں؟

الجواب:۔ جو پہاڑ کسی کی ملکیت نہ ہوں اور ان کا تعلق علاقے کے مفادِ عامہ سے بھی نہ ہو تو اس کو باقاعدہ حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والا شریعت کی رُو سے

لہ لما فی الھندیۃ، عند ابی یوسفؒ و محمدؒ یثبت بنفس الاحیاء۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۶ ص۳۸۶ کتاب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۲۱۰ کتاب احیاء الموات۔

۲ہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیاء ارضاً میتۃً فھی لہٗ ولیس لعرقٍ ظالمٍ حقٌ۔ (ابوداؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات)

وَمِثْلُہٗ فی فتح الودود حاشیۃ ابی داؤد ج ۲ ص۸۱ باب احیاء الموات۔

اس کا مالک متصور ہوگا۔

لما قال العلامة علاؤ الدين الحصكفيؒ: إذا احيا مسلم او ذمى ارضاً غير منتفع بها وليست لمملوكة لمسلم ولا ذمى وهى بعيدة من القرية ملكها واعتبر محمدؒ عدم ارتفاق اهل القرية وبه يفتى۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج۵ ص۲۷۸ كتاب احياء الموات) [1]

غیر مسلم کیلئے احیاء موات کا حکم

سوال :۔ ہمارے علاقے میں ہندو اور سکھ بھی رہتے ہیں، انہوں نے حکومت کی اجازت سے گاؤں کی بنجر زمین کو آباد کیا اور اب اس میں مختلف فصلیں کاشت کرتے ہیں، تو کیا یہ زمین ان کی ملکیت متصور ہوگی یا نہیں ؟

الجواب :۔ موات کی احیاء کرنے والے کے لیے مسلمان ہونا شرط نہیں، اگر کوئی غیر مسلم بھی حکومتِ وقت کی اجازت سے علاقے کی بنجر زمین کو آباد کرے تو وہ اس کی ملکیت متصور ہوگی۔ اس لیے صورتِ مسئولہ میں بنجر زمین کو حکومت کی اجازت سے آباد کرنے والے ہندو اور سکھ اس کے مالک متصور ہوں گے۔

قال العلامة الحصكفيؒ: اذا احيى مسلم او ذمى ارضا غير منتفع بها وليست بمملوكة لمسلم ولا ذمى ......ملكها ان اذن له الامام فى ذلك وقالا يملكها بلا اذنه وهذا لو مسلماً فلو ذميا شرط الاذن اتفاقاً۔

(الدر المختار على هامش رد المحتار ج ۵ ص۲۷۷ كتاب احياء الموات) [2]

---

[1] قال النبى صلى الله عليه وسلم من احياء ارضاً ميتة فهى له۔

(سنن الترمذى ج ۱ ص۲۵۶ باب ما ذكر فى احياء ارض الموات)

ومثلهٗ فى البدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ كتاب الاراضى۔

[2] قال العلامة المرغينانىؒ: ويملكه الذمى بالاحياء كما يملكه المسلم لان الاحياء سبب الملك الا ان عند ابى حنيفةؒ اذن الامام من شرطه فيستويان فيه كما فى سائر اسباب الملك حتى الاستيلاء على اصلنا۔

(الهداية ج ۴ ص۴۷۷ كتاب احياء الموات)

مواتـ کی تعریف | **سوال**:۔ جناب مفتی صاحب! موات کسے کہتے ہیں، اور کون کون سی زمینیں اس میں داخل ہیں؟

الجواب:۔ ہر وہ زمین جو گاؤں یا شہر سے باہر ہو اور اس پر کسی کی ملکیت نہ ہو اور نہ اس کے ساتھ کسی کا کوئی حق وابستہ ہو اور نہ وہ شہر یا گاؤں کے متعلقہ امور سے وابستہ ہو اس کو موات کہا جاتا ہے، لہٰذا جن زمینوں میں یہ شرائط پائی جائیں وہ موات میں داخل ہیں ۔

قال العلامة الکاسانیؒ. فالارض الموات هی ارض خارج البلد لم تکن ملکا و احد ولا حقاله خاصًا فلا یکون داخل البلد مواتٌ اصلاً ۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص۱۹۴ کتاب احیاء الموات) [۱]

صرف قبضہ سببِ ملک نہیں | **سوال**:۔ اگر کوئی شخص گاؤں کی بنجر زمین (شاملات) پر قبضہ کر کے سرکاری کاغذات میں اپنے نام انتقال کرائے لیکن اسے آباد نہ کرے بلکہ کئی سالوں سے اسی طرح بنجر رہنے دے تو کیا حاکمِ وقت یا اس کا نائب یعنی تحصیلدار وغیرہ وہی زمین کسی دوسرے شخص کو دے سکتا ہے یا نہیں تاکہ وہ اس کو آباد کرے؟

الجواب:۔ موات کی ملکیت کے لیے ضروری ہے کہ حاکمِ وقت یا اس کے نائب (تحصیلدار وغیرہ) کی اجازت سے بنجر زمین پر قبضہ کر کے اسے آباد کرے یعنی قابلِ کاشت بنائے صرف اس پر قبضہ کرنا سببِ ملک نہیں، اس لیے اگر حاکمِ وقت یا اس کا نائب وہ زمین کسی دوسرے شخص کو دینا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے تاہم

---

[۱] وفی الهندیة: فالارض الموات هی ارض خارج البلد لم تکن ملکا واحد ولاحقًاله خاصا فلایکون داخل البلد موات اصلاً وکذا ما کان خارج البلدة من مرافقها محتطبا لاهلها و مرعیً لهم لا یکون مواتًا حتی لایملك الامام اقطاعها وکذلك ارض الملح والقار ونحوها مما لایستغنی عنها المسلمون ارض موات حتی لا یجوز للامام ان یقطعها لاحد۔

(الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۸۵ کتاب احیاء الموات)

حاکم کو تین سال تک انتظار کرنا ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: ومن حجر الارض ای منع غیرہ منها بوضع علامة من حجر او غیرہ ثم اهملها ثلاث سنین دفعت الیٰ غیرہ وقبلها هو احق بها وان لم یملکها لانہ انما یملکها بالاحیاء والتعمیر لا بمجرد التحجیر۔

(الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار ج ۵ ص۲۷۸ کتاب احیاء الموات)[1]

لیز موجبِ ملک نہیں

سوال: جناب مفتی صاحب! بعض دفعہ حکومت کسی بنجر قطعہ زمین کو سو سال یا اس سے کم و بیش مدت کے لیے کسی شخص کو لیز یا پٹہ پر دے دیتی ہے اور اس شخص سے سالانہ یا جملہ مدتِ لیز کی رقم بصورتِ اجارہ وصول کرتی ہے، اور معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ اس مدت کے گذر جانے کے بعد یہ زمین حکومت کو واپس کر دی جائے گی۔ تو کیا لیز (پٹہ) پر زمین لینے والا آدمی اس زمین کا مالک بن جاتا ہے؟

الجواب: اجارہ و لیز موجبِ ملک نہیں، یہ آدمی صرف اتنی مدت تک ہی اس زمین سے انتفاع حاصل کر سکتا ہے جتنی مدت تک زمین لیز وغیرہ پر حاصل کی گئی ہو، مدتِ اجارہ ختم ہونے کے بعد زمین حکومت کو واپس کی جائے گی، یہی وجہ ہے کہ لیز یا اجارہ پر زمین لینے والا شخص اسے فروخت نہیں کر سکتا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: او ارضا بشرط ان یثنیها ان یحرثها او یکری انهارها العظام او یسرقنها لبقاء اثر هذہ الافعال لرب الارض فلو لم تبق لم تفسد۔

قال العلامة ابن عابدینؒ تحت قولہ (بشرط ان یثنیها) فان کان اثرہ یبقی بعد انتهاء العقد یفسد لان فیہ منفعة لرب الارض والا فلا۔ (رد المحتار ج ۵ ص۴۱ کتاب الاجارة۔ باب الاجارة الفاسدة)

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: ومن حجر ارضا ولم یعمرها ثلاث سنین اخذها الامام ودفعها الیٰ غیرہ لان الدفع الی الاول کان لیعمرها فتحصل المنفعة للمسلمین من حیث العُشر والخراج فاذا لم یحصل یدفعه الیٰ غیرہ تحصیلا للمقصود لان التحجیر لیس باحیاء لیملکه به۔

(الهدایة ج ۴ ص۴۷۷ کتاب احیاء الموات)

سرکاری شاملات زمین پر کسی کے قبضہ سے اِحیاء کا حکم

سوال :- ہمارے گاؤں کے قریب پرانی زمین ہے جوکہ ارضِ موات یعنی شاملاتِ دیہہ ہے، اب ایک آدمی نے جوکہ دوسرے علاقہ سے آیا ہے اس شاملات زمین کا کچھ حصّہ اپنے نام پر انتقال کرالیا ہے، کیا اس شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شاملات زمین کا اپنے نام انتقال کرا لے، واضح ہو کہ یہ زمین گاؤں سے تقریباً ۲ کلومیٹر دور ہے، اس بارے میں شرعی حکم صادر فرماکر ممنون فرمائیں؟

الجواب :- ایسی سرکاری شاملات جس سے اہلِ دیہہ کے مرافق متعلق ہوں، اس کا اِحیاء درست نہیں ہے اور اسی وجہ سے ایسی زمین کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ اسے تمام اہلِ دیہہ کے منافع اور مرافق کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور اگر اہل دیہہ کا اس سے مشترکہ مفاد وابستہ نہ ہو تو اس کا اِحیاء درست ہے مگر اس کے لیے اِذنِ امام (یعنی حاکمِ وقت کی اجازت) شرط اور ضروری ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله : اذا احیا مسلم او ذمی ارضاً غیر منتفع بها ولیست بمملوكة لمسلم ولا ذمی فلو مملوكه لم تكن مواتا فلو لم یعرف مالكها فهی لقطة یتصرف فیها الامام ـــ وهی بعیدة من القریة اذا صاح من باقصی العامر لا یسمع بها صوته ملكها عند ابی یوسف رح ان اذن له الامام فی ذلك وهو المختار ان اذن له الامام فی ذلك یملكها بلا اذنه الخ (الدر المختار علی هامش ردّ المحتار ج ۵ ص ۳۰۶، ۳۰۷ كتاب احیاء الموات) [1]

---

[1] وفی الهندیة : قال القدوری فما كان عادیاً الی قدم خرابه لا مالك له او كان مملوكاً فی الاسلام لا یعرف له مالك بعینه وهو بعیدٌ عن القریة ـــــ وبعد اسطر قال وملك فی الموات یثبت باحیاءِ باذن الامام الخ

{الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۳۸۶ كتاب احیاء الموات}

ہندوؤں کی متروکہ جائیداد پر قبضہ کا حکم

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اندریں صورت کہ ۱۹۴۷ء میں علاقہ کشمیر پر مسلمانوں نے حملہ کیا جس کے نتیجے میں کئی ہندو مارے گئے، کئی روپوشش ہو کر بھاگ گئے، بعدہٗ مسلمانوں نے ان کے مال و متاع پر قبضہ کر کے اپنے استعمال میں لائے اور ان کے مکانوں، مندروں اور گرجوں وغیرہ کی چادریں اکھیڑ کر اپنے ملک میں لائے اور یہاں مساجد کی تعمیر میں ان کو استعمال کیا۔ اب ایک مولوی صاحب نے کہا ہے کہ ہندوؤں کے متروکہ مکانوں اور مندروں وغیرہ کی چادریں مساجد کی تعمیر میں استعمال کرنا مسلمانوں کے لیے حرام ہے اور ایسی مساجد میں نماز با جماعت ادا کرنا ناجائز ہے، اور ان چادروں کو ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے خرید بھی نہیں۔ اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ایسی چادریں اور اس طرح کا دیگر ساز و سامان مساجد کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور ایسی مساجد عند الشریعت مسجد کا حکم رکھتی ہیں یا نہیں؟ نیز مسلمانوں کے لیے ایسی چادروں اور دوسرے سامان کی خرید و فروخت جائز ہے یا نہیں؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ سب سے پہلے تو یہ بات تحقیق طلب اور قابلِ غور ہے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں نے کشمیر میں ہندوؤں پر جو حملے کیے ہیں اس کو شرعاً جہاد کہا جا سکتا ہے یا نہیں! ہمارے نزدیک تو کتبِ فقہ سے جہاد کے متعلق جو کچھ ثابت اور معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر جہاد مقرر ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کا ہو جائے اور اسلام معزز ہو اور کفر کے تمام قواعد اور رسم و رواج نیست و نابود ہوں۔ بناء علیہ فقہاء کرام نے وجوبِ جہاد کے لیے چند شرائط لکھے ہیں: اوّل یہ کہ مسلمان اتنی تعداد میں ہوں کہ جس سے شان و شوکت پیدا ہو۔ دوم یہ کہ ان کا خرچ بھی مہیا ہو۔ سوم یہ کہ ان کے لیے امن و حفاظت کی جگہ بھی ہو کہ کفار کے شر سے نجات حاصل ہو اور عند الحاجت کام آوے۔ اور اگر مسلمانوں کو یقین ہو کہ غلبہ کفار کو ہو گا تو اس صورت میں جہاد فرض نہیں ہے "جامع الرموز" میں ہے: الجہاد فرض عین بشرط القدرة على القتال والسلاح والزاد والرواحلة ..... انتہٰی ــــ اور فتاوٰی عالمگیریہ میں ہے: والثانی ان یرجوا الشوکة والقوة لاهل الاسلام وان كان لا يرجوا الشوكة للمسلمين فی القتال فانه لا يحل له القتال لما فيه من القاء نفسه فی التهلكة.....

اسی طرح درمختار، شامی اور فتح القدیر میں بھی مذکور ہے۔

اب اس تفصیل کی روشنی میں ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں پر مسلمانوں کے حملوں کو اگر جہاد کہا جاوے اور اس دوران جو کچھ املاکِ کفار یعنی ہندوؤں کے اموال میں سے مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے وہ مالِ غنیمت ہے اور اس کا ذاتی استعمال میں لانا، خرید و فروخت کرنا، اور مساجد کی تعمیر میں لگانا درست ہے اور وہ مساجد بہر حال شرعی مسجد ہوں گی اور ان میں نمازیں پڑھنا درست ہے۔ (فقط واللہ اعلم)

گاؤں یا شہر کے قریب بنجر زمین آباد کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں کے قریب ایک قطعہ اراضی بنجر پڑا ہے جس میں گاؤں کے لوگ اپنے جانور وغیرہ چراتے ہیں اور اپنے مویشیوں کے لیے چارہ وغیرہ لاتے ہیں، اب ایک شخص تحصیلدار کی اجازت سے اس کو آباد کرنا چاہتا ہے جبکہ ایسا کرنے میں گاؤں کے لوگوں کی اکثریت کا نقصان ہے۔ تو کیا شرعاً یہ قطعہ زمین آباد کرنا جائز ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب:۔ کسی بنجر زمین کو آباد کرنا اور اس کو کارآمد بنانا ایک اچھا عمل ہے مگر اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ گاؤں یا شہر والوں کا نقصان نہ ہو، اسی طرح وہ زمین گاؤں یا شہر کے قریب نہ ہو کہ لوگ اس سے اجتماعی طور پر فائدہ اٹھاتے ہوں صورتِ مسئولہ کے مطابق یہ بنجر زمین چونکہ گاؤں کے قریب ہے اور گاؤں والے اس کو بطور چراگاہ استعمال کرتے ہیں اس لیے اس زمین کو تحصیلدار کی اجازت کے باوجود آباد کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں گاؤں والوں کا اجتماعی نقصان ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني ؒ: لا يجوز احياء ما تقرب من العامر ويترك مرعى لاهل القرية ومطرحاً لحصائدهم لتحقق حاجتهم اليها حقيقتها او دليلها على ما بيناه فلا يكون مواتاً لتعلق حقهم بها بمنزلة الطريق والنهر ـ الخ (الهداية ج۴ ص۴۷۸ كتاب احياء الموات)

تحدیدِ ملکیّتِ زمین

انفرادی اور شخصی ملکیّت

موجودہ دور میں معاشی اور اقتصادی بدحالی کی اصل وجہ اصولِ دین اور احکام اسلام سے بُعد ہے جب تک ہم اسلام کے عمدہ، بہترین اور ابدی اصولوں پر عمل پیرا رہیں گے من حیث قوم و ملک ترقی کی منازل طے کرتے رہیں گے۔ اسلام کے انہی زرّین اصولوں سے دوری ہی کا نتیجہ ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں متمول اور سفید پوش طبقہ کے درمیان معاشی تفاوت کی وجہ سے اقتصادی زبوں حالی پیدا ہو چکی ہے اور پورا ملک اس وقت بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ ملک کی اکثر سیاسی جماعتوں اور حکمرانوں نے اپنے طور پر اس کا یہ حل نکالا کہ عارضی یا مستقل طور پر ملکیتِ زمین کی تحدید کر دی جائے اور اس کو قانونی شکل دینے کے لیے کوشش بھی کی گئی، جس پر علماء کرام نے حکومت کے اس موقف پر شرعی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی۔ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے مفتی حضرت مولانا مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ نے بھی "تحدید ملکیتِ زمین کے دلائل کا ایک جائزہ" کے عنوان سے ایک جامع مضمون لکھا جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جامعہ دارالعلوم حقانیہ کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نے "انفرادی اور شخصی ملکیت" کے عنوان سے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔ ماہنامہ الحق نے ان ہر دو گرانقدر مضامین کو شائع کیا، جنہیں اب افادۂ عام کے لیے فتاویٰ کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے فتاویٰ حقانیہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

تحدیدِ ملکیتِ زمین کے دلائل کا ایک جائزہ

اسلام میں اسکی کوئی گنجائش نہیں

ملک کے متموّل اور فقراء کے درمیان معاشی تفاوت اور اقتصادی بدحالی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے مقرر کردہ اصول اور احکام سے بُعد ہوتا گیا۔ اموال کے حقوق ادا نہ ہوئے اور استحصال زر میں حلال وحرام کی تمیز نہ کی گئی، نتیجہ میں وہ شدید بحران رونما ہوا جس سے پورا ملک دوچار ہے۔ اس کا علاج زمینوں کی ملکیت کی حد تک اکثر سیاسی جماعتیں یہ تجویز کر رہی ہیں کہ زمین کی ملکیت کی ایک خاص حد مقرر کی جائے۔ یہاں تک کہ بعض مذہبی جماعتوں سے بھی اس سلسلہ میں بے احتیاطی ہوئی اور عارضی طور پر یا مستقلاً تحدید ملکیت زمین کو اپنے منشوروں میں جگہ دی حالانکہ معاشی بے اعتدالی اور بدحالی کے فساد کا علاج تحدیدِ ملک سے نہیں ہو سکتا۔ عملی اور واقعاتی تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو سکتی ہے۔ کہ اس علاج سے مرض تو زائل ہو نہیں سکتا۔ مگر دین میں بلا دلیل ایک گونہ تحریف و ترمیم کا ارتکاب ہو جائے گا۔ اور مسئلہ بھی اپنی جگہ لاینحل رہے گا۔

اگر زمینداروں کے پاس سو سوا سو ایکڑ زمین چھوڑ کر زائد اس سے لے لی جائے اور حکومت اس زائد زمین کو ملک کے تمام بے زمین افراد پر موافق ضرورت تقسیم کرے تو ملک کی آبادی کے تناسب سے یہ محدود زمین ہرگز سب افراد تک نہیں پہنچ سکتی۔ بعض کو دی جائے اور بعض محروم رہیں۔ تو فساد اپنی جگہ قائم رہا۔ پھر اس تحدید شریعت کے کئی احکام مثلاً میراث وغیرہ منسوخ اور معطل ہو جائیں گے۔ پھر جبکہ بسا اوقات اربابِ اقتدار ایسے عارضی اور مصلحتی قوانین کو دائمی حیثیت دے دیتے ہیں تو قانونِ وراثت مستقل طور پر معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ سب یہ تحدید سوشلزم

کیلئے سنگ بنیاد ہے، کیونکہ تحدید ہی کے دلائل سے سرے سے شخصی ملکیت میں نفی ہو سکتی ہے۔

(ج) جن نظائر اور شواہد کو کھینچ تان کر تحدید ملکیت کے لئے وجہ جواز بنایا جاتا ہے تاکہ روٹی کا مسئلہ حل ہو سکے ٹھیک اسی طرح عزل، اسقاط حمل وغیرہ نظائر و شواہد کے بنا پر تحدید نسل (خاندانی منصوبہ بندی) کیلئے بھی وجہ جواز نکالی جا سکتی ہے تاکہ روٹی کا مسئلہ حل ہو سکے۔ اگر وہ تحدید جائز نہیں تو یہ کیوں جائز ہے۔؟

نظائر اور شواہد کا جائزہ | بعض حضرات نے حاکم وقت کو اقتصادی بدحالی دور کرنے کے لئے تحدید ملکیت کے اصول بنانے کا اختیار دیا ہے ——— اور اسی ضمن میں کچھ دلائل پیش کئے ہیں۔ ہم اس کا بھی مختصراً جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

(الف) اس میں شک نہیں کہ فقراء اور مساکین کو اگر ضروریات زندگی میسر نہ ہوں اور ہلاکت کا خطرہ ہو تو حکومت ذخیرہ اندوزی کرنے والوں سے جبری طور پر غلہ وغیرہ لیکر فقراء کی حاجت برآری کر سکتی ہے اور فقراء بھی براہ راست اضطراری حالت میں بغیر رضاء مالک غلہ وغیرہ لیکر اپنی ضروریات میں خرچ کر سکتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں لازمی ہے کہ تنگی اور ضرورت ختم ہونے پر اس کے مالکوں کو معاوضہ دیا جائے۔ قال فی الدر المختار لوخاف الامام علی اھل بلد الھلاک اخذ الطعام من المحتکرین وفرق علیھم فاذا وجدوا سعۃ ردوا مثلہ؛ ومن اضطر لمال غیرہ وخاف الھلاک تناولہ بلا رضاہ ونقلہ الزیلعی عن الاختیار واقرہ۔ (الدر المختار ج ص)

اور علامہ ابن حزم ظاہری نے بھی المحلی ج ۵ ص۴۵۲ میں لکھا ہے کہ اغنیاء پر فرض ہے کہ فقراء کی ضروریات کو پورا کریں اور حاکم وقت کے لئے جائز ہے کہ اغنیاء کو اس بات پر مجبور کرے علامہ کی اصل عبارت یہ ہے۔

وفرض علی الاغنیاء من اھل کل بلد ان یقوموا بفقراءھم ویجبرھم السلطان علی ذلک ان لم تقم الزکوٰۃ بھم ولا فی سائر اموال المسلمین بھم فیقام لھم بما یأکلون من القوت الذی لابد منہ ومن اللباس للشتاء والصیف بمثل ذلک وبمسکن یکنھم من المطر والصیف والشمس وعیون المارۃ - انتھٰی۔

لیکن ابن حزم مالکان اموال کو معاوضہ دینے کا بھی قائل نہیں اور یہ اسکی تفردات میں سے ہے۔ الغرض ضرورت کے وقت اغنیاء کے اموال سے فقراء کی حاجت برآری فرض ہے مگر اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ بادشاہ وقت زمین کے قانونی مالکوں سے زمین چھین کر

بے زمین لوگوں کو زمین بھی فراہم کرے گا۔

ب۔ رہا ابوعبیدہ بن الجراحؓ کا جہادی دستے پر تین سو ساتھیوں کو اپنا اپنا تمام توشہ اکٹھا کرنے کا حکم دینا (بخاری ص۶۲۵) اور اس سے اپنا مدعی ثابت کرنا تو اس سے بھی تحدید ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس واقعہ میں نہ تو یہ توشے ابوعبیدہؓ کی ملکیت بنائے گئے تھے اور نہ اوقاف کی طرح غیر مملوکہ تھے۔ بلکہ ان میں ملکیت شخصی بہرحال باقی تھی اور اباحت کی شکل میں ایک دوسرے کے راشن سے فائدہ اٹھانے کا کہا گیا تھا۔ غزوۂ خیبر میں ستو کا اکٹھا کر کے یکساں تقسیم کرنے کی بھی یہی حقیقت ہے۔

ج۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت بلالؓ کو دی گئی وادیٔ عقیق کی زمین واپس لے لینے کو بھی تحدید ملکیت کیلئے پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ زمین غیر آباد (موات) تھی حضرت عمر نے صرف وہی حصہ اس سے واپس لیا جو انہوں نے آباد نہیں کیا اور جو آباد اور زیر کاشت لایا گیا تھا۔ اُسے واپس نہیں لیا (رواہ یحیٰ بن آدم عن عبداللہ بن ابی بکر کذا فی التعلیق علی الاموال ص۲۹۰) اور یہ اب بھی جائز ہے کہ جب ایک شخص تین سال کے اندر اندر ارض موات کو آباد نہ کرے تو حکومت وقت اس کو واپس لے سکتی ہے، کیونکہ ارض موات میں آباد کرانے سے قبل صرف قبضہ سے ملکیت ثابت ہی نہیں ہوتی، ہدایہ میں ہے:

فبقی غیر مملوك كما كان هو الصحيح (ج ص۴۶۳)

ایسی زمین غیر آباد ہونے کی وجہ سے مملوک ہی نہیں ہوتی بلکہ غیر مملوک ہے۔

د ۔ اس میں شک نہیں کہ حضور علیہ السلام نے مجاہدین کی خوشی اور طیب خاطر سے قبیلۂ ہوازن کے وفد کو اُن کے قیدی واپس دے دیے تھے۔ (بخاری ص۶۱۸) مگر اس سے بھی تحدید ملک کا جواز معلوم نہیں ہو سکتا، کیونکہ اوّلاً تو یہ احتمال موجود ہے کہ یہ واپسی تقسیم سے قبل ہوئی ہو۔ جیساکہ ابن کثیر کی رائے ہے کہ:

وظاهر سياق حديث عمرو بن شعيب الذى اورده محمد بن اسحٰق عن ابيه عن جده ان رسول الله صلى الله عليه وسلم رد الى هوازن سبيهم قبل القسمة۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص۳۵۵)

حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے بنو ہوازن کو ان کے قیدی تقسیم سے پہلے پہلے واپس کر دئے تھے۔

اس احتمال کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ ملکیت شخصی ثابت ہی نہیں ہوئی تھی، جبکہ تحدید ملکیت میں تو شخصی ملکیت کا ازالہ ہوتا ہے۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ واپسی تقسیم کے بعد ہوئی، جیساکہ بخاری کی روایت وقد کنت استأنیت بکم سے مفہوم ہوتا ہے تو اس سے بھی حاکمانہ اور جبری طور پر ملکیت چھین لینے یا اسے محدود کر دینے کا جواز نہیں نکالا جا سکتا، اس لئے کہ یہاں واپسی طیب خاطر یعنی پوری رضا و رغبت سے ہوئی تھی اور اس طیب خاطر کی پوری رعایت اور تحقیق کر کے ایسا کیا گیا۔ اور ایسی واپسی اب بھی بالاجماع جائز ہے۔

پھر یہ بات بھی واضح رہے کہ اکثر مجاہدین نے قیدیوں کو مفت واپس کیا اور جن افراد مثلاً اقرع بن حابس اور عیینہ اور ان کی قوم نے مفت واپس کرنے سے انکار کیا (البدایۃ والنہایۃ ج۴ص۳۵۳) اور انہیں معاوضہ دینے کا وعدہ کیا گیا تو وہ عوض بھی قیمت اور ثمن نہیں تھا۔ کیونکہ اس وعدہ میں نہ ثمن کی مقدار معلوم تھی اور نہ اجل متعین تھا اور شریعت میں ایسی خرید و فروخت جائز ہی نہیں جس میں نہ قیمت معلوم ہو، نہ ادائیگی کی میعاد، یہاں تک کہ اس معاملہ میں تو ثمن کی ادائیگی اور اس کا تحقق بھی غیر یقینی تھا، جس پر بخاری کے یہ الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔ کہ ومن احب منکم ان یکون علی حظہ حتی نعطیہ ایاہ من اوّل مایفئ اللہ علینا فلیفعل۔ (جو تم ہی سے چاہے کہ اگر ہمیں اللہ نے مال غنیمت ہی سے کچھ دیدیا تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔) ان الفاظ سے بھی یہی واضح ہو رہا ہے۔ پس اس حدیث سے بھی تحدید ملک یا تبدیل ملک کا استدلال غیر صحیح ہے۔

۵۔ پانچویں دلیل تحدید ملکیت کے لئے فقہاء کرام کے قاعدہ تحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام کی پیش کی گئی ہے، یعنی کسی عام ضرر کے ازالہ کی خاطر ضرر خاصہ برداشت کیا جائے، لیکن اس قاعدہ سے بھی تحدید ملکیت کے جواز کا استنباط درست نہیں، کیونکہ اس ملک میں ہر بے زمین شخص کو تو تکلیف اور مصیبت لاحق نہیں ہوتی، لاکھوں لوگ جو زمین کے مالک نہیں ہیں، مگر نہ ننگے ہیں نہ بھوکے بلکہ دیگر معاشی ذرائع کی وجہ سے آسودہ حال ہیں۔ ثانیاً کہ ضرر عام اگر موجود ہے تو دونوں طرف کو اور دونوں صورتوں میں ہے۔ البتہ طالبین تحدید عموماً وہ لوگ ہیں جو سوشلسٹ اقوام اور نظریات سے متاثر ہیں۔ اور عموماً ان کے دلوں میں حلال و حرام کی تمیز اور آخرت کا احساس نہیں، مذہب ان کے نزدیک ثانوی حیثیت کا حامل ہے، پیٹ

بقیہ : تحدید ملکیت زمین کے مسائل سے مذہب کو خاطر خواہ تعلق نہیں ثالثاً یہ کہ اس شر و فساد کے زمانہ میں جبکہ حکّام و امراء عموماً بے دین خائن اور بد دیانت ہوتے ہیں۔ مفاد پرستی، رشوت ستانی، سفارش اور اقرباء پروری ان کا شیوہ ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کو اراضی کی تحدید اور تصرف کی باگ ڈور سپرد کر دینا درحقیقت قوم اور ملک کی تباہی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بیت المال اور اوقاف کے حکّام پر خیانت کے اثرات ظاہر ہونے لگیں تو انہیں مسلمانوں کے اموال مصادرۃً لینے کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ اس طرح کرنا حکام کو حرام خوری اور خیانت کا دروازہ کھول دینا ہے۔ (در مختار مع ردّ محتار ج ۴ ص ۲۸۵)

الغرض تحدید ملکیت کے جواز میں جبکہ دینی و علمی لحاظ سے بیشمار فتنوں اور اقتصادی و مالی لحاظ سے بیشمار حق تلفیوں اور بد دیانتیوں کا خطرہ ہے تو کیوں بے احتیاطی سے کام لیکر فتنوں کا دروازہ کھولا جائے۔ لہٰذا تحدید ملکیّت کے جواز یا حکومت کو اس کا حق دینے کا فتویٰ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور میرا اس سے قطعاً اتفاق نہیں۔

محمد فرید خادم دار الافتاء دار العلوم حقانیہ

انفرادی اور شخصی ملکیت

جذبۂ نصح و خیر خواہی کی بناء پر "جماعت اسلامی" سے ایک گذارش کرنی ہے جو کسی قومی و ملی موڑ پر حکمتِ عملی کا سہارا اے لیتی ہے۔ حالانکہ ان کے قائد مودودی صاحب کے الفاظ میں "کسی مقصد کی برتری کے لئے صرف مقصد کا اعلیٰ ہونا کافی نہیں بلکہ اس تک پہنچنے کے ذرائع اور خطوط بھی بے لاگ اور پاکیزہ ہونے چاہئیں"۔ مگر عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ مقصد برآری کی خاطر جماعت نہ صرف یہ کہ طریقِ کار کی صحت کا خیال نہیں رکھتی بلکہ دین کے ایک ایک اصول کو سیاست کے خراد پر چڑھا دیتی ہے۔ اس وقت جماعت اسلامی کا انتخابی منشور سامنے آچکا ہے۔ اس میں زراعت کے عنوان میں زمین کی ملکیت مغربی پاکستان میں سو اور دو سو ایکڑ کے درمیان اور مشرقی پاکستان میں ۱۰۰ بیگھہ تک محدود کر دی گئی ہے اور تمہید میں کہا گیا ہے کہ

"غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں"۔ قطع نظر اس بات کے کہ شریعت کا مذکورہ قاعدہ کن حالات اور کن غیر معمولی تدابیر پر منطبق ہوتا ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے نہ تو زمین کے بارہ میں کسی قسم کی تحدید کی ہے اور نہ دیگر اموال و املاک میں انفرادی اور شخصی ملکیت کی کسی قسم کی حد بندی گوارا کی ہے۔ جائز اور حلال ذرائع سے جتنی بھی ملکیت حاصل کی جائے شریعت نہ صرف اسے جائز بلکہ اللہ تعالےٰ کی ایک نعمت قرار دیتی ہے۔ قرآن و حدیث ایسے نصوص و شواہد سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم نہ تو حالات کی نزاکت اور وقت کی رو میں بہہ کر ان کی تاویل کر سکتے ہیں اور نہ سوشلزم کا ہوا کھڑا کر کے اس کے ڈر سے اسلام کے کسی مسئلہ میں تحریف اور تحدید کر سکتے ہیں۔ اسلام غیر محدود ملکیت سے نہیں روکتا، البتہ وہ مالک کو اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کا پابند بنا کر ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت

ملکیت کی تحدید کرتا جاتا ہے، یہ زکوٰۃ و عشر، یہ صدقات اور ہبات اور سب سے بڑھ کر اسلام کا قانونِ میراث تحدیدِ ملکیت نہیں تو اور کیا ہے مگر لامحدود کو محدود بنانے کا یہ منصوبہ قدرت کا بنایا ہوا ہے۔ ہم اس میں اضافہ کر سکتے ہیں نہ کمی، ہم مجرموں اور معاشرہ کی حق تلفی کرنے والوں کا ہاتھ توڑ سکتے ہیں، مگر انہیں کسی حلال کمائی کے ایک پیسہ سے نہیں روک سکتے۔

حکمتِ عملی کی پالیسی | ہمیں حالات کا مقابلہ اور خرابیوں کی اصلاح کرنی ہے۔ مگر یہ اصلاح ایسی نہیں کہ دین کے کسی اصول پر قینچی چلا کر فساد کا ایک اور دروازہ کھول بیٹھیں۔ دین کا مسئلہ بہر حال اپنی جگہ رہے گا۔ جماعت اسلامی اسے ہماری ناعاقبت اندیشی سمجھے یا کچھ اور ہم تو اس "حکمتِ عملی" کو بہر حال دین کے لئے زہرِ قاتل سمجھیں گے۔ اگر جماعت اسلامی غیر معمولی حالات کی وجہ سے ۲۰۰ ایکڑ تک زمین کی تحدید کو غیر معمولی تدبیر اور دین کے اصول سے غیر متصادم سمجھتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ کل سوشلسٹ اور کمیونسٹ اسی دلیل سے ملکیتِ زمین کا حق قطعی طور پر چھین کر اسے "غیر معمولی تدبیر" اور دین کے اصول سے "غیر متصادم" قرار نہ دے بیٹھیں، اگر جماعت کی طرف سے دین کے اصول کی کوئی واضح تشریح بھی ہو جائے تو معاملہ صاف ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی چاہا اس نے کسی چیز کو اصول اور پھر جب چاہا تو "اسلام کے اصولوں سے غیر متصادم"، کا فتویٰ لگا کر اسی اصول کو حکمتِ عملی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ آہ! اصولِ اسلام کی اس بے دردی سے پائمالی۔ جنگِ آزادی میں جمہوریت اور پارلیمانی نظام کو لات اور منات کہا گیا، مگر بعد میں یہی چیز اصل الاصول بن گئی۔ عورت کی امارت اور حکومت کو ہر حال میں اسلام سے متصادم کہا گیا، پھر یہی چیز وقت کا اہم ترین جہاد قرار پایا، انتخابی جدوجہد کو خلافِ شریعت کہا گیا، پھر یہی مشغلۂ روزگار بن گیا، مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کی تقدیس ہر حال میں قائم رکھنے پر زور دیا گیا، مگر پھر اس راہ کی ہر گری پڑی چیز کو گلے سے لگا کر رفیق جادۂ منزل بتایا گیا، اور اب مسئلہ ملکیت زمین میں گو دا اسے

عارضی کہا گیا) ایک ایسا مؤقف اختیار کیا گیا جس کی مخالفت خود عمر بھر کا شیوہ بنا رہا تھا کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا معلوم نہیں جماعت کے عمائدین اس نئے اجتہاد اور حکمتِ عملی کی کیا توجیہہ کریں، تاویل جو بھی مگر یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ فلاں فلاں جماعتوں نے بھی ایسا کیا اور فلاں بزرگ نے بھی ایسا کہا ہے۔ اگر ایک چیز کا برائی ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے وزن میں اس بات سے کمی نہیں آسکتی کہ اور لوگ بھی ایسا کرتے ہیں، ایسی بات تو جرائم کی تاریخ میں بھی کسی نے نہیں کہی کہ میں اگرچہ مجرم ہوں مگر یہ تو ایک ایسا جرم ہے کہ ع درشہرِ شمار روز کنند ۔۔ اور نہ کسی عدالت نے مجرم کے اس مؤقف کو قابلِ تسلیم قرار دیا ہے۔ تعدیل صحابہؓ، اور دیگر علمی وفقہی مسائل اور اب لاہوری مرزائیوں[1] کے بارہ میں جماعت کا یہی عذرِ گناہ سامنے آچکا ہے۔ مگر غلط بات غلط ہے خواہ اس کا کہنے والا کتنا بڑا آدمی کیوں نہ ہو یہ تو ایک ضمنی بات تھی، اب رہا ملکیتِ شخصی کو سلب کرنا یا اسے محدود کرنا۔

شخصی ملکیت کے شواہد تو جہاں تک اصل مسئلہ انفرادی اور شخصی ملکیت کا تعلق ہے، خواہ املاک منقولہ ہوں یا غیر منقولہ ہوں اسلام نے اسے انسان کا فطری حق بنایا ہے نہ تو اس کی تحدید کی جاسکتی ہے اور نہ عصرِ حاضر کے لادینی اقتصادی نظاموں کے علمبردار اس میں قطع برید کر سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے آیت اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما فھم لھا مالکون میں انسان کی شخصی ملکیت پر مہر ثبت کر دی ہے اور قرآن کی بے شمار آئتیں اس جملہ فھم لھا مالکون (پس وہ اس کے مالک ہیں) کی تائید کرتی ہیں۔ جو لوگ ان الارض للہ (زمین اللہ کی ہے) قسم کی آیات کو آگے پیچھے سے کاٹ

---

[1] مولانا مودودی نے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ لاہوری پارٹی کے مرزائی نہ مسلمان ہیں نہ کافر (س)

کر اپنے مدعی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہاں متصلاً اللہ نے خود یورثہا من یشاء (وہ جسے چاہے زمین کا وارث بنا دے) یا اس کے ہم معنی الفاظ میں انفرادی ملکیت بیان کر کے ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا ہے۔ قل اللّٰھم مالک الملک کے ساتھ تؤتی الملک من تشاء بھی ہے اور والذین یکنزون الذھب والفضۃ کے ساتھ ولا ینفقونہا فی سبیل اللہ کی قید انسان کی انفرادی مالکیت کا اعلان کر رہی ہے، پھر وہ اسے اپنی ملکیت میں ہر جائز تصرّف کرنے اور اسے اپنی ملکیت سے منتقل کرنے کا حق بھی دیتا ہے۔ چنانچہ بیع، شراء، ہبہ، تملیک، اعتاق، تدبیر، کتابت، اجارہ، اعارہ، مزارعت، وقف، رہن، قرض، صدقہ، وصیت، میراث وغیرہ اس تصرّف کے شواہد عدل ہیں۔ اسی طرح وہ کسی دوسرے مسلمان کے مال و دولت میں ناجائز دست اندازی سے بچنے کو ایمان کی اوّلین علامت قرار دیتا ہے۔ ظلم و تعدّی، چوری، ڈاکہ، خیانت، غصب، لوٹ کھسوٹ، جبر و استحصال کو حرام قرار دے کر اسلام انسان کے شخصی ملکیت کا تحفظ کرنا چاہتا ہے۔ وہ یکساں طور پر سرمایہ دار اور غریب دونوں کو ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل (ایک دوسرے کے مال کو ناحق نہ کھاؤ) سے مخاطب کرتا ہے۔ الا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منہ (الحدیث) (خبردار کسی ایک کا مال دوسرے کو بغیر اس کی مرضی کے حلال نہیں) ”ارشاد نبوی ہے“

سوشلزم کی بنیاد ظلم و استحصال اور مادیت | پس جو لوگ سوشلزم کو تمام معاشی خرابیوں کا مداوا سمجھتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اللہ کے بھیجے ہوئے عادلانہ نظام اسلام کے تمام اصول و فروع کو تہس نہس کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ لوٹ کھسوٹ اور انسان کے تمام حقوق کی پائمالی و بربادی کا ایک ایسا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف غریب اپنے رہے سہے سکھ اور چین سے محروم ہو جائے بلکہ پوری قوم چند خونخوار درندوں کی جماعت کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہے، اسلام کے مذکورہ تمام اصول کو ایک طرف رکھ کر ایک لمحہ کے لئے فرض کر لیں کہ سوشلزم آجاتا ہے اور وہ پوری قوم کو حقِ ملکیت سے محروم کر کے اللہ کی دی ہوئی تمام دولت

اور وسائلِ معاش کو ایک پارٹی کے حوالے کر دیتا ہے، تو کیا وہ پارٹی انسانیت کو اسکے تمام حقوق دلا دے گی۔ اور کیا وہ پارٹی موجودہ معاشرہ ہی سے ابھر کر سامنے آئی ہوگی یا آسمان سے فرشتوں کی شکل میں اترے گی۔ لیکن اگر اس کی اٹھان اس معاشرہ سے ہو جس کا مشت نمونہ نمبر وار ۳۰۳ بعنوان "ثمروں کی شکل میں سامنے آچکا ہے اور اس کا حل و عقد اس بیوروکریسی کے ہاتھوں میں ہو جو فائل کی سطح پر بڑے بڑے پراجیکٹ کھڑے کرکے پھر اُسے نذرِ سیلاب بھی کر دیتی ہے، اور اس طرح کروڑوں روپے ہضم کرکے فائل داخل دفتر کر دیتی ہے — تو خدارا ذرا سوچیے کہ ایسے لوگوں کا لایا ہوا سوشلزم یا کوئی بھی معاشی نظام انسان کے مال و جان اور اس کے حقوق میں مساوات قائم رکھ سکے گا — ؟ ہرگز نہیں۔ سوشلزم کی بنیاد تاریخ کی مادی تعبیر پر ہے جس میں نہ خوفِ خدا کی گنجائش ہے، نہ محاسبۂ آخرت کی، اور نہ کسی تنقید اور نصیحت کی۔

مساوات یعنی مواسات استحصال نہیں احتساب | اس کے مقابلہ میں اسلام ہے جو ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرتا ہے جو ہر لمحہ اور ہر عمل میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، آخرت کا محاسبہ اس کے دل میں رچا بسا ہوتا ہے، ہر فرد کو دوسرے پر ظلم و غصب اور ہر برائی سے روکنے کا پورا حق ہے، اور وہ امیر کو بھی چاہے تو تلوار سے درست کر سکتا ہے، وہ اگر اسلامی قلمرو کے دوسرے سرے پر کسی کتے کے بھوک و پیاس سے مر جانے کی خبر سنتا ہے تو اللہ کے سامنے جواب دہی کے تصور سے تڑپنے لگتا ہے وہ ہر انسان کی بھوک و پیاس کو اپنی حاجت سمجھتا ہے اور جذبۂ ایثار سے خود فقیر رہ کر دوسروں کو اپنی متاع کا مالک بنا دیتا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے معاشی مسائل کی بنیاد مساوات پر نہیں بلکہ مؤاسات پر رکھی، وہ معاشی ناہمواری کو جبر سے نہیں بلکہ ایمان اور یقین کی بیداری سے حل کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے ایسا معاشرہ قائم کیا خلافتِ راشدہ اس کی واضح مثال ہے۔

سوشلزم اور گھر گھر کا مجیدی | دوسری طرف سوشلسٹوں کے طور طریقے تھے، اور جبر و ظلم کی

اساس پر ایک ایسی عمارت اٹھائی گئی جو نصف صدی میں دم توڑتی نظر آنے لگی ہے۔ "تاریخ کی اس مادی تعبیر" پر تازہ چانٹا حال ہی میں روس کے سیکرٹری جنرل برزنیف نے یہ کہہ کر رسید کیا کہ روس میں سوشلسٹ نظام عملاً ناکام ہو چکا ہے۔ اور اس طرح فشھد شاھد من اھلھا کا ایک نمونہ سامنے آ گیا ـــــ الغرض ہمارے پاس معاشی اور معاشرتی یگانگت کے لئے اسلام جیسا نسخۂ کیمیا موجود ہے، مگر افسوس اور صد افسوس کہ نہ تو ہم نے اسے سمجھا نہ پرکھا اور نہ کبھی آزمایا۔ ومن لم یذق لم یدر۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

سوشلزم عیار لیڈروں کا دام فریب | ہماری اس بے علمی اور حقیقت سے بیخبری سے موجودہ دور کے ابن الوقت سیاست دانوں نے خوب فائدہ اٹھایا بیچارے عوام اسے اپنی ساری بربادیوں کا تریاق سمجھ کر ان کے پیچھے دوڑنے لگے اور اس حقیقت سے غافل ہو گئے کہ چور راہی کمین گاہ تک پہنچا کر رہی سہی پونجی سے بھی ہمیں محروم کر دے گا۔ بات ناشائستہ سی ہے مگر مثال خوب چسپاں رہے گی کہ ہمارے علاقہ میں بچے کا ختنہ کراتے وقت عموماً بچے کو اِدھر اُدھر کی بھول بھلیوں میں بہلایا جاتا ہے اور ختنہ کا عین موقعہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں وہ دیکھو سونے کی چڑیا اڑ رہی ہے اور ابھی تیرے قدموں میں ہے۔ بچہ شوق سے نگاہ اٹھاتا ہے اور ادھر اپنے جسم کے ایک حصہ سے محروم۔ تو ہمارے ہاں سوشلزم کی مثال اُسی "سونے کی چڑیا" کی سی ہے جس سے عیار لیڈر خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں ـــــ (فروری ۷۴ء)

کتاب المزارعت

(مزارعت کے احکام و مسائل)

مزارعت کی چند صورتیں

سوال:۔ ہمارے معاشرہ میں علاقائی سطح پر مزارعت کی مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں۔ بعض علاقوں میں مالکِ زمین کو تخم کھیتی باڑی یا دوسرے اخراجات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیا شرعی نقطۂ نظر سے مالکِ زمین پر یہ ذمہ داری عائد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مزارعت کا معاملہ ظاہر الروایۃ کی رُو سے تین صورتوں میں جائز ہے:۔

(۱) زمین اور تخم ایک طرف سے ہو اور بیل و عمل (محنت) دوسری طرف سے۔

(۲) زمین ایک طرف سے اور عمل و گائے و تخم دُوسری طرف سے۔

(۳) زمین، بیل اور تخم ایک طرف سے اور عمل (محنت) دوسری طرف سے۔

ان جملہ تین صورتوں میں مزارعت کا معاملہ شرعاً جائز ہے۔

لما قال العلامة ابو الحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ: اذا کانت الارض والبذر لواحدٍ والعمل والبقر لواحدٍ جازت المزارعة وان کانت الارض لواحدٍ والعمل والبقر والبذر لآخر جازت المزارعة وان کانت الارض والبذر والبقر لواحدٍ والعمل لآخر جازت۔ (مختصر القدوری ص۲۰۸ کتاب المزارعة)[1]

فصل کی کٹائی کی ذمہ داری کا حکم

سوال: بعض علاقوں میں مالکِ زمین کسان (مزارع) پر دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ فصل کے تیار ہونے پر کاٹ کر صفائی کرکے مالک کے گھر پہنچائے گا، کیا

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفی رحمه الله: (وکذا) صحت (لو کان الارض والبذر لزید والبقر والعمل للآخر) (او الارض له والباقی للآخر) (او العمل له والباقی للآخر) فهذه الثلاثة جائزة۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۷۸ کتاب المزارعة)
وَمِثْلُهٗ فی الهدایة ج۴ ص۴۲۴ کتاب المزارعة۔

کسان (مزارعہ) کیلئے ان شرائط کی پابندی ضروری ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ ظاہر الروایۃ میں گنجائش نہ ہونے کے باوجود متاخرین علماء نے عرف کو مدنظر رکھتے ہوئے قاضی ابو یوسفؒ کی رائے کو اختیار کرکے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ کسان (مزارعہ) پر فصل کاٹنے اور تیار کرنے کی ذمہ داری ڈالنے میں کوئی حرج نہیں ، تاہم فصل کو مالکِ زمین کے گھر پہنچانے کی ذمہ داری کی نشاندہی عام کتابوں میں نہیں ملتی البتہ اگر کسان بطور احسان یہ فریضہ سرانجام دے تو ایسا عمل طرفین کے باہمی تعلقات پر اچھے اثرات مرتب ہونے کا باعث بنتا ہے ۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ : (وصح اشتراط العمل) کحصاد و دیاس ونصف علی العامل وعند الثانی علی العامل وھو الاصح) وعلیه الفتوٰی ۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۲۸۲ کتاب المزارعت) له

کسان (مزارعہ) کا مالکِ زمین کی اجازت کے بغیر فصل سے کچھ لینا

سوال:۔ مالکِ زمین کی اجازت کے بغیر کسان فصل سے کوئی چیز لے سکتا ہے یا نہیں ؟ ایسا ہی بعض چیزیں بوقتِ ضرورت گھر لے جاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ مزارعت سے مراد اگر بٹائی کا نظام (مزارعت بالنصف وغیرہ) ہو تو مالکِ زمین کاشتکار کے ساتھ شریک ہے اور شراکت میں بغیر اجازتِ شریک کے کوئی چیز بھی اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے ، تاہم کسی معمولی چیز (جس کی عرف میں اجازت ہو) استعمال کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ، اور اگر مزارعت سے مراد اجارہ ہو تو تمام آمدنی کسان کی ہوتی ہے اس لیے مالکِ زمین سے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ۔

له لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله ، (اقول) تلخص من ھذا أن الصحیح صحة اشتراط العمل علی العامل وبه صرح فی متن التنویر والملتقی ۔

(تنقیح الحامدیة ج ۲ ص ۲۰۵ کتاب المزارعة)

وَمِثْلُهٗ فی تبیین الحقائق ج ۵ ص ۲۸۳ کتاب المزارعة ۔

لما رواہ الامام علی بن عمر الدارقطنیؒ : عن عمرو بن یثربی قال شھدتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجۃ الوداع بمنٰی فسمعتُہٗ یقول لا یحل لامرءٍ من مال اخیہ شئٌ الا ما طابت بہ نفسہ ۔ انتہی
(سُنن الدار قطنی ج ۳ ص ۲۵ رقم ۸۹ کتاب البیوع) لہ

کاشتکار سے بطور ضمانت کچھ رقم رکھنا

سوال :۔ اگر مالک زمین کاشتکار سے کچھ رقم بطور زرِ ضمانت اپنے پاس رکھے تاکہ کاشتکار معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرسکے اور مالکِ زمین بے جا نقصان سے بچ سکے۔ شرعاً زمین کے مالک کے اس اقدام کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب :۔ مالکِ زمین کے لیے بطورِ اعتماد کوئی چیز رکھنے کے جواز کے نظائر موجود ہیں تاہم شرعی رُو سے یہ زمین رہن شمار ہوگی جس سے مرتہن (مالک) مرہونہ سے استفادہ کا حق نہیں رکھتا، عموماً کچھ رقم بطور ضمانت رکھ کر مالکِ زمین اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے جس کا اسے شرعاً حق نہیں ۔

لما قال العلامۃ قاضی خانؒ : لو استاجر خیاطاً لیخیط لہ ثوباً واخذ من الخیاط رھناً بالخیاط جاز ۔ انتہی (الفتاوٰی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص ۵۹۸ کتاب المزارعۃ) ۲ہ

مزارعت پر موت کے اثرات

سوال :۔ مزارعہ کی وفات پر اگر اولاد عقدِ مزارعت کو باقی رکھنا چاہتی ہو لیکن مالک زمین اس پر راضی نہ ہو تو کیا اس صورت میں مزارعہ کے ورثاء کو منوانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

لہ لما ذکر الشیخ ولی الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد الخطیبؒ : وعن ابی حرۃ الرقاشی عن عمہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئٍ الا بطیب نفسٍ منہ ۔ (مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۲۵۵ باب الغصب والعاریۃ، الفصل الثانی)
وَمِثْلُہٗ فی نصب الرایۃ ج ۴ ص ۱۶۹ کتاب الغصب ۔

۲ہ وفی الھندیۃ : لو استأجر خیاطاً لیخیط لہٗ ثوباً واخذ من الخیاط رھناً بالخیاط جاز ۔
(الفتاوٰی الھندیۃ ج ۵ ص ۴۳۵ الفصل الثالث فیما یجوز الارتھان الخ)
وَمِثْلُہٗ فی شرح مجلۃ الاحکام لشیخ سلیم رستم باز ص ۳۸۷ تحت مادۃ ۷۰۱

الجواب:۔ عاقدین میں سے کسی ایک کی وفات سے مزارعت کا معاہدہ ختم ہوجاتا ہے، تاہم جو فصل زمین میں موجود ہو تو اس کے پکنے تک انتظار کرنا ہوگا، البتہ اگر مزارعہ کے ورثاء فصل کو چھوڑنا چاہتے ہوں یا چھوڑنا چاہتے ہوں تو ان کو اس کے خلاف پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: بخلاف ما لو مات رب الارض والزرع بقلٌ فان العمل فیہ جمیعاً علی العامل أو ورثتہ لبقاء مدۃ العقد والعقد یوجب علی العامل عملاً یحتاج الیہ الیٰ انتھاء الزرع کما مر ولو مات قبل البذر بطلت ولاشیئ لکرب بہ کما مر۔ (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ج ۶ ص ۲۸۱، ص ۲۸۲ کتاب المزارعت) [۱]

قدیم قبرستان میں زراعت کا حکم

سوال:۔ ایک قدیم قبرستان جس پر سو سال سے زائد مدت گذر گئی ہے اور اس میں قبریں بھی دکھائی نہیں دیتیں ہیں، تو کیا ایسے قبرستان سے دوسرے فوائد مثلاً زراعت وغیرہ لیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی قبرستان کی قدامت کے لیے مُدت کا کوئی تعین نہیں ہے، تاہم فقہاء کرام کی تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب قبریں اتنی پرانی ہوں کہ مُردوں کے ابدان بظاہر اس سے متاثر نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں ایسے قبرستان کا دوسرے

---

[۱] لما قال العلامۃ فخرالدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفیؒ: (وتبطل بموت احدھما) لانھا اجارۃٌ وھی تبطل بموت أحد المتعاقدین اذا عقدھا لا نفسھما وقد بیناہ فی الاجارۃ وھذا علیٰ اطلاقہ ھوجواب القیاس وفی الاستحسان اذا مات أحدھما وقد نبت الزرع یبقی عقد الاجارۃ حتی یستحصد ذٰلک الزرع ثم تبطل فی الباقی لان فی ابقاء العقد حتی یستحصدھا مراعاۃ الحقین فیعمل العامل أو ورثتہ علی حالہ فاذا حصد یقسم علی ما شرطا ولا ضرورۃ فی الباقی فتبطل ولو مات رب الارض قبل المزارعۃ بعد ماکرب الارض وحفر الانھار انتقضت المزارعۃ لانہ لیس فی ذٰلک اتلاف مال علی المزارع ولاشیئ للعمل بمقابلۃ العمل۔ انتھی (تبیین الحقائق ج ۵ ص ۲۸۲ کتاب المزارعۃ)۔
ومثلہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۱۶۲ کتاب المزارعۃ۔

مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز ہے، اگر دوبارہ اس میں مُردے دفن کئے جائیں تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں، اور اگر قبرستان ذاتی ہو تو اپنے حصے میں آبادی کرنا یا زراعت کے لیے استعمال کرنا بھی مرخص ہے۔

لما قال العلامة فخرالدین عثمان بن علی الزیلعیؒ: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ فی قبرہ وزرعہ والبناء علیہ۔ (تبیین الحقائق ج ۱ ص۲۴۶ کتاب المزارعۃ)[1]

افیون کی کاشت کا حکم

سوال:۔ افیون کی کاشت کا شرعی نقطۂ نظر سے کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ افیون ایک ایسی چیز ہے جس سے عصرِ حاضر میں خطرناک اور مہلک ترین منشیات (یعنی ہیروئن وغیرہ) تیار کی جاتی ہیں جس سے پوری دنیا تباہی اور بربادی کی لپیٹ میں ہے اور اس کے مضرِ محض ہونے پر پوری دُنیا متفق ہے، اس لیے اس کی کاشت اور خرید و فروخت کے جواز کے کوئی خاص دلائل نہیں پائے جاتے بلکہ عام اقوال اس کی حُرمت کے مؤید ہیں۔ تاہم اگر افیون کا استعمال دوائی تک محدود ہو یا تخمِ افیون (خشخاش) حاصل کرنا مقصود ہو تو پھر ان ضروریات کے مطابق محدود پیمانے پر اس کی کاشت کی گنجائش پائی جاتی ہے لیکن معاشرہ میں یہ نیّت بہت کم پائی جاتی ہے۔

لما قال العلامۃ شمس الدین محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ: ویحرم أکل الحشیشۃ والافیون لکن دون حرمۃ الخمر۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر ردالمحتار ج۶ ص۴۵۷ کتاب الاشربۃ)[2]

---

[1] قال العلامۃ ابن نجیم المصریؒ: ولو بلی المیت وصار تراباً جاز دفن غیرہ وزرعہ والبناء علیہ۔ (البحر الرائق ج۲ ص۱۹۵ کتاب المزارعۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج ۱ ص۱۶۷ کتاب المزارعۃ۔

[2] لما قال العلامۃ شیخ الاسلام ابوبکر بن علی الحدادالیمنیؒ: ولا یجوز اکل الحشیشۃ والافیون وذلک کلہ حرام۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج۲ ص۲۷۰ کتاب الاشربۃ۔)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاویٰ الکاملیۃ ص۲۷۰ کتاب الاشربۃ۔

تمباکو کی کاشت جائز ہے

سوال:۔ سگریٹ یا نسوار کے لیے جو تمباکو استعمال ہوتا ہے شرعی نقطہ نظر سے اس کی کاشت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ بعض فوائد کے باوجود جدید تحقیق کی رُو سے اگرچہ تمباکو نوشی کے مضر اثرات پائے جاتے ہیں لیکن کسی نتیجہ پر پہنچنا تا حال ثابت نہیں جس کی وجہ سے اس کو مضر محض شمار کر کے محرمات کی فہرست میں شمار کیا جائے، اس لیے فقہاء کے اقوال سے اباحت کا حکم معلوم ہوتا ہے، دریں حال تمباکو کی کاشت اور خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (شرب الدخان) فانہٗ لم یثبت اسکارہٗ ولا تغیرہٗ ولا اضرارہٗ بل ثبت لہٗ منافع فہو داخل تحت قاعدۃ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ۔
(رد المحتار ج ۶ ص ۴۵۹ کتاب الاشربۃ) [1]

بھنگ کی کاشت کا حکم

سوال:۔ بھنگ ایک نشہ آور بوٹی ہے جس کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، کیا اس کی کاشت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھنگ چونکہ نشہ آور اشیاء کی فہرست میں شامل ہے اس لیے اس کی خرید و فروخت اور مزارعت شرعاً ناجائز ہے۔

لما قال العلامة شمس الدین محمد بن عبد اللّٰہ التمرتاشیؒ: ویحرم اکل البنج والحشیشۃ والافیون لکن دون حرمۃ الخمر۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۵۷ کتاب الاشربۃ) [2]

---

[1] قال العلامة المفتی محمد کامل بن مصطفیٰ الطرابلسیؒ: وقد حقق المتأخرون من اہل مذہبنا الحنفیۃ انہ (شرب الدخان) لیس بحرام وانما فی تعاطیہ الکراہۃ و قد منّا ان احسن ما قیل فیہ قول الامیر رحمہ اللّٰہ واختلف فی الدخان والورع ترکہ۔ (الفتاویٰ الکاملیۃ ص ۲۸۶ کتاب الکراہیۃ۔ مطلب فی حکم شرب الدخان)

[2] قال العلامة شیخ الاسلام ابوبکر بن علی بن محمد الحدادی الیمنیؒ: ولا یجوز اکل البنج والحشیشۃ والافیون وذٰلک کلہٗ حرامٌ۔
(الجوھرۃ النیرۃ ج ۲ ص ۲۷ کتاب الاشربۃ)
ومثلہٗ فی الفتاویٰ قاضی خان علیٰ ہامش الہندیۃ ج ۳ ص ۲۳۱ کتاب الاشربۃ۔

مزارع کی طرف سے تخم کے باوجود مالکِ زمین کا اس پر کھاد وغیرہ کے اشتراط سے مزارعت کا حکم

سوال:۔ اگر مالکِ زمین (رب الارض) کاشتکار (مزارع) پر کھاد وغیرہ امور کی اشتراط کرے جبکہ تخم (بیج) بھی کاشتکار کی طرف سے ہو تو کیا ان امور کے اشتراط کی وجہ سے مزارعت فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ مزارعت میں جب تخم (بیج) مزارع کی طرف سے ہو تو کھاد جیسے امور کی اشتراط علی المزارع کی وجہ سے مزارعت فاسد نہیں ہوتی بلکہ متاخرین فقہاء کرام کے نزدیک صحیح ہوتی ہے اور فتویٰ بھی متأخرین فقہاء کے قول پر ہے۔

وفی الھندیۃ: اذا شرط رب الارض والبذر من المزارع ان یسرقنھا قبل تفسد المزارعۃ عند المتقدمین ولاتفسد عند المتاخرین والفتوٰی علی قول المتاخرین۔ کذا فی جواھر الاخلاطی۔

{الفتاوٰی الھندیۃ ج۵ ص۲۴۴ کتاب المزارعۃ
الباب الثالث فی الشروط فی المزارعۃ}

ھدایہ کی ایک عبارت کی وضاحت

سوال:۔ جنابِ مفتی صاحب! ھدایہ کی اس عبارت "لاتجوز المزارعۃ والمساقات عند ابی حنیفۃ" کا کیا مطلب ہے؟ کیا واقعی امام ابوحنیفہؒ کے ہاں مزارعت کی جملہ انواع نا جائز ہیں؟ جبکہ احادیثِ مبارکہ مزارعت کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

الجواب:۔ مزارعت کے مسئلہ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف جتنے بھی اقوال منسوب ہیں اگر اُن میں نظرِ عمیق سے غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ امام ابوحنیفہؒ کا ان اقوال سے مقصد مطلق عدمِ جواز کا نہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ کوئی مالکِ زمین کاشتکاروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور ان کی محنت کو شیرِ مادر سمجھ کر ہڑپ نہ کر جائے، اسی طرح باہمی تنازعات اور جھگڑوں سے معاشرہ پاک وصاف ہو کیونکہ معاشرے میں جھگڑے عموماً اسی سے پیدا ہوتے ہیں، اور اسی طرح مالکِ زمین عزیمت پر عمل کر کے اپنی زمین کسی غریب آدمی کو کاشت کیلئے مفت دیدے ۔۔۔ اسلئے علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے حاوی القدسی کے حوالہ سے نقل کیا ہے: کرھھا ابوحنیفۃؒ ولعینہ اشد النھی۔

(فیض الباری ج۳ ص۲۲۵ کتاب المزارعت)

چشمہ کے پانی سے منع کرنے کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں موضع بھکن ملکوٹ تحصیل وضلع ایبٹ آباد میں پینے کے صاف پانی کی سخت قلت ہے ہماری خواتین کو چار کلومیٹر دور سے پانی لانا پڑتا ہے، جبکہ اتنے ہی فاصلے پر سرکاری جنگل میں پانی وافر مقدار میں نالے میں بہہ رہا ہے۔ ہم نے کوشش کر کے گورنمنٹ سے ایک سکیم منظور کرائی اور گاؤں کو پانی سپلائی کرنے کے لیے باقاعدہ ٹینکی تعمیر کر کے پائپ لائن بچھانے کا کام شروع کر دیا، ساتھ والے گاؤں کے لوگوں نے آکر ٹینکی توڑ دی اور پائپ لائن بھی اکھاڑ دی، ان کا موقف یہ ہے کہ اس جنگل پر ہمارے حقوق زیادہ ہیں اسلئے ہم اس کا پانی آپ لوگوں کو نہیں دیں گے۔ جبکہ پانی وافر مقدار میں ہے، دوسرے یہ کہ یہ پانی اس گاؤں والوں کے نہ تو پینے کے کام آتا ہے اور نہ ہی وہ اس سے اپنی زمینیں سیراب کرتے ہیں، یہ لوگ صرف اور صرف ضد پر قائم ہیں۔

جناب عالی! قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ صادر فرما کر ہمیں اس مشکل سے نکالیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے؟

الجواب:۔ پانی، آگ اور گھاس سب مشترکہ اموال ہیں، کوئی بھی شخص کسی کو ان سے منع نہیں کر سکتا، تاہم جو اس پانی کے قریب ہو اولاً اس کا حق ہے اور جو اس سے زائد ہو وہ دوسرے لوگ بغیر اس کی اجازت کے استعمال کر سکتے ہیں، کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کو اس کے استعمال سے منع کرے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق سرکاری جنگل کا پانی آپ سب لوگوں کا مشترکہ پانی ہے ساتھ والے گاؤں کے لوگوں کا اس سے منع کرنا بے انصافی اور ناجائز ہے، ان کو شرعاً یہ حق نہیں کہ وہ آپ لوگوں کو اس پانی کے استعمال سے منع کریں۔

لما فی الهندية: ماء البحار ولكل واحد من الناس فيها حق الشفعة وسقى الاراضى حتى ان من اراد ان يكرى نهراً منها الى الارض لم يمنع من ذلك ...... والثانى ماء الاودية العظام لجيحون وسيحون ودجلة والفرات للناس فيه حق الشفعة على الاطلاق وحق سقى الاراضى بان احى واحد ارضاً ميتة وكرى منه نهراً يسقيها ان كان لا يضر بالعامة ولا يكون نهراً فى ملك احد لانها مباحة فى الاصل ..... والاصل فيه قوله عليه السلام الناس شركاء فى ثلاث فى الماء والكلاء والنار۔

(الهداية ج۴ ص۴۸۲ مسائل الشرب)

کتاب
الذبائح
والصید

ولا تاكلوا مما لم يذكر
اسم الله عليه وانه لفسق

واذا حللتم
فاصطادوا

کتاب الذبائح

(ذبح کرنے کے احکام و مسائل)

ذبح کے لیے اللہ کا نام لینا ہی کافی ہے

سوال: اگر ایک شخص کوئی جانور ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللهِ اَللهُ اَكْبَرُ کہنے کی بجائے دوسرے ایسے کلمات ذکر کرے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں استعمال ہوتے ہوں تو کیا اس سے ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب: ذبیحہ کی حلت کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا کافی ہے جس کی تخصیص مذکورہ بالا کلمات سے نہیں بلکہ ہر اُن کلمات سے ذبح کرنا جائز ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دال ہوں۔

لما قال العلامة التمرتاشیؒ: (والشرط فی التسمیة هو الذکر الخالص عن شوب الدعاء) وغیره (فلا یحل بقوله اللّٰهم اغفرلی) لانه دعاء وسوال (بخلاف الحمد لله وسبحان الله مریداً به التسمیة) فانه یحل۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۰۱ کتاب الذبائح)[1]

معاونِ ذابح کے لیے تسمیہ کا حکم

سوال: مذبوحہ کی حلت کے لیے اگرچہ ذابح کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص ذابح سے تعاون کر رہا ہو تو کیا اُس کے لیے بھی ذابح کی طرح تسمیہ کہنا ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس کے تسمیہ ترک کرنے سے مذبوحہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟

الجواب: اگر معاون کی حیثیت اس درجہ کی ہو کہ ذابح کا کردار اس کے بغیر نامکمل ہو، یہاں تک کہ چھری ہاتھ میں لے کر ذبح کرنے میں دونوں شریک کار ہوں تو ہر ایک کے لیے تسمیہ کہنا ضروری ہے اور ہر ایک مستقل ذابح شمار ہوگا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: وفیها اراد التضحیة فوضع یده مع ید القصاب

---

[1] لما قال الشیخ الاسلام ابو بکر بن علی الحداد الیمنیؒ: وان قال بسم الله الرحمٰن الرحیم فهو حسن، والشرط هو الذکر الخالص المجرد علیٰ ما قال ابن مسعود جردوا التسمیة۔۔۔۔۔ ولو قال سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله یرید التسمیة اجزء لان المامور به ذکر الله علیٰ وجه التعظیم۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۷۶ کتاب الذبائح)

فی الذبح واعانه علی الذبح سمی کل وجوباً فلو ترکہا احدھما اوظن ان تسمیۃ احدھما تکفی حرمۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۳۴ کتاب الاضحیۃ) [1]

ذبح فوق العقد کا حکم

سوال: شریعتِ مقدسہ میں ذبح فوق العقد کا کیا حکم ہے، اور اس سے جانور کی حلت وحرمت پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟

الجواب: ذبح میں اصل چیز حلقوم، مری اور دو رگوں کا کاٹنا ضروری ہے جو عقد کے نیچے جمع ہوتے ہیں اس لیے تحت العقد ذبح کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تاہم اگر ماہرین ذبح یہ کہیں کہ یہ اعضاء عقد کے اوپر کٹ جاتے ہیں تو بلاشبہ جانور حلال ہے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ ذبح تحت العقد ہو۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانی رحؒ: والذبح بین الحلق واللبۃ وفی الجامع الصغیر لا بأس بالذبح فی الحلق کلہ وسطہ واعلاہ واسفلہ۔

(الھدایۃ ج ۴ ص ۴۳۵ کتاب الذبائح) [2]

کسی جانور کا حرکت کرنا یا خون نکلنا باعثِ حلت ہے

سوال: اگر کسی جانور میں بظاہر زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے ہوں لیکن ذبح کرنے کے بعد اس سے خون نکل آئے یا وہ حرکت کرے تو کیا اس سے وہ جانور حلال تصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب: جب کسی جانور میں ظاہری علاماتِ حیات مفقود ہوں لیکن بوقتِ ذبح

---

[1] لما قال العلامۃ الفرغانی رحمہ اللہ: رجلٌ اراد ان یضحی فوضع صاحب الشاۃ مع ید القصاب فی الذبح واعانہٗ علی الذبح حتی صار ذابحاً مع القصاب۔ قال الشیخ الامام رحمہ اللہ تعالیٰ یجب علی کل واحدٍ منھما التسمیۃ حتی لو ترک احدھما التسمیۃ لاتحل الذبیحۃ۔ (الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیۃ ج ۳ ص ۳۵۵ کتاب الاضحیۃ۔ فصل فی مسائل متفرقۃ)

[2] قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفی رحمہ اللہ: وذکاۃ (الاختیار ذبح بین الحلق واللبۃ بالفتح! المنحر من الصدر (وعروقہ الحلقوم) کلہ وسطہ او اعلاہ او اسفلہ وھو مجری النفس۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۲۹۴ کتاب الذبائح)
وَمِثْلُہٗ فی العنایۃ علی ھامش فتح القدیر ج ۸ ص ۴۱۲ کتاب الذبائح۔

حرکت کرے یا اتنا خون نکل آئے جتنا کہ زندہ جانور سے نکلتا ہو تو اس کی زندگی کے لیے یہ علامت کافی ہے اور اس سے یہ جانور حلال سمجھا جائے گا۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: ذبح شاۃ مریضۃ فتحرکت او خرج الدم حلت والا لا ان لم تدر حیاتہ۔ قال ابن عابدینؒ (قولہ او اخرج الدم) کما یخرج من الحی۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۰۸ کتاب الذبائح) [۱]

بوقتِ ذبح جانور کا سر تن سے جدا کرنا مکروہ ہے

سوال:۔ ذبح کرتے وقت اگر ذابح سے جانور کا سر کٹ جائے تو کیا اس سے مذبوحہ پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ذبح کرتے وقت ذبیحہ کا سر کٹ جانے سے ذبح پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کا گوشت حلال اور کھانے کے قابل ہے، تاہم جانور کے ٹھنڈا ہونے سے قبل اس کا سر کاٹنا بوجہ غیر ضروری تعذیب کے کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال الامام ابو الحسین احمد بن محمد البغدادیؒ: ومن بلغ بالسکین النخاع او قطع الرأس کرہ لہ ذٰلک وتوکل ذبیحتہ۔ (مختصر القدوری ص ۲۷۶ کتاب الذبائح) [۲]

بوجہ حادثہ سر کٹنے کے بعد جانور کا حکم

سوال:۔ اگر کسی جانور کا سر کسی حادثہ میں تن سے جدا ہو جائے تو باقیماندہ بدن پر چھری پھیرنے سے وہ جانور حلال ہوگا یا نہیں؟

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: رجل ذبح شاۃ او بقرۃ وتحرکت بعد الذبح خرج منها دم مسفوح تحل وکذا ان تحرکت ولم یخرج الدم او خرج الدم ولم یتحرک..... وفی شرح الطحاوی وخروج الدم لا یدل علی الحیٰوۃ الا اذا کان یخرج کما یخرج من الحی۔ (خلاصۃ الفتاوی ج ۴ ص ۳۰۶ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی البزازیۃ علی هامش الهندیۃ ج ۶ ص ۳۰۵ کتاب الذبائح۔

[۲] لما قال الامام عبد اللہ بن محمود بن مودود الموصلی ویکرہ ان یبلغ بالسکین النخاع او یقطع الرأس وتؤکل۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج ۵ ص ۱۲ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۲۹۶ کتاب الذبائح۔

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق سر کٹنے کے بعد وہ رگیں اگر باقی ہوں جن کو کاٹنے سے جانور حلال ہوتا ہو تو یہ جانور حلال ہوگا صرف چھری پھیرنا کافی نہیں۔

لما قال العلامۃ ابن البزاز الکردریؒ: ولو انتزع الذئب رأس الشاۃ وبقیت حیۃ تحل بالذبح بین اللبۃ واللحیین، وفیہ..... شاۃ قطع الذئب اوداجھا وھی حیۃ لا تذکی لفوات محل الذبح۔ (الفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۳۰۸ کتاب الذبائح)[1]

دانت یا ناخن وغیرہ سے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ حلال جانور قریب المرگ ہو اور چھری وغیرہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے جانور کے مردار ہونے کا خطرہ ہو تو کیا دانت، ناخن یا کسی تیز دھار پتھر سے جانور کا ذبح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی ہنگامی حالت میں چاقو یا چھری دستیاب نہ ہونے کی صورت میں ناخن، دانت یا تیز دھار پتھر وغیرہ سے جانور کا ذبح کرنا صحیح اور درست ہے بشرطیکہ ناخن اور دانت نکلے ہوئے ہوں ورنہ انگلیوں میں بڑھے ہوئے ناخن یا منہ کے دانتوں سے جانور ذبح کرنا جائز نہیں، لیکن انسان کے قابلِ احترام اجزاء ہونے کی وجہ سے نکلے ہوئے دانتوں یا ناخنوں سے جانور ذبح کرنا کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامۃ ابو عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانیؒ: ظفر منزوعٌ اَوْ قرن اَوْ عظم اَوْ سنٌّ منزوعۃ ذبح بہٖ فانھر الدم وأفری الاوداج لم یکن بأکلہ بأسٌ واکرہ ھٰذا الذبح، وان ذبح بظفر او بسن غیر منزوعۃ فھی میتۃٌ۔ (الجامع الصغیر ص۳۸۶ کتاب الذبائح)[2]

---

[1] ذکر فی الھندیۃ: ولو انتزع الذئب رأس الشاۃ وھی حیۃ تحل بالذبح بین اللبۃ واللحیین..... شاۃ قطع الذئب اوداجھا وھی لا تذکی لفوات محل الذبح۔

(الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۲۹۱ کتاب الذبائح۔ الباب الثالث فی المتفرقات)

[2] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ویجوز بالظفر والسن والقرن اذا کان منزوعًا حتی لا یکون بأکلہ بأسٌ الا ان یکرہ ھٰذا الذبح..... بخلاف غیر المنزوع لانہٗ یقتل بالثقل فیکون فی معنی المنخنقۃ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۳۶ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۱ کتاب الذبائح۔

مشینی ذبیحہ کا حکم | **سوال:۔** آجکل جدید سائنسی آلات سے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے، شریعتِ مقدسہ میں مشینی ذبیحہ کا کیا حکم ہے ؟

الجواب:۔ کسی جانور کو ذبح کرنے کے لیے شریعتِ مقدسہ نے چند شرائط رکھی ہیں:۔
(۱) ذبح کرنے والے کا مسلمان ہونا (۲) بوقتِ ذبح تسمیہ پڑھنا (۳) تحت العقد ذبح کرنا۔
لہٰذا اگر جدید سائنسی آلات سے ذبح کرنے میں مذکورہ شرائط موجود ہوں تو ذبیحہ حلال ہوگا اور اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں، بصورتِ دیگر ایسا ذبیحہ حلال نہیں اور نہ اس کا کھانا جائز ہے۔

لما قال الامام ابوالحسن احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ : وذبیحۃ المسلم والکتابی حلال ولا تؤکل ذبیحۃ المرتد والمجوسی والوثنی والمحرم وان ترك التسمیۃ عمداً فالذبیحۃ میتۃ لا تؤکل وان ترکہا ناسیاً اُکل والذبح بین الحلق واللبۃ والعروق التی تقطع فی الزکاۃ اربعۃ الحلقوم والمری والودجان۔
(مختصر القدوری ص۲۷۶ کتاب الذبائح) [1]

خاص مواقع کے ذبح کا حکم | **سوال:۔** بعض دفعہ خاص اسباب کی موجودگی میں کوئی جانور ذبح کیا جاتا ہے، مثلاً بیمار کو جب صحتیابی ملے تو اس کے لیے جانور ذبح کیا جاتا ہے یا کسی اہم تقریب کے انعقاد پر مہمان نوازی کے لیے جانور ذبح کیا جاتا ہے، تو کیا ان خاص اسباب کی وجہ سے اس کی حلّت پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں وہ ذبیحہ حرام ہے جو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کیا گیا ہو، مذکورہ بالا صورتوں میں غیر اللہ کا تقدس و تقرب نہیں بلکہ شکرِ الٰہی پیشِ نظر ہوتا ہے اس لیے اس ذبیحہ کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

---

[1] قال الامام عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلیؒ : والذکاۃ الاختیاریۃ وھی الذبح فی الحلق واللبۃ والاضطراریۃ وھی الجرح فی ای موضع اتفق وشرطھما التسمیۃ وکون الذابح مسلماً او کتابیاً۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۹ کتاب الذبائح)
ومِثلُہٗ فی کنزالدقائق ص۴۱۶ کتاب الذبائح۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (ولو ذبح للضیف یحرم) وعلی ھذا فالذبح عند وضع الجدار او عروض مرض او شفاء منه لا شك فی حله لان القصد منه التصدق۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۰۹ کتاب الذبائح) [1]

اہلِ کتاب کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ موجودہ دور کے عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں ذابح کا مسلمان یا اہلِ کتاب ہونا ضروری ہے، اسلیئے عیسائی اور یہودی اگر اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کی پیروی کے دعویدار ہوں تو ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ تاہم موجودہ دور کی جدت پسندی کو مدنظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائی اور یہودی ایسے عقائد و نظریات پر عمل پیرا ہیں جو اُن کے مذہب کے بنیادی عقائد سے متصادم ہیں، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ ان کا ذبیحہ کھانے سے احتراز کیا جائے۔

لما قال العلامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفیؒ: حل ذبیحة مسلم و کتابی۔ الخ (کنز الدقائق ص ۴۱۶ کتاب الذبائح) [2]

اہلِ تشیع کے ذبیحہ کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا اہلِ تشیع کے ذبیحہ کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ علماءِ محققین کے نزدیک موجودہ دور کے اہلِ تشیع تعصب اور بغض و عناد کی وجہ سے ایسے عقائد کے معتقد ہیں جو موجبِ کفر ہیں، ایسے کفریہ عقائد رکھتے

---

[1] قال العلامة المفتی محمد کامل بن مصطفیٰ الطرابلسیؒ: وعلی ھذا فالذبح عند وضع الجدار وعروض مرض وشفاء منه لا شك فی حلّه لان القصد منه التصدق۔ (الفتاوی الکاملیة ص ۲۳۹ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر للحمویؒ ج ۳ ص ۲۳۰ کتاب الذبائح۔

[2] قال الشیخ ابوالحسین احمد بن محمد البغدادیؒ: وذبیحة المسلم والکتابی حلال۔ (مختصر القدوری ص ۲۷۵ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج ۵ ص ۹ کتاب الذبائح۔

کی وجہ سے ان کے ذبیحہ کا حکم مرتدین کا ہو کر کھانے کے قابل نہیں۔

لما قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: الرافضی ان کان یسب الشیخین ویلعنھما فھو کافرٌ وان کان یفضل علیًا علی ابی بکر وعمر رضی اللہ عنھم لا یکون کافرًا لکنہٗ مبتدعٌ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۴ ص ۳۸۱ کتاب الکراھیۃ)[1]

گائے کے گوشت کی حلت کا حکم

سوال:۔ بعض واعظین سے اکثر ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں جو گائے کے گوشت سے نفرت دلاتی ہیں، کیا گائے کا گوشت کھانا از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ از روئے شرع گائے ان حیوانات کی فہرست میں داخل ہے جو چیر پھاڑ کر نہیں کھاتے، اس لیے اس کی حلت میں کوئی شک نہیں، فقہاء کی تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ گائے تو درکنار بلکہ اس کے پیٹ میں زندہ بچے کو اگر ذبح کیا جائے تو وہ بھی حلال ہے۔

لما قال العلامۃ ابن عابدینؒ: بقرۃ تعسرت ولادتھا فادخل ربھا یدہ وذبح الولد حل وان جرحہ فی غیر محل الذبح وان لم یقدر علیٰ ذبحہ حل وان قدر لا۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۰۳ کتاب الذبائح)[2]

چوری کیے گئے جانور کے گوشت کا حکم

سوال: چوری کئے گئے یا کسی مغصوبہ جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] لما قال العلامۃ مُلا علی القاریؒ: قلتُ! وَھٰذا فی غیر حق الرافضۃ الخارجیۃ فی زماننا فانھم یعتقدون کفر اکثر الصحابۃ فضلاً عن سائر اھل السنۃ والجماعۃ فھم کفرۃ بالاجماع بلا نزاع۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۹ ص ۱۳۷ کتاب الفتن)

وَمِثْلُہٗ فی شرح الفقہ الاکبر ص ۸۲ الکبیرۃ لا تخرج المؤمن عن الایمان۔

[2] قال العلامۃ الاستاذ محمد الشھیر بالطوریؒ: لوان بقرۃ تعسر علیھا الولادۃ فادخل صاحبھا یدہ وذبح الولد حل أکلہ وان جرحھا فی غیر موضع الذبح اذا کان لا یقدر علیٰ ذبحہ یحل وان کان یقدر لا یحل۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۱۷۱ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاویٰ الھندیۃ ج ۵ ص ۲۸۷ کتاب الذبائح۔ الباب الاول۔

الجواب:۔ حلال جانور کی حلت وحرمت کے احکام پر سرقہ اور غصب مؤثر نہیں ہوتے بشرطیکہ ذابح مسلمان ہو اور ذبح کے وقت ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، تاہم سارق اور غاصب پر مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے۔

لما قال العلامة ابن البزاز الکردری: غصب شاة وضحی بہا ان اخذھا مالکھا وضمنہ النقصان لا یقع عن الاضحیة وان ضمنہ قیمتھا حیة وقعت عنھا لانھا صارت ملکاً من وقت الغصب۔ (الفتاوی البزازیة علی ھامش الھندیة ج۶ ص۲۹۱ کتاب الاضحیة) [۱]

خرگوش حلال جانور ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! خرگوش کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اہل تشیع اس کی حرمت کے قائل ہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے خرگوش کو حلال جانور قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمہ اللہ: (و) حل (غراب الزرع) الذی یأکل الحب (والارنب والعقعق)۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۰۸ کتاب الذبائح) [۲]

کوّے کی حلت وحرمت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کوّے کی حلت وحرمت کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کوّے کو عربی میں غُراب کہا جاتا ہے، فقہاء کرام کے اقوال سے

---

[۱] لما قال العلامة طاھر بن عبدالرشید البخاری: اذا غصب شاة وضحی بھا لا یجوز و صاحبھا بالخیار ان شاء اخذھا ناقصة ویضمنہ النقصان ولا یجوز عن الاضحیة وان شاء ضمنہ قیمتھا حیة فتصیر الشاة ملکاً للغاصب من وقت الغصب فیجوز عند الثلاثة رحمھم اللہ استحساناً۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۱۶ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُہٗ فی الفتاوی الھندیة ج۵ ص۳۰۳ الباب السابع فی التضحیة عن الغیر۔

[۲] واخرجہ الامام ابو عیسی الترمذی فی سننہ: عن ھشام بن زید قال سمعت انساً یقول انفجنا ارنباً بمر الظھران فسعی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفھا فادرکتھا فاخذتھا فاتیت بھا ابا طلحة فذبحھا بمروة فبعث معی بفخذھا او بورکھا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاکلہ فقلت اکلہ قال قبلہ۔ (الجامع الترمذی ج۲ ص۲ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی اکل الارنب)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۷۲ کتاب الذبائح۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تین قسمیں ہیں (۱) بعض کوّے ایسے ہوتے ہیں جو صرف مردار اور اور نجس چیزیں کھاتے ہیں، غراب (کوّے) کی یہ قسم حرام ہے۔ (۲) دوسری قسم کے کوّے وہ ہیں جو کھانے میں صرف دانے (پاکیزہ چیزیں) استعمال کرتے ہیں، مُردار نہیں کھاتے، ان کا کھانا حلال ہے۔ (۳) کوّوں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جس کی خوراک حرام اور حلال سے مرکب ہوتی ہے، یعنی مردار بھی کھالیتے ہیں اور پاکیزہ چیزیں بھی ۔ قاضی ابو یوسفؒ اگرچہ اس کی کراہت کے قائل ہیں لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلال ہے اور فتویٰ آپؒ ہی کے قول پر ہے۔

لما قال العلامة فخر الدين عثمان بن على الزيلعيؒ: والغراب ثلاثة انواع يأكل الجيف فحسب فانه لايؤكل ونوع يأكل الحب فقط فانهٗ يؤكل ونوع يخلط بينهم وهو ايضاً يؤكل عند ابي حنيفةؒ وهو العقعق لانه كالدجاج وعن ابي يوسف رحمه الله انه يكره لان غالب ماكوله الجيف والاول اصح ۔ انتهى

(تبيين الحقائق ج ۵ ص۲۹۵ كتاب الذبائح) له

ہُدہُد کھانے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہُدہُد کا گوشت کھانا ازروئے شرع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام میں ہر اُس پرندے کا کھانا حرام ہے جو اپنی خوراک (شکار) چیر پھاڑ کر کھاتا ہو، ہُدہُد کا شمار چونکہ ایسے پرندوں میں نہیں ہوتا جو چیر پھاڑ کر کھاتے ہیں اس لیے اس کے کھانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، تاہم بعض فقہاء کرام نے اس کے کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے، اس لیے اجتناب ہی بہتر ہے۔

له لما قال العلامة الاستاذ محمد الشهير بالطوری رحمه الله: والغراب ثلاثة انواع نوعٌ يأكل الجيف فحسب فانهٗ لايؤكل ونوعٌ يأكل الحب فحسب فانه يؤكل ونوع يخلط بينهما وهو ايضاً يؤكل عند الامام وهو العقعق لانه يأكل الدجاج وعن ابي يوسفؒ انهٗ يكره اكله لانهٗ غالب اكله الجيف والاوّل اصح ۔

(البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۲ كتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی مجمع الانهر شرح الملتقى الابحر ج ۲ ص۵۱۴ كتاب الذبائح ۔

لما قال الامام شیخ الاسلام ابوبکر بن علی بن محمد الحدادی الیمنیؒ: وکذا لا بأس باکل العقعق والھدھد والحمام والعصافیر لان عامة اکلھا الحب والثمار (الجوھرة النیرة ج ۲ ص۲۷۹ کتاب الذبائح) لـہ

وقال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ: ویکرہ الصرد والھدھد۔

(رد المحتار ج ۶ ص ۳۰۶ کتاب الذبائح) لـہ

موطوءہ جانور (چارپائے) کا شرعی حکم

سوال:۔ کسی حیوان سے بدفعلی کرنے سے اس فعل کی قباحت اور حرمت سے قطع نظر اس کے گوشت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ کسی حلال جانور سے ایسے مکروہ فعل کے کرنے سے اس کا گوشت یا دودھ حرام نہیں ہوتا ہے، تاہم ایسے حیوان کی موجودگی اس غیر فطری عمل کے تذکرا اور یاددہانی کا ذریعہ ضرور ہے، اس لیے فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ ایسے جانور کو ذبح کرکے اس کا گوشت جلادیا جائے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ شناعت دائمی نہ رہے تاہم کسی دور دراز علاقہ میں لے جاکر فروخت کرنے سے بھی ایسے جانور کو دور کیا جاسکتا ہے۔

لما قال العلامة ابن الھمامؒ: (والذی یروی انه تذبح البھیمة وتحرق ذلك لقطع) امتداد (التحدث به) کلما رؤیت فیتاذی الفاعل به ولیس بواجب واذا ذبحت وھی مما لاتؤکل ضمن قیمتھا...... وان کانت مما تؤکل اکلت وضمن عند ابی حنیفةؒ وعند ابی یوسفؒ لاتؤکل۔ (فتح القدیر شرح الھدایة ج ۵ ص۴۵ کتاب الذبائح) ۲ـہ

لـہ قال الامام ابو اللیث السمرقندیؒ الفقیه الکامل: ولا بأس باکل العقعق عند ابی حنیفةؒ وکذا لا بأس بالھدھد۔ (الفتاوی النوازل ص۲۳۶ کتاب الذبائح)

ومِثْلُهٗ فی الفتاوی الھندیة ج ۵ ص۲۹۰ کتاب الذبائح۔ الباب الثانی۔

۲ـہ قال العلامة ابن نجیمؒ: والذی انھا تذبح البھیمة وتحریم فذلك لقطع التحدث به ولیس بواجب قالوا وان کانت الدابة مما لا تاکل لحمھا تذبح وتحرق لما ذکرنا وان کانت مما تؤکل تذبح وتؤکل عند ابی حنیفة وقالا تحرق ھذا ایضاً۔ (البحر الرائق ج ۵ ص۱۷ کتاب الذبائح)

ومِثْلُهٗ فی رد المحتار ج ۴ ص۲۶ کتاب الحدود، مطلب فی وط الدابة

یورپ کے ذبح شدہ جانوروں کے گوشت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! بلادِ عرب میں نیوزی لینڈ، آسٹریلیا وغیرہ یورپی ممالک سے بند ڈبوں میں مرغی اور دیگر جانوروں کا گوشت آتا ہے اور ان ڈبوں پر یہ تحریر ہوتا ہے کہ حلال طریقے سے ذبح کیا گیا ہے، تو کیا ایسے گوشت کا استعمال کرنا جائز ہے؟

الجواب:۔ ایسے گوشت کے بارے میں اگر غالب گمان یہ ہو کہ اس کے ذابحین مسلمان ہیں اور انہوں نے اسلامی طریقہ سے ذبح کیا ہے تو فتویٰ کی رُو سے اس کا استعمال کرنا مرخص ہے مگر تقویٰ کی رُو سے اس سلسلہ میں عصرِ حاضر کی دیگر بے احتیاطیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے استعمال سے پرہیز ہی کرنا چاہیئے۔

لما قال العلامة التمرتاشی رحمه الله: وزکوٰة الإختیار ذبح ا طلق واللبة..... والمری والودجان..... وشرط کون الذابح مسلماً حلالاً خارج الحرم..... والشرط فی التسمیة هو الذکر الخالص عن شوب الدعاء۔ (تنویر الابصار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۶ کتاب الذبائح) [۱]

غیر فطری طریقہ کی پیداوار غیر ملکی گائے کا حکم

سوال:۔ بعض نسل کی گائیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی نسل کشی کے لیے خنزیر کا مادہ منویہ بذریعہ ٹیسٹ ٹیوب یا بذریعہ حقنی استعمال کیا جاتا ہے جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے، ایسی گائے کو جرمنی یا غیر ملکی گائے کہا جاتا ہے۔ ایسی گائے کے گوشت کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ حیوانات کی نسل مادہ سے ثابت ہوتی ہے، نر کے مادۂ منویہ کا کوئی

---

[۱] وفی الهندیة: الاختیاریة فرکنها الذبح فیما یذبح من الشاة......... والذبح هو فری الاوداج ومحله ما بین اللبة واللحیین..... منها ان یکون مسلماً او کتابیاً..... منها التسمیة حالة الزکاة عندنا..... منها ان یرید بها التسمیة علی الذبیحة..... منها قیام اصل الحیاة فی المستأنس وقت الذبح۔ (الفتاویٰ الهندیة ج۵ ص۲۸۵، ۲۸۶ کتاب الذبائح۔ الباب الاول)

ومثله فی الهدایة ج۴ ص۴۳۲ کتاب الذبائح۔

اعتبار نہیں ہوتا، اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بکری کے ساتھ کوئی درندہ جفتی کرے تو بچہ ماں کے تابع ہوگا، لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق جرمنی کی مذکورہ گائے کو ذبح کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا یعنی اس کا گوشت کھانا جائز ہے۔

لما قال العلامة الكاسانی رحمه الله : فان كان متولداً من الوحشي والانسي فالعبرة للام فان كانت اهلية يجوز والافلا حتى ان البقرة الاهلية اذا نزعها ثور وحشي فولدت ولداً فانه يجوز ان يضحى به وان كانت البقرة وحشية والثور اهليا لم يجز لان الاصل فی الولد الام لانه ينفصل عن الام۔

(بدائع الصنائع ج۵ ص۶۹ كتاب الذبائح) [1]

بوقتِ ذبح عمداً تسمیہ چھوڑنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت قصداً و عمداً بسم اللہ چھوڑ دے تو کیا یہ ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ احناف کے ہاں ذبح کرتے وقت بسم الله الخ قصداً و عمداً ترک کرنا ذبیحہ کے مردار ہونے کا سبب ہے، لہٰذا بوقتِ ذبح عمداً بسم اللہ ترک کرنے سے ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے جس سے کسی بھی قسم کا انتفاع جائز نہیں، نہ خود کھا سکتا ہے اور نہ دوسروں کو کھلا سکتا ہے۔

لما قال العلامة المرغينانی رحمه الله : ان ترك التسمية عمداً لايسع الاجتهاد ولو قضى القاضی بجواز بيعه لا ينفذ۔

(الهداية على صدر فتح القدير ج۸ ص۵۷ كتاب الذبائح) [2]

---

[1] قال العلامة ابوبكر الجصاص الرازیؒ : الاترى ان حمارة اهلية لو ولدت من حمار وحشی لم يؤكل ولدها ولو ولدت حمارة وحشية من حمار اهلی اُكل ولدها فكان الولد تابعاً لامه دون ابيه۔ (احكام القرآن ج۵ ص۳ سورة النحل)

[2] قال العلامة ابن عابدينؒ : ولا تحل ذبيحة من تعمد ترك التسمية مسلماً اوكتابيا لنص القرآن ولا نعقاد الاجماع۔ (رد المحتار ج۶ ص۲۹۹ كتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی الهداية ج۴ ص۴۳۵ كتاب الذبائح۔

حلال جانور کے حرام اجزاء

سوال: حلال مذبوحہ کے بدن سے کون کون سی چیزیں کھانا حرام ہیں؟

الجواب: حلال جانور کا شرعی طریقہ سے ذبح ہونے کے باوجود اس کے سات مندرجہ ذیل اعضاء کا کھانا حرام ہے:۔ (۱) پتّا (۲) مثانہ (۳) غدود (۴) فرج (۵) ذکر، (۶) خصیتین اور (۷) دمِ مسفوح۔

لما قال العلامة محمد بن حسن الشیبانیؒ: عن مجاهد قال کره رسول الله صلی الله علیه وسلم من الشاة سبعاً: المرار والمثانة والغدة والحیاء والذکر والانثیین والدم۔ انتهی (کتاب الآثار ص۱۷۹ باب ما یکره من الشاة الدم وغیره)[1]

جانور کو گولی مار کر ذبح کرنا

سوال: جناب مفتی صاحب! ہمارے گاؤں کے قریب ایک جنگل ہے جس کو ہم لوگ بیلہ کہتے ہیں، گاؤں والے اس میں اپنے مال مویشی چھوڑ دیتے ہیں جس میں کبھی کبھی کوئی جانور وحشی بھی ہو جاتا ہے جو کسی طرح قابو میں نہیں آتا تو لوگ اس کو گولی مار کر گرا لیتے ہیں اور پھر اس کو ذبح کرتے ہیں۔ تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: گولی مار کر گرانے کے بعد اگر جانور میں جان باقی ہو اور فوراً اس کو شرعی طریقہ سے ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہوگا ورنہ نہیں، البتہ کسی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بلاوجہ گولی مارنا ظلم و زیادتی اور موجبِ گناہ ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمہ الله: وحل المذبوح بقطع ای ثلاث منها اذ للاکثر حکم الکل۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۲۹۵ کتاب الذبائح)

---

[1] قال العلامة علاؤ الدین الکاسانیؒ: واما بیان ما یحرم اکله من اجزاء الحیوان المأکول فالذی یحرم اکله منه سبعة الدم المسفوح والذکر والانثیان والقبل والغدة والمثانة والمرارة۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۶۱ کتاب الذبائح)

ومثله فی تنقیح الحامدیة ج۲ ص۲۳۲ کتاب الذبائح۔

خنزیر کی حرمت میں فلسفہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! یہاں جاپان میں عموماً خنزیر کا گوشت کھایا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض مسلمان جو کہ عرصہ دراز سے یہاں مقیم ہیں وہ بھی استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گائے اور خنزیر کے گوشت میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا گوشت ایک ہی طرح کا ہوتا ہے بلکہ خنزیر کا گوشت گائے کے گوشت سے لذیذ ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ اسلام میں خنزیر کا گوشت حرام قرار دینے کا کیا فلسفہ ہے؟

الجواب:۔ اسلامی نقطہ نظر سے کسی چیز کی حلت اور حرمت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اللہ تعالیٰ جس چیز کو حلال فرمادیں وہ حلال ہوتی ہے اور جس کو حرام فرما دیں وہ حرام ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں کسی کو قیاس آرائی کی اجازت نہیں کہ وہ اِدھر اُدھر صغریٰ وکبریٰ ملا کر کسی چیز پر حلال یا حرام ہونے کا حکم لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف حیوانات کی طرح گائے کو بھی حلال قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ ۔۔۔۔ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ ۝

(سورۃ الانعام پ ۸ آیت ع ـــ)

(ترجمہ)" آٹھ نر و مادہ یعنی بھیڑ میں دو قسم اور بکری میں دو قسم، آپؐ کہہ دیں کہ کیا اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو ۔۔۔۔ اور گائے میں دو قسم، آپؐ کہہ دیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو؟"

مشہور مفسرِ قرآن علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

ثمّ بین اضاف الانعام الیٰ غنم ۔۔۔۔۔۔ الابل ذکورها واناثها وبقر کذٰلك وانهٗ تعالیٰ لم یحرم شیئاً من ذٰلك ولا شیئاً من اولادها بل کلها مخلوقة لبنی اٰدم اکلا ورکوباً وحمولة وحلباً وغیر ذٰلك من وجوه المنافع۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۸۳)

(ترجمہ)" پھر اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی اقسام کو بیان کیا ۔۔۔ حتیٰ کہ اونٹ اس کا نر و مادہ اور اسی طرح گائے بھی، بیشک اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اور ان کی اولاد میں سے کسی کو بھی حرام نہیں کیا بلکہ یہ سارے کے سارے بنی آدم کے کھانے، سواری، باربرداری اور دودھ وغیرہ منافع کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔"

اس لیے گائے کے حلال ہونے میں شک کرنا صحیح نہیں ـــــ اور خنزیر کو بعض دیگر حیوانات کی طرح حرام قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا۔ (سورۃ الانعام پ۸ آیت ۔)

(ترجمہ) "آپ فرمادیں کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں جو مجھ کو پہنچتی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھاوے مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا گوشت سؤر کا کہ وہ ناپاک اور ناجائز ہے"۔

اور اسی پر امت کا اجماع ہے، علامہ دمیریؒ فرماتے ہیں:۔

"خنزیر نجس العین ہے اور اس کا کھانا حرام ہے اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں"۔ (حیات الحیوان (اردو) ج ۲ ص ۱۶۱ الخنزیر)

خنزیر کی حرمت پر قرآنی آیات، احادیثِ مبارکہ، آثارِ صحابہ و تابعین اس کثرت سے دال ہیں کہ کسی بھی مسلمان کے لیے ان کے ہوتے ہوئے اس کا کھانا حلال نہیں۔

شریعت جس چیز کو حرام کرتی ہے اس میں اس حکم کے علاوہ دیگر مضرات بھی ہوتے ہیں جو انسانی بدن یا اس کے اخلاق کے لیے صحیح نہیں ہوتے۔ چنانچہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ خنزیر کی حرمت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

(۱) اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور، بے غیرت اور دیوث ہے، اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر (انسانی) بدن اور روح پر بھی پلید ہی ہوگا کیونکہ یہ بات ثابت شدہ اور مُسلّم ہے کہ غذاؤں کا اثر بھی انسان کی روح پر ضرور ہوتا ہے پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بدجانور کے گوشت کا اثر بھی بد ہی ہوگا، جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے بھی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصہ حیا کی قوت کو کم کر دیتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا ہے، پس جبکہ یہ امر مُسلّم ہے کہ تغیّرِ بدن و تغیّرِ اخلاق کے اسباب میں سے زیادہ تر قوی سبب غذا ہے، لہٰذا ایسے جانور کا گوشت کھانے سے شریعتِ اسلامیہ نے منع فرما دیا۔

(۲) خنزیر یعنی خوک نجاست کی طرف بہت زیادہ مائل ہے خصوصاً انسان کا فُضلہ یعنی براز اس کی خوراک ہے، اس کا گوشت اسی نجاست سے پیدا ہوتا ہے، پس اس کا گوشت کھانا گویا

اپنی نجاست کھانا ہے ۔
(۳) صاحب مخزن الادویہ فسادِ گوشت خوک اور اس کی حرمت کی تیرہ وجوہ ذیل میں تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس جانور کا گوشت فطرتِ انسانی کے برخلاف ہے، وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"گوشت خوک موارِ خلط غلیظ است و مورث حرص شدید و صداع مزمن، دوادالفیل، واوجاع المفاصل وفسادِ عقل وزوال مروت وغیرت وحمیت و باعثِ فحش است واکثرے از فرق غیر اسلامی آں رامی خورند وقبل از ظہور نورِ اسلام گوشت آں را در بازار ہامی فروختند و بعد ازاں در مذہب اسلام حرام و بیع آں ممنوع وموقوف گردید بسیار کثیف و بدہیئت است ۔"
(احکام اسلام عقل کی نظر میں ص ۲۰۴)

(۴) سُور کا گوشت ایک بیماری کا باعث بنتا ہے جو کہ آنکھوں کی ایک بیماری ہے اور اس کا نام ٹرکن اوسس ہے جو کہ صحرائی آب وہوا میں بہت جلد اثر کرتی ہے ۔

باقی رہا مسئلہ گائے وغیرہ کا تو مولانا اشرف علی تھانوی اس بارے میں فرماتے ہیں :۔

(۱) یہ سارے جانور دراصل مزاجِ انسانی کے موافق اور ستھرے ومعتدل المزاج ہوتے ہیں اس لیے حلال ٹھہرائے گئے ہیں اور ان جانوروں کو خدا تعالیٰ نے بہیمۃ الانعام فرمایا ہے، اور اسی توافق واعتدال کے سبب دنیا میں زیادہ تر انہیں جانوروں کا گوشت بنی آدم استعمال کرتے ہیں، فطرتِ انسانی اس امر کی مقتضی ہے کہ جیسا کہ بنی آدم کی خوراک کا کچھ حصہ نباتات سے ہوتا ہے ایسا ہی کچھ حصہ اس کا حیوانات سے ہو، اور اس کی خوراک کے لیے حیوانات بھی وہ مقرر ہونے مناسب تھے جو اس کے مزاج کے موافق ہوں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا ۔

(۲) جبکہ انسان جامع جلال وجمال ہے تو اس کی خوراک میں بھی جلال وجمال دونوں کا ہونا مناسب تھا لہٰذا انسان کی خوراک کے لیے وہ جانور مقرر ہوئے جن میں جمال وجلال ہر دو صفات موجود ہیں ۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں ص ۲۱۷)

مزید تفصیل کے لیے "حیات الحیوان" از علامہ دمیری رحمہ اللہ کی طرف مراجعت کریں، مسلمان کے لیے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم ہی کافی ہے ۔ (ہوالموفق والمعین)

کچھوا کھانے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چونکہ دریائی جانور سب پاک ہیں اس لیے کچھوا کھانا بھی جائز ہے، جبکہ کچھ لوگوں کے نزدیک اس کا کھانا درست نہیں، شریعتِ مطہرہ کے احکامات کی روشنی میں بتائیں کہ کچھوا کھانا حلال ہے یا حرام؟

الجواب:۔ احناف کے نزدیک دریائی جانوروں میں سے فقط مچھلی حلال ہے، باقی سب حرام، لہٰذا کچھوا (شمشتی) کھانا بھی حرام ہے۔

قال العلامة المرغینانیؒ: ولا یوکل من حیوان الماء الا السمك۔
(الهدایة ج۴ ص۴۴ کتاب الذبائح)

درندوں کی حرمت کا فلسفہ

سوال:۔ بعض اوقات میرے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ شریعتِ مقدسہ نے جو شیر، ریچھ، گیدڑ وغیرہ درندوں کو حرام قرار دیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے اور کس فلسفہ کے تحت یہ درندے حرام قرار دیئے گئے ہیں، ازراہ کرم تسلی بخش جواب دے کر مشکور فرمائیں؟

الجواب:۔ ایک مسلمان کے لیے کسی چیز کے بارے میں حلت وحرمت کا اعتقاد کسی فلسفے کے تحت نہیں ہونا چاہیئے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہوئے ماننا ضروری ہے اللہ تعالیٰ کسی چیز کے بارے میں حلت وحرمت کا حکم بغیر کسی حکمت کے نہیں فرماتا۔

چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سارے درندے جانور جن کی سرشت و فطرت میں پنجوں سے چھیلنا اور صولت سے زخم پہنچانا اور جن میں سخت دلی ہے سب حرام ٹھہرائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیڑیئے کے بارے میں فرمایا ہے: اویاکل احد یعنی کیا بھیڑیئے کو بھی کوئی انسان کھاتا ہے یعنی اس کو کوئی نہیں کھاتا۔ وجہ حرمت ظاہر ہے کہ ان جانوروں کے کھانے سے انسان میں درندگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی طبیعت اعتدال سے خارج ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں رحم نہیں ہوتا، اسی واسطے ہر شکاری پرندے کے کھانے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا۔" (احکام اسلام عقل کی نظر میں ص۲۰۵ کتاب الاکل والشرب)

کتاب الصّید
(شکار کرنے کے احکام ومسائل)

جال سے شکار کرنا جائز ہے

سوال:۔ بعض علاقوں میں مچھلی یا پرندوں کے شکار کے لیے جال استعمال کیا جاتا ہے جس میں عموماً پرندوں کو سبز باغ دکھا کر پکڑا جاتا ہے، کیا یہ طریقہ دھوکہ دہی کے دائرہ میں ہو کر شکار پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شکار قرآن وحدیث کی رو سے مباح ہے، ایسے مباح امر کے حصول کے لیے کسی حیلہ کا اختیار کرنا شرعاً ممنوع نہیں، جال سے شکار کرنا کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے فقہاء کی عام عبارتیں اس کے جواز پر دال ہیں۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ: رجلٌ حفر فی ارضه حفیرة فوقع فیها صیدًا فجاء رجلٌ واخذه قال الصید یکون للآخذ وان کان صاحب الارض اتخذ تلك الحفیرة لاجل الصید فهو احق بالصید۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۵۹ کتاب الصید والذبائح) [1]

بندوق سے شکار کرنے کا حکم

سوال:۔ بندوق یا غلیل سے کیا ہوا شکار اگر ذبح نہ ہو سکے تو اس کے کھانے کا کیا حکم ہے؟ اگر بندوق یا غلیل کی گولی سے شکار زخمی ہو کر مر جائے تو کیا یہ جرح ذبح کے لیے کافی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز خود جارح نہ ہو بلکہ زور

---

[1] قال العلامة ابن البزاز الکردریؒ: لمن نصب فسطاطًا بارض صید فی ارض رجل او انکسر رجله فیها او وقع فیه بحیث لا یقدر علی البراح فاخذه انسان ونازعه صاحب ان کان صاحب الارض بحیث لو مدّ یده یصل الیه فهو له وان کان بعیدًا لا یصل الیه یده لو مدّه فهو للآخذ۔ (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۳۰۳ الباب الخامس فی تملیك الصید)
ومثلهٗ فی الهندیة ج۵ ص۴۱۸ الباب الثانی فی تملیك مابه الصید الخ۔

سے شکار کو زخمی کرے اور وہ اس سے مر جائے تو یہ موقوذہ کے حکم میں ہو کر حلال نہیں ، بندوق اور غلیل کی گولی خود جارح نہیں بلکہ عموماً جانور اس کے زور (پریشر) سے زخمی ہوتا ہے اس لیے اُس کی حلت کے لیے یہ جرح کافی نہیں، تاہم اگر حیوان میں کچھ حیات باقی ہو اور اس کو ذبح کرلیا جائے تو پھر کھانے میں کوئی حرج نہیں ۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ : ولا یحل صید البندقة والحجر والمعراض والعصا وما اشبه ذلک وان جرح ذلک ۔ (الفتاوی قاضی خان علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۶۰ کتاب الصید والذبائح) [1]

مجروح شکار کا ذبح کرنا ضروری ہے

سوال : مجروح شکار اگر چند لمحے زندہ رہ سکتا ہو یا اضطراری موت سے محفوظ ہو جائے تو اس کی حلت کے لیے زخمی ہونا ہی کافی ہے یا اس کا ذبح کرنا ضروری ہے ؟

الجواب : مجروح شکار جب کچھ دیر زندہ ہو یا کم از کم اضطراری موت سے بچ سکتا ہو تو شرعاً ذبح کرنا ضروری ہے کیونکہ جرح ذبح اختیاری کے حکم میں ہے اور یہ اس وقت کارآمد ہے جب تک ذبح اختیاری قابلِ عمل نہ ہو ۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ : وقال اصحابنا رحمهم الله لو جرحه السهم او الکلب فادرکه لکن لم یأخذه حتی مات فان کان فی وقت لو اخذه یمکنه ذبحه فلم یأخذ حتی مات لم یؤکل لانه بحصار مقدوراً علیه فخرج الجرح من ان یکون ذکاة ۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۵۱ کتاب الصید) [2]

---

[1] عن ابراهیم بن عدی بن حاتمؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا رمیت فسمیت فخزقت فکل وان لم تخزق فلا تاکل ولا تاکل من المعراض الا ما ذکیت ولا تاکل من البندقة الا ما ذکیت ۔ (رواه احمد) (نیل الاوطار ج۸ ص۱۴۳ کتاب الصید، باب النهی عن الرمی بالبندق وما فی معناه)

وَمِثْلُهٗ فی رد المحتار علی الدر المختار ج۶ ص۴۷۱ کتاب الصید ۔

[2] قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ : (ولا بد من ذبح صید مستأنس لان ذکاة الاضطرار انما یصار الیها عند العجز عن ذکاة الاختیار (وکفی جرح نعم) کبقر وغنم (توحش) فیجرح کصید (او تعذر ذبحه) کان تردی فی بئر او ند او صال حتی لو قتله المصول علیه مریداً ذکاته حل ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۰۳ کتاب الذبائح)

وَمِثْلُهٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۷۱ کتاب الذبائح ۔

شکار کا کٹا ہوا عضو کھانا جائز نہیں

سوال:۔ اگر شکار کرنے وقت تیر یا کسی اور تیز دھار آلہ سے زندہ جانور سے کوئی عضو الگ ہو جائے اور بعد میں وہ جانور ذبح کر لیا جائے تو اس کٹے ہوئے عضو کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کسی زندہ جانور سے اس کا کوئی عضو آلۂ شکار سے کٹ کر الگ ہو جائے تو اُس جانور کے ذبح کرنے سے وہ عضو حلال نہیں ہوتا اس لیے اس الگ شدہ عضو کو کھانا شرعاً درست نہیں۔

لما قال العلامة ابو بکر بن علی الحدادالیمنیؒ: (قوله واذا رمی صیداً فقطع عضواً منه أکل الصید لما بیناه ولا یؤکل العضو) لقوله علیه السلام ما ابین من الحی فهو میت والعضو بهذه الصفة لان المبان منه حی حقیقة لقیام الحیات فیه۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۷۴ کتاب الصید) [1]

دریاؤں میں موجود مچھلیوں کو بیچنا جائز نہیں

سوال:۔ بعض دریاؤں میں مچھلیوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے حکومت ان دریاؤں کو بطور ذریعہ آمدنی استعمال کرتی ہے اور ایسی جگہوں پر اُن لوگوں کو مچھلی کا شکار کرنے کی اجازت دیتی ہے جو حکومت کو ایک خاص رقم ادا کرتے ہیں، عُرف میں اس اجازت کو ٹھیکہ کہا جاتا ہے، کیا شرعاً اس طرح معاملہ طے کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ ملکیت کے لیے جہاں فروخت (بیع) بطور سبب استعمال ہوتا ہے اس میں یہ ضروری ہے کہ جو چیز فروخت کرنی مقصود ہو اُس کی تسلیم بائع (فروخت کرنے والے) کے دائرہ اختیار میں ہو اور جہاں کہیں فروخت کی ہوئی چیز سے بائع

---

[1] قال العلامة اکمل الدین محمد بن محمود البابرتیؒ: قال (وان رمی صیداً) اذا قطع بالرمی عضواً من الصید لما بیناه ان الرمی مع الجرح مبیح وقد وجد ولا یؤکل العضو ان امکن حیاته بعد الابانة وان لم یمکن أکلا۔ (العنایة شرح الهدایة علی هامش فتح القدیر ج ۹ ص ۶۱ کتاب الصید)

وَمِثْلُهٗ فی الدرالمختار مع ردّ المحتار ج ۶ ص ۴۷۳ کتاب الصید۔

مشتری کے حوالے کرنے سے قاصر ہو تو وہاں پر بائع کا یہ معاملہ ناجائز ہو کر اس کے لیے یہ رقم لینا ناجائز ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں حکومت کا یہ ٹھیکیداری معاملہ ایک بے بنیاد معاملہ ہے، تاہم اگر ٹھیکیدار محنت کرے اور مچھلی کا شکار کر کے فروخت کرے تو شکار کرنے سے اس کی ملکیت ثابت ہو کر اس کی آمدنی اس کے لیے حلال ہوگی۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ولا يجوز بيع السمك قبل ان يصطاد لانه باع مالا يملكه ولا في حظيرة اذا كان لا يؤخذ الا بصيد لانه غير مقدور التسليم۔ (الهداية ج ۳ ص۵۵ كتاب الصيد) [1]

شکاری کُتے کے شکار کا حکم

سوال:۔ ہمارے گاؤں میں لوگ شکار کے لیے کُتے پالتے ہیں اور ان کو شکار کی تعلیم دیتے ہیں اور پھر ان سے شکار کھیلتے ہیں۔ تو اگر وہ کُتا شکار کو پکڑے اور خود نہ کھائے بلکہ مالک کے پاس لے آئے لیکن وہ شکار راستے ہی میں اُس کے مُنہ میں مر جائے تو کیا اس شکار کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ اسلام نے شکار کی غرض سے کُتا پالنے اور اس کے ذریعے شکار کرنے کی اجازت دی ہے بشرطیکہ اُس کو شکار کرنے کی تعلیم دی گئی ہو اور وہ شکار پکڑ کر مالک کے پاس لے آئے لیکن خود اس سے نہ کھائے تو ایسے کتے کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہے اگرچہ وہ جانور کُتے کے منہ میں ہی ختم ہو جائے۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مالک نے شکار پکڑنے کے لئے کُتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا ہو، بدون اس کے شکار حلال نہیں۔

لقوله تعالىٰ: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ (سورة المائدة آيت ۴)

---

[1] قال العلامة ابن نجيم رحمه الله: (قوله والسمك قبل الصيد) اى لم يجز بيعه لكونه باع مالا يملكه فيكون باطلاً اطلقه فشمل ما اذا كان فى حظيرة اذا كان لا يؤخذ الا بصيد لكونه غير مقدور التسليم۔ (البحر الرائق ج۶ ص۷۳ كتاب الصيد)
ومِثلُهٗ فى فتح القدير ج۶ ص۴۹ كتاب الصيد۔

چیتے اور شیر کے ذریعے شکار کرنا

سوال :- جناب مفتی صاحب ! کیا چیتے اور شیر کے ذریعے شکار کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ فقہ حنفی کی روشنی میں اس کا جواب عنایت فرمائیں ؟

الجواب :- چونکہ یہ دونوں جانور اپنی درندگی اور خونخواری کی وجہ سے تعلیم کے قابل نہیں ہوتے اس لیے فقہاء نے ان کے ذریعے شکار کرنے کو نا جائز قرار دیا ہے۔ تاہم اگر یہ دونوں جانور تعلیم یافتہ ہو کر شکار کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ علّت کی بناء پر ان کے شکار کو نا جائز قرار دیا گیا تھا وہ مفقود ہو چکا ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : فلا یجوز الصید بذب واسد لعدم قابلیتهما للتعلیم فانهما لا یعملان للغیر الاسد لعلو همته والذب لخساسته۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۴۶۳ کتاب الصید)

قال العلامة ابن عابدینؒ : وحاصله البحث فی استثناء الخنزیر والاسد والذب وفی التعلیل لان الشرط فی ظاهر الروایة قبول التعلیم فیحل بکل معلم ولو خنزیر۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۴۶۴ کتاب الصید) [۱]

شوقیا طور پر شکار کھیلنے کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب ! ہمارے گاؤں میں کچھ لوگ بعض موذی جانوروں مثلاً گیدڑ وغیرہ کا شکار شوقیا طور پر کرتے ہیں، اس سے ان لوگوں کا مقصود صرف کھیل تماشا ہوتا ہے، کیا شرعاً ایسا شکار جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب :- کسی بھی جانور کا شکار اس غرض سے کرنا چاہیئے کہ اس سے کچھ نفع حاصل ہو، صرف کھیل تماشا کے طور پر شکار کرنا جائز نہیں خصوصاً حرام جانور کا شکار کہ جس سے کوئی ظاہراً فائدہ نہ پہنچتا ہو مگر وہ جانور کھیت وغیرہ کو نقصان پہنچاتا ہو تو پھر اُسے مارنا جائز اور مرخص ہے۔

لما قال العلامة وهبة الزحیلی : ویکره الصید لهواً لانه عبث لقوله علیه السلام

---

[۱] قال العلامة وهبة الزحیلی : واستثنٰی ابو یوسفؒ من ذٰلك الاسد والذئب لانهما لا یعملان لغیرهما الاسد لعلوهمته والذب لخساسته والحق بعضهم الحداٗة لخساستها والخنزیر مستثنٰی۔ (الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج ۳ ص ۲۰۴ الفصل الثانی فی الصید)

لاتتخذوا شيئًا فيه الروح غرضًا ای هدفًا من قتل عصفورًا عبثًا عج الی الله يوم القيامة يقول يارب ان فلانًا قتلنی عبثًا ولم يقتلنی منفعة ۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہٗ ج ۳ ص۶۹۳ الفصل الثانی فی الصید) [1]

تجارت کی غرض سے شکار کا حکم

سوال :- جناب مفتی صاحب دارالعلوم حقانیہ!
ہم چند ساتھی اجتماعی طور پر دریائے سندھ میں مچھلی کا شکار کرتے ہیں اور پھر اُسے فروخت کر دیتے ہیں، ایک صاحب کا کہنا ہے کہ شکار صرف کھانے کی حد تک جائز ہے تجارت کے لیے شکار جائز نہیں۔ آنجناب سے گذارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ تجارت کی غرض سے شکار کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :- اگرچہ بعض علماء کے ہاں شکار کو بطور پیشہ اختیار کرنا مکروہ ہے مگر راجح قول یہ ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق تجارت کے لیے شکار کرنا مباح ہے اس میں حرمت کا کوئی شائبہ نہیں۔

لما قال العلامة الحصكفیؒ: هو مباح الا لمحرم فی غير الحرم او للتلهی كما هو ظاهر او حرفة علی ما فی الاشباه قال المصنفؒ وانما زدته تبعًا له والا فالتحقيق عندی اباحة اتخاذه حرفة لانه نوع من الاكتساب وكل انواع الكسب فی الاباحة سواء علی المذهب الصحيح۔

(الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۶۲ کتاب الصید) [2]

---

[1] لما قال العلامة الحصكفیؒ: هو مباح بخمسة عشر شرطًا...... الا لمحرم فی غير الحرم او للتلهی كما هو ظاهر۔ قال العلامة ابن عابدينؒ فی مجمع الفتاویٰ: ويكره للتلهی۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص۴۶۱، ۴۶۲ کتاب الصید)

[2] قال العلامة ابن عابدينؒ: وفی التاتارخانية قال ابويوسفؒ اذا طلب الصيد لهوًا ولعبًا فلا خير فيه واكرهه وان طلب منه ما يحتاج اليه من بيع او ادام او حاجة اخری فلا بأس۔
ردّ المحتار ج ۶ ص۴۶۲ کتاب الصید)

كتاب
الاضحية

کتاب الاضحیۃ

(قربانی کے احکام و مسائل)

نصابِ قربانی کا معیار

سوال:۔ قربانی کے وجوب کے لیے شریعتِ مطہرہ میں نصاب کے معیار کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ اگر کوئی شخص اپنے حوائجِ اصلیہ اور قرض کے علاوہ ۲/۱-۷ تولے سونا یا ۲/۱-۵۲ تولے چاندی یا اس مقدار سے زائد نقد مالیت کا مالک ہو تو ایسے شخص پر شرعاً قربانی کرنا لازم ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: قال ابو حنيفة الموسر الذی لهٗ مايتا درهم اويساوی مايتی درهم سوی المسكن والخادم والثياب التی يلبس ومتاع البيت الذی يحتاج اليه وهٰذا اذا بقی لهٗ الیٰ ان يذبح الاضحية۔
(خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۳۰۹ كتاب الاضحية)[1]

قربانی کے ایام کا حکم

سوال:۔ قربانی کتنے دنوں تک کرنا جائز ہے؟ نیز اس میں جلدی کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ایام النحر (قربانی کے دن) تین ہیں، یعنی ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ متعین دن ہیں، تاہم پہلے دن (۱۰ ذی الحجہ) قربانی کرنا افضل ہے۔

لما ذكر العلامة محمود آلوسیؒ فی تفسيره: وعن تها ثلاثة ايام يوم العيد ويومان

---

[1] لما ذكر فی الهندية: (اما شرائط الوجوب) منها اليسار وهو ما يتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما يتعلق به وجوب الزكوٰة ....والموسر وظاهر الرواية من لهٗ مائتا درهم او عشرون دينارًا اوشئ يبلغ ذٰلك سوى سكنه ومتاع سكنه ومركوبه وخادمه فی حاجته التی لايستغنی عنها۔ (الفتاوىٰ الهندية ج۵ ص۲۹۲ كتاب الاضحية۔الباب الاول فی تفسيرها)
ومِثْلُهٗ فی ردالمحتار ج۶ ص۳۱۲ كتاب الاُضحيـة۔

وبعدہ..... لماروی عن عمرو علی وابن عمروابن عباسٍ و انسٍ و ابی ھریرۃ رضی اللہ عنھم أنھم قالوا ایام النحر ثلاثۃ افضلھا اوّلھا وقد قالوا سماعًا لأن الرأی لایھتدی إلی المقادیر۔ (روح المعانی ج۷ ص۱۴۵)

اُضحیۃ (قربانی کے جانور) کی عمر

سوال:۔ شریعتِ مقدسہ میں قربانی کے لیے جانور کی عمر کی کوئی حد مقرر ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے لیے مختلف اجناس کے حیوانات میں مختلف عمروں کا اعتبار کیا ہے۔ اونٹ میں پانچ سال، گائے بھینس میں دوسال، دنبہ اور بکری میں ایک سال کا تعین کیا ہے تاہم اگر دنبہ موٹا تازہ ہو اور ایک سال کا دکھائی دیتا ہو تو پھر اس میں چھ ماہ کی عمر کے دُنبے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔

لما قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ: ویجزئ من ذٰلک کلہ الثنی فصاعدًا الا الضان فان الجذع منہ یجزی..... اذا کانت عظیمۃ لو خلط بالثنیان یشتبہ علی الناظر من بعیدٍ والجذع من الضأن ما تمت لہٗ ستۃ اشھر فی مذھب الفقھاء..... والثنی منھا ومن المعز ابن سنۃ ومن البقر ابن سنتین ومن الابل ابن خمس سنین ویدخل فی البقر الجاموس لانہٗ من جنسہ۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۴۷ کتاب الاضحیۃ)[2]

[1] قال العلامۃ برھان الدین المرغینانیؒ، وھی جائزۃٌ فی ثلاثۃ ایام یوم النحر ویومان بعدہ لما روی عن عمرو علی وابن عباس رضی اللہ عنھم انھم قالوا ایام النحر ثلٰثۃ افضلھا اوّلھا۔ (الھدایۃ ج۴ ص۴۴۳ کتاب الاضحیۃ) —— قال الحافظ قاسم بن قطلوبغا: قولہٗ روی عن عمرو علی وابن عباس۔ قلتُ روی الطحاوی فی الاحکام اثر علی وابن عباسٍ۔
(منیۃ الالمعی فیما فات من تخریج احادیث الھدایۃ للزیلعی ص۵۶ کتاب الاضحیۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۱۹ کتاب الاضحیۃ۔

[2] قال الشیخ ابوبکر بن علی الحدادی الیمنیؒ: (قولہٗ یجزی فی ذٰلک الثنی فصاعدًا الا الضان فان الجذع منہ یجزی) یعنی اذا کان عظیمًا بحیث اذا خلط بالثنایا یشتبہ علی الناظر من بعید فالجذع من الضأن ما تم لہٗ ستۃ اشھر وقیل سبعۃ والثنی منھا ومن المعز مالہٗ سنۃ وطعن فی الثانیۃ ومن البقر مالہ سنتان وطعن فی الثالثۃ ومن الابل مالہ خمس سنین وطعن فی السادسۃ ویدخل فی البقر الجوامیس لانھا من جنسھا۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج۲ ص۲۸۵ کتاب الاضحیۃ)
وَمِثْلُہٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۷۰ کتاب الاضحیۃ۔

شرکاءِ قربانی کی تعداد

سوال:۔ گائے، بھینس وغیرہ کی قربانی میں کتنے اشخاص شریک ہوسکتے ہیں؟

الجواب:۔ گائے بھینس کی قربانی میں شرعاً سات حصوں کی حد مقرر ہے اس سے زائد حصوں کی گنجائش نہیں تاہم سات سے کم حصوں میں کوئی حرج نہیں۔

لما قال العلامة علاؤالدین ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولا یجوز بعیر واحد ولا بقرة واحدة عن اکثر من سبعة ویجوز ذٰلك عن سبعة او اقل من ذٰلك۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۷ کتاب الاضحیة)[۱]

شرکاءِ قربانی کی نیت کا حکم

سوال:۔ اگر قربانی کے شرکاء کی نیت قربت کی حیثیت مختلف ہو، مثلاً بعض نے وجوب اور بعض نے نفل کی نیت کی ہو تو کیا اس سے قربانی متاثر ہوگی یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور (گائے، بھینس وغیرہ) میں شراکت کو جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ سب کی نیت حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہو، اگرچہ مختلف انواع کی قربات ہوں، لہٰذا متنفلین و واجبین کی قربانی صحیح ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر بن مسعود الکاسانیؒ: ولو ارادوا القربة الاضحیة او غیرها من اجزاءهم سواء کانت القربة واجبة او تطوعاً او وجبت علی البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة او اختلفت (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص۷۱ کتاب الاضحیة)[۲]

---

[۱] قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: والتقدیر بالسبع یمنع الزیادة کما لا یمنع النقصان حتی لو کانت الشرکاء فی البدنة او البقرة ثمانیة لم یجزهم ولو کانوا اقل من ثمانیة الا ان نصیب واحد منهم اقل من السبع لا یجوز ایضاً۔ (خلاصة الفتاویٰ ج ۴ ص۳۱۵ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا۔

[۲] قال العلامة محمد الشهیر بالطوریؒ: تجوز عن سبعة بشرط قصد الکل القربة واختلاف الجهات فیما لا یضر کالقران والمتعة والاضحیة لاتحاد المقصود وهو القربة۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۷ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاویٰ الهندیة ج ۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فیما یتعلق بالشرکة فی الضحایا۔

شرکتِ اضطراری میں قربانی کا وجوب

سوال:۔ اگر والد کی وفات کے بعد چند بیٹے اس کے وارث ہوں، جائداد متروکہ کو بحالِ خود رکھ کر جملہ برادران اس سے استفادہ کرتے رہیں لیکن تقسیم کرنے کی نوبت نہ آئی ہو، ہر بھائی کا حصہ نصاب کی مقدار سے زائد ہو، کیا اس صورت میں جملہ برادران ایک قربانی کریں گے یا ہر ایک پر قربانی مستقل طور پر واجب ہو گی ؟

الجواب:۔ ایسی حالت میں جبکہ ہر ایک بھائی کا حصہ نصاب کو پہنچتا ہو تو سبب کے متحقق ہونے پر ہر ایک کی ملکیت کا استقلالاً اعتبار ہو گا، ملکیت متحقق ہونے پر شرکت مانع نہیں، اس لیے ہر ایک پر الگ الگ قربانی واجب ہو گی، مشترکہ طور پر ایک قربانی کرنے سے کسی ایک کا بھی ذمہ فارغ نہیں ہو گا

لما قال الامام ابوالحسین احمد بن محمد البغدادی القدوریؒ :الاضحیۃ واجبۃ علیٰ کل حر مسلم موسر فی یوم الاضحیٰ یذبح عن نفسہ ۔ انتہی

(مختصر القدوری ص۲۷۸ کتاب الاضحیۃ) [1]

قربانی کا جانور خریدنے کے بعد کسی کو شریک کرنا

سوال:۔ قربانی کے لیے جانور خریدنے کے بعد کسی کو اس میں شریک کیا جائے تو کیا اس طرح کرنے سے قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ قربانی کا جانور خریدنے سے قبل سات افراد تک کی شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ ایک دفعہ چند افراد مل کر قربانی کا جانور خریدیں اور ان میں سے کسی ایک شخص کی قربانی نفلی ہو تو ایسی حالت میں کسی کو بعد ازاں شریک کرنا جائز نہیں البتہ اگر تمام حصہ داروں کی قربانی واجب ہو تو پھر کسی کو شریک کرنے میں کوئی حرج نہیں تاہم بہتر یہ ہے کہ قربانی میں شرکت کا دائرہ قربانی کا جانور خریدنے سے قبل تک محدود رکھا گیا ہو۔

---

[1] قال العلامۃ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفیؒ :تجب علیٰ حر مسلم مقیم موسر عن نفسہ ۔ انتہی (کنز الدقائق ص۴۲۰ کتاب الاضحیۃ)

ومثلہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۴۱ کتاب الاضحیۃ ۔

لما قال العلامة برہان الدین المرغینانیؒ: ولو اشتری بقرة یرید ان یضحی بہا عن نفسہ ثم اشرک فیہا ستة معہ جاز استحسانًا..... والاحسن ان یفعل ذلک قبل الشراء لیکون ابعد عن الخلاف۔ (الہدایة ج۴ ص۴۴۳ کتاب الاضحیة)[1]

نابالغ کی قربانی کا حکم

سوال:۔ کیا صاحبِ نصاب نابالغ پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟ اور وجوب کی ادائیگی باپ یا ولی اپنے مال سے کرے گا یا نابالغ کے مال سے کی جائے گی؟

الجواب:۔ صاحبِ نصاب نابالغ پر شرعًا قربانی واجب ہے اور ادائیگی وجوب اس کے مال سے کی جائے گی۔ [عـ]

لما قال العلامة ابو بکر الکاسانیؒ: واما البلوغ والعقل فلیسا من شرائط الوجوب فی قول ابی حنیفةؒ وابی یوسفؒ ــــ حتی تجب الاضحیة فی مال الصبی والمجنون اذا کان موسرین۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۶۴ کتاب الاضحیة)[1]

میت کے لیے قربانی کا حکم

سوال:۔ کیا میت کی حصہ داری سے دیگر شرکاء کی قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ قربانی میں میت کی یا حصہ داری کے بعد مرنے والے کی شراکت شرعًا نقصان دہ نہیں جملہ شرکاء کی قربانی درست اور صحیح ہے۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ: (وان مات احد السبعة) المشترکین فی البدنة

---

[1] قال العلامة الحصکفیؒ: (وصح اشتراک ستة فی بدنة شریت لاضحیة) ای ان نوی وقت الشراء الاشتراک صح استحسانًا والا لا (استحسانًا وذا) ای الاشتراک (قبل الشراء احب۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج۶ ص۳۱۷ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُہٗ فی الہندیة ج۵ ص۳۰۴ الباب الثامن فیما یتعلق بہ الشرکة فی الضحایا۔

[2] قال العلامة ابن عابدینؒ: (وقولہ یضحی عن ولدہ الصغیر من مالہ) ای مال الصغیر ومثلہ المجنون۔ قال فی البدائع اما البلوغ والعقل فلیسا من شرائط الوجوب فی قولہما۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۱۶ کتاب الاضحیة)

عـ البتہ اکثر علماء نے نابالغ اور مجنون کے مال پر قربانی کے عدمِ وجوب کو راجح قرار دیا ہے (مرتب)

(وقال الورثة اذبحوا عنه وعنكم صح) عن الكل استحسانًا لقصد القربة من الكل۔ (الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۶ کتاب الاضحیة) [1]

بلاعذرِ شرعی قربانی چھوڑ دینا

سوال: قربانی واجب ہونے کے باوجود بلاعذر شرعی چھوڑ دی جائے اور قربانی کے ایام گذر جائیں تو پشیمانی کے احساس کے طور پر کیا کرنا چاہیئے؟

الجواب: قربانی واجب شرعی ہے بلاعذر ترک کرنا موجب گناہ ہے، تاہم قربانی کے دن گذرنے کے بعد اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے ممکن ہے اللہ تعالیٰ اسکی طرف سے قبول کرلے، اور اگر کوئی قربانی کو اپنے اوپر خود واجب کرلے یا فقیر قربانی کے لیے جانور خریدے تو اس صورت میں زندہ جانور کو صدقہ کردینا ضروری ہے۔

لما قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله: ولو لم يضح حتى مضت ايام النحر ان كان واجب على نفسه اوكان فقيرًا وقد اشترى الاضحية تصدق به حية و ان كان غنيًا تصدق بقيمته شاة اشترى اولم يشترى لانها واجبة على الغنى وتجب على الفقير بالشراء بقيمة۔ (الهداية ج ۴ ص ۴۴۴ کتاب الاضحیة) [2]

قربانی کے جانور کو تبدیل کرنا

سوال: ایک شخص نے قربانی کے لیے جانور خریدا، بعدازاں محض اس لالچ کی وجہ سے فروخت کرنا کہ دوسرا کم قیمت والا جانور مل جائے تو کچھ رقم کا فائدہ ہوگا، تو کیا اس صورت میں اس

---

[1] قال العلامة علاؤ الدين الكاساني رحمه الله: اذا اشترك سبعة في بدنة فمات احدهم قبل الذبح فرضي ورثته ان يذبح عن الميت جاز استحسانًا۔
(بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع ج ۵ ص ۷۲ کتاب الاضحیة)
ومثله في خلاصة الفتاوى ج ۴ ص ۳۱۵ کتاب الاضحیة۔

[2] قال العلامة عبد الله بن مودود الموصلي: فان مضت ولم يذبح فان كان فقيرًا وقد اشترى تصدق بها حية وان كان غنيًا تصدق بثمنها اشتراها اولا۔
(الاختيار لتعليل المختار ج ۵ ص ۱۹ کتاب الاضحیة)
ومثله في الدر المختار على صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۰ کتاب الاضحیة۔

خریدے ہوئے جانور کو فروخت کرکے دوسرا جانور خریدنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: اگر قربانی کرنے والا غنی ہو اور اس پر قربانی واجب ہو تو ایسی حالت میں خریدنے سے جانور متعین نہیں ہوتا اس لیے اس حال میں تبدیلی مرخص ہے لیکن اگر قربانی نفلی ہو جو کہ خریدنے سے واجب ہو جاتی ہے پھر اس میں تبدیلی مرخص نہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں ایسی صورت میں زائد رقم بچے تو اس کا تصدق کیا جائے گا، بلکہ فقہاء نے صورتِ اولیٰ میں بھی زائد رقم کے تصدق کو اولیٰ قرار دیا ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: وفي الاصل اشترى اضحية ثم باعها جاز في ظاهر الرواية ولو اشترى مثلها وضحى بها ان كانت الثاني مثل الاولى او خيرا منها جاز لا يلزمه شيء آخر، وان كان دون الاولى تصدق بفضل القيمتين۔ (خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۱۹ كتاب الاضحية)[1]

قربانی کے جانور سے انتفاع کا حکم

سوال: کیا قربانی کے جانور سے دودھ لینا یا سواری کیلئے استعمال کرکے انتفاع لینا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب: قربانی کے جانور سے انتفاع لینا شرعاً درست نہیں بلکہ اس کے دودھ کو ٹھنڈے پانی سے خشک کیا جائے گا، تاہم اگر دودھ یا بال وغیرہ اجزاء سے انتفاع لیا جائے تو بعینہٖ اس اجزاء کو یا اس کی قیمت کو فقراء میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

لما قال العلامة ابن عابدينؒ: (قوله يكره الانتفاع بلبنها) فان كانت التضحية قريبة ينضح ضرعها بالماء البارد الاحلبه وتصدق به۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۹ كتاب الاضحية)[2]

---

[1] وذكر في الهندية: رجل اشترى شاة للاضحية واوجبها بلسانه ثم اشترى اخرى جاز له بيع الاولى في قول ابي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى وان كانت الثانية شرا من الاولى وذبح الثانية فانه يتصدق بفضل ما بين القيمتين۔ (الفتاوى الهندية ج۵ ص۲۹۴ الباب الثاني في وجوب الاضحية بالنذر)

[2] قال العلامة ابن البزاز الكردريؒ: ويكره حلبها وجز صوفها قبل الذبح وينتفع به فان فعله تصدق به...... وان في ضرعها لبن يخاف عليه تنضح ضرعها بالماء البارد او فرجها بالماء البارد اذ قربت ايام النحر وان بعدت يحلبها ويتصدق باللبن وما اصاب من اللبن تصدق بمثله او قيمته وكذا الصوف۔ (الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۲۹۴ كتاب الاضحية السادس في الانتفاع)

ومثله في خلاصة الفتاوى ج۴ ص۳۲۱ كتاب الاضحية۔

قربانی کے گوشت کی تقسیم کا طریقہ **سوال:**۔ شریعتِ مقدسہ میں قربانی کے گوشت کو حصہ داروں اور فقراء میں تقسیم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور میں حصہ داروں کو جائز رکھا ہے لہٰذا گوشت کو شرکاء آپس میں ایسے طریقے سے تقسیم کریں جس میں کسی کی حق تلفی کا امکان نہ ہو، تاہم فقراء پر صدقہ کے لیے وزن کرنا ضروری نہیں۔

لما قال العلامة فخرالدین حسن بن الفرغانیؒ: سبعة ضحوا بقرة واقتسموا لحمها وزنًا جاز لان بیع اللحم باللحم وزنًا بمثلٍ مثلًا جائزٌ فكذٰلك القسمة فان اقتسموا جزافًا لا یجوز اعتبارًا بالبیع۔ (الفتاوىٰ قاضی خان علی هامش الهندیة ج ۳ ص ۳۵۱ فصل فیما یجوز فی الضحایا... الخ) [۱]

قربانی کے گوشت کو تین حصوں میں تقسیم کرنا **سوال:**۔ کیا قربانی کا سارا گوشت خود رکھا جاسکتا ہے یا تین حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہے؟ اس کی تقسیم کے صحیح طریقہ کی وضاحت فرمائی جائے؟

الجواب:۔ قربانی کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کرنا مندوب ہے۔ ایک حصہ فقراء پر تقسیم کیا جائے، دوسرا حصہ عزیز و اقرباء کو کھلایا جائے اور تیسرا حصہ اپنے لیے رکھ لیا جائے، تاہم اگر سارا گوشت صدقہ کردیا جائے یا اپنے لیے ذخیرہ کرلیا جائے تو بھی مرخص ہے۔

لما قال العلامة ابوبکر الکاسانیؒ: والافضل ان یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لاقاربه واصدقائه ویدخر الثلث.... ولو تصدق بالکل جاز ولو حبس الکل لنفسه جاز۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص ۸۱) [۲]

---

[۱] قال العلامة شمس الدین محمد بن عبدالله التمرتاشیؒ: ویقسم اللحم وزنًا لا جزافًا۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۱۷ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الفتاوىٰ البزازیة علی هامش الهندیة ج ۶ ص ۲۹۰ الباب الرابع فیما یجوز من الاضحیة۔

[۲] قال العلامة ابن عابدینؒ: والافضل ان یتصدق بالثلث ویتخذ الثلث ضیافة لاقاربه واصدقائه ویدخر الثلث ویستحب ان یأكل منها ولو حبس الکل لنفسه جاز لأن القربة فی الاراقة والتصدق باللحم تطوعٌ۔ (رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۸ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۵ ص ۳۰۰ الباب السادس فیما یستحب من الاضحیة۔

میّت کی طرف سے کی گئی قربانی کے گوشت کا حکم

سوال :- کیا میّت کی طرف سے کی گئی قربانی کا گوشت خود کھایا جاسکتا ہے یا صدقہ کرنا لازمی ہے ؟

الجواب :- اموات کی طرف سے ذبح شدہ قربانی کے جانور کا گوشت خود کھانا اور دوسروں کو کھلانا جائز ہے بشرطیکہ قربانی میّت کی وصیّت سے نہ کی گئی ہو ورنہ وصیّت کی صورت میں صدقہ کرنا لازمی ہے۔

لما قال العلامة قاضی خانؒ : ولو ضحی عن میت من مال نفسه بغیر امر المیت جاز وله أن یتناول منه ولا یلزمه ان یتصدق به لانها لم تصر ملکاً للمیت.....وان ضحی عن میت من مال المیت بامر المیت یلزمه التصدق بلحمه ولا یتناول منه لان الاضحیة عن المیت ۔ (الفتاوی قاضیخانؒ علی هامش الهندیة ج۳ ص۳۵۲ فصل فیما یجوز فی الاضحیة ما لایجوز) [۱]

نذر کی ہوئی قربانی کے گوشت کا حکم

سوال :- نذر کی ہوئی قربانی کے گوشت کا کیا حکم ہے ؟ کیا قربانی کرنے والا اس میں سے خود کھاسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب :- نذر کی ہوئی قربانی بھی قربت الی اللہ کا ذریعہ ہے لیکن ناذر اپنی قربانی کا گوشت نذر کی وجہ سے خود نہیں کھاسکتا بلکہ تمام گوشت فقراء میں تقسیم کرنا لازمی ہوگا۔

لما قال العلامة الحصکفیؒ : ولو فقیراً ولو ذبحها تصدق بلحمها ولو نقصها تصدق بقیمة النقصان ایضاً ولا یأکل الناذر منها فان أکل تصدق بقیمة ما اکل ۔ وفی حاشیة رد المحتار : اوفقیراً شراها وان ذبح لا یأکل منها ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۱ کتاب الاضحیة) [۲]

---

[۱] قال العلامة ابن عابدینؒ : من ضحی عن المیّت یصنع کما یصنع فی اضحیة نفسه من التصدق والاکل والاجر للمیّت والملك للذابح ۔ قال الصدر والمختار انه ان کان الاضحیة بامر المیت لا یأکل منها والا یأکل ۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۶ کتاب الاضحیة) ـــــ ومثله فی خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۲۲ کتاب الاضحیة ۔

[۲] قال العلامة فخر الدین الزیلعیؒ : ان وجبت بالنذر فلیس لصاحبها ان یأکل منها شیئاً ولا ان یطعم غیره من الاغنیاء سواء کان الناذر غنیاً او فقیراً لان سبیلها التصدق ولیس للمتصدق ان یأکل صدقته ولا ان یطعم الاغنیاء ۔ (تبیین الحقائق ج۶ ص۸ کتاب الاضحیة) ومثله فی الهندیة ج۵ ص۳۰۰ الباب الخامس فی محل اقامة الواجب ۔

چرمِ قربانی کا رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کرنا

سوال:۔ چرم قربانی یا اسکی قیمت مسجد، مدرسہ یا رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چرم قربانی از قبیل تطوعات ہے، اس لیے بعینہٖ کھال کو مسجد، مدرسہ یا رفاہ عامہ کے کاموں یا اغنیاء کو تملیکاً دینا اور استعمال کرنا شرعاً مباح ہے، البتہ کھال کی قیمت کا مصرف صرف فقراء و مساکین ہیں، اس کے علاوہ دیگر امور میں استعمال کرنا ناجائز عمل ہے، تاہم اگر بعینہٖ کھال کسی غنی کو تملیکاً بغیر توکیل وحیلہ کے حوالے کی جائے تو غنی کا اپنی طرف سے کھال کی قیمت مسجد یا مدرسہ اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف کرنے سے کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔

لما قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: ویتصدق بجلدها او یعمل منه نحو غربال وجراب وقربة وسفرة ودلو (او يبدله بما ينتفع به باقيًا) كما مر (لا بمستهلك كخل ولحم غيره كدراهم (فان بيع اللحم والجلد به) بمستهلك او بدراهم يتصدق بثمنه)۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المختار ج ۶ ص ۳۲۸ کتاب الاضحیة)[1]

صاحبِ نصاب کو چرمِ قربانی دینا جائز ہے

سوال: کیا صاحب نصاب امام مسجد یا دیگر اشخاص کو چرم قربانی دینا یا خود استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ راجح اور مفتیٰ بہ قول کی رُو سے چرمِ قربانی صدقاتِ نافلہ کے زمرے میں ہے، اس لیے بعینہٖ چرمِ قربانی کو خود استعمال کرنا اور اپنی اولاد یا دیگر

---

[1] لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاریؒ: ويجوز الانتفاع بجلد الاضحية والهدى والمتعة والتطوع بان يتخذه فروا او بساطا او جرابا او غربالا وله ان يشتري به متاع البيت كالغربال والجراب والخف ولا يشتري به الخل والمري واللحم ولا بأس ببيعه بالدراهم ليتصدق بها وليس له ان يبيعه بالدراهم لينفقها على نفسه ولو فعل ذلك يتصدق بثمنه۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج ۴ ص ۳۲۱، ص ۳۲۲ کتاب الاضحية)

ومثله فی الفتاوی البزازية علیٰ هامش الهندية ج ۴ ص ۲۹۴۔ السادس فی الانتفاع کتاب الاضحية۔

اغنیاء کو دینا شرعاً درست ہے۔

لما قال العلامۃ علاؤ الدین الحصکفیؒ: (ویتصدق بجلدھا او یعمل منہ نحو غربال وجراب) وقربۃ سفرۃ ودلو (او یبدل بما ینتفع بہ باقیاً۔

(الدر المختار علی صدر رد المختار ج۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیۃ)[۱]

قربانی کا گوشت اجرت میں دینا جائز نہیں

سوال:۔ اگر قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت اور صاف کرتے وقت کسی شخص سے مدد لی جائے اور پھر اس کو گوشت یا جُز اضحیہ حق الخدمت کے طور پر دیا جائے تو اس سے قربانی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

الجواب:۔ قربانی کی حقیقت محض اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے (اراقۃ الدم) خون بہانے تک محدود ہے، تاہم ایسے مقدس فعل میں کسی قول یا خودغرضی کا شائبہ ہونا اس کے فلسفہ سے متصادم ہے، اس لیے قربانی کے کسی جزء کو ذاتی مقاصد کے لیے فروخت کرنا یا کسی کو حق الخدمت میں دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما قال العلامۃ شمس الدین محمد بن عبداللہ التمرتاشیؒ: (ولا یعطی اجر الجزار منہا) لانہ کبیع۔ (تنویر الابصار علی صدر رد المختار ج۶ ص۳۲۸ کتاب الاضحیۃ)[۲]

داغدار جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔ داغدار جانور کی قربانی کے بارے میں شریعتِ مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ داغ، دھبہ ایسے عیوب نہیں جو قربانی کرنے سے مانع ہوں، لہٰذا داغدار

---

[۱] لما قال الامام شیخ الاسلام ابوبکر الحدادالیمنیؒ: (قولہ ویتصدق بجلدھا) لانھا جزء منہا (قولہ او یعمل منہ آلۃ تستعمل فی البیت) کالنطع والجراب والغربال ولا بأس ان یتخذ فروًا لنفسہ۔ (الجوھرۃ النیرۃ ج۲ ص۲۸۵ کتاب الاضحیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج۸ ص۱۷۸ کتاب الاضحیۃ۔

[۲] قال العلامۃ علاؤ الدین ابوبکر الکاسانیؒ: ولا ان یعطی اجر الجزار والذابح منہا۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۸۱ کتاب الاضحیۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۱۹ کتاب الاضحیۃ۔

جانور کی قربانی صحیح اور درست ہے۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاريؒ: والتي بها كيٌّ والتي لاينزل لها لبن من غير علة والتي لها ولد يجوز۔ (خلاصة الفتاوىٰ ج۴ ص۳۲۱ كتاب الاضحية)[۱]

نکیل والے جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔کسی جانور کی ناک میں نکیل ڈالنے سے قربانی پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔قربانی کے جانور میں کسی عضو کا ثلث سے زیادہ عیب دار ہونا قربانی پر اثرانداز ہوتا ہے، ثلث یا ثلث سے کم قربانی سے مانع نہیں، چونکہ نکیل ڈالنے سے جانور کی ناک میں معمولی سا سوراخ ہو جاتا ہے جس کا قربانی پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

لما قال الامام المجتهد ابو عبد الله محمد بن الحسن الشيبانيؒ: وان قطع من الذنب او الأذن والألية الثلث او اقل اجزأه وان كان اكثر لم يجز۔ (الجامع الصغير ص۳۸۷ كتاب الاضحية)[۲]

سینگ کا ٹوٹ جانا مانع قربانی نہیں

سوال:۔اگر کسی جانور کے سینگ نہ ہوں یا ٹوٹ جائیں تو اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ نے قربانی کے جانور میں اس عیب کو معیوب قرار دیا ہے جو جانور کے منافع اور خوبصورتی میں رکاوٹ بنتا ہو، چنانچہ سینگ جانور کا ایسا جزء نہیں جس کے نہ ہونے کی وجہ سے جانور کے منافع یا خوبصورتی میں فرق آتا ہو، لہٰذا اس قسم کے جانور کی قربانی میں شرعاً کوئی حرج نہیں بشرطیکہ سینگ دماغ کی ہڈی

---

[۱] قال العلامة ابن عابدينؒ: تجوز الضحية بالمجبوب..... والتي لها كيٌّ والتي لا لسان لها في الغنم۔ (رد المحتار ج۶ ص۳۲۵ كتاب الاضحية)

وَمِثْلُهٗ في الهندية ج۵ ص۲۹۷ الباب الخامس في محل اقامة الواجب۔

[۲] قال العلامة برهان الدين المرغينانيؒ: وان قطع من الذنب او الأذن او العين او الألية الثلث او اقل اجزأه وان كان اكثر لم يجز لان الثلث تنفذ فيه الوصية من غير رضاء الورثة فاعتبر قليلاً۔ (الهداية ج۴ ص۴۴۵ كتاب الاضحية)

وَمِثْلُهٗ في رد المحتار ج۶ ص۳۲۴ كتاب الاضحية۔

تک نہ ٹوٹا ہو۔

لما قال العلامة ابن عابدینؒ: (قوله ویضحی بالجماء) ھی التی لا قرن لہا خلقاً وکذا العظماء التی ذھب قرنہا بالکسر الی المخ لم یجز۔

(رد المحتار ج۶ ص۳۲۳ کتاب الاضحیۃ)[1]

حاملہ جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔ اگر قربانی کے لیے خرید ا گیا جانور (گائے، بکری وغیرہ) حاملہ نکل آئے تو کیا اس کی قربانی جائز ہے یا اس کو تبدیل کیا جائے گا؟

الجواب:۔ شریعت مطہرہ میں عیب دار جانور کی قربانی صحیح نہیں لیکن حمل کوئی ایسا عیب نہیں جو قربانی سے مانع بنے، تاہم چونکہ اس میں بلا ضرورت ایک دوسری جان کا ضیاع ہے اس لیے حاملہ کی قربانی کراہت سے خالی نہیں۔

لما قال العلامۃ جلال الدین الخوارزمیؒ: رجل لہٗ شاۃ حاملٌ فاراد ذبحہا تقارب الولادۃ یکرہ ذبحہا لان فیہ تضییعاً لما فی بطنہا من غیر فائدۃ۔

(الکفایۃ شرح الھدایۃ فی ذیل فتح القدیر ج۸ ص۴۲۱ کتاب الاضحیۃ)[2]

خنثیٰ مشکل جانور کی قربانی کا مسئلہ

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! خنثیٰ مشکل جانور کی قربانی شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس جانور کے نر یا مادہ ہونے کی تمیز مشکل ہو اور دونوں کی علامات موجود ہوں تو چونکہ ایسے جانور کے گوشت کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے اس لیے

---

[1] قال العلامۃ ابوبکر الکاسانی رحمہ اللہ:۔ وتجزی الجماء وھی التی لا قرن لہا خلقۃ وکذا مکسورۃ القرن ...... فان بلغ الکسر المشاش لا تجزیہ المشاش رؤس العظام۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج۵ ص۷۶ کتاب الاضحیۃ)
وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۴۴۶ کتاب الاضحیۃ۔

[2] قال العلامۃ المحقق محمد الشھیر بالطوریؒ: ویکرہ ذبح الشاۃ اذا تقارب ولادتہا لانہٗ یضیع ما فی بطنہا۔ (البحر الرائق ج۸ ص۱۷۱ کتاب الاضحیۃ)
وَمِثْلُہٗ فی ردّ المحتار ج۶ ص۳۰۴ کتاب الذبائح۔

ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ۔

قال العلامة علاؤ الدین الحصکفیؒ: ولا بالخنثی لان لحمها لاینضج۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۵ کتاب الاضحیۃ) لہ

خصّی جانور کی قربانی کا حکم

سوال:۔ شریعت مقدسہ میں خصّی جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جانور کے اخصاء سے اس کے گوشت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس لیے خصّی جانور کی قربانی نہ صرف جائز ہے بلکہ فقہاء نے مستحب کہا ہے ۔

لما قال العلامة ابوبکر بن علی الحدّاد الیمنیؒ: قوله یجوز ان یضحی .... والخصی لانه اطیب لحمًا من غیر الخصی۔ قال ابوحنیفةؒ ما زاد فی لحمه انفع مما ذهب من خصیتیه ۔ (الجوهرة النیرة ج ۲ ص ۲۸۵ کتاب الاُضحیة) ۲ لہ

قربانی کیلئے جانور خرید کر موٹا کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص دس ذی الحجہ سے دو تین ماہ قبل قربانی کے لیے جانور خریدے اور پھر اس کو خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کرے تو کیا اس شخص کو اس عمل کا ثواب ملے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ قربانی کے لیے پہلے سے جانور خریدنا اور پھر اس کو خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کرنا مستحب اور باعثِ اجر و ثواب عمل ہے ۔

لما قال العلامة ظفر احمد العثمانیؒ: (الجواب) قربانی کا جانور پہلے سے خریدنا اور اس کو موٹا تازہ کرنا مستحب ہے۔ الخ (امداد الاحکام جلد ۴ ص ۱۹۰، کتاب الصید والذبائح والاضحیۃ)

لہ لما ذکر فی الهندیة: لا تجوز التضحیة بالشاة الخنثی لان لحمها لاینضج۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص ۲۹۹ الباب الخامس فی محل اقامة الواجب)

۲ لہ لما ورد فی الحدیث: عن جابر بن عبد الله قال ذبح النبی صلی الله علیه وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین ۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۳۸۲ کتاب الاضحیة)

وَمِثْلُهٗ فی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ج ۵ ص ۸۰ کتاب الاضحیة ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قربانی کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص پیارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کرے تو یہ قربانی ہو جائے گی یا نہیں اور اس میں ثواب ہوتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ درست ہے اور اس میں ثواب بھی ہوتا ہے اور اس کے گوشت کا حکم اپنی قربانی کے گوشت جیسا ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۵۸۹ کتاب قربانی اور عقیقہ کے مسائل)

قربانی کے جانور کے دانت دیکھنا

سوال:۔ ہمارے علاقے کے اکثر لوگ قربانی کا جانور خریدتے وقت اس کے دانت ضرور دیکھتے ہیں اگر کسی جانور کے سامنے والے دو دانت نہ نکلے ہوں تو اس کو قربانی کے لیے نہیں خریدتے چاہے اس جانور کی عمر پوری ہی کیوں نہ ہو۔ تو کیا قربانی کرنے کے لیے جانور کے سامنے کے دو دانتوں کا نکل آنا ضروری ہے یا نہیں؟ وضاحت سے اس مسئلے کو بیان فرمایا جائے۔

الجواب:۔ علماء احناف کے نزدیک قربانی کے لیے جو جانور متعین کیا جائے اس کی عمر کا خیال رکھنا ضروری ہے دانتوں کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے اگر کسی جانور کی عمر پوری ہو تو اس کی قربانی بلاشک وشبہ جائز ہے چاہے اس کے دانت نکلے ہوں یا نہ نکلے ہوں، چونکہ اس عمر میں عموماً جانوروں کے دانت نکل آتے ہیں اس لیے بطور علامت دیکھے جاتے ہیں۔ ویسے آجکل دھوکہ دہی کا عام رواج ہے، لوگ چند پیسوں کی خاطر کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے کم عمر جانور کی عمر پوری بناتے ہیں اس لیے دانتوں کا دیکھنا مناسب ہے۔

لما قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: وصح الجذع ذو ستۃ اشہر من الضأن ان کان بحیث لو خلط بالثنایا لا یمکن التمیز من بعد وصح الثنی فصاعداً من الثلاثۃ والثنی ھو ابن خمس من الابل وحولین من البقر والجاموس وحول من الشاۃ۔ (الدر المختار علی صدر رد المحتار ج ۶ ص ۳۲۱، ۳۲۲ کتاب الاضحیۃ)[1]

---

[1] لما قال الشیخ المفتی عبد الرحیم: عمر پوری ہونی ضروری ہے، دانت کی علامت ہو یا نہ ہو۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد ۳ ص ۱۸۷ کتاب الاضحیہ)

عورت کے حقِ مہر پر قربانی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو حق مہر میں ۔اتولہ سونا بشکل زیورات دیا ہے، اس کے علاوہ عورت کے کے پاس کوئی نقدی وغیرہ نہیں، تو کیا یہ عورت قربانی کرے گی یا نہیں؟ جبکہ اس کا شوہر اب اتنا مالدار نہیں رہا کہ وہ خود قربانی کرسکے؟

الجواب:۔ جب کسی کے پاس ۷½ تولہ سونا موجود ہو چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو یا اینٹ کی شکل میں اور اس پر کوئی قرضہ وغیرہ نہ ہو تو یہ شخص صاحبِ نصاب ہے اس کے ذمے قربانی کرنا لازم ہے ۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں عورت کے ذمے قربانی کرنا واجب ہے وہ ہر صورت میں قربانی کرے گی، موصوفہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پہ لاگو نہ ہوگی ۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وشرائطها: الاسلام والاقامۃ واليسار الذی يتعلق به وجوب صدقۃ الفطر کما مر۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۳۱۲ کتاب الاضحیۃ) [1]

گذشتہ سالوں کی قربانی کا حکم

سوال:۔ اگر کسی شخص سے گذشتہ کئی سالوں کی قربانی رہ گئی ہو اور وہ اس کی قضاء کرنا چاہے تو شرعاً اس کا کیا طریقہ ہوگا کہ اس کا ذمہ فارغ ہو جائے؟

الجواب:۔ گذشتہ سالوں کی رہ جانے والی قربانی کی قضاء کا طریقہ یہ ہے کہ جتنے سالوں کی قربانی رہ گئی ہو تو ہر سال کی قربانی کے بدلے اس کی قیمت فقراء و مساکین میں صدقہ کردے اور اللہ تعالیٰ سے اس گناہ کی مغفرت بھی مانگے ۔

لما قال العلامۃ الحصکفیؒ: وتصدق بقيمتها غنی شراها اولا لتعلقها بذمته بشرائها اولاً فالمراد بالقيمۃ قيمۃ شاۃ تجزی فيها۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج۶ ص۳۲۱ کتاب الاضحیۃ) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ مفتی عبدالرحیمؒ: جب عورتیں صاحبِ نصاب ہیں تو اُن پر قربانی کرنا واجب ہے کہ اپنے پیسے سے قربانی کریں خود کے پاس رقم نہ ہو تو شوہر کے پاس سے لے کر قربانی کریں، یا شوہر عورتوں سے اجازت لیکر ان کی طرف سے قربانی کریں تو واجب قربانی ادا ہو جائے گی۔ (فتاویٰ رحیمیہ ج۳ ص۱۸ کتاب الاضحیہ)

لما قال العلامۃ وهبۃ الزحيلی: ولو ترکت التضحيۃ حتیٰ مضی وقتها...... واما الغنی اذا لم يشتر الاضحيۃ فيتصدق بقيمۃ شاۃ علی الصحيح۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج ص۲۰۷ کتاب الاضحیۃ۔ المبحث الثالث، وقت التضحیۃ)

قربانی کی بجائے قیمت

ہمارے ملک اور بعض اسلامی ممالک میں دین کی روح سے نابلد ایسے روشن خیال اور تجدد زدہ افراد کی کمی نہیں جو آئے دن اپنی تحقیق و اجتہاد کی چھری اسلامی شعائر اور قطعی و متواتر احکام و عبادات پر چلانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی عید الاضحیٰ کے موقعہ پر ایسے شوشے شوشے چھوڑ دیئے جاتے ہیں کہ قربانی کرنا جانوروں کی ضیاع ہے۔ اس سے قومی سرمایہ ضائع ہوتا ہے۔ اور بجائے قربانی کے اس کی قیمت کو رفاہی کاموں میں لگانا چاہیئے۔ علماء اسلام نے تفصیل سے ایسے شبہات اور وسوسہ اندازیوں کے معقول جوابات دیئے ہیں۔ اس دفعہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اجلاس ۱۳۹۶ھ کے نوٹس میں الجزائری اخبار الشعب مجریہ جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ میں شائع شدہ ایک الجزائری فتوٰی لایا گیا ہے، جس میں حج کے موقعہ پر قربانی کی بجائے اس کی نقد قیمت تقسیم کرنے کا کہا گیا تھا۔ رابطہ کی مجلس تاسیسی نے تفصیلی دلائل کے ساتھ ایک فتوٰی میں اس نظریہ کو غیر اسلامی قرار دیا کہ قرآن و سنت کے واضح نصوص نبی کریم علیہ السلام کے عمل، قولی و فعلی ہدایات اور عہدِ نبوت سے لے کر اب تک صحابہ کرامؓ اور امتِ مسلمہ کے تعامل سے ثابت شدہ مسائل و عبادات میں کسی رائے زنی کی گنجائش نہیں، تقرب الی اللہ خود ساختہ طریقوں سے لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کرنے سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنے میں ہے کسی کام کے اقتصادی اور معاشی مصالح کے پہلو تب تلاش کئے جا سکتے ہیں جہاں امت کے اجماعی فیصلوں اور نصوص قطعی پر زد نہ پڑے اس لئے استبدال ذبائح بالثمن جیسے لایعنی مباحث کا دروازہ کھولنا ابتداع اور مداخلت فی الدین کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مذکورہ ہر سہ قراردادوں میں اسلامی نقطۂ نظر اور جمہور اہلسنت کے عقائد کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے اس لئے ایسی قراردادیں عالم اسلام کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے اطمینانِ قلب و زیادتِ ایمان کا باعث ہیں۔ دوسری طرف مغرب سے متاثر خام اذہان کو بھی تنبیہ ہو جاتی ہے۔ کہ ایسے مسائل میں عالمِ اسلام کی اکثریت کسی بھی ملحدانہ خیالات کی روادار نہیں۔

عقیقہ کی مشروعیّت کا فلسفہ

سوال :۔ جناب مفتی صاحب! عقیقہ کی مشروعیّت کا کیا فلسفہ ہے، اسلام نے اس کا کیوں حکم دیا ہے؟ تفصیلاً وضاحت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب :۔ احکام شرعیہ کی مشروعیت میں بعض حکمتیں پنہاں ہوتی ہیں، عقیقہ کی مشروعیت اور ساتویں دن کی رعایت کی بعض حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں، نفس مشروعیت کی حکمتوں اور فلسفوں کی طرف فیلسوفِ اسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ:۔

وکان فیہا مصالح کثیرۃ راجعۃ الی المصلحۃ الملیۃ والمدنیۃ والنفسیۃ فابقاھا النبی ﷺ وعمل بہا ورغب الناس فیہا۔ (حجۃ اللہ البالغۃ ج۲ ص۲۱۴)

(ترجمہ) "عقیقہ میں بہت سی مصلحتیں تھیں جن کا تعلق مصالح نفسیہ مدنیہ اور ملیہ سے تھا، ان مصالح کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس کو باقی رکھا، خود بھی اس پر عمل کیا اور لوگوں کو بھی اس کی رغبت دلائی۔"

عقیقہ کے فواعد سے متعلق حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

(۱)۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ معاشرہ میں بچے کا اپنے نسب کا متعارف کرانا ایک ضروری امر ہے تاکہ معاشرہ والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ بچہ فلاں شخص کا بیٹا ہے اور کوئی شخص اسکے متعلق ناپسندیدہ بات نہ کہہ سکے، اس کے تعارف کے لیے ایک صورت یہ بھی تھی کہ یہ شخص خود گلی کوچوں میں پکارتا پھرے کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات ناگوار تھی، اس لیے جب لوگوں کو عقیقہ پر بلایا جائے یا ان کے پاس گوشت بھیجا جائے تو اس کی وجہ سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص کے ہاں بچہ یا بچی پیدا ہوئی ہے۔

(۲)۔ عقیقہ کے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان میں سخاوت کا مادہ پیدا ہوتا ہے، بخل اور کنجوسی جیسی مذموم صفت سے بچنے کی ایک تدبیر ہے جو انسان کی خوبی شمار ہوتی ہے۔

عقیقہ کے مذہبی اور ملّی فائدہ

عقیقہ کے مذہبی اور ملّی فوائد میں سے ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس میں ملتِ ابراہیمی سے تعلق کا مظاہرہ ہوتا ہے، کیونکہ عیسائیوں کے ہاں بچہ پیدا ہونے پر زرد رنگ کے پانی میں اس کو رنگ دیا جاتا ہے جس کو یہ لوگ "معمودیہ (بپتسمہ)" کہتے ہیں اور اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○ (سورۃ البقرۃ آیت ـــ)

(ترجمہ) "ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا ہے اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے اور ہم تو اسی اللہ کے پرستار ہیں۔"

اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی نسبت ملتِ ابراہیمی سے واضح کریں، مسلمانوں کے عام معاشرتی افعال میں ایسے طریقے ہونے چاہئیں جس سے ملتِ ابراہیمیؑ کا تعلق معلوم ہوتا ہو، ملتِ ابراہیمی میں یہ متعارف تھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کی جگہ ایک دُنبہ ذبح کیا تھا۔

علاوہ ازیں مشہور افعال میں سے حج بھی ہے جس میں ذبح کرنا اور بال منڈوانا بھی ہے۔

تو عقیقہ کرنے سے ملتِ ابراہیمی کے ان متعارف افعال اور امور سے نسبت پیدا ہوتی ہے اس لیے مذہبی تعلق کے مظاہرہ کے لیے ایک عظیم صورت ہے۔ ایک اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اس میں تابعداری اور انقیاد کا ایک نمونہ ہے، کیونکہ بچے کی پیدائش پر اس عقیقہ سے ایسا ہی ہوا جیسا کہ اس نے اپنا یہ بیٹا ہی اس کے دربار میں پیش کیا جو اتباع اور فرمانبرداری کی معراج ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۱۴۲/۱۴۳)

عقیقہ کرنے میں ایک نکتہ اور راز یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنا بچہ بڑا پیارا ہوتا ہے، بچے کی پیدائش پر والدین کو بہت ہی خوشی ہوتی ہے اور مستقبل کی امیدوں کی سوچ و فکر سے گھر کا ہر فرد خوشی کی وجہ سے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا، ہر ایک کا دل فرحت و سرور سے لبریز ہوتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ بطور تشکر کچھ تصدق ہو اور تصدق کی بہترین صورت یہ قربانی یعنی عقیقہ ہے۔

(الذبائح فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص۲۸۳ المبحث الثالث مشکلۃ اللحوم۔ الخ)

عقیقہ کے فوائد میں سے اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ عقیقہ کا گوشت فقراء اور مساکین، دوستوں اور رشتہ داروں کو پیٹ بھر کر کھلانے سے طبعی طور پر ان کے دلوں سے دُعائیں نکلیں گی جس سے بچہ کا مستقبل روشن ہوگا، عقیقہ فقراء اور مساکین، دوست و احباب کی دعاؤں کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

تسبیع کی رعایت کا فلسفہ یہ بات ثابت ہے کہ عقیقہ میں بہتر یہ ہے کہ یہ بچے کی پیدائش کے ساتویں دن ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں: "اگر بچہ کی پیدائش کے وقت یہ ضروری قرار دیا جائے تو ممکن ہے کہ اس سے بچے کے والدین کو تکلیف ہو، کیونکہ اس وقت ایک تو گھر کے لوگ بچہ اور اس کی ماں کی خبر گیری میں مصروف اور مشغول ہوتے ہیں، ایسے وقت میں ان کو عقیقہ کا حکم کرنا ان کے لیے کہیں تکلیف کا باعث نہ بنے، علاوہ ازیں ایسے اوقات میں کبھی کبھار جانور ملنے میں بھی دشواری ہوتی ہے، فوراً لزوم کی صورت میں پورا گھرانہ ان تمام مشکلات سے دوچار ہوگا، اس لیے مسنون یہ رہا کہ عقیقہ ساتویں دن ہو جس کے لیے ایک ہفتہ قابلِ اعتماد مدت ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۱۴۴)

عقیقہ کے لیے جانور متعین کرنے کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص عقیقہ کے لیے کوئی جانور متعین کر دے مگر زیادہ پیسے ملنے کے لالچ یا کسی اور فائدہ کی غرض سے وہ شخص اسے فروخت کر کے کوئی دوسرا جانور ذبح کر دے تو کیا اس سے عقیقہ کی سنت ادا ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ عقیقہ چونکہ شرعاً واجب نہیں اس لیے اگر کسی شخص نے عقیقہ کیلئے کوئی جانور متعین کیا لیکن بعد میں اس نے کسی وجہ سے دوسرا جانور ذبح کیا تو اس سے عقیقہ کی سنت ادا ہو گئی، متعین کردہ جانور ذبح کرنا ضروری نہیں۔

مُردہ بچے کے عقیقہ کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد فوت ہو جائے تو کیا اس بچے کا عقیقہ کرنا مستحب ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بچے کی پیدائش پر عقیقہ کرنا مستحب ہے لیکن یہ استحباب صرف زندہ بچے تک محدود ہے مُردہ بچے کے عقیقہ کا استحباب ثابت نہیں۔

لما قال الشیخ المفتی عبد الرحیمؒ: مرحوم بچہ کے عقیقہ کا مستحب ہونا ثابت نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ جلد ۲ ص ۹۴ کتاب الاضحیہ)

بچے کا عقیقہ کس پر ہے

سوال:۔ بچے کا عقیقہ کرنا والدین میں سے کس کے ذمے لازم ہے؟

الجواب:۔ بچے کا نان ونفقہ والدین میں سے جس کے ذمے واجب ہو تو استطاعت ہونے کی صورت میں بچے کا عقیقہ کرنا بھی اُسی پر لازم ہے، استطاعت نہ ہونے کی صورت میں کسی کے ذمے لازم نہیں۔

لما قال الشیخ المفتی عبد الرحیم: جس کے ذمے بچہ کا نفقہ واجب ہے اسی کے ذمہ عقیقہ بھی ہے، باپ کی حیثیت نہ ہو تو ماں عقیقہ کرے۔

(فتاویٰ رحیمیہ جلد ۲ ص ۹۴ کتاب الاضحیہ)

قربانی اور مسائل عید قربان

> دارالعلوم حقانیہ کے دارالافتاء سے ماہنامہ الحق میں افادۂ عام کے لیے "قربانی اور مسائل عید قربان" کے عنوان سے یہ مضمون شائع ہوا تھا۔ فتاویٰ اور مسائل کی مناسبت سے یہاں درج کیا جاتا ہے ——— مرتب ———

قربانی اور قرآن قربانی اسلام کی مُہتم بالشان عبادت ہے، اس کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی مرتبہ (آٹھ سورتوں میں) خداوند کریم نے قربانی اور متعلقاتِ قربانی، اس کی اہمیت اور حکمت و فلسفہ، مختلف اُمتوں میں اس شکل و صورت پر روشنی ڈالی ہے، اور امتِ مُسلمہ ملتِ ابراہیمی کے لیے اسے دینی شعار اور امتیازی نشان قرار دیا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (سورۃ الحج ۳۴)

(ترجمہ) "اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کی تاکہ وہ اللہ کے دیئے گئے مویشیوں پر اس کا نام بلند کریں"

جیسا کہ خود آیتِ کریمہ سے واضح ہے، یہاں منسک سے مراد ذبح کرنا قربانی دینا ہے، محققین اور تمام اکابر مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔ (قرطبی مراح للنوویؒ۔ فتح القدیر للشوکانیؒ وغیرہ)

قربانی کی حکمت اور فوائد کے بارہ میں ارشادِ ربانی ہے:۔

لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ (سورۃ الحج آیت ۳۷)

(ترجمہ) "اللہ تعالیٰ کے ہاں قربانی کا گوشت پوست اور خون نہیں پہنچتا مگر اس کے ہاں تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔"

سورۃ الکوثر میں واضح اور قطعی حکم ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۔ (سورۃ الکوثر ۲)۔ (ترجمہ) "پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو"

قربانی اور حدیث (۱) عن ابن عمرؓ قال اقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ عشر سنین یضحی۔ (جامع الترمذی ج ۱ ص ۲۷۷ ابواب الاضاحی)

(ترجمہ) "حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس برس تک مدینہ منورہ میں رہے اور برابر قربانی کرتے رہے۔"

(۲) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ عید قربان کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں اونٹ یا کسی دوسرے جانور کی قربانی کرتے۔ (مسند احمد و نسائی) [1]

(۳) حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں گندم گوں رنگ کے دو بینڈھے قربان کیے۔ (بخاری نیز کتاب اختلاف الحدیث للشافعی علی الام ج ۷ ص ۲۸) [2]

(۴) بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہراتؓ کی طرف سے گائے کی قربانی کی۔ [3]

(۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر صاحب وسعت پر سال بھر میں ایک قربانی واجب ہے۔ (ابن ماجہ ص ۲۳۳) [4]

(۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے استطاعت کے باوجود قربانی نہ دی وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔ [5]

(۷) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ یہ قربانیاں کیا ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم کی سنت ہے۔ (مشکوٰۃ) [6]

(۸) اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ عید قربان کے دن ابن آدم کا کوئی عمل قربانی سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب نہیں، قیامت کے دن قربانی کے جانور کے سینگ، بال، سُم تک اعمالِ حسنہ کو بھاری کر دیں گے، اس کے خون کے قطرے زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو جاتے ہیں۔ تو طیبِ نفس (دل کی خوشی) سے قربانی کرتے رہو۔ (ترمذی، ابن ماجہ) [7]

(۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے ہر بال کے بدلے تمہارے لیے نیکی ہے۔ (سنن ابن ماجہ) [8]

سبحان اللہ! کیا ٹھکانہ ہے رحمتِ خداوندی کا کہ اتنی بڑی دولت میسر ہو اور پھر بھی مسلمان کوتاہی کرے، مومن کی شان تو یہ ہے کہ قربانی اگر اس پر واجب نہ بھی ہو تب بھی ثواب اور نیکیوں کا یہ خزانہ ہاتھ سے نہ جانے دے۔

شرائط وجوبِ قربانی قربانی واجب ہونے کی شرائط یہ ہیں:۔

(۱) اسلام (غیر مسلم پر واجب نہیں) (۲) اقامت (مسافر پر واجب نہیں) (۳) حریت یعنی آزاد ہونا۔ (غلام پر واجب نہیں) اس کے لیے مرد ہونا شرط نہیں عورتوں پر بھی واجب ہے، نابالغ پر نہ خود واجب ہے نہ اس کی طرف سے اس کے ولی پر واجب ہے۔ کما فی ظاہر

الروایۃ وبہ الفتوی۔[۹] (۴) تونگری یعنی جو مسلمان اتنا مالدار ہو کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو اُس پر عید کے دن صدقۂ فطر اور قربانی واجب ہے چاہے وہ مالِ تجارت ہو یا نہ ہو اور چاہے اس پر پورا سال گذر چکا ہو یا نہ گذرا ہو۔ (بہشتی زیور ہٰذا)

قربانی کے جانور اونٹ، گائے، بکری کی تمام انواع (نر، مادہ، خصی، غیر خصی) کی قربانی ہو سکتی ہے بھینس گائے میں شمار ہے اور بھیڑ یا دنبہ بکری میں ہیں۔ گائے، بھینس، اونٹ ان سب میں سات آدمی بھی شریک کر سکتے ہیں جبکہ کسی کا ساتویں حصہ سے کم نہ ہو۔ اگر کسی گائے یا اونٹ میں سات یا اس سے کم آدمی شریک ہوئے تو سب کی قربانی درست ہے اور اگر آٹھ یا زیادہ ہوئے تو سب کی قربانی نہ ہوگی۔[۱۱]

جانور کی عمر اونٹ پانچ سال کا، گائے بھینس دو سال کی، بکری ایک سال کی، اس سے کم عمر کی قربانی جائز نہیں، ہاں اگر دُنبہ یا بھیڑ اتنا موٹا تازہ ہو کہ سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو چھ مہینے کی عمر والے کی بھی قربانی درست ہے[۱۲]

کانے اور اندھے جانور کی قربانی جائز نہیں۔ اگر ایک کان تہائی یا تہائی سے زیادہ کٹ گیا یا دُم تہائی یا اس سے زیادہ کٹ گئی (یہ پیدائشی نہ ہوں) تو قربانی درست نہیں۔ اتنا لاغر جس کی ہڈیوں میں مغز نہ ہو یا ایسا لنگڑا جو تین پاؤں سے چل سکتا ہے، چوتھا پاؤں رکھ نہیں سکتا یا اس سے چل نہیں سکتا اس کی قربانی درست نہیں۔ جس کے سارے یا آدھے سے زیادہ دانت نہ ہوں اس کی قربانی بھی جائز نہیں۔ جس جانور کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا ٹوٹ گئے ہوں مگر جڑیں سالم نہ ہوں یا خصی ہو اس کی قربانی درست ہے[۱۳]

خُنثیٰ جانور جس میں نر و مادہ دونوں کی علامتیں ہوں اور جلّالہ جو صرف غلیظ چیزیں کھاتا ہو یا جس کی ٹانگ کٹی ہو اس کی قربانی جائز نہیں۔ اور اگر جانور خریدنے کے بعد ایسا کوئی عیب پیدا ہو تو اس کے بدلے میں دوسرا جانور خریدے۔ ہاں اگر غریب آدمی ہو جس پر قربانی واجب نہ ہو تو اس کے واسطے درست ہے کہ وہی قربانی کر دے[۱۴]

قربانی کے اوقات (۱) قربانی کا وقت بقر عید یعنی دس ذی الحجہ کی طلوعِ صبح صادق سے بارہویں کے غروبِ آفتاب تک ہے۔ پہلا دن دس ذی الحجہ سب سے افضل ہے، پھر گیارہ ذی الحجہ پھر بارہ ذی الحجہ کا درجہ ہے[۱۵]

(۲) بقر عید کی نماز سے پہلے قربانی کرنا درست نہیں، ہاں دیہات یا قصبوں والے جہاں

نمازِ عید نہ ہوتی ہو نماز فجر کے بعد قربانی کرسکتے ہیں [۱۶]

(۳) رات کو ذبح کرنا بہتر نہیں، شاید اندھیرے میں کوئی رگ نہ کٹے اور قربانی درست نہ ہو۔ [۱۷]

(۴) اگر بارہویں کے غروبِ آفتاب سے پہلے مقیم ہوا یا تونگر ہوا تو قربانی کرنا واجب ہے [۱۸]

(۵) قربانی کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا اولیٰ ہے ورنہ کسی اور سے بھی کرانا جائز ہے [۱۹]

(۶) قربانی کے جانور کو قبلہ رخ لٹا کر پہلے یہ دعا پڑھے: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اَللّٰهُمَّ مِنْکَ وَلَکَ۔ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ کہہ کر ذبح کرے اور ذبح کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے: اللّٰھم تقبّلہ منّی کما تقبّلت من حبیبک محمد وخلیلک ابراھیم علیھم السلام [۲۰]

(۷) زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں، دل کا ارادہ بھی کافی ہے۔ [۲۱]

(۸) اگر قربانی واجب ہو اور قربانی کے دن بغیر قربانی کیے گذر جائیں تو بعد میں بھیڑ یا بکری کی قیمت دیدی جائے اور اگر جانور خرید لیا گیا ہو تو بعینہٖ وہی خیرات کر دیا جائے [۲۲]

گوشت اور کھال کا حکم

(۱) قربانی دینے والا قربانی کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے خویش واقارب، غنی وفقراء سب کو دے سکتا ہے، بہتر یہ ہے کہ کم از کم تہائی حصہ خیرات کر دے، اس سے کمی نہ کرے [۲۳]

(۲) اگر سات آدمی قربانی میں شریک ہوں تو گوشت اندازے سے نہ بانٹیں بلکہ صحیح تول کر تقسیم کریں ورنہ گناہ ہوگا [۲۴]

(۳) قربانی کی کھال یا اس کی قیمت خیرات کر دیں اور ان لوگوں کو دیں جو زکوٰۃ وصدقہ فطر کے مستحق ہیں۔ قیمت میں جو پیسے ملیں وہی خیرات کر دیں، اگر تبدیل کر کے دیئے تو بُری بات ہے مگر ادا ہو جائیں گے [۲۵]

(۴) کھال کو اپنے کام میں بھی لا سکتے ہیں مثلاً اس سے رسّی بٹوائی یا چھلنی یا ڈول یا جائے نماز بنوائی۔ (بہشتی زیور) [۲۶]

(۵) گوشت یا چربی یا چمڑا قصائی یا کسی اور کو تنخواہ یا مزدوری میں دینے کا حکم نہیں۔ [۲۷]

(۶) قربانی کی رسّی جھول وغیرہ بھی خیرات کرنی چاہیئے [۲۸]

(۷) اگر اپنی خوشی سے کسی مُردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے قربانی کی جائے تو اس قربانی کے گوشت

میں سے کھانا یا کھلانا اور بانٹنا سب درست ہے جس طرح اپنی قربانی کا حکم ہے۔ (بہشتی زیور)[۲۹]

تکبیراتِ تشریق نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک شہری مقیم کو ہر نمازِ پنجگانہ کے بعد جو جماعتِ مستحبہ کے ساتھ ادا کی گئی ہو ایک بار بلند آواز سے تکبیر کہنا واجب ہے اگر زیادہ بار کہے تو افضل ہے اسے تکبیرِ تشریق کہتے ہیں جو یہ ہے: اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ[۳۰]

عید کی سنتیں حجامت بنوانا، غسل کرنا، اچھے سے اچھا لباس پہننا (جو میسر ہو) سرمہ لگانا، میسر ہو تو خوشبو لگانا۔ اس عید میں نمازِ عید سے پہلے کچھ نہ کھانا چاہیئے بلکہ افضل یہ ہے کہ واپس آکر قربانی کرے اور اس کا گوشت کھائے، اس عید میں عید گاہ جاتے ہوئے بلند آواز سے یہ تکبیر پڑھے: اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔ عیدگاہ میں وقت سے پہلے جانا اور شروع صفوں میں بیٹھنے کی کوشش کرنا، واپسی پر عید گاہ سے جس راستے سے گیا تھا اس کی بجائے دوسرے راستے سے آنا بھی سنت ہے۔

نمازِ عید کی نیت دو رکعت نماز عید الاضحیٰ مع چھ تکبیراتِ واجب کے، بندگی اللہ تعالیٰ کی، منہ طرف قبلہ شریف کے، پیچھے اس امام کے،

پہلی رکعت میں ثناء کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھنے سے پہلے امام صاحب تین بار اللہ اکبر کہیں گے، مقتدی بھی اللہ اکبر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھائیں، پہلی دو بار تکبیر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیں اور تیسری تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لیں اور حسبِ معمول امام صاحب کے ساتھ رکعت پوری کریں۔ دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور قرأت کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے تین بار تکبیرات کہیں گے، مقتدی حسب سابق اللہ اکبر کہتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور چھوڑ دیں، چوتھی بار اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جائیں۔

خطبہ نمازِ عید کے بعد خطبہ ہوتا ہے جس کا سننا واجب ہے، کچھ لوگ خطبہ ختم ہونے سے پہلے عید گاہ سے چلے جاتے ہیں، خواہ خطیب کی آواز سنائی دے یا نہ دے خطبہ ختم ہونے تک اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔

---

[۱] عن عبد اللہ بن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یذبح او ینحر بالمصلّی۔ (سنن النسائی ج ۲ ص ۲۰۲ باب ذبح الامام اضحیتہ بالمصلّی)

[۲] عن انسؓ قال ضحیّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکبشین املحین اقرنین ذبحھما

بیدہ ولیسمّی وکبر ووضع رجلہ علیٰ صفاحہما۔ (صحیح بخاری ج ۲ صـ۸۳۵،
باب التکبیرات عند الذبح — سُنن النسائی ج ۲ صـ۲۰۳ باب الکبش کتاب الاضحیۃ)

۳ـہ عن عائشۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل علیہا وحاضت بسرق
قبل ان تدخل مکۃ وھی تبکی فقال مالکِ اَنُفستِ قالت نعم قال ان ھٰذا امر
کتبہ اللہ علیٰ بنات آدم فاقضی مایقضی الحاج غیر ان لا تطوفی بالبیت
فلما کنا بمنیٰ اتیت بلحم بقر فقلت ما ھٰذا قالوا ضحی رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم عن ازواجہ بالبقر۔ (صحیح بخاری ج ۲ صـ۸۳۲ باب الاضحیۃ للمسافر والنساء)

۴ـہ عن مخنف بن سلیم قال کنا وقوفا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعرفۃ
فقال یآیہا الناس ان علیٰ اھل بیت فی کل عام اضحیۃ وعتیرۃ أتدرون
ماالعتیرۃ ھی التی یسمیہا الناس الرجبیۃ۔

(ابن ماجہ صـ۲۲۶ باب الاضاحی واجبۃ اُم لا)

۵ـہ عن ابی ھریرہؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان لہٗ سعۃ ولم
یضح فلایقربن مصلانا۔ (ابن ماجۃ صـ۲۲۶ باب الاضاحی واجبۃ اُم لا)

۶ـہ عن زید بن ارقمؓ قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یارسول اللہ
ماھٰذہ الاضاحی قال سُنۃ ابیکم ابراھیم علیہ السلام۔

(مشکوٰۃ ج ۱ صـ۱۲۹ باب فی الاضحیۃ۔ الفصل الثالث)

۷ـہ عن عائشۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ماعمل ابن آدم یوم النحر عملاً
احبّ الی اللہ عزّ وجل من ھراقۃ دم وانہٗ لیاتی یوم القیٰمۃ بقرونہا
واظلافہا واشعارہا وان الدم لیقع من اللہ عزّ وجل بمکان قبل ان یقع الارض
فطیبوابہا نفسا۔ (ابن ماجۃ صـ۲۲۶ باب ثواب الاضحیۃ)

۸ـہ عن زید بن ارقمؓ قال قال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یارسول اللہ
ماھٰذہ الاضاحی قال سُنۃ ابیکم ابراھیم قالوا فمالنا فیہا یارسول اللہ قال
بکل شعرۃ حسنۃ قالوا فالصوف یارسول اللہ قال بکل شعرۃ من الصوف حسنۃ۔

(ابن ماجہ صـ۲۲۶

۹ـہ قال العلامۃ الکاسانیؒ: بشروط وجوب قربانی، الاسلام، الاقامۃ، حریۃ

ولا تجب (علی الصبی) فی ظاھر الروایۃ ولکن الافضل ان یفعل ذلک۔
(بدائع الصنائع ج۵ ص۶۴ کتاب الاضحیۃ)

خلہ بہشتی زیور ص۲۵ حصہ تیسرا۔

[۱۱] قال العلامۃ الزیلعیؒ: (والاضحیۃ من الابل والبقر والغنم) لان جواز التضحیۃ بھذہ الاشیاء عرف شرعاً بالنص علی خلاف القیاس فیقتصر علیھا۔
(تبیین الحقائق ج۶ ص۷ کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ الکاسانیؒ: ویدخل فی کل جنس نوعہ والذکر والانثیٰ منہ الی قولہ والمعز نوع من الغنم والجاموس نوع من البقر بدلیل انہ یضم ذلک الی الغنم والبقر فی باب الزکوٰۃ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۶۹ کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ الکاسانیؒ: ولا یجوز بعیر واحد ولا بقرۃ واحدۃ عن اکثر من سبعۃ ویجوز ذلک عن سبعۃ۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۷ کتاب الاضحیۃ)

[۱۲] لما فی الھندیۃ: فلا یجوز شیئٌ مما ذکرنا من الابل والبقر والغنم عن الاضحیۃ الا الثنی من کل جنس والا الجذع من الضأن خاصۃ اذا کان عظیما الی قولہ قالوا الجذع من الغنم ابن ستۃ اشھر والثنی ابن سنۃ والجذع من البقر ابن سنۃ والثنی منہ ابن سنتین والجذع من الابل ابن اربع سنین والثنی ابن خمس۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۲۹۷ الباب الخامس)

[۱۳] لما فی الھندیۃ: ولا تجوز العمیاء والعوراء البین عورھا الی قولہ ولو ذھب بعض ھذہ الاعضاء دون بعض من الاذن والالیۃ والذنب والعین۔
(الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۲۹۸ الباب الخامس)

وفی جامع انہ اذا کان ذھب الثلث او اقل جاز وان کان اکثر من الثلث لا یجوز۔ وروی ابو یوسف رحمہ اللہ انہ ان کان ذھب الثلث لا یجوز وان کان اقل من ذلک جاز۔ وقال ابو یوسف رحمہ اللہ ذکرت لابی حنیفۃ رحمہ اللہ فقال قولی مثل ذلک۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج۵ ص۲۹۸ الباب الخامس کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ التمرتاشیؒ: فلو مھزولۃ لم یجز الی قولہ المھزولۃ التی لا مخ فی عظامھا۔ (شرح تنویر الابصار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۲۲۷ کتاب الاضحیۃ)

۱۴؎ قال العلامة التمرتاشیؒ : ولا بالخنثیٰ لان لحمہا لا ینضج۔ (شرح تنویر الابصار علیٰ ہامش رد المحتار ج ۵ ص۲۲۸ کتاب الاضحیۃ)

قال العلامۃ ابن عابدینؒ : والعرجاء التی تمشی بثلاثۃ قوائم وتجافی الرابع عن الارض لا تجوز الاضحیۃ بہا (البحر الرائق ج ۸ ص۱۷۶ کتاب الاضحیۃ)

قال المرغینانیؒ : واما الھتماء وھی التی لا اسنان لہا فعن ابی یوسفؒ انہ یعتبر فی الاسنان الکثرۃ والقلۃ وعنہ ان بقی ما یمکن الاعتلاف بہ اجزأ۔

ویجوز ان یضحی بالجماء وھی التی لا قرن لہا لان القرن لا یتعلق بہ مقصود وکذا مکسورۃ القرن لما قلنا والخصی لان لحمہا اطیب۔ (الہدایہ ج۴ ص۴۴۸ کتاب الاضحیۃ)

قال الحصکفیؒ : واشتراھا سلیمۃ یعتب بعیب مانع من التضحیۃ کان علیہ ان یقیم غیرہا مقامہا ان کان غنیاً وان کان فقیراً یجزیہ ذلک لان الوجوب علی الغنی بالشرع ابتداءً لا بالشراء۔

(الدر المختار علیٰ ہامش رد المحتار ج۵ ص۲۲۹ کتاب الاضحیۃ)

۱۵؎ قال العلامۃ الکاسانیؒ : فلا یجوز لاحد ان یضحی قبل طلوع الفجر الثانی من الیوم الاوّل من ایام النحر۔ (بدائع الصنائع ج۵ ص۷۳ کتاب الاضحیۃ)

۱۶؎ وایام النحر ثلاثۃ یوم الاضحی وھو یوم العاشر من ذی الحجۃ الخ۔

(بدائع الصنائع ج ۵ ص۶۵ کتاب الاضحیۃ)

۱۷؎ والمستحب ذبحہا بالنہار دون اللیل لانہ امکن لاستفاد العروق کذا فی الجوھرۃ النیرۃ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۲۹۶ کتاب الاضحیۃ)

۱۸؎ لما فی الھندیۃ : لو کان مسافراً فی اول الوقت ثم اقام فی آخرہ تجب علیہ۔

(الفتاوی الھندیۃ ج ۵ ص۲۹۲ کتاب الاضحیۃ۔ باب شرائط وجوب)

قال العلامۃ طاہر بن عبد الرشید البخاریؒ : ولو جاء یوم الاضحی ولا مال لہ ثم استفاد مائتی درھم ولا دین علیہ وجبت الاضحیۃ۔

(خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۳۰۹ کتاب الاضحیۃ)

لما فی الھندیۃ : وھکذا لو کان فقیراً فی اوّل الوقت ثم ایسر فی آخرہ تجب علیہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۵ ص۲۹۲ کتاب الاضحیۃ باب حکم الوجوب)

١٩ـ لما فی الهندیة : والافضل ان یذبح اضحیته بیده ان کان یحسن الذبح لان الاولیٰ فی القربات ان یتولی بنفسه وان کان لا یحسن الذبح فالافضل ان یستعین بغیره ولکن ینبغی ان یشهدها بنفسه ـ
(الفتاویٰ الهندیة ج ٥ ص ٣٠٠ کتاب الاضحیة ـ الباب الخامس)

٢٠ـ عن جابرٍ قال ذبح النبی صلی الله علیه وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین فلما وجههما قال انی وجهت وجهی الخ (مشکوٰة ص ١٢٨ کتاب الاضحیة ـ الفصل الثانی)

٢١ـ قال العلامة ابن عابدینؒ : ولا یشترط ان یقول بلسانه ما نوی بقلبه کما فی الصلوٰة ـ (رد المحتار ج ٥ ص ٢١٩ کتاب الاضحیة)

٢٢ـ اذا اوجب شاة بعینها او اشتراها لیضحی بها فمضت ایام النحر قبل أن یذبحها تصدق بها حیة ولا یأکل من لحمها لانه انتقل الواجب من اراقة الدم الی التصدق وان لم یوجب ولم یشتر وهو موسر وقد مضت ایامها تصدق بقیمة شاة تجزی للاضحیة ـ
(رد المحتار ج ٥ ص ٢٢٦ کتاب الاضحیة)

٢٣ـ قال العلامة الحصکفیؒ : ویأکل من لحم الاضحیة ویوکل غنیاً ویدخر وندب ان لا ینقص التصدق عن الثلث ـ (الدر المختار علیٰ رد المحتار ج ٥ ص ٢٢٣ کتاب الاضحیة)

٢٤ـ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : سبعة ضحوا واردوا ان یقسموا اللحم بینهم ان اقتسموها وزناً جاز وان اقتسموها جزافاً ان جعلوا مع اللحم شیئاً من السقط کالرأس والاکارع یجوز فان لم یجعلوا لا یجوز ـ
(خلاصة الفتاویٰ ج ٤ ص ٣١٥ کتاب الاضحیة)

٢٥ـ ولا بأس بالدراهم لیتصدقها ولیس له ان یبیعه بالدراهم لینفقها علیٰ نفسه ولو فعل ذلک یتصدق بثمنه ـ (خلاصة الفتاویٰ ج ٤ ص ٣٢٢ کتاب الاضحیة)

٢٦ـ ویجوز الانتفاع بجلد الاضحیة والهدی والمتعة والتطوع بان یتخذه فروًا او بساطاً او جراباً او غربالا الخ
(خلاصة الفتاویٰ ج ٤ ص ٣٢١ کتاب الاضحیة)

٢٧ـ لما فی الهندیة : ولا یحل بیع شحمها واطرافها ورأسها وصوفها

وو برها وشعرها ولبنها الذی یحلبه منها بعد ذبحها بشئ لا یمکن الانتفاع به الا باستهلاک عینه من الدراهم والدنانیر والماکولات والمشروبات ولا ان یعطی اجر الجزار والذابح منها۔ (الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۰ کتاب الاضحیة)

۲۸ـہ لما فی الهندیة: واذ ذبحها تصدق بجلالها وقلائدها کذا فی السراجیة۔

(الفتاوی الهندیة ج ۵ ص۳۰ کتاب الاضحیة۔ الباب السادس)

۲۹ـہ قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ: سئل نصیرؒ عن رجل ضحی عن المیت قال الاجر له والملک لهذا وفی الفتاوی ان کان بامر المیت المختار انه لا یتناول۔ وقال فی باب البائع إن ضحی بغیر امره المختار انه یتناول۔

(خلاصة الفتاوی ج۴ ص۳۲۲ کتاب الاضحیة)

۳۰ـہ لما فی الهندیة: اما صفته فانه واجب واما عدده وماهیته فهو ان یقول مرة واحدة الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله والله اکبر الله اکبر ولله الحمد۔

واما شروطه فاقامة ومصر ومکتوبة وجماعة مستحبة واما وقته فاوله عقیب صلوٰة الفجر من یوم عرفة وآخره فی قول ابی یوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ عقیب صلوٰة العصر من آخر ایام التشریق والفتوی علی قولهما۔ (الفتاوی الهندیة ج۱ ص۱۵۲ الباب السابع)

ویستحب یوم الفطر للرجل الاغتسال والسواک ولبس احسن ثیابه ویستحب التختم والتطیب واستحب فی عید الفطر ان یأکل قبل الخروج الی المصلی الاکل قبل صلوٰة یوم الاضحی لا یکره لکن یستحب له ان لا یفعل ویستحب ان یکون اول تناولهم من لحوم الاضاحی ویکبر فی الطریق فی الاضحی جهراً۔

وکیفیة صلوٰتها: ان ینوی صلوٰة العید بقلبه ویقول بلسانه اصلی صلوٰة العید لله تعالیٰ الخ (الفتاوی الهندیة ج ا ص۱۴۹ باب صلوٰة العیدین)

ثم یکبر للتحریمة ..... ثم یکبر الامام والقوم تکبیرات الزوائد ثلاثاً یرفع یدیه للامام والقوم فی کل منها ثم یکبر الامام والقوم تکبیرات الزوائد ثلاثاً ویرفع یدیه فیها کما فی الرکعة الاولیٰ۔ (طحطاوی ص۲۹۱ باب العیدین)
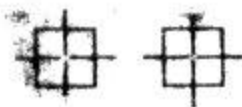
کتاب
الوصیة

ان الله تعالى تصدق عليكم

بثلث اموالكم زيادة فى

اعمالكم فضعوها حيث شئتم

کتاب الوصیّۃ

(وصیت کے احکام و مسائل)

وارث کے لیے وصیت کرنا باطل ہے

سوال:۔ ایک شخص نے اپنے کل مال کی وصیت پوتے کے لیے کر دی جبکہ اس کی پوتیاں اور بہنیں بھی موجود ہیں، تو کیا یہ وصیت شرعاً درست اور نافذ ہوگی یا نہیں؟ تفصیلاً جواب مطلوب ہے؟

الجواب:۔ ورثاء کے حقوق قانونِ وراثت کے مطابق متعین ہیں، اور مورث ورثاء کو وصیت کرکے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی کا حق نہیں رکھتا، جس وارث کے لیے وصیت کی جائے اس کی تنفیذ دوسرے ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوگی اور اگر دیگر ورثاء اجازت نہ دیں تو وصیت کالعدم رہے گی تاہم بصورتِ اجازت وصیت پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام: ان اللّٰہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقہٗ ألا لا وصیۃ لوارث ولانہ یتأذی البعض بایثار البعض ففی تجویزہ قطیعۃ الرحم ولانہ حیف بالحدیث الّذی رویناہ۔

(الھدایۃ ج۴ ص۶۲۵ کتاب الوصایا) [۱]

نابالغ اولاد کی شادیاں کرانے کیلئے وصیت کا حکم

سوال:۔ زید نے اپنی بالغ اولاد کی شادیاں کر دی ہیں، کیا وہ اپنی نابالغ اولاد کی شادی کے لیے اپنی جائیداد میں سے شرعاً کسی حصہ کی وصیت

---

[۱] عن عمرو بن خارجۃ خطب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال ان اللّٰہ قد اعطی کل ذی حق حقہ ألا لا وصیۃ لوارث۔

(سنن النسائی ج۲ ص۱۳۱ کتاب الوصایا، باب ابطال الوصیۃ للوارث)

کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اولاد کی شادیاں کرانا والد کی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ احسان کا معاملہ ہے زندگی میں تو باپ کو اپنی جائیداد میں تصرف کا مکمل اختیار حاصل ہے، لیکن مرنے کے بعد اولاد کے لیے ایسے اضافی اخراجات کی وصیت کالعدم رہے گی۔

کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام: اِنَّ اللّٰہَ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ اَلَا لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ۔

(سنن النسائی ج۲ ص۱۳۱ کتاب الوصایا باب ابطال الوصیۃ للوارث) [1]

وصیت مملوکہ جائیداد میں نافذ ہے

سوال: زید نے بکر کے لیے اپنی جائیداد میں پانچویں حصے کی وصیت کی، پھر اپنے بیٹے خالد کو بعض جائیداد متفرق جگہوں میں دے دی، تاہم وفات کے وقت اس کی ملکیت میں کچھ جائیداد ضرور تھی، کیا ایسی حالت میں وصیت تمام جائیداد میں نافذ ہو گی جس میں بیٹے کو دی ہوئی جائیداد بھی شامل ہے یا صرف موت کے وقت مملوکہ جائیداد میں وصیت نافذ ہو گی؟

الجواب: وصیت درحقیقت مرتے وقت نافذ ہوتی ہے، اس لیے موت کے وقت جو جائیداد باقی ہو اس میں وصیت معتبر ہو گی، چونکہ موت سے قبل وصیت کرنے والا اپنی جملہ جائیداد میں مالکانہ تصرفات کا حق محفوظ رکھتا ہے اس لیے اُسے وصیت سے قولاً یا عملاً رجوع کا حق بھی حاصل ہے، لہٰذا بیٹے کو جو جائیداد زندگی میں دی ہو وہ اسی کی ملکیت ہو گی البتہ باقیماندہ جائیداد سے پانچواں حصہ موصیٰ لہٗ کو دیا جائے گا۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین۔

(مقدمۃ السراجی ص۳) [2]

---

[1] لما قال العلامۃ المرغینانی رحمہ اللہ:- ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ السلام: ان اللہ اعطی کل ذی حق حقہ الا لا وصیۃ لوارث۔

(الھدایۃ ج۴ ص۶۲۵ کتاب الوصایا)

[2] وفی الھندیۃ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما یبقی بعد الکفن والدین۔

(الفتاوی الہندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض) ومثلہ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض۔

کل مال کے ثُلث سے زائد میں وصیت معتبر نہیں

سوال:۔ ایک عورت نے زندگی میں اپنی کل جائیداد غیر منقولہ رائج الوقت ملکی قانون کے تحت بذریعہ رجسٹری محلہ کی مسجد کے لیے اس شرط کے ساتھ وقف کی کہ میری وفات تک یہ جائیداد میری رہے گی، میرے مرنے کے بعد کل اثاثہ یعنی سوئی سلائی تک مسجد کی ملکیت ہوگی، اور اس بات کے گواہ بھی موجود ہیں۔ جبکہ مرحومہ کے ورثاء میں ماموں زاد بھائی کی بیٹی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے جس کے بارے میں مرحومہ نے بتایا تھا کہ میں نے اس لڑکی کو جو کچھ دینا تھا وہ اپنے ہاتھوں سے دے دیا ہے اب اسے اور کچھ نہ دوں گی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مرحومہ کی موت کے بعد اس کے رشتہ داروں کو کچھ ملے گا یا نہیں؟ یا اس کا جملہ اثاثہ مسجد کے لیے ہی وقف ہوگا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا یہ وقف وصیت سے متعلق ہے اور وصیت کل مال کے ثلث سے زائد میں معتبر نہیں یعنی کل جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کا صرف ۱/۳ حصہ مسجد کے لیے وقف ہوگا اور ۲/۳ حصہ میں ارث جاری ہوگی، کیونکہ وصیت کے ذریعے کوئی اپنے ورثاء کو میراث سے محروم نہیں کرسکتا۔

قال العلامة محمد علاؤ الدین افندیؒ: الارث جبری لایسقط بالاسقاط۔

(تکملة ردالمحتار ج ۱ ص ۳۵۹ مطلب واقعة الفتوٰی۔ کتاب الدعوٰی)

قال العلامة السجاوندیؒ: وتنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین۔

(مقدمة السراجی ص ۳ م [۱])

میّت کی زبانی وصیّت سے مسجد پر خرچ کرنا

سوال:۔ زید نے وفات سے دو ماہ قبل مسجد کے لیے دس ہزار روپے دینے کا کہا تھا جن میں سے اس نے دوسو پچاس روپے مسجد پر خرچ بھی کردیئے لیکن بقیہ رقم وفات تک وہ کسی وجہ سے خرچ نہ کرسکا، تو کیا مرحوم کے ترکہ سے یہ رقم مسجد پر خرچ

---

[۱] وفی الھندیة: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الکفن والدین ......
ثم یقسم الباقی بین الورثة علی سھام المیراث۔
(الفتاوٰی الھندیة ج ۶ ص ۴۴۷ کتاب الفرائض)

کی جائے گی یا نہیں، جبکہ مرحوم کی وصیت پر گواہ بھی موجود ہیں؟

الجواب: اگر مرحوم کی وصیت کے بارے میں اس کے ورثاء اقرار کرتے ہوں یا اس پر گواہ موجود ہوں اور جائیداد متروکہ کے ثلث سے اس کی ادائیگی ممکن ہو تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔

قال العلامة السجاوندی رحمہ اللہ: وتنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین۔ (مقدمة السراجی ص۳) [1]

وصیت کی وجہ سے وارث حقِ میراث سے محروم نہیں ہوتا

سوال: ایک عورت جو کہ لاولد ہے، نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میری زرعی جائیداد اور مکان میرے دونوں دیوروں کو برابر برابر دیدی جائے کیونکہ ان دونوں نے میری بیماری پر کافی مال خرچ کیا ہے اور آئندہ بھی میری تجہیز و تکفین پر خرچ کریں گے، اس لیے میرے کسی دوسرے اقارب کو میری جائیداد میں کوئی حق حاصل نہیں، جبکہ اس کی وفات کے بعد اس کے دو چچازاد بھائی زندہ ہیں، تو کیا شرعاً ان دونوں کو مرحومہ کی میراث میں سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب: شریعت کے مطابق کفن و دفن پر جو خرچ ہوگا وہ ترکہ سے لیا جائے گا اور باقی جائیداد کے ثلث سے وصیت پوری کی جائے گی اس لیے کہ ثلث سے زیادہ وصیت کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں اور بقیہ مال ورثاء پر تقسیم ہوگا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کے دونوں دیوروں کو ثلث مال ملنے کے بعد باقی مال اس کے دونوں چچازاد بھائیوں کا ہوگا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: تتعلق بترکة المیت حقوق اربعة مرتبة الاول یبدأ بتکفینه وتجهیزه من غیر تبذیر ولا تقطیر..... ثم تنفذ وصایاہ من ثلث ما بقی بعد الدین ثم یقسم الباقی بین ورثته بالکتاب والسنة والاجماع الأمة۔ (مقدمة السراجی ص۳) [2]

---

[1] قال العلامة ابن البزازؒ: وتبرعات المریض کالهبة والصدقة......... من الثلث۔ (البزازیة علی هامش الهندیة ج۶ ص۴۳۲ کتاب الوصایا)

[2] قال العلامة المرغینانیؒ: قال ولا تجوز بما زاد علی الثلث لقول النبی علیه السلام فی حدیث سعد ابن وقاص رضی اللہ عنہ الثلث والثلث کثیر۔ (الهدایة ص۶۵۳ کتاب الوصایا۔ باب صفة الوصیة)

وصیّت صرف ثلث مال میں نافذ ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص زندگی میں ہی اپنے مال کی وصیت کرے تو اس کی وصیت کتنے مال میں نافذ ہوگی یا کہ اس کا جملہ مال وصیت کے مطابق خرچ کیا جائے گا؟

الجواب:۔ وصیت میت کے کل مال کے صرف ثلث میں جاری ہوگی یعنی میت کی وصیت کو اس کے ثلث مال سے پورا کیا جائے گا اور باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبدالرشیدؒ: ثم تقضی دیونہٗ من جمیع مابقی من مالہ ثم تنفذ وصایاہ من ثلث مابقی بعد الدّین الخ

(السراجی ص۳) [1]

وصیّت سے رجوع صحیح ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کے لیے اپنے مال میں مخصوص حصہ کی وصیت کرے اور اسے اسٹامپ پر تحریر بھی کر دے لیکن چند دن بعد وصیت کرنے والا کچھ ذاتی ناراضگی کی وجہ سے وصیت سے رجوع کر لیتا ہے، تو کیا اس شخص کا وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وصیت سے رجوع کرنا صحیح ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جب وصیت کنندہ نے اپنے وصیت نامہ سے رجوع کر لیا تو بعد الموت وصی کو کچھ نہیں ملے گا۔

قال العلامۃ المرغینانیؒ: ویجوز للموصی الرجوع عن الوصیّۃ واذا صرح بالرجوع اوفعل مایدل علی الرجوع کان رجوعًا۔ (الھدایۃ ج۴ ص۶۴۴ کتاب الوصایا، باب فی صفۃ الوصیّۃ مایجوز من ذٰلک الخ) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: ثم تنفذ وصایاہ من ثلث مایبقی بعد الکفن والدّین الا ان تجیز الورثۃ اکثر من الثلث الخ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض الباب الاول فی تعریفھا وفیما یتعلق بالترکۃ)

وَمِثْلُہٗ فی الھدایۃ ج۴ ص۶۵۱ کتاب الوصایا، باب فی صفۃ الوصیۃ مایجوز من ذٰلک الخ۔

[2] وفی الھندیۃ: ویصح للموصی الرجوع عن الوصیّۃ ثم الرجوع قد یثبت صریحاً وقد یثبت دلالۃ الخ۔ (الفتاوٰی الھندیۃ ج۶ ص۹۲ کتاب الوصایا، الباب الاول فی تفسیرھا وشرط جوازھا وحکمھا الخ)

وَمِثْلُہٗ فی فتاوٰی قاضیخان ج۴ ص۴۳۲ کتاب الوصایا۔ فصل فیما یکون رجوعًا عن الوصیۃ الخ

غیر مسلم کو وصیّت کرنے کا حکم

سوال:۔ ایک مسلمان کا اپنے مال میں کسی غیر مسلم کے لئے وصیت کرنا جائز ہے یا نہیں ؟ اگر جائز ہے تو یہ وصیت کتنے مال میں جاری ہوگی؟

الجواب:۔ اسلام میں وصیت کا دائرہ وسیع ہے مسلمان کے علاوہ غیر مسلم کے لئے بھی وصیت کرنا درست ہے اور اس کا اجراء صرف ثلث مال میں ہوگا۔

قال العلامة الکاسانیؒ: اما کونه مسلماً فلیس بشرط حتی لوکان ذمیاً فاوصی له مسلم او ذمی جاز۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳۴۱ کتاب الوصایا) [1]

اثباتِ وصیت کے لیے شہادت ضروری ہے

سوال:۔ ایک آدمی نے یہ دعویٰ کیا کہ فلاں شخص نے میرے لیے اتنے مال کی وصیت کی ہے جبکہ مرحوم کے ورثاء اس وصیت کے منکر ہیں مگر مدعی کے پاس گواہ موجود ہیں، تو کیا شرعاً ورثاء کا انکار مرحوم کی وصیت کو ختم کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس طرح دیگر معاملات اور عقود کے اثبات کیلئے گواہوں کی گواہی موجب اثبات ہے بالکل اسی طرح وصیت بھی گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو جائے گی اور اس سے ورثاء کے انکار کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔

لما قال العلامة الدکتور وهبة الزحیلی: وتثبت الوصیّة بطرق الاثبات الشرعیّة کالشهادة والکتابة۔

(الفقه الاسلامی وادلته ج ۸ ص ۱۲۶
المبحث السابع اثبات الوصیّة)

---

[1] قال العلامة المرغینانیؒ: ویجوز ان یوصی المسلم للکافر والکافر للمسلم فالاوّل لقوله تعالیٰ: لاینهاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین۔

(الهدایة ج ۴ ص ۶۴۱ کتاب الوصایا)

موصی لہ کا موصی سے پہلے وفات پا جانے پر وصیت کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب نے اپنی زندگی میں ہی اپنے ایک دوست کے لیے ایک قطعہ اراضی کا وصیت نامہ لکھا تھا کہ میرے مرنے کے بعد یہ زمین تمہاری ہے، لیکن والد صاحب کا یہ دوست ان کی زندگی میں ہی انتقال کر گیا، اب میرے والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے دوست کے بیٹے اس قطعہ اراضی کا مطالبہ کرتے ہیں، کیا شرعاً ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ وصیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ موصی لہ وصیت کرنے والے کی وفات تک زندہ ہو تب وہ وصیت کا اہل ہوگا ورنہ بصورتِ دیگر اگر موصی لہ وصیت کرنے والے کی زندگی میں ہی فوت ہو جائے تو وصیت باطل ہو جائے گی، اس لیے صورتِ مسئولہ میں وصیت کا مال وصیت کرنے والے کا حق ہے موصی لہ کی اولاد کا دعویٰ استحقاق درست نہیں۔

قال العلامة الکاسانی رحمہ اللہ : وتبطل بموت الموصی لہ قبل موت الموصی لان العقد وقع لہ لا لغیرہ فلایمکن ایقاء علی غیرہ۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳۹۴ کتاب الوصایا، فصل تبطل الوصیة)[1]

وصی کو معزول کرنا جائز ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کو وصی مقرر کرے اور پھر چند دنوں کے بعد اس کو معزول کر کے کسی اور کو وصی مقرر کرے تو کیا شرعاً اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ایک دفعہ کسی کو وصی مقرر کرنے کے بعد پھر اس کو معزول کر سکے ؟

الجواب:۔ موصی کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی کو وصی مقرر کرنے کے بعد

---

[1] قال العلامة وھبہ الزحیلی : موت الموصی لہ المعین قبل موت الموصی تبطل بہ الوصیة باتفاق المذاھب الاربعة لان الوصیة عطیة وقد صادقت المعطی میتاً فلا تصح کالھبة للمیّت ۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج ۸ ص ۱۱۶ المبحث الرابع مبطلات الوصیة)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص ۴۵۳ کتاب الوصایا ۔

پھراس کو معزول کردے لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ وصی کو اس کی معزولی کی اطلاع ہو جائے۔

قال العلامة الکاسانیؒ: فالوصیة تبطل بالنص علی الابطال....اما النص فنحو ان یقول ابطلتُ الوصیة التی اوصیتها لفلان او فسختها او نقضتها الخ۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۹۴ کتاب الوصایا، فصل بیان ما تبطل به الوصیّة) [1]

وصیت کی ملکیت کے لیے قبول کرنا ضروری ہے

سوال:۔ اگر کوئی شخص کسی کے لیے اپنے مرنے کے بعد ایک مخصوص مال کی وصیت کرجائے تو کیا اس شخص کی صرف وصیت سے موصی لہٗ اس مخصوص مال کا مالک بن جائے گا یا اس کا قبول کرنا اس کے لیے ضروری ہے؟

الجواب:۔ وصیت ایک عقد ہے اور حنفیہ کا اصول ہے کہ ہر عقد کی تکمیل کے لیے قبول کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں بھی موصی لہٗ کا وصیت کو قبول کرنا لازمی امر ہے بدون اس کے وہ اُس چیز کا مالک نہیں بن سکتا، لیکن قبول کرنے میں واضح الفاظ کا کہنا ضروری نہیں نفس قبضہ میں لینا بھی کافی ہے۔

قال العلامة وهبة الزحیلی: حکم الوصیة بمعنی الاثر المترتب علی الشئ هو انتقال ملکیة الموصی به الی الموصی له ملکاً جدیداً بقبول الموصی له بعد وفاة الموصی وبه تلزم الوصیة بالاتفاق۔ (الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج۸ ص۲۲ کتاب الوصایا، وقت ثبوت ملکیة الموصی به) [2]

---

[1] قال العلامة وهبة الزحیلی، والرجوع اما ان یکون صریحاً او دلالة فالرجوع الصریح: ماکان بلفظ هو نص فی الرجوع مثل قول الموصی رجعت عن وصیتی لفلان او ترکتها او ابطلتها او نقضتها او ما اوصیت به لفلان هو لورثتی ونحوه۔ (الفقه الاسلامی وادلتهٗ ج۸ ص۱۱۴ المبحث الرابع، مبطلات الوصیة)

[2] قال العلامة الکاسانیؒ: وملك بدون القبول او بدون عدم الرد ووقوع الیأس عنه ولم یوجد القبول منه ولا وقع الیأس عن الرد مادام حیاً فلا یعتق۔

(بدائع الصنائع ج ۷ ص۳۳۲ کتاب الوصایا، فصل رکن الوصیّة)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۶ ص۹۰ کتاب الوصایا، الباب الاول۔

مبہم وصیّت کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص ان الفاظ سے وصیت کرے کہ میرے مال سے کچھ حصہ فلاں شخص کو دیدیا جائے مگر اس نے اس مال کی تعین نہ کی ہو تو کیا وصیت کرنے والے کی وفات کے بعد موصیٰ لہٗ کو وہ مبہم مال دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ شرعاً تو ایسی وصیت صحیح ہے البتہ ابہام کی وجہ سے وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد اس کا تعین ورثاء کی صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ موصی لہٗ کو جتنا چاہیں دے سکتے ہیں، تاہم اگر وصیت کرنے والے نے اپنی زندگی میں ہی اس مال کو متعین کر دیا ہو تو بعد الموت وہی مال دینا پڑے گا بشرطیکہ وہ مال میت کے کل ترکہ کے ثلث سے زیادہ نہ ہو۔

قال العلامة الکاسانی رحمه الله : منها ما اذا اُوصی لرجل بجزء ماله او بنصیب من ماله او بطائفة من ماله او ببعض او بشقص من ماله فان بین فی حیاته شیئاً والا اعطاه الورثة بعد موته ماشاء والان هٰذه الالفاظ تحتمل القلیل والکثیر فیصح البیان فیه ما دام حیا ومن ورثته اذا مات لانهم قائمون مقامه۔

(بدائع الصنائع ج۷ ص۳۵۶ کتاب الوصایا، فصل شرائط الوصیة)

مجنون (پاگل) اور نابالغ کی وصیّت کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! اگر کوئی مجنون یا نابالغ کسی کے لیے وصیت کر جائے تو کیا اس کے مرنے کے بعد موصی لہ اُس مال کا مالک متصوّر ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ نابالغ اور مجنون چونکہ تصرفات کا حق نہیں رکھتے اس لیے شرعاً ان کی وصیت کا بھی کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا مجنون کی وصیت سے موصی لہٗ اس مال کا مالک متصور نہ ہوگا۔

قال العلامة الکاسانی رحمه الله : ومنها ان یکون من اهل التبرع فی الوصیة بالمال ومایتعلق به لان الوصیة بذٰلك تبرع بایجابه بعد موته فلا بد من اهلیة التبرع فلا تصح من الصبی والمجنون لانهما لیسا من

اھل التبرع لکونہ من التصرفات

(البدائع والصنائع جلد ۷ ص۳۳۴ کتاب الوصایا ، فصل فی الشرائط) [1]

پوتے کے لیے وصیّت کا حکم

سوال:۔ اگر دادا پوتے کے لیے اپنے بیٹوں کے برابر حصہ میراث کی وصیت کرے تو کیا اس کی وصیّت پوتے کو چچوں کے برابر حصۂ میراث ملے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کے لیے وصیت کرنا اگرچہ صحیح ہے مگر یہ وصیت میت کے ثلث مال میں جاری ہوگی ، ثلث مال سے زیادہ پوتے کو نہیں ملے گا۔ تاہم اگر ثلث مال اتنا ہو کہ بیٹوں کے حصص کے برابر بنتا ہو تو وصیت کے مطابق برابر حصہ ملے گا ، مثلاً مرحوم کے دو بیٹے اور ایک پوتا ہو تو مال کے تین حصّے کر کے ایک ایک حصہ ہر ایک کو ملے گا۔

کما فی الهندية : يعتبر كونه وارثا اوغير وارث وقت الموت لا وقت الوصيّة حتى لو اوصى لاخيه وهو وارث ثم ولد له ابن صحت الوصية للاخ ولو اوصى لاخيه وله ابن ثم مات الابن قبل موت الموصى بطلت الوصيّة للاخ - (الفتاوى الهندية ج ۶ ص ۹۰ كتاب الوصايا - الباب الاول)-

وصیّت سے رجوع کرنا صحیح ہے

سوال:۔ اگر ایک شخص اپنے کسی دوست کے لیے کچھ مال کی وصیت کرے لیکن مرنے سے پہلے اس کو منسوخ کر دے ، تو کیا اس شخص کا اپنی وصیّت سے رجوع کرنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں ؟

الجواب:۔ وصیت چونکہ امر استحبابی ہے اس لیے اگر موصی وصیت کرنے کے بعد اس سے رجوع کرلے اور اپنی ماقبل وصیت کو باطل کر دے تو یہ اس کا شرعاً حق بنتا ہے اور اس رجوع سے وہ وصیت باطل ہو جائے گی ، چاہے رجوع

---

[1] وفی الهندية : ولا تصح الوصية الا ممن يصح تبرعه فلا تصح من المجنون والمكاتب والماذون الخ - (الفتاوى الهندية ج ۶ ص ۹۲ كتاب الوصايا ، الباب الاول)

قولاً ہو یا عملاً یا تحریراً۔

قال العلامة الكاسانيؒ: الموصي حتى يملك الرجوع عندنا ما دام حيا لان الموجود قبل موته مجرد ايجاب، وانه يحتمل الرجوع في عقد المعاوضة فهي بالتبرع اولى۔ (بدائع الصنائع ج۷ ص۳۷۸ كتاب الوصايا، فصل صفة هذا العقد)[۱]

موصی بہ پر صرف قبضہ کرنا بھی کافی ہے

سوال: جناب مفتی صاحب! وصیت کو قبول کرنے کے لیے "قبول کرتا ہوں" کے الفاظ کہنا ضروری ہے یا کہ صرف موصی بہ قبضہ کر لینے سے موصی لہٗ کی قبولیت پوری ہو جائے گی؟

الجواب: "قبول کرتا ہوں" کے الفاظ کہنے سے جس طرح قبول کرنا پورا ہوتا ہے تو اسی طرح دلالۃ وفعلاً جو قبول کرنے کو واضح کرتے ہوں سے بھی پورا ہوتا ہے الفاظ سے قبول کرنا ضروری نہیں۔

قال العلامة علاؤ الدين الحصكفي رحمہ اللہ: وفي البدائع ركنها الايجاب والقبول وقال زفر الايجاب فقط قلتُ والمراد بالايجاب ما يعم الصريح والدلالة بأن يموت الموصى له بعد موت الموصي بلا قبول۔

(الدر المختار على صدر رد المحتار ج۶ ص۶۵۰ كتاب الوصايا)[۲]

وصی کا موصی کے انتقال کے بعد وصیت کو رد کرنا

سوال: ایک صاحب نے کسی کو اپنا وصی بنایا اور اُس نے

---

[۱] قال العلامة وهبة الزحيلي: تبطل الوصية باسباب اما من الموصي كرجوعه عن الوصية او زوال اهليته او ردته۔ (الفقه الاسلامي وادلته، ج۸ ص۱۱۲ المبحث الرابع، مبطلات الوصية)

وَمِثْلُهٗ في الهندية ج۶ ص۹۳ كتاب الوصايا، الباب الاول۔

[۲] وفي الهندية: ويشترط في الوصية القبول صريحاً او دلالة وذلك بان يموت الموصى له قبل الرد والقبول فيكون موته قبولاً فترثها ورثته۔

(الفتاوى الهندية ج۶ ص۹ كتاب الوصايا، الباب الاول في تفسيرها)

قبول بھی کر لیا اور اس بات پر وصیت کرنے والے کی وفات تک قائم رہا، اب وہ موصی کی وفات کے بعد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے، تو کیا وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب ایک آدمی کسی شخص کو وصی مقرر کرے اور وہ وصیت کو قبول کر کے اس پر وصیت کرنے والے کی وفات تک قائم رہے تو وصیت کرنے والے کے انتقال کے بعد وصی ہونے کی ذمہ داری کو پورا کرنا اس پر لازم ہوگا اور وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

قال العلامة محمد الطوری رحمہ اللہ: واذا اوصی الیہ فقبل قبل موتہ او بعدہ ثم رد لم یخرج لان الموصی ما اوصی الا الی من یعتمد علیہ من الاصدقاء والامناء الخ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۴۵۷ کتاب الوصایا) لہ

بیٹے کی موجودگی میں بھائی کے لیے وصیت کرنا

سوال:۔ ایک بھائی غریب اور نادار ہے جبکہ دوسرا بھائی امیر و مالدار ہے، دونوں بھائیوں کی اولاد بھی موجود ہے۔ اب اگر مالدار بھائی اپنے غریب بھائی کے لیے اپنے مال میں سے کچھ مخصوص رقم کی وصیت کرے تو کیا اپنی اولاد کی موجودگی میں بھائی کے حق میں وصیت صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ بھائی اگرچہ وارث ہے مگر اپنی اولاد یعنی بیٹوں کی موجودگی میں وہ بمنزلہ اجنبی کے ہے جبکہ شریعتِ مطہرہ میں اجنبی کے لیے ایک تہائی مال تک کی وصیت جائز ہے، لہٰذا بیٹوں کی موجودگی میں غریب بھائی کے لیے وصیت کرنا صحیح ہے، البتہ اگر مخصوص مال کل مال کے ایک تہائی سے متجاوز ہو تو وہ ورثاء کے اختیار میں ہوگا۔

وفی الهندیة: یعتبر کونہ وارثا او غیر وارث وقت الموت لا وقت الوصیة حتی لو اوصی لاخیہ وهو وارث ثم ولد لہ ابن صحت الوصیة للاخ ولو اوصی لاخیہ ولہ ابن ثم مات الابن قبل موت الموصی بطلت الوصیة۔ (الفتاوی الهندیة ج ۶ ص ۹۱ کتاب الوصایا۔ الباب الاول)

شیخ احمد کی طرف منسوب وصیت نامہ کی شرعی حیثیت

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ گذشتہ کافی عرصہ سے پاک و ہند میں بار بار ایک وصیت نامہ شائع ہو رہا ہے جس کی نسبت شیخ احمد خادم روضۂ رسول مقبول علیہ السلام کے نام سے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ یہ وصیت نامہ بصورت اشتہار مختلف عنوانات سے بار بار مختلف مضامین کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور سادہ لوح مسلمانوں کو ترغیب و ترہیب دے دے کر اس کی تشہیر و اشاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ کیا حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اسکی نسبت صحیح ہے؟ اور کیا ایک ایسے غیر یقینی طریقے سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف اس کا منسوب کرنا جائز ہے؟ اس اشتہار (وصیت نامہ) کی شرعی حیثیت اور شرعاً اس کی اشاعت پر روشنی ڈالیں؟

الجواب:- مذکورہ وصیت نامہ بشکل اعلان و اشتہار نصف صدی سے مختلف امصار و بلاد میں بار بار چھپ رہا ہے اور اس کے مندرجات کے غیر شرعی ہونے کی وجہ سے علماء کرام نے بار بار اس کی تردید کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس قسم کے وصیت نامے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں، کیونکہ اس کے مندرجات بالکل بیہودہ، غلط اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ چنانچہ آج سے کافی عرصہ قبل حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمتہ نے اس من گھڑت کہانی کی سختی سے تردید کی۔ چنانچہ اس بارہ میں ان کا مفصل فتویٰ "امداد الفتاوی جلد ۴ ص ۵۰۶، ۵۰۷" پر موجود ہے۔ مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی اور جہالت کا نتیجہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے یقینی ثابت شدہ ارشادات و تعلیمات (جو کہ بشکل قرآن و سنت مدون و منضبط موجود ہیں) کی ترویج و اشاعت کی طرف تو توجہ نہیں مگر دوسری طرف علماء کرام کے بار بار اعلانات اور وضاحتوں کے باوجود ایک بے سروپا اور بے ثبوت افسانے کی ترویج و اشاعت میں ایک دوسرے سے سبقت لے کر دانستہ و نادانستہ وعیدات نبوی کے مصداق بن رہے ہیں ارشاد نبوی ہے:۔

من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار۔ (الحدیث)

(ترجمہ) "جس نے جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ باندھا پس وہ اپنے لیے جہنم میں ٹھکانا بنائے۔"

یہ اور اس کے علاوہ بیشمار نصوص و احادیث ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسولِ کریم اور مذہب کے نام منسوب رطب و یابس پر بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے عمل نہیں کرنا چاہیئے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات وارشادات کو دروغگوئی اور جعلسازوں کی دسیسہ کاریوں اور من گھڑت باتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مسلمانوں کے اسلاف نے فنِ حدیث، فنِ اصولِ حدیث، فنِ اسماء الرجال کے ناموں سے عظیم الشان علوم وفنون مدوّن کئے اور محدّثین نے ایک ایک روایت کو شریعت و عقل، فہم و درایت، ادراک و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھ کر صحیح و ضعیف کو ایک دوسرے سے جدا کر کے رکھ دیا اور معمولی قرائن کی وجہ سے بھی جو روایت کے خلافِ شرع ہونے پر دال تھے احادیث کو موضوع کہہ دیا۔ ایک طرف اتنی حزم واحتیاط، اتنا تقوٰی اور دینی بصیرت کی یہ کیفیت ہے اور دوسری طرف یہ ہمارے سادہ لوح مسلمان بھائی اپنی کم علمی و کم فہمی کی وجہ سے ایک موضوع، بے اصل اور من گھڑت وصیّت نامہ کی اشاعت میں دن رات مصروف ہیں، حالانکہ معمولی توجہ اور عقل ودانش سے کام لیا جائے تو اس کا خلافِ اصل اور بے سند و دلیل ہونا واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کی نہ کوئی سند ہے نہ دلیل ہے محض ایک فرضی نام سے منسوب کردہ ایسے مضامین کی کیا حیثیت ہے جو از روئے شرع قرآن و سُنّت کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ مثلاً ان مختلف النوع وصیّت ناموں سے بعض منتخب باتیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

(ا) اس وصیّت نامہ کی نسبت شیخ احمد خادم روضۂ نبوی کی طرف کی جاتی ہے[د] اور یہ ہمیشہ اسی نام اور لقب سے شائع ہوتا ہے، حالانکہ آج تک شیخ احمد کے نام سے روضۂ اقدس کا کوئی خادم نہیں گذرا۔ (ب) اور پھر تعجب ہے کہ یہ ایک ہی شخص اتنی بڑی عمر پاوے (ج) یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ ایک شخص کے علاوہ کسی اور خادمِ روضۂ نبوی یا عالمِ اسلام کے دیگر اکابر اولیاء، بزرگانِ دین اور عبادِ مقرّبین کو خواب میں اس قسم کی وعیدات وتہدیدات اور وصیت کیوں نہیں کی گئی؟ (د) اور اگر بالفرض یہ قصّہ صحیح بھی ہوتا تو حرمین الشریفین (مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منورہ) میں اس کی شہرت زیادہ ہونی چاہیئے تھی؟ حالانکہ پوری دنیا سے مسلمانوں کی آمد ورفت اور رسل ورسائل کے باوجود وہاں اس وصیت نامے کا نام ونشان بھی نہیں، اور اگر اس قصّہ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ کون لوگ تھے جنہیں خواب دیکھنے والے نے یہ قصّہ سنایا اور پھر کن راویوں نے کن وسائط سے یہ واقعہ

ہندوستان تک پہنچا اور یہاں کس ثقہ اور معتمد شخص نے اسے سنا اور پھر کس نے اس کے اردو تراجم کر کے لوگوں میں اس کی اشاعت کی؟ ظاہر ہے کہ ایک ایسی روایت جس کا نہ راوی معلوم ہے نہ سند اور نہ درمیانی وسائط، اور نہ اس کی کوئی تاریخی حیثیت ہے محض ایک من گھڑت اور تراشیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جعلی یا موضوع ہدایت کی اشاعت و روایت نصاً اور اجماعاً حرام ہے بلکہ بعض محدثین کے نزدیک تو کفر ہے۔

(۲) اس میں لکھا ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ساٹھ ہزار آدمی مرے جن میں سے کوئی بھی ایمان دار نہ تھا۔ اور بعض وصیت ناموں کے مطابق ستر لاکھ مسلمان کلمہ گو مرے اور ان میں صرف ستر آدمی صحیح مسلمان تھے۔

یہ مضمون بھی اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی ارشادات کے خلاف ہے ارشادِ خداوندی ہے:۔

وسعت رحمتی علیٰ غضبی۔ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

نیز ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس گئے گذرے دور میں بھی اکثر مسلمان توبہ کر کے اور کلمہ پڑھتے ہوئے مرتے ہیں جو خاتمہ بالخیر ہونے کی علامت ہے۔

(۳) اسی طرح اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ "تارک الصلوٰۃ کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں"۔ یہ حکم صاف طور پر حدیث کے خلاف ہے، ارشادِ نبوی ہے۔ صلّوا علیٰ کلّ برّ و فاجر۔ یعنی ہر نیک اور بدکار مسلمان پر نمازِ جنازہ پڑھو۔

(۴) اس میں علاماتِ قیامت اور قربِ قیامت کے ضمن میں بعض ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا روایات و احادیث میں کہیں بھی ذکر نہیں ملتا، مثلاً:۔

(الف) ایک ستارہ آسمان پر طلوع ہوگا (ب) قرآن مجید کے حروف اڑ جائیں گے۔

(۵) اس میں بعض ایسی چیزوں کی ترغیب و تعلیم ہے جن کا حرام اور بدعتِ قطعی ہونا بدلائلِ شرعیہ ثابت ہو چکا ہے، مثلاً:۔

(الف) تخصیص شربت کی شہداء کربلا کے واسطے (ب) اور کھیر حضرت خاتونِ جنت رضی کے واسطے (ج) اور پلاؤ حضرت غوث الاعظم رح کے واسطے۔

(۶) اسی طرح آجکل کے مروجہ مولود شریف اور قوالیاں جو کہ تمام شرع و عقل کے خلاف ہیں جیسا کہ اس وصیت نامہ کے بارے میں حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے امداد الفتاویٰ ج ۴ ص ۵۰۷

ہیں ان چیزوں کا ذکر کیا ہے ۔

(۷) اس میں بعض ایسی چیزیں ذکر ہیں جن سے (العیاذ باللہ) خاکم بدہن حضور فخر کائنات سردارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تحقیر کا پہلو نکلتا ہے اور حضورؐ کی شان شفاعتِ کبریٰ ورحمۃ للعالمینی اور محبوبیت ومقبولیت بارگاہِ خداوندی پر زد پڑتی ہے ، مثلاً :-

"جس نے اس وصیت نامہ کی تشہیر کی اس کی اور اس کے پورے خاندان کی شفاعت کی جائے گی اور انہیں جنت میں جگہ دلوائی جائے گی اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا" گویا محض ایک فرضی خواب کی وجہ سے مسلمانوں کی نجات وشفاعت کے لیے ایک ایسی شرط لازمی کر دی گئی ہے جس کا نہ قرآن میں ذکر ہے نہ احادیث میں۔

اگر واقعی ایمان کی مقبولیت اور انسان کی مغفرت وشفاعت کے لیے اس وصیت نامہ کی تشہیر ضروری قرار دی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ کروڑوں مسلمان ، علماء وصلحاء ، اہل اللہ اور بزرگانِ دین سب کے سب محروم الشفاعت اور مستحق جہنم ٹھہریں گے جنہوں نے اس وصیت نامہ کی تشہیر نہیں کی اور نہ اب کر رہے ہیں ، اس من گھڑت اور بے سروپا داستان کی زد کہاں پہنچ رہی ہے ۔

ایک اور وصیت نامہ جو کہ ملتان سے مشتہر کیا گیا ہے اس میں حسب ذیل عبارتیں موجود ہیں :-

(الف) اے شیخ احمد میں خدائے عزوجل سے بہت شرمندہ ہوں ۔

(ب) اس وجہ سے میں خداوند کریم اور فرشتوں کو منہ نہیں دکھا سکتا ۔

(ج) اے شیخ احمد میری امت کو کہہ دے کہ تمہاری بدولت خداوند کریم سے بہت شرمندہ ہوں ۔

(د) میں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) پھر اپنے خدا سے معافی چاہتا ہوں ، اے شیخ احمد تو بھی یہ وصیت نامہ لوگوں کو پہنچا دے تاکہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکوں ۔ (ملاحظہ ہو مختلف طبقوں کے علماء کا فتوی مطبوعہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور ص۱۶ ، ۲۵ جنوری ۱۹۶۳ء)

اس قسم کے جملوں سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ اقدس ، شانِ شفاعت اور وجاہت و عظمت کو گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلام دشمن آریوں اور عیسائیوں کی سازش معلوم ہوتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فریضۂ رسالت اور تبلیغ کی ذمہ داریوں کو باکمل و احسن اور انتہائی تمام وکمال سے ادا کر کے سبکدوش ہو گئے اور بارگاہِ خداوندی سے رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً اور فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي ۔ نیز وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور لِيَغْفِرَ لَكَ اللهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ اور دیگر بے شمار بشارات وانعامات پا کر شفیع المذنبین اور

رحمۃ للعالمین کے مقام پر فائز ہوئے ۔ اب امت کی بدکرداری اور گنہگار ہونے کا کوئی عذر اور بوجھ اور باز پرس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نہیں اور نہ ہماری بداعمالیوں کا وبال آپ پر ہے جس کی وجہ سے معاذ اللہ آپؐ کو شرمندہ ہونا پڑے، وہ اپنے فریضہ سے بھی ہزارہا درجہ زیادہ پیغام رشد و ہدایت خداوندی انسانیت تک پہنچا کر اپنے فریضۂ تبلیغ سے باحسن وجوہ سرخرو ہو چکے ہیں۔

اس وصیت نامہ کی اشاعت کی طرف توجہ دیتے ہوئے لوگوں کو لاکھوں کروڑوں روپے کے لالچ اور خوف وعذاب، تباہی و بربادی سے ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے ۔ اور پھر "سنا ہے" کہہ کر کامیابی اور بربادی کے بعض فرضی افسانے لکھے ہوئے ہیں، جبکہ نہ تو سنانے والا معلوم اور نہ ہی سننے والا معلوم ہوتا ہے ۔

خلاصہ یہ کہ ہرگز اس کے تمام مندرجات اور مضامین کو صحیح نہ سمجھنا چاہیئے، البتہ جو باتیں قرآن و حدیث اور دین کی کتابوں میں لکھی ہیں ان کے موافق نیک راہ پر چلنے اور نبی کریمؐ کی سنت کو مضبوطی سے تھام کر بری راہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے، جھوٹی اور بے اصل باتوں کی نسبت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنا بہت بڑا بھاری گناہ ہے ۔ اسلئے از روئے شرع ایسے مضمون کی اشاعت کرنے والا سخت گنہگار ہوگا ۔ اگر کسی کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات، مبشرات و منذرات کے پڑھنے، سیکھنے اور انہیں شائع کرنے کا شوق ہو تو یہ تمام تعلیمات احادیث شریف کی مستند کتابوں میں موجود ہیں، ان کے پڑھنے، سیکھنے، عمل کرنے اور شائع کرنے سے ایمانی جذبہ اور عشقِ نبوی کا ثبوت دیا جا سکتا ہے ۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم ۔

وصیت نامہ کی تحریر وارث کے حق میں نافذ نہیں

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! گذارش ہے کہ میرے والد صاحب کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، وفات سے تقریباً آٹھ سال قبل یعنی ۹۱/۱/۲۴ کو ایک اقرار نامہ تحریر کیا جس میں انہوں نے اپنا ملکیتی دس مرلہ زمین کا پلاٹ اپنی بیٹی (میری سگی بہن مسماۃ شاہجہاں) کے نام کیا تھا، بعد میں ۹۲/۷/۱۴ کو انہوں نے ایک دوسرا اقرار نامہ تحریر کیا جس میں مذکورہ بالا دس مرلہ کا پلاٹ اپنی دوسری بیوی (میری سوتیلی والدہ) اور اس کے بیٹے (میرے سوتیلے بھائی) کے نام کیا۔ بعد ازاں ۹۶/۸/۲۱ کو میرے والد صاحب نے ایک وصیت نامہ تحریر کیا جس میں یہی مذکورہ زمین اپنی دوسری بیوی کے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں (میرے سوتیلے

بھائی بہنیں) کے نام کر دی، بعد ازاں اپنی وفات سے چند روز قبل یعنی ۹۹/۱/۲۴ کو ایک اور وصیت نامہ تحریر کیا جس میں مجھے مذکورہ بالا زمین کا مختارِ خاص بنا کر ہدایت کی گئی ہے کہ اس زمین کو بیچ کر میری دوسری بیوی کے بچوں (میرے سوتیلے بھائی بہنیں) کی پرورش اور تربیت پر صرف کرنا۔

جنابِ عالی! مندرجہ بالا صورتحال کے پیشِ نظر آپ سے التماس ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں ہماری راہنمائی کریں کہ مذکورہ بالا چار دستاویزات میں سے کس پر عمل کیا جائے؟ عین نوازش ہوگی۔

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ دو مسئلوں پر محیط ہے:۔

(۱) **ھبہ**: جو کہ موصوف نے اپنی دس مرلہ زمین کو ہبہ کیا ہے اور شریعتِ اسلامی میں ہبہ نافذالعمل ہے مگر اس کی تکمیل قبض پر موقوف ہے۔ اگر موہوبہ چیز پر قبضہ نہ کیا جائے تو صرف زبان سے کہنے یا تحریری اقرارنامہ سے ہبہ تام نہیں ہوتا، اور جب کسی رشتہ دار کو کوئی چیز ہبہ کر دی جائے اور وہ اس کے قبضہ میں دے دی جائے تو پھر اس سے رجوع کرنا شرعاً صحیح نہیں اور نہ واہب کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا اگر موصوف نے مذکورہ زمین اپنی دختر مسماۃ شاہجہان کے قبضہ میں دے دی تھی تو اب موصوفہ کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں، والد کا ہبہ سے رجوع یا تنسیخ کا اسٹامپ کارآمد نہیں، اور اگر قبضہ میں نہیں دیا ہو تو والد کا کسی وقت بھی اپنے ہبہ سے رجوع کرنا صحیح ہے اور ہبہ کا اقرارنامہ بحق مسماۃ شاہجہان بی بی ناکارہ اور منسوخ متصور ہوگا۔

لما قال المرغینانیؒ: الھبة عقد مشروع تصح بالایجاب والقبول والقبض، اما الایجاب والقبول فلانه عقد والعقد ینعقد بالایجاب والقبول والقبض لابد منه لثبوت الملك اھ (الھدایة ج۳ ص۲۸۱ کتاب الھبة)

لما قال المرغینانیؒ: وان وھب ھبة لذی رحم محرم لم یرجع فیھا لقوله علیه السلام اذا کانت الھبة لذی رحم محرم لم یرجع فیھا لان المقصود صلة الرحم وقد حصل۔

(الھدایة ج۳ ص۲۸۷ کتاب الھبة باب ما یصح رجوعه)

(۲) **وصیت**: باقی اسٹامپ کا تعلق وصیت کے ساتھ ہے، شرعاً وصیت کے نفاذ کیلئے چند شرائط ہیں:۔

(۱) وصیت کا نفاذ مال کے صرف ایک تہائی یعنی ۳/۱ میں ہوتا ہے۔
(۲) دوسرے یہ کہ موصی لہ یعنی جس شخص کے لیے وصیت کی گئی ہو وہ اس کے مال کا وارث نہ ہو، اس لیے کہ وارث کے لیے وصیت کرنا شرعاً جائز نہیں۔

لہٰذا اسی بناء پر باقی تین اسٹامپ اپنے ورثاء یعنی اولاد کے لیے وصیت کے زمرے میں آتے ہیں اس لیے نافذ العمل نہیں بلکہ اس میں جملہ ورثاء کا حق وراثت ہے، شرعاً ان (تین) اقرار ناموں پر عمل کرنا جائز نہیں۔ تاہم وصیت کے مطابق مسمی مظفر داد اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کا ان کے حصہ شرعی میں کفیل ہوگا، اقرار نامہ کی کفالت مال متعین کی ہے جو ناکارہ اور غیر صحیح ہے۔

لما فی الھدایۃ: ولا تجوز بما زاد علی الثلث لقولہ علیہ السلام وحدیث سعد بن ابی وقاص رضی الثلث والثلث کثیر۔اھ ایضاً ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ السلام ان اللہ تعالیٰ اعطی کل ذی حق حقہ لا وصیۃ للوارث الخ۔

(الھدایۃ ج ۴ ص ۶۵۱، ۶۵۲ کتاب الوصایا)

(واللہ اعلم وعلمہ تام)

کتاب
الفرائض

تعلموا الفرائض وعلموها الناس

کتاب الفرائض
(میراث کے احکام ومسائل)

قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا

سوال:۔ ایک شخص نے اپنے بھائی کو کسی غلط فہمی کی وجہ سے قتل کر دیا اور مرحوم کے عصبہ میں سے اس قاتل بھائی کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں، تو کیا قاتل کو مقتول بھائی کی میراث میں حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ قصداً عمداً یا خطاءً ہر حالت میں قتل سبب حرمانِ ارث ہے، اس لیے صورتِ مذکورہ میں مقتول کی جائیداد اس کے دوسرے ورثاء کو دی جائے گی قاتل بھائی کے وجود کا اعتبار نہیں بلکہ بوجہ مانع یہ کالعدم رہے گا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: المانع من الارث اربعة...... والقتل الذی یتعلق به وجوب القصاص او الکفارة۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع)[1]

دادا کی موجودگی میں چچا کی میراث سے محرومی کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں دادا اور چچا کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں، تو مرنے والے کی میراث شرعاً کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:۔ بشرط صدق وثبوت اگر ورثاء کی تعداد درست ہو تو بعد از اداۓ حقوق متقدمہ علی الارث تمام جائیداد دادا کو بطور عصوبت دی جائے گی، اور چچا چونکہ عصبہ بعید ہے اسلئے وہ دادا کی موجودگی میں میراث سے محروم رہے گا۔ نقشہ ملاحظہ ہو:۔

مسئلہ ۱

دادا	چچا
۱/۱ (کل ترکہ کا حقدار)	محجوب

---

[1] وفی الهندیة: القاتل بغیر حق لا یرث من المقتول شیئاً عندنا سواء قتله عمداً او خطاءً وکذلک کل قاتل هو فی معنی الخاطئ.... وقتل الصبی والمجنون والمعتوه والمبرسم والموسوس یوجب حرمان المیراث لان الحرمان یثبت جزاء قتل محظور الخ

(الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۵۴ الباب الخامس فی الموانع)

قال العلامة السجاوندیؒ :۔ اَمّا الاب فلهٗ احوالٌ ثلث والتعصیب المحض وذٰلك عند عدم الولد وولد الابن وان سفل .... والجد الصحیح کالاب عند عدم الاب۔
(السراجی ص۷ باب معرفة الفروض) [1]

اختلافِ دین مانع ارث ہے

سوال :۔ اگر کوئی مسلمان عیسائی عورت سے نکاح کرے تو موت کی صورت میں میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں یا نہیں ؟

الجواب :۔ عیسائی عورت سے اگرچہ نکاح جائز ہے لیکن یہ میاں بیوی عقائد میں اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کی میراث سے محروم رہیں گے کیونکہ اختلافِ دین مانع ارث ہے۔

قال العلامة السجاوندیؒ : المانع من الارث اربعة...... واختلاف الدینین ای اسلامًا وکفرًا۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع) [2]

خاوند اور بہن میں جائیداد کی تقسیم کا حکم

سوال :۔ ایک عورت نے مرنے کے بعد خاوند اور ایک بہن وارث چھوڑے ہیں جبکہ عصبات کوئی نہیں، مہربانی کر کے شریعت کی روشنی میں دونوں کا حصہ متعین فرما دیں ؟

الجواب :۔ اگر مرحومہ کے ورثاء میں خاوند اور ایک اعیانی بہن کے علاوہ اور کوئی زندہ نہ ہو تو کل جائیداد کا نصف خاوند کو اور باقی نصف بہن کو دیا جائے گا، نقشہ ملاحظہ ہو :۔

مسئلہ ۲ — مرحومہ

زوج (خاوند)	بہن
(۱)	(۱)
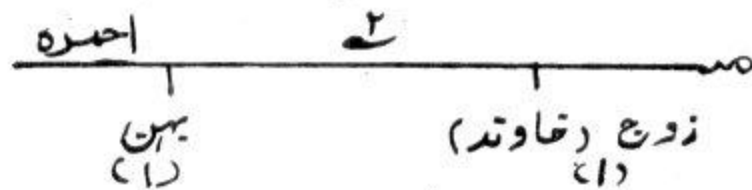
قال العلامة السجاوندی رحمه الله : واما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد

---

[1] وفی الهندیة : فالاقرب العصبات ...... ثم الاب ثم الجد اب الاب وهم ای العصبة کل من لیس لهٗ سهم مقدر .... واذا انفرد اخذ جمیع المال۔
(الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۵۱ الباب الثالث فی العصبات)

[2] وفی الهندیة : واختلاف الدین ایضًا یمنع الارث والمراد به الاختلاف بین الاسلام والکفر۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۵۴ باب الموانع)

وولد الابن وان سفل ۔ (السراجی ص۷ باب معرفۃ الفروض ومستحقیھا)

وقال ایضاً: واما للاخوات لاب وام فاحوال خمس النصف للواحدۃ ۔

(السراجی ص۱۰ فصل فی النساء) لہ

بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی میراث سے محرومی

سوال:۔ ایک شخص کی وفات کے بعد اس کا ایک بیٹا زندہ ہے لیکن دوسرا بیٹا جو کہ اس کی زندگی میں ہی فوت ہو گیا تھا اب اس کے بیٹے زندہ ہیں، تو کیا دادا کی میراث میں سے مرحوم کے ایک بیٹے کی موجودگی میں فوت شدہ بیٹے کی اولاد کا کچھ حق بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ بیٹا قریبی عصبہ ہے اور پوتا اس سے بعید ہے، قریبی وارث کی موجودگی میں بعید کے ورثاء حق وراثت سے محروم رہتے ہیں، اس لیے تمام جائیداد بیٹے کا حق ہے پوتے کو کچھ نہیں ملے گا، تاہم اگر بیٹا دل کی خوشی سے اسے کچھ دے دے تو کوئی حرج نہیں ۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: اولٰھم بالمیراث جزء المیّت ای البنون ثم بنوھم ۔

(السراجی ص۱۴ باب العصبات) ۲ہ

حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی میراث سے محروم رہے گا

سوال:۔ ایک شخص کی وفات کے بعد اس کے ورثاء میں دو حقیقی بھائی، ایک بہن اور ایک علاتی بھائی رہ گئے ہیں، شریعت مطہرہ کی

لہ قال اللہ تبارک وتعالیٰ: (۱) وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ ۔ (سورۃ النساء ۱۲) ۔ (۲) إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۔ (سورۃ النساء ۱۷۶)

۲ہ قال العلامۃ السرخسیؒ: واولاد الابن یقومون مقام اولاد الصلب عند عدم اولاد الصلب فی جمیع ما ذکرنا لقولہٖ تعالیٰ: يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۔ واسم الاولاد یتناول اولاد الابن مجازاً...... فان اجتمع اولاد الصلب واولاد الابن فان کان فی اولاد الصلب ذکر فلا شئ لاولاد الابن ذکوراً او اناثاً او مختلطین لان المذکر او لاد الصلب مستحق لجمیع المال باعتبار حقیقۃ الاسم ۔ (المبسوط للسرخسی ج ۲۹ ص۱۴۱ کتاب الفرائض)

روشنی میں مرحوم کی جائیداد ان ورثاء میں کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:۔ بشرطِ صحتِ سوال اگر مرحوم کے ورثاء میں دو حقیقی بھائی، ایک بہن اور ایک علاتی بھائی ہی ہیں اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا قریبی عصبہ یا ذوی الفروض نہ ہو تو بعد از ادائے حقوق متقدمہ علی الارث مرحوم کی تمام جائیداد کے پانچ حصے کرکے ہر ایک حقیقی بھائی کو دو دو حصے (۲/۵، ۲/۵) اور ایک حصہ (۱/۵) حقیقی بہن کو دیا جائے گا اور اعیانی بھائیوں کی موجودگی میں علاتی بھائی حق وراثت سے محروم رہیں گے۔

قال العلامة السجاوندیؒ: واما للاخوات لاب وام ...... ومع الاخ لابٍ وامٍّ للذکر مثل حظ الانثیین یصرن به عصبة لاستوائهم فی القرابة الی المیت۔

(السراجی ص۱۰ فصل فی النساء)

وایضاً: لقوله علیه السلام ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات کالاخ لاب وام فانه مقدم علی الاخ لاب اجماعاً۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات)[1]

بیٹے، بیٹی میں میراث کی تقسیم اور نواسی کا اس سے محروم ہونا

سوال:۔ ایک عورت نے مرنے کے بعد ایک بیٹا، ایک بیٹی اور ایک نواسی وارث چھوڑے ہیں شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ان ورثاء میں مرحومہ کی میراث کس طرح تقسیم ہوگی؟

الجواب:۔ حسب بیان سائل صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا ترکہ بعد از ادائے حقوق متقدمہ علی الارث تین حصے کرکے ایک حصہ بیٹی کو اور دو حصے بیٹے کو ملیں گے، اور نواسی چونکہ ذوی الارحام میں سے ہے لہٰذا عصبات کی موجودگی میں یہ میراث سے محروم رہے گی، نقشہ ملاحظہ ہو:۔

مرحومہ

بیٹا	بیٹی	نواسی
۲	۱	محروم

---

[1] وفی الهندیة: اختان لابوین واخت لاب فالمال للاختین فرضاً ورداً ولاشیٔ للاخت لاب فان کان منهما اخوها عصبها فلهما الباقی وهو الثلث للذکر مثل حظ الانثیین۔

(الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۵۲ الباب الرابع فی الحجب)

قال العلامة السجاوندیؒ: اما البنات الصلب فاحوال ثلث ...... ومع الابن للذکر مثل حظ الانثیین وھو یعصبھن۔ (السراجی ص۸ فصل فی النساء) ؎۱

صرف والد ہی کا بیٹے کی تمام جائیداد کا وارث ہونا

سوال:۔ اگر ایک آدمی کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں صرف اس کا والد باقی ہو تو از روئے شریعتِ مقدسہ مرحوم کا ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟

الجواب:۔ بشرط صحتِ سوال مرحوم کا تمام ترکہ بعد از ادائے ما وجب تقدیمہ علی الارث اس کے والد کو بطور عصوبت ملے گا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: اما الاب فله احوال ثلث ...... والتعصیب المحض وذٰلک عند عدم الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۶ باب معرفة الفروض)

وایضاً: والعصبة کل من یأخذ ما ابقته اصحاب الفرائض وعند الانفراد یحرز جمیع المال۔ (مقدمة السراجی ص۴) ؎۲

اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاتی بہن کی میراث سے محرومی

سوال:۔ ایک عورت نے مرنے کے بعد ایک اعیانی بھائی اور ایک علاتی بہن وارث چھوڑے جبکہ ان کے علاوہ ذوی الفروض اور عصبہ میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے، تو مرحومہ کا ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

الجواب:۔ صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر واقعی مرحومہ کے ورثاء میں ایک اعیانی بھائی اور ایک علاتی بہن کے علاوہ کوئی دوسرا قریبی عصبہ یا ذوی الفروض زندہ نہ ہو تو بعد از اداءِ حقوقِ مقدمہ علی الارث مرحوم کی تمام جائیداد کا مستحق اس کا اعیانی بھائی

؎۱ قال اللہ تبارک وتعالیٰ:۔ یُوصِیکُمُ اللّٰهُ فِی اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ۝ (سورۃ النساء آیت ۱۱)

؎۲ وفی الھندیة: فاقرب العصبات ...... ثم الاب، وھم ای العصبة کل من لیس له سھام مقدرة ویأخذ ما بقی من سھام ذوی الفروض واذا انفرد اخذ جمیع المال۔ (الفتاوی الھندیة ج۶ ص۴۵۱ الباب الثالث العصبات)

ہے اور اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاتی بہن کو کچھ نہیں ملتا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: ثم جزء ابیہ ای الاخوۃ۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات)

وایضاً، ویسقط بنوالعلات ایضا بالاخ لابٍ وامٍّ۔ (السراجی ص۱۱ باب معرفة الفروض)[1]

نافرمان بیٹے کا باپ کی میراث میں استحقاق

سوال:۔ ایک شخص اپنے باپ کا نافرمان ہونے کے ساتھ اُسے گالی گلوچ بھی دیتا ہے تو کیا یہ شخص باپ کے مرنے کے بعد میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے، لیکن یہ میراث سے محرومی کا سبب نہیں بن سکتا، کیونکہ ارث اضطراراً ورثاء کی طرف منتقل ہوتی ہے، اس لیے نافرمان بیٹا فرمانبردار بیٹے کی طرح میراث لے سکتا ہے۔

قال العلامة محمد علاؤالدین افندیؒ: الارث جبریٌ لا یسقط بالاسقاط۔
(تکملة رد المحتار ج۱ ص۳۵۹ مطلب واقعة الفتوٰی۔ کتاب الدعوٰی)

وراثت کے لیے محض رشتہ دار ہونا کافی نہیں

سوال:۔ ہمارے علاقے میں ایک عورت فوت ہوگئی ہے جس کے ورثاء میں کوئی بھی عصبہ، ذوی الفروض یا ذوی الارحام موجود نہیں صرف خاوند کے بھتیجے ہیں، تو کیا مرحومہ کی میراث میں سے اس کے خاوند کے بھتیجوں کو حصہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ کسی بھی عورت کے خاوند کے بھتیجے خاوند کے تو عصبہ ہیں لیکن اس کی بیوی سے اس کا کوئی خاص رشتہ نہیں جو سببِ ارث بن جائے صرف خاوند کی قرابت کی وجہ سے بیوی کی میراث میں ان کو حق نہیں دیا جاسکتا اور نہ یہ کسی حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں بلکہ ایسی حالت میں تو ان کے درمیان اجنبیت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کا آپس میں نکاح بھی جائز ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اس عورت کے شرعی ورثاء

---

[1] قال اللہ تعالیٰ: وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (سورة النساء ۱۷۶)

لما فی الحدیث: ان اعیان بنی الام یتوارثون دون بنی العلات۔
(السراجی ص۱۴ باب العصبات)

نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ترکہ بیت المال میں جائے گا۔

قال العلامۃ السید شریف الجرجانی ؒ: ثم بیت المال ای اذا لم یوجد احد من المذکورین توضع التركة فی بیت المال۔ (الشریفیۃ ص۱۱) لہ

نکاحِ فاسد سے پیدا ہونے والی اولاد کا وراثت سے محروم ہونا

سوال: ایک شخص نے زوجۂ غیر سے نکاح کیا اور اس نکاح سے اس کی اولاد بھی پیدا ہوئی، تو کیا یہ اولاد ماں کے اس دوسرے خاوند سے میراث لے سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: زوجۂ غیر کے ساتھ نکاح کرنا نکاحِ فاسد ہے اور نکاحِ فاسد کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہو وہ اگرچہ ثابت النسب ہوگی لیکن باپ کی میراث میں حقدار نہ ہوگی۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: ویثبت النسب واما الارث فلا یثبت۔

(الدر المختار علی هامش رد المحتار ج۲ ص۳۸۲ باب ثبوت النسب) لہ

رواجی قبضہ کا اعتبار نہیں

سوال: ایک شخص کے مرنے کے بعد جائز ورثاء میں دو بیوگان کے علاوہ اس کے بہن بھائی تھے لیکن انگریزی قانون (رواج) کے مطابق مرحوم کی دونوں بیویاں اس کی جائیداد پر قابض تھیں، اب اس کی ایک بیوی فوت ہو چکی ہے تو یہ ترکہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں صرف رواجی قبضہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے دونوں بیویاں سے مرحوم کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں وہ کل جائیداد کے صرف ۱/۴ حصہ کی حقدار ہوں گی جبکہ بقیہ جائیداد مرحوم کے ان ورثاء میں تقسیم ہوگی جو اسکی

لہ لما فی الهندیۃ: فیبدأ بالفروض النسبیۃ بقدر حقوقهم ثم ذوی الارحام ثم مولی الموالاۃ ...... ثم الموصی له بجمیع المال ثم بیت المال۔ (الفتاوی الهندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض الباب الاول)

لہ قال العلامۃ الرافعی رحمہ اللہ: وعبارۃ ابی سعود ولا توارث بین الزوجین فی الفاسد۔ (تقریرات ج۱ ص۱۹۷ باب ثبوت النسب)

موت کے وقت زندہ تھے۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما للزوجات فحالتان الربع للواحدۃ فصاعدۃ عند عدم الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۷ فصل فی اصحاب الفروض)[1]

مجرم کا پھانسی گھاٹ میں ہونا مرض الموت کے حکم میں نہیں

سوال:۔ اگر کوئی شخص قتل کے الزام میں قید خانہ میں محبوس ہو تو کیا اس کا اقرار اور جائیداد وغیرہ میں تصرفات مرض الموت کے حکم میں شمار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب:۔ جس شخص کو قتل کے الزام میں عدالت کی طرف سے سزائے موت (پھانسی) کا حکم ہو چکا ہو یا قتل کے جرم میں حوالات یا قید خانہ میں محبوس ہو، اُس کی یہ حالت مرض الموت کے مانند نہیں سمجھی جائے گی، اس کے تمام معاملات مثل صحت کے جاری ونافذ ہوں گے البتہ جس وقت قید سے نکال کر مقتل (پھانسی دیئے جانے کی جگہ) کی طرف روانہ کر دیا جائے تو قید خانہ سے نکالنے کے بعد پھانسی ہونے تک جتنی دیر لگے گی وہ مرض الموت کے مانند ہوگی، اس حالت میں اگر اس نے کوئی تصرف مثلاً اقرار وغیرہ کیا ہو تو وہ مرض الموت کے تصرفات کی طرح ناقابل قبول ہے۔ اور اگر اس روز پھانسی کی سزا کسی وجہ سے ملتوی ہو جائے یا اس کا حکم بالکل منسوخ ہو جائے تو قید خانہ سے نکل کر پھانسی گھاٹ تک آنے کی حالت مرض الموت کے مانند نہ رہے گی یعنی مثل صحت کے سمجھی جائے گی اور اس حالت میں جو تصرفات کئے تھے وہ جاری اور درست سمجھے جائیں گے۔

قال العلامۃ عالم بن العلاء الانصاریؒ: ولو کان محصورًا او محبوسًا فی حد او قصاص او واقفًا فی صف القتال فھو فی حکم الصحیح ــ وقد ذکر محمدؒ فی الاصل مسائل تدل علی ان الشرط خوف الھلاک علی طریق الغلبۃ لا کونہ صاحب فراش فانہ قال: اذا اخرج الرجل للقصاص او الرجم فھو فی حکم المریض۔ (الفتاوی التاتارخانیۃ ج۳ ص۵۸۰ کتاب الطلاق، باب طلاق المریض)[2]

---

[1] لقولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ۔ (سورۃ النساء:۱۲)

[2] وفی الھندیۃ: ولو اعید المخرج للقتل الی الحبس او رجع المبارز بعد المبارزۃ الی الصف صار فی حکم الصحیح کالمریض اذا برا من مرضہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۱ ص۴۶۳ الباب الخامس فی طلاق المریض)

طویل بیماری مرض الموت شمار ہوگی

سوال:۔ از روئے شرع مرض الموت کے تصرفات محدود ہیں جس میں بسا اوقات میت کے تصرفات موقوف سمجھے جاتے ہیں لیکن بعض بیماریاں سالوں تک ممتد رہتی ہیں کیا ایسی ممتد بیماری کو مرض الموت کہا جائے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ مرض الموت میں یہ ضروری نہیں کہ یہ چند دنوں تک محدود ہو بلکہ کبھی مرض الموت کی مدت طویل بھی ہو سکتی ہے، تاہم جو بیماری عمومی حیثیت اختیار کر جائے جیسا کہ آجکل ثوران الدم (بلڈ پریشر) ذیابیطس (شوگر) یا امراض قلب میں مبتلا ہونے مرض الموت میں شمار کرنا مشکل ہے، کیونکہ یہ بیماریاں اگرچہ فوری طور پر موت کا سبب بن سکتی ہیں لیکن مدتوں تک محیط ہونے سے بھی خالی نہیں ۔

قال العلامة ابن البزاز رحمه الله : ولو طال المرض وصد بحال لا يخاف عليه الموت كالفالج او صار مدنقًا او يابس الشق لا يكون حكم المرض الا اذا تغير حاله عن ذلك ومات من ذلك التغير فما فعل فى حال التغيير فمن الثلث۔
(الفتاوى البزازية على هامش الهندية ج ۶ ص ۴۳۴ كتاب الوصايا)[1]

شرعی بیت المال نہ ہونے کی صورت میں میراث کا حکم

سوال:۔ اگر کسی میت کے اقسام ثلاثہ (ذوی الفروض، عصبات، ذوی الارحام) ورثاء میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو اور شرعی بیت المال بھی نہ ہو تو اس کے ترکہ کا کیا کیا جائے گا، شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب مطلوب ہے ؟

الجواب:۔ جب شرعی بیت المال موجود نہ ہو تو مسئولہ صورت کے مطابق میراث

---

[1] قال العلامة ابن نجيمؒ : والمقعد والمفلوج والاشل والمسلول ان تطاول ذلك ولم يخف منه الموت فهبته من كل المال لانه اذا تقادم العهد صار من طبعه كالعمى والعرج وهذا لان المانع من التصرف فى مرض الموت ومرض الموت لا يكون سببًا للموت غالبًا وانما يكون سببًا للموت اذا كان بحيث يزداد حالاً فحالاً الى ان يكون آخره الموت ۔ (البحر الرائق ج ۸ ص ۴۲۸ قبيل باب العتق فى المرض والوصية بالعتق)

کو ایک امین (امانت دار شخص) کے ہاتھ میں دے دیا جائے تاکہ وہ ایسے فقراء جن کا کوئی سرپرست وغیرہ نہ ہو پر اس طرح خرچ کرے کہ ان فقراء کا نفقہ، تداوی، کفن دفن وغیرہ اس ترکہ سے پورا کرے۔

قال العلامۃ ابن عابدین رحمہ اللہ : واما الرابع ای الضوائع مثل مالا یکون لہ اناثا وارثونا) فمصرفہ المشہور ھو اللقیط الفقیر والفقراء الذین لا اولیاء لھم فیعطی منہ نفقتھم وادویتھم وکفنھم وعقل جنایتھم۔ (ردالمحتار ج۲ ص۵۸ مطلب فی بیان بیوت المال ومصارفھا، قبل باب المصرف)

حینِ حیات میں جائیداد کی تقسیم کا شرعی طریقہ

سوال:۔ ایک شخص کی ایک بیوی، دو بیٹے، تین بیٹیاں، ایک پوتی اور دو پوتے ہیں جن کا والد فوت ہو چکا ہے، اب یہ شخص زندگی میں ہی اپنی جائیداد ان میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں اس کی صورت کس طرح ہونی چاہیئے؟ کیا پوتوں اور پوتیوں کو بیٹوں اور بیٹیوں کے برابر حصہ دیا جائے گا؟ اور اگر کوئی ان کو محروم رکھے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب:۔ زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد کی تقسیم درحقیقت ہبہ ہے جس میں مالک کو کلی اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح چاہے تقسیم کرے اور اولاد کا اس پر باقاعدہ قبضہ کر لینے کے بعد وہی تقسیم نافذ رہے گی تاہم کسی وارث کو بلا وجہ میراث سے محروم کرنا سراسر زیادتی ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ زندگی میں ہی اولاد میں جائیداد تقسیم کرنے والے کو ایسا طریقہ اپنانا چاہیئے کہ اگر اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد ورثاء میں تقسیم کرنے کی نوبت آئے تو اسی طرح تقسیم ہوتی۔ لہٰذا مسئولہ صورت میں بھی اس شخص کو چاہیئے کہ وہ کل جائیداد کے ۵۶ حصے کر کے ثمن کل جائیداد کا (۷/۵۶) بیوی کو اور ہر ایک بیٹے کو ۱۴/۵۶، ۵۶/۱۴ حصہ اور بیٹی کو ۷/۵۶ حصے کے حساب سے تقسیم کرے، اور جہاں تک پوتوں اور پوتیوں کا تعلق ہے تو بہتر یہ ہے کہ دادا اپنی زندگی میں ہی ان کو کچھ دے دے تاکہ اس کے مرنے کے بعد قانونی تنازعات پیدا نہ ہو جائیں لیکن اگر دادا پوتوں اور پوتیوں کو کچھ نہ دینا چاہے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔

قال العلامة ابن البزاز رحمه الله: الا فضل فی هبة الابن والبنت التثلیث کالمیراث۔ (الفتاوی البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج ۶ ص ۲۳۷ کتاب الهبة۔ الجنس الثالث)

نقشہ ملاحظہ ہو:۔

مسئلہ ۵۶

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی	بیٹی
۷	۱۴	۱۴	۷	۷	۷

بذریعہ اعلانِ عاق نامہ بیٹے کو میراث سے محروم کرنا

سوال:۔ اگر کوئی شخص اپنے بیٹے سے ناراض ہو اور اسی ناراضگی کی وجہ سے اخبار وغیرہ میں بذریعہ اشتہار اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے اُسے عاق کرنے کا اعلان کردے، تو کیا باپ کی وفات کے بعد عاق شدہ بیٹا میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ وراثت ایک اضطراری حق ہے کوئی شخص اپنی طرف سے اس حق کو زائل یا ختم نہیں کرسکتا، اس لیے باپ کے مرنے کے بعد عاق شدہ بیٹا بھی میراث کا حقدار ہے، تاہم اگر یہ شخص اپنی زندگی ہی میں اپنی جملہ جائیداد اور منقولہ سرمایہ اپنے ورثاء میں تقسیم کردے اور ان کو باضابطہ مالک بنادے تو اس صورت میں باپ کے مرنے کے بعد عاق شدہ بیٹا حقِ ارث کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

قال العلامة محمد علاؤ الدین آفندیؒ: الارث جبریٌ لایسقط بالاسقاط۔ (تکملة ردّ المحتار ج ۱ ص ۳۵۹ مطلب واقعة الفتوی۔ کتاب الدعوی)[۱]

---

[۱] وذکر الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ: عن ابراهیم عن الاسود عن عائشةؓ قالت اشتریت بریرةؓ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اشتریها فان الولاء لمن اعتق۔ (الجامع الصحیح البخاری ج ۲ ص ۹۹۹ کتاب الفرائض باب الولاء لمن اعتق الخ)

ومثله فی امداد الفتاوی ج ۴ ص ۳۶۴ کتاب الفرائض۔

کفار کے ہاں قید شخص کی میراث کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرا ایک بھائی کشمیر میں جہاد کے دوران انڈین فوج کے ہاتھوں قید ہوگیا ہے، اب دوسرے بھائی والد صاحب کے ترکہ کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو کیا قیدی بھائی کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ اس کی رہائی کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔

الجواب:۔ جب کوئی مسلمان کفار کے ہاتھوں قید ہو جائے تو وہ تاوقت موت یا ارتداد عام مسلمانوں کی طرح میراث کا حقدار ہے، لہٰذا آپ کا وہ بھائی جو دشمن کی قید میں ہے باپ کی میراث میں برابر کا حقدار ہے اس کی رہائی یا موت کی مصدقہ اطلاع تک اس کا حصہ محفوظ رکھا جائے۔

قال السید شریف الجرجانیؒ: حکم الاسیر کحکم سائر المسلمین فی المیراث مالم یفارق دینہ فیرث ویورث منہ لان المسلم من اھل دار الاسلام اینما کان۔ (الشریفیۃ ص۱۴۲ فصل فی الاسیر) [1]

شیعہ سنی کے مابین میراث کا حکم

سوال:۔ کیا کوئی شیعہ کسی سنی کے مال میں شرعاً میراث کا حقدار بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیعہ (روافض) کے مختلف گروہ ہیں جو شیعہ کفریہ عقائد مثلاً الوہیتِ حضرت علیؓ اور قذفِ سیدہ حضرت عائشہؓ وغیرہ کے قائل ہوں تو اختلافِ دین کی وجہ سے شیعہ سنی کا وارث نہیں ہو سکتا البتہ جو شیعہ غالی نہ ہوں تو صرف بدعت مانع ارث نہیں۔

قال العلامۃ السجاوندی رحمہ اللہ: والمانع من الارث الاربعۃ......

---

[1] وفی الھندیۃ: وحکم الاسیر کحکم سائر المسلمین فی المیراث مالم یفارق دینہ فان فارق دینہ فحکمہ حکم المرتد فان لم یعلم ردتہ ولا حیاتہ ولا موتہ فحکمہ حکم المفقود۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۷ الباب الثامن فی المفقود والاسیر الخ)

وَمثلہٗ فی السراجی ص۷۵ فصل فی الاسیر۔

والقتل الذی یتعلق بہ وجوب القصاص او الکفارۃ..... واختلاف الدینین ای اسلاماً وکفراً۔ (السراجی ص۵ فصل فی الموانع) [1]

مُرتد کسی مسلمان کی میراث کا حقدار نہیں

سوال:- میرا بھائی امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا وہاں وہ عیسائی بن گیا، تو کیا والد صاحب کی وفات کے بعد اس کو میراث میں حصہ دیا جائے گا یا نہیں؟ جبکہ وہ اپنے حصۂ میراث کا مطالبہ کرتا ہے۔

الجواب:- ارتداد مانع ارث ہے۔ اسی بناء پر مُرتد ہونے کی وجہ سے آپ کا بھائی بھی باپ کے مالِ وراثت کا حقدار نہیں رہا۔

قال العلامۃ سید شریف جرجانیؒ: واما المرتد فلا یرث من احد لا من مسلم ولا من مرتد مثلہ لانہٗ جانٍ بارتدادہ فلا یستحق الصلۃ الشرعیۃ التی ھی الارث بل یحرم عقوبۃ ما لقاتل بغیر حق۔ (الشریفیۃ ص۱۴۱ فصل فی المرتد) [2]

مرتدہ عورت کے ترکہ کا حکم

سوال:- ایک مسلمان عورت روس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئی تو وہاں وہ اسلام کو چھوڑ کر مُرتد ہو گئی، اور اب اس کا انتقال ہو گیا ہے تو شرعاً کون اس کے ترکہ کا حقدار ہے؟

الجواب:- ارتداد اگرچہ مانع ارث ہے مگر عورت اس سے مُستثنیٰ ہے، اس لیے صورتِ مسئولہ میں اس مرتدہ عورت کی موت کے بعد اس کا ترکہ اُس کے ورثاء میں

---

[1] قال العلامۃ الحصکفیؒ: اختلاف الملتین اسلاماً وکفراً۔ قال السید احمد الطحطاویؒ: ای من جھۃ الاسلام والکفر اما اختلافھما من جھۃ الیھودیۃ والنصرانیۃ فلا یکون مانعاً وھذا التقیید لا بد منہ ...... واما عدم توریث الکافر من المسلم فبالاجماع۔
(طحطاوی حاشیۃ الدر المختار ج۴ ص۳۷۸ کتاب الفرائض)
ومثلہٗ فی امداد الفتاویٰ ج۴ ص۳۵۵ کتاب الفرائض۔

[2] وفی الھندیۃ: المرتد لا یرث من مسلم ولا من مرتد مثلہ۔
(الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۵ الباب السادس فی میراث اھل الکفر)
ومثلہٗ فی السراجی ص۲۷ فصل فی المرتد۔

بطریقۂ شرعی تقسیم ہوگا۔

قال العلامۃ السید شریف الجرجانیؒ: وکسب المرتدۃ جمیعًا ای سواء اکتسبتہ فی اسلامہا اوفی ردّتہا قبل اللحوق بدارالحرب لورثتہا المسلمین بلاخلاف بین اصحابنا۔ (الشریفیۃ ص۱۲۰ فصل فی المرتد) لہ

ہیجڑے کی میراث کی حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ایک ہیجڑا جس کے داڑھی بھی ہے اگر اُس کا باپ، ماں یا کوئی اور رشتہ دار مرجائے تو میراث میں اس کا کتنا حصہ ہوگا؟

الجواب:۔ اگر ہیجڑے پر مردوں کے آثار موجود ہوں تو اُسے مردوں جتنا حصہ ملے گا اور اگر عورتوں کے آثار زیادہ ہوں تو عورتوں جتنے حصے کا حقدار ہوگا، چونکہ صورتِ مسئولہ میں اس ہیجڑے کی داڑھی آچکی ہے جو کہ مردوں کی علامت ہے اس لیے اس کا حصۂ میراث مردوں جتنا ہوگا۔

قال العلامۃ السید شریف الجرجانیؒ: فلابد ان یزول الاشکال بظہور العلامۃ لانہ ان جامع بذکرہ اونبتت لہ لحیتہ اواحتلم کاحتلام الرّجل فہو رجلٌ۔
(الشریفیۃ ص۱۲۵ فصل فی الخنثیٰ) ۲ہ

مرنے والے کا قرضہ نکل آنے پر تقسیمِ ترکہ کالعدم ہوجاتی ہے

سوال:۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا بیٹا طاہر جمال تقریبًا ۱۳ سال ملائشیا میں رہا، جب وہ گاؤں واپس آیا

لہ وفی الہندیۃ: والمرتدۃ اذا ماتت قسم مالہا بین ورثتہا علیٰ فرائض اللہ تعالیٰ سواء کان کسب الاسلام اوکسب الردۃ کلا الکسبین یصیر میراثًا عنہا۔
(الفتاویٰ الہندیۃ ج۶ ص۴۵۵ الباب السادس فی میراث اہل الکفر)
ومِثْلُہٗ فی السراجی ص۷۵ فصل فی المرتد۔

۲ہ وفی الہندیۃ: فاذابلغ الخنثیٰ وخرجت لحیتہ اووصل الی النساء فہو رجلٌ۔ (الفتاویٰ الہندیۃ ج۶ ص۴۵۷ الباب التاسع فی میراث الخنثیٰ)
ومِثْلُہٗ فی السراجی ص۶۵ فصل فی الخنثیٰ۔

تو یہاں ہم نے قرضہ لے کر اس کی شادی کی، کچھ عرصہ بعد وہ سخت بیمار ہوگیا تو اس کا علاج بھی قرضہ لے کر کرایا اور اسی بیماری میں اس کا انتقال ہوگیا، بعد از وفات بینک میں اس کے ۱۴ لاکھ روپے موجود تھے جو کہ بذریعہ عدالت ورثاء میں تقسیم کئے گئے، اس کے بعد اس کے ذمے کافی قرضہ نکل آیا۔ تو کیا اس قرضہ کی ادائیگی کے لیے ورثاء سے رجوع کیا جاسکتا ہے یا نہیں یا اس قرضہ کو ادا کرنے کا میں ہی ذمہ دار ہوں؟

الجواب:۔ کسی کی وفات کے بعد اس کے جملہ مال سے اولاً چار حقوق منہا کئے جائیں گے اور پھر بقیہ مال ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔

وفی الهندیة : الترکة تتعلق بها حقوق اربعة جهاز المیت ودفنه والدّین والوصیة والمیراث فیبداء اولاً بجهازه وکفنه ومایحتاج الیه فی دفنه بالمعروف ۔ (الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض)

قال الشیخ السید شریف الجرجانیؒ : ثم تقضی دیونه من جمیع مابقی من ماله ای یبدأ بقضاء دینه من جمیع ماله الباقی بعد التجهیز والتکفین وهذا هوالثانی فی الاربعة ۔ (الشریفیة ص۵ کتاب الفرائض)

اور اگر لاعلمی یا دھوکہ دہی کی وجہ سے مرنے والے کا جملہ ترکہ اس کے ورثاء میں تقسیم ہو جائے تو یہ تقسیم صحیح نہیں بلکہ از سر نو قرضہ وغیرہ منہا کر کے بقیہ میراث کو ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔

کما فی مجلة الاحکام : اذا ظهر دَین علی المیت بعد قسمة الترکة تنسخ القسمة.

قال العلامة سلیم رستم بازؒ : تحت مادة سواءکان الدّین محیطاً بالترکة اولا اما الاوّل فظاهر لانه یمنع الملك فیمنع التصرف واما الثانی فتعلق حق الغرباء بالترکة شائعاً ولان القسمة مؤخرة عن قضاء الدین لحق المیّت ۔

(شرح المجلة ص۶۴۱ الفصل السابع فی فسخ القسمة واقالتها)

لہٰذا بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں بھی مرحوم بیٹے کے ذمہ قرض کی ادائیگی اس کے باپ کے ذمے نہیں بلکہ تقسیم وراثت کالعدم متصوّر ہو کر جملہ ترکہ سے قرضہ منہا کیا جائے گا اور بقیہ مال ورثاء میں تقسیم ہوگا، اس لیے مرحوم کے باپ کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ دیگر ورثاء دَین (قرض) کی ادائیگی کرے چاہے ورثاء میں اس کی بیوہ ہو یا ماں باپ ہوں۔

رضاعت موجب میراث رشتہ نہیں

سوال:۔ کیا رضاعی بیٹے کو باپ کی میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ مرحوم کے اس رضاعی بیٹے کے علاوہ چچازاد بھائی بھی ہیں؟

الجواب:۔ وراثت کے حقدار صرف نسبی بھائی ہیں لہٰذا مرحوم کی جملہ جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے چچازاد بھائیوں کو ملے گی، رضاعی بیٹے کا اس کی میراث سے کوئی واسطہ نہیں۔

قال العلامة سراج الدین السجاوندیؒ: ثم یقسم الباقی بین ورثته بالکتاب والسنة واجماع الامة فیبدأ باصحاب الفرائض هم الذین لهم سهام مقدرة فی کتاب الله تعالیٰ ثم بالعصبات من جهة النسب الخ۔ (السراجی ص۴ کتاب الفرائض) [1]

متبنیٰ کو میراث دینے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، محلے کے ایک دوست نے اُسے اپنا بیٹا دیدیا، اس شخص نے بحیثیت باپ اس بچے کی پرورش کی، تو کیا اس شخص کی وفات کے بعد یہ لڑکا اس کی میراث کا مالک متصور ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ چونکہ یہ لڑکا مرحوم کا حقیقی نہیں بلکہ منہ بولا بیٹا ہے اور کسی کو متبنیٰ بنانا کوئی سببِ میراث رشتہ نہیں جس کی وجہ سے کوئی کسی کا وارث بن جائے، اس لیے مرحوم کا مال اس کے دیگر رشتہ داروں میں تقسیم ہوگا اور لڑکے کو بطور حقِ وراثت کچھ نہیں ملے گا البتہ اگر مرحوم نے اپنی زندگی میں تملیکاً اس کو کچھ دیا ہو تو وہ اس کا مالک ہے اور مرحوم کا کوئی رشتہ دار اس میں وراثت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

قال العلامة سراج الدین السجاوندیؒ: العصبات النسبیة...... وهم اربعة اصناف جزء المیت واصله وجزء ابیه وجزء جده۔ (السراجی ص۱۸،۱۹ باب العصبات) [2]

---

[1] قال العلامة عبدالله بن المودود الموصلیؒ: ویستحق الارث برحم ونکاح وولاء۔
(الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)
ومِثلُهٗ فی الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔ الباب الاول۔

[2] قال العلامة الموصلیؒ: ویستحق الارث برحم ونکاح وولاء۔
(الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)
ومِثلُهٗ فی الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔ الباب الاول۔

سوتیلا باپ میراث سے محروم ہے

سوال:۔ ایک آدمی کا انتقال ہو گیا ہے اس کے ورثاء میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور ایک سوتیلا باپ موجود ہیں، مرحوم کی میراث ان میں کس طرح تقسیم ہو گی؟

الجواب:۔ حقوقِ متقدمہ کی ادائیگی کے بعد باقیماندہ مال مرحوم کی بیوہ اور دو بیٹوں میں تقسیم ہو گا جبکہ سوتیلا باپ حقِ میراث سے محروم ہو گا اس لیے کہ دونوں کے درمیان موجبِ ارث کوئی رشتہ داری نہیں۔

۱۶ = ۲ × ۸

بیٹا	بیٹا	بیوہ
۷/۱۶	۷/۱۶	۲/۱۶

قال العلامۃ السجاوندیؒ: العصبات النسبیۃ...... وھم اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (السراجی ص۱۹ باب العصبات)[1]

سوتیلے بیٹے کی میراث کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے کسی بیوہ عورت سے شادی کی جبکہ بوقتِ نکاح اس عورت کا مرحوم شوہر سے ایک بیٹا بھی تھا جس نے اس آدمی کے گھر میں پرورش پائی اور وہ بھی اس کو اپنا بیٹا سمجھتا رہا، اب یہ آدمی فوت ہو گیا ہے تو کیا یہ لڑکا اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ میراث میں شریک ہو گا یا نہیں، یاد رہے کہ اس لڑکے کے یہ بھائی اس کی ماں (یعنی اس عورت کے دوسرے شوہر) سے ہیں؟

الجواب:۔ چونکہ مرحوم اور اس کے سوتیلے بیٹے کے درمیان کوئی موجبِ میراث رشتہ نہیں اسلئے مرحوم کا ترکہ اس کے حقیقی بیٹوں کا ہے اور یہ لڑکا میراث سے محروم رہے گا۔

قال العلامۃ الموصلیؒ: ویستحق الارث برحم ونکاح وولاء۔
(الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)[2]

---

[1] قال العلامۃ الموصلیؒ: ویستحق الارث برحم ونکاح وولاء...... ثم اصلہ وھو الاب والجد ثم جزء ابیہ ثم بنوھم الخ۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض)
ومثلہ فی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاول۔

[2] وفی الھندیۃ: ویستحق الارث باحدی خصال ثلاث بالنسب وھو القرابۃ والسبب وھو الزوجیۃ والولاء۔ (الفتاوی الھندیہ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاول)

دو بیویوں کی اولاد میں میراث کی تقسیم کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی سے میرے علاوہ میری دو بہنیں بھی ہیں، اور دوسری بیوی سے تین بیٹے ہیں جبکہ میری والدہ کا والد صاحب سے پہلے انتقال ہو گیا ہے، تو کیا والد صاحب کا ترکہ ان کی سب اولاد میں برابر تقسیم ہو گا یا ہم حقیقی بہن بھائی کو کم اور دوسروں کو زیادہ ملے گا؟

الجواب:- میراث کی تقسیم میت کے ساتھ رشتے کی بناء پر ہوتی ہے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحوم کے ساتھ اس کی دونوں بیویوں کی اولاد کا حق برابر ہے اس لیے آپ سب میں حصۂ شرعی کے مطابق میراث تقسیم ہو گی، یعنی ماں کے حصے کے علاوہ مال کے دو حصے ایک بھائی اور دو بہنوں کو ملیں گے اور تین حصے دوسرے تین بھائیوں کو ملیں گے۔

۸ × ۱۰ = ۸۰

بیوہ	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی
۸۰/۱۰	۸۰/۱۴	۸۰/۱۴	۸۰/۱۴	۸۰/۱۴	۸۰/۷	۸۰/۷

قال العلامۃ السجاوندیؒ: العصبات النسبیۃ وھم اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجدّہ الاقرب فالاقرب یرجحون بقرب الدرجۃ اولھم بالمیراث جزء المیّت ای البنون۔ (السراجی ص۱۹ باب العصبات)[1]

مہر میں شوہر کا حصۂ ارث

سوال:- ایک عورت کو شادی کے بعد کسی وجہ سے اس کے انتقال تک اس کا حق مہر نہیں ملا جبکہ اس عورت کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے صرف ایک باپ، دو بھائی اور شوہر زندہ ہیں، تو اب مہر کس کا حق ہے؟

الجواب:- حقِ مہر بھی مرحومہ کے ترکہ میں شامل ہے اس لیے مرحومہ کے دیگر اموال

---

[1] قال العلامۃ المُوصلی رحمہ اللہ: غصبۃ بنفسہ وھو کل ذکر لا یدخل فی نسبتہ الی المیت انثیٰ واقربھم جزء المیت وھو بنوہ۔
(الاختیار لتعلیل المختار ج ۵ ص۹۲ فصل فی العصبات)
وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۶ ص۴۵ الباب الثالث فی العصبات۔

کی طرح اس کے مہر کی رقم بھی شوہر اور باپ کے درمیان تقسیم ہوگی یعنی آدھا مہر شوہر کو اور آدھا باپ کو ملے گا بھائی محروم ہوں گے ۔

قال العلامة السجاوندیؒ : اما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والربع مع الولد الخ ۔ (السراجی ص۹ باب معرفة الفروض الخ) [1]

کسی وارث کو وراثت سے محروم کرنا

سوال :۔ کیا کسی وارث کو حقِ وراثت سے محروم کرنا جائز ہے ، اگر نہیں تو محروم کرنے والے کا فیصلہ نافذ ہوگا یا نہیں ؟

الجواب :۔ کسی وارث کو حقِ وراثت سے محروم کرنا جائز نہیں ، ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا تاہم جو فیصلہ وہ کر چکا ہے (یعنی اپنی زندگی میں اپنے جملہ اموالِ منقولہ وغیر منقولہ کو دیگر ورثاء میں تقسیم کر دے) نافذ ہوگا اور اس کی موت کے بعد محروم ہونے والا وارث حقِ میراث کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاریؒ : ولو وهب جمیع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو آثم نص عن محمد هکذا فی العیون ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۰۰ کتاب الهبة قبیل الفصل الثانی) [2]

بیٹیوں کو میراث سے محروم کرنا گناہ ہے

سوال :۔ بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ باپ کے ترکہ میں بیٹیوں کو حصہ نہیں دیا جاتا ، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے ؟

---

[1] قال العلامة الموصلیؒ : ثم تقضی دیونه ..... والربع فی فرضها وفرض الزوج والنصف فی فرض الزوج ۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۵،۹۲ کتاب الفرائض)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض ، الباب الاوّل ۔

[2] قال العلامة قاضی خان رحمه الله : رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع ۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ فصل فی الهبة الولد لولده)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۳۹۱ الباب السادس فی الهبة للصغیر ۔

الجواب:۔ باپ کے مرنے کے بعد جس طرح بیٹے اس کی میراث میں ارث کے حقدار ہیں اسی طرح بیٹیاں بھی ترکہ میں شرعاً حقدار ہیں اور یہ حق ان کو اسلام نے دیا ہے اس لیے انہیں اس شرعی حق سے محروم کرنا ناجائز و حرام ہے۔

قال العلامة طاھر بن عبد الرشید البخاریؒ: ولو وھب جمیع مالہ لابنہ جاز فی القضاء وھو اٰثم نص عن محمد ھٰکذا فی العیون۔ (خلاصۃ الفتاوی ج۴ ص۴۰۰ کتاب الھبۃ قبل الفصل الاول) [1]

ولد الزنا اور ولد الملاعنۃ کی میراث کا حکم

سوال:۔ جس بچے کے نسب کی باپ لعان کے ذریعے نفی کر دے اور پھر میاں بیوی کے مابین رشتہ ازدواج بھی ختم ہو جائے، اب سوال یہ ہے کہ جب یہ بچہ مر جائے تو اس کی میراث باپ کو ملے گی یا ماں اور اس کے رشتہ داروں میں تقسیم ہوگی؟

الجواب:۔ جس بچے کا نسب بذریعہ لعان باپ سے منقطع ہو جائے تو وہ ولد الزنا کی طرح ہے، اب چونکہ اس کا رشتہ نسب صرف ماں سے ثابت ہے اس لیے اس کی میراث بھی ماں اور اس کے رشتہ دار لیں گے اور باپ حق میراث سے محروم رہے گا۔

قال العلامۃ الموصلیؒ: وعصبۃ ولد الزنا وولد الملاعنۃ موالی امھما لانہ لااب لہ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم الحق ولد الملاعنۃ بامہ فصار کشخص لاقرابۃ لہ من جھۃ الاب فیرثہ قرابۃ امہ ویرثھم۔ (الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۹۴ فصل فی العصبات) [2]

---

[1] قال العلامۃ قاضی خان رحمہ اللہ: رجل وھب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون اٰثما فیما صنع۔ (فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ ج۳ ص۲۷۹ فصل فی ھبۃ الوالد لولدہ)

ومثلہٗ فی الھندیۃ ج۵ ص۳۹۱ الباب السادس فی الھبۃ الصغیر۔

[2] قال العلامۃ الحصکفیؒ: وعصبۃ ولد الزنا وولد الملاعنۃ مولی الام..... وھی ان ولد الزنا یرثہ من امہ میراث اخ لام...... وولد الملاعنۃ یرث من توأمہ میراث اخ لابوین۔ (الدر المختار علی ھامش رد المحتار ج۵ ص۴۹۵ کتاب الفرائض)

ومثلہٗ فی امداد الفتاوی ج۴ ص۳۴۰ کتاب الفرائض۔

دور رشتہ والے کی میراث کا حکم

سوال:۔ ایک آدمی فوت ہوگیا ہے اور اس کے ورثاء میں ایک بیوہ مسماۃ گل بیلنہ، دوسرا وارث مسمی جمعہ گل جوکہ باپ کے رشتے سے چچازاد بھائی اور ماں کے رشتہ سے سوتیلا بھائی ہے دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ مسمی جمعہ گل کو مرحوم کی میراث میں کتنا حصہ ملے گا؟

الجواب:۔ مرحوم کے ترکہ میں مسمی جمعہ گل کو دو حصے ملیں گے، ایک اخیافی بھائی ہونے کے ناطے سے اور دوسرا عصوبت کی وجہ سے، اس لیے تقسیم میراث میں مرحوم کی بیوہ کو ۱/۴ حصہ ملے گا اور باقی مال جمعہ گل کا ہوگا بشرطیکہ کوئی اور وارث نہ ہو۔

	۴
بیوہ	جمعہ گل
۱/۴	۳/۴

پنشن کی رقم میں میراث کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! یہاں ایک آدمی کا انتقال ہوگیا ہے جوکہ فوج میں ملازم تھا اس نے اپنی پنشن بیوی کے نام پر اس عنوان سے کی تھی کہ میری وفات کے بعد میری پنشن میری بیوہ کو دی جائے، اب اس کی وفات کے بعد اس کے دوسرے ورثاء پنشن میں وراثت کا دعویٰ کرتے ہیں، تو کیا مرحوم کی بیوہ کے علاوہ دیگر ورثاء کا بھی پنشن میں حصہ بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ پنشن کا وظیفہ مال مملوکہ نہیں بلکہ سرکار کی طرف سے ایک عطیہ ہوتا ہے بناء برایں وجہ یہ وظیفہ تقسیم میراث سے مستثنیٰ ہوگا، سرکار جس کو چاہے اور جتنا چاہے دے سکتی ہے، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحوم کے کاغذات اس کی بیوہ کے نام ہیں اور سرکار بھی اس پر راضی ہے اس لیے یہ پنشن صرف بیوہ کا حق ہے۔

لما قال الشیخ اشرف علی التھانویؒ: چونکہ میراث مملوکہ اموال میں جاری ہوتی ہے اور یہ وظیفہ محض تبرع و احسان سرکار کا ہے بدون قبضہ کے مملوک نہیں ہوتا لہٰذا آئندہ جو وظیفہ ملے گا اس میں میراث جاری نہیں ہوگی، سرکار کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تقسیم کردے۔ الخ (امداد الفتاویٰ جلد۴ ص۳۴۲ کتاب الفرائض)

میت کی جملہ مملوکہ اشیاء میں ارث جاری ہونے کا حکم

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! کیا میراث صرف میت کی جائیداد میں جاری ہوگی یا گھر اور اس کے سازوسامان اور نقدی میں بھی جاری ہوگی؟

الجواب:۔ کسی کی ملکیت میں جو کچھ بھی ہو اس کے مرنے کے بعد وہ سب ترکہ شمار ہوگا، چاہے مرحوم کی جائیداد ہو یا نقدی، گھر ہو یا اس کا سازوسامان، ان سب اشیاء میں ارث جاری ہوگی اور ورثاء میں تقسیم ہوگی۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشیدؒ: قال علماءُنا رحمہم اللہ تتعلق بترکۃ المیت حقوق اربعۃ۔

قال المحشی تحت لفظ الترکۃ: والمراد من الترکۃ ما ترکہ المیت خالیًا عن تعلق حق الغیر بعینہ وان کان حق الغیر متعلقا بعینہ کالرھن والعبد الجانی والمشتری قبل القبض قال صاحبہ یقدم علی التجھیز کما فی حال حیاتہ الخ۔

(الشریفیۃ شرح السراجی ص۳ کتاب الفرائض)[1]

مفقود الخبر کے ترکہ کی تقسیم کا حکم

سوال:۔ اگر کوئی شخص کئی سالوں سے لاپتہ ہو اور ہر ممکن ذریعہ سے تلاش کے باوجود اس کا اتہ پتہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی جائیداد کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ اس کے ورثاء میں تقسیم کی جائے گی یا نہیں؟

الجواب:۔ شریعتِ مقدسہ میں مفقود الخبر ۹۰ سال تک زندہ اور اپنی جائیداد کا مالک ہوتا ہے، اس لیے جب تک مفقود الخبر کی عمر ۹۰ سال نہ ہو جائے اور مسلمان حاکم اس کی موت کا فیصلہ نہ کر دے اُس وقت تک اس کی جائیداد کو تقسیم نہیں کیا جائے گا، جب مسلمان حاکم یا قاضی کی طرف سے اس کی موت کی تصدیق و فیصلہ ہو جائے تو اُس وقت موجود ورثاء میں اس کی جملہ جائیداد بطور میراث تقسیم ہوگی اور فوت شدہ ورثاء

---

[1] قال العلامۃ الزیلعیؒ: والمراد من الترکۃ ما ترکہ المیت خالیا عن تعلق حق الغیر بعینہ الخ۔ (تبیین الحقائق ج۶ ص۲۲۹ کتاب الفرائض)

وَمِثْلُہٗ فی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض۔

محروم ہوں گے۔

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشیدؒ: المفقود حیٌّ فی مالہ حتیٰ لایرث منہ احدٌ ومیتٌ فی مال غیرہ حتیٰ لا ترث من احد ویوقف مالہ حتیٰ یصح موتہ او تمضی علیہ مدۃ۔ واختلف الروایات فی تلک المدۃ وبعد اسطر قال بعضھم تسعون سنۃ وعلیہ الفتویٰ الخ۔ (السراجی ص۵۶، ۵۷ فصل فی المفقود) [1]

عصبہ کی موجودگی میں ترکہ میں نواسیوں کے حصہ کا حکم

سوال:- ایک عورت فوت ہوگئی ہے اس کے ورثاء میں دو نواسیاں (بیٹی کی بیٹیاں)، دو بھائی اور شوہر زندہ ہیں، اب نواسیوں کو نانی کی میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ ان کی والدہ نانی سے قبل ہی فوت ہوگئی ہے؟

الجواب:- نواسیوں کا شمار ذوالارحام میں ہوتا ہے، عصبہ کی عدم موجودگی میں ان کو نانا یا نانی کی میراث میں حصہ ملے گا، صورتِ مسئولہ میں چونکہ مرحومہ کے دو بھائی ہیں جو اس کے عصبہ میں سے ہیں اس لیے اس کا جملہ ترکہ اس کے شوہر اور بھائیوں میں بقدرِ حصۂ شرعی تقسیم ہوگا اور نواسیاں محروم ہوں گی۔

وفی الھندیۃ: وانما یرث ذوی الارحام اذا لم یکن احد من اصحاب الفرائض ممن یرد علیہ ولم یکن عصبۃ الخ۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ص۴۵۹ ج۶ الباب العاشر فی ذوی الارحام) [2]

---

[1] وفی الھندیۃ: قال مشائخنا رحمہم اللہ مدار مسئلۃ المفقود علیٰ حرف واحد ان المفقود یعتبر حیًا فی مالہ ومیتًا فی مال غیرہ حتیٰ ینقضی من یعلم انہ لایعیش الیٰ مثل تلک المدۃ الا تموت اقرانہ وبعد ذلک یعتبر میتا فی مالہ۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج۶ ص۴۵۶ الباب الثامن فی المفقود والاسیر)

[2] قال العلامۃ طاھر بن عبدالرشید البخاری رحمہ اللہ: ولا شئ لذوی الارحام مع العصبۃ او مع صاحب الفرائض الخ۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج۴ ص۲۱۹ جنس آخر فی ذوی الارحام واما الصنف الرابع الخ)

ومِثْلُہٗ فی السراجی باب ذوی الارحام ص۳۵

اعیانی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی کا میراث سے محروم ہونا

سوال:۔ یہاں ہمارے علاقہ میں ایک شخص فوت ہو گیا ہے جس کے ورثاء میں تین بیٹیاں، ایک اعیانی بہن اور بھائی، ایک علاتی بھائی زندہ ہیں، تو کیا اعیانی بہن بھائی کی موجودگی میں سوتیلے یعنی باپ شریک بھائی کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ اعیانی بہن بھائی کی موجودگی میں علاتی اور اخیافی بہن بھائی کی میراث سے محروم ہوں گے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحوم کا ترکہ اس کی تین بیٹیوں اور اعیانی بہن بھائی میں تقسیم ہوگا اور سوتیلا بھائی محروم ہوگا، نقشہ درج ذیل ہے:۔
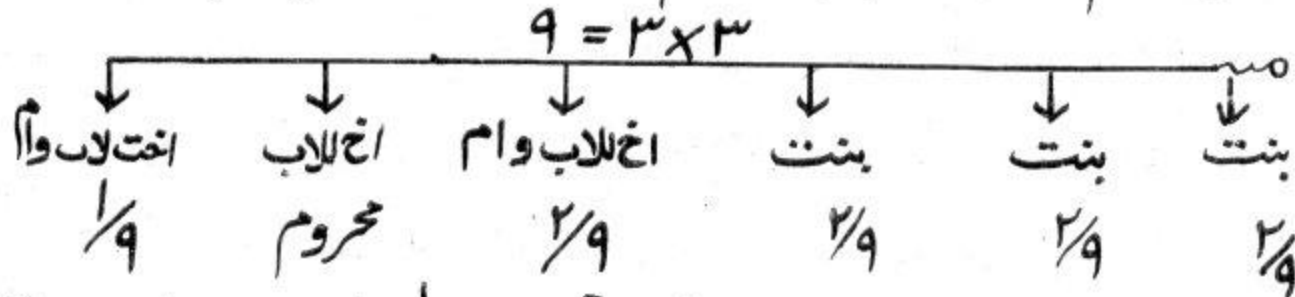
مسئلہ ۹ = ۳×۳

بنت	بنت	بنت	اخ للاب و ام	اخ للاب	اخت لاب وام
۲/۹	۲/۹	۲/۹	۲/۹	محروم	۱/۹

قال الشیخ سراج الدین محمد بن عبد الرشیدؒ: انّ ذی القرابتین اولیٰ من ذی قرابة واحدة ذکراً کان او انثیٰ لقوله علیه السلام ان اعیان بنی الامّ یتوارثون بنی العلات کالاخ لاب ام اذا صارت عصبة مع البنت اولیٰ من الاخ لاب الخ۔

(السراجی ص۱۴ باب العصبات)

میراث میں مطلقہ کے حصے کا حکم

سوال:۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی عدت گذر جانے کے بعد اس شخص کا انتقال ہو گیا اب اس کی مطلقہ بیوی حقِ میراث کا دعویٰ کرتی ہے، تو کیا اس کو سابقہ خاوند کے ترکہ سے حصہ ملے گا یا نہیں ؟

الجواب:۔ مطلقہ عورت عدت گذر جانے کے بعد خاوند کے لیے اجنبی بن جاتی ہے، اس لیے مطلقہ کو عدت گذر جانے کے بعد میراث میں حصہ نہیں ملے گا کیونکہ میت کے ورثاء کا حق ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مطلقہ کا دعویٰ ارث صحیح نہیں ہے۔

وفی الهندیة: ولو طلقها طلاقاً بائناً او ثلاثاً ثم مات وهی فی العدّة فکذلك عندنا ترث ولو انقضت عدتها ثم مات

لم ترث الخ۔ (الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۴۶۲ الباب الخامس فی طلاق المریض) لہ

بیوی کا کفن شوہر کے ذمہ ہے

سوال:۔ اگر کوئی عورت فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء میں شوہر، بھائی اور باپ زندہ ہے، تو کیا اُس عورت کا کفن اس کے مہر سے بنایا جائے گا یا اس کا جملہ خرچہ شوہر برداشت کرے گا؟

الجواب:۔ چونکہ کفن عورت کا لباس ہے اور لباس شرعاً شوہر کے ذمے واجب ہوتا ہے، لہٰذا جب عورت فوت ہو جائے تو اس کے کفن کا خرچہ شوہر برداشت کرے گا اس کے حق مہر سے منہا نہیں کیا جائے گا۔

قال العلامة الحصکفیؒ: واختلف فی الزوج والفتوٰی علیٰ وجوب کفنها علیه عند الثانی وان ترکت مالاً خانیة ورجحه فی البحر بانه الظاهر لانه ککسوتها۔ (الدر المختار علیٰ صدر رد المحتار ج ۱ ص۸۱۰ باب صلوٰۃ الجنائز) ۲؎

اپنا حصہ میراث کسی دوسرے حصہ دار پر فروخت کرنا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہمارے والد صاحب کا چند ماہ قبل انتقال ہو گیا ہے اور انہوں نے کافی جائیداد ترکہ میں چھوڑی ہے، میں ایک غریب آدمی ہوں کیا میں اپنا حصہ میراث اپنے بھائیوں میں سے کسی ایک بھائی پر فروخت کر سکتا ہوں یا نہیں؟ جبکہ میرے علاوہ دوسرے ورثاء ابھی جائیداد کو تقسیم نہیں کرنا چاہتے؟

الجواب:۔ آپ چونکہ اپنے والد صاحب کے فوت ہو جانے کے بعد ان کے ترکہ میں

لہ قال العلامة قاضی خان رحمه الله: وان ابانها بغیر سوالها ثم مات وهی فی العدة ورثته عندنا وان مات بعد انقضاء العدة لم ترث الخ۔

(فتاوٰی قاضیخان ج ۲ ص۲۷۲ کتاب الطلاق فصل فی المعتدة التی ترث)

وَمِثْلُهٗ فی شرح الوقایة ج ۲ ص۱۰۹ کتاب الطلاق، باب طلاق المریض۔

۲؎ وفی الهندیة: ومن لم یکن له مال فالکفن علیٰ من تجب علیه النفقة الا الزوج فی قوله محمدؒ وعلیٰ ابی یوسفؒ یجب الکفن علی الزوج وان ترکت مالا وعلیه الفتوٰی هکذا فی قاضی خان۔

(الفتاوٰی الهندیة ج ۱ ص۱۶۱ الفصل الثالث فی التکفین)۔ وَمِثْلُهٗ فی فتاوٰی قاضیخان علیٰ هامش الهندیة ج ۱ ص۱۸۹ فصل فی غسل المیت الخ

حصۂ شرعی کے حقدار ہیں اور وہ حصہ آپ کی ملکیت ہے اس لیے آپ کے لیے یہ جائز ہے کہ اپنے حصہ کی جائیداد تقسیم سے قبل یا بعد اپنے بھائیوں میں سے کسی ایک پر فروخت کردیں۔

لما قال العلامة المرغینانی رحمہ اللہ: ویجوز بیع احدھما نصیبہ من شریکہ وجمیع الصور ومن غیر شریکہ بغیر اذنہ۔

(الھدایة ج۲ ص۵۸۸ کتاب الشرکة)[1]

چار بیویوں کا خاوند کے ترکہ میں حصۂ شرعی

سوال:- ایک شخص کی چار بیویاں ہیں اور اس کی وفات کے بعد چاروں زندہ ہیں، تو کیا ہر ایک کو خاوند کے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا یا سب کا حصۂ شرعی آٹھواں ہے جو ان میں برابر تقسیم کیا جائے گا؟

الجواب:- اسلام نے اولاد کی موجودگی میں بیوی کے لیے آٹھواں حصہ مقرر کیا ہے، چاہے کسی کی ایک بیوی ہو یا زیادہ، اور اگر اولاد نہ ہو تو ۱/۴ حصہ اس کیلئے مقرر ہے اس لیے صورت مسئولہ میں مرحوم کی کل جائیداد کا ۱/۸ حصہ اس کی چاروں بیواؤں میں برابر تقسیم کیا جائے گا اور باقی ترکہ مرحوم کی اولاد اور دوسرے ورثاء کو دیا جائے گا۔

قال العلامة السجاوندیؒ: اما للزوجات فحالتان الربع للواحدة فصاعدًا عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والثمن مع الولد وولد الابن وان سفل۔ (السراجی ص۷/۸ باب معرفة الفروض)[2]

---

[1] قال العلامة ابن الھمام رحمہ اللہ: ان الشرکة اذا کانت بینھما من الابتداء بان اشتریا حنطة او ورثاھا کانت کل حبة مشترکة بینھما فلیبع کل منھما نصیبہ شائعًا جائز من الشریک والاجنبی۔

(فتح القدیر ج۶ ص۱۵۴ کتاب الشرکة)

[2] وفی الھندیة: وللزوجة الربع عند عدمھما والثمن مع احدھما والزوجات والواحدة یشترکن فی الربع والثمن وعلیہ الاجماع۔

(الفتاوی الھندیة ج۶ ص۴۵۰ الباب الثانی فی ذوی الفروض)

[3] ومثلہ فی الاختیار لتعلیل المختار ج۵ ص۸۶ کتاب الفرائض۔

پہلے شوہر کا میراث میں حصّہ نہیں ہے

سوال:- کسی مطلقہ عورت نے ایک دوسرے مرد سے نکاح کر لیا اور چند سال اس کے ساتھ زندگی گذارنے کے بعد فوت ہو گئی، اب اس کے ترکہ میں دونوں خاوندوں کا مال ہے، پہلا شوہر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میرے والے مہر میں مجھے ۴/۱ حصہ مال ملنا چاہیئے جبکہ اس عورت کے شوہر ثانی سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں بھی ہیں، کیا شرعاً پہلے خاوند کو عورت کے ترکہ میں حصّہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب:- طلاق دے کر عدت گذر جانے کے بعد میاں بیوی کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا اور دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو جاتے ہیں جبکہ میراث کے لیے رشتہ ارث ضروری ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جہاں تک عورت کے پہلے شوہر کے حق مہر کا تعلق ہے تو وہ عورت کی ملکیت ہے اس میں سابقہ شوہر کا کوئی تعلق نہیں اسلئے عورت کا جملہ ترکہ اس کے شوہر ثانی، تین بیٹوں اور دو بیٹیوں میں تقسیم ہو گا۔

مرحومہ ۴ × ۸ = ۳۲

شوہرِ اول	شوہرِ ثانی	بیٹا	بیٹا	بیٹا	بیٹی	بیٹی
محروم	۸/۳۲	۶/۳۲	۶/۳۲	۶/۳۲	۳/۳۲	۳/۳۲

وفی الهندية: لو طلقها طلاقاً بائناً او ثلاثاً ثم مات وهي في العدة فكذلك عندنا ترث ولو انقضت عدتها ثم مات لم ترث وهذا اذا طلقها من غير سؤالها فاما اذا طلقها بسؤالها فلا ميراث لها۔

(الفتاوى الهندية ج ۱ ص ۴۶۲ الباب الخامس في طلاق المريض)

بھتیجوں کی موجودگی میں بھتیجیاں میراث سے محروم ہوں گی

سوال:- ایک شخص کے فوت ہو جانے کے بعد اس کے ورثاء میں صرف چھ بھتیجے اور چار بھتیجیاں زندہ ہیں، اب بھتیجیاں چچا کے ترکہ میں میراث کا مطالبہ کرتی ہیں، تو کیا ان کو شرعاً چچا کے ترکہ میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ میں مرحوم کے جملہ ترکہ میں صرف اس کے بھتیجے حقدار ہیں اور بھتیجیوں کو چچا کے ترکہ سے کچھ بھی نہیں ملے گا وہ شرعاً محروم ہوں گی، مرحوم کا جملہ ترکہ چھ بھتیجوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا۔

قال العلامة السجاوندیؒ : العصبات النسبیة.... ثم جزء ابیه ای الاخوة ثم بنوهم وان سفلوا ثم جزء جده۔ (السراجی ص۱۴۰ باب العصبات) ؎۱

نکاح ثانی کرنے سے عورت کا حصہ میراث ختم نہیں ہوتا

سوال :۔ جناب مفتی صاحب امیرے والد صاحب ۱۹۸۶ء میں فوت ہوگئے ہیں اور انہوں نے نقد رقم کے علاوہ کچھ جائیداد بھی ترکہ میں چھوڑی ہے، والد صاحب کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی والدہ نے دوسرا نکاح کرلیا، اب وہ والد صاحب کے جملہ ترکہ میں اپنے حصّہ کا مطالبہ کررہی ہیں، تو کیا شرعاً والدہ کا اس ترکہ میں حصہ بنتا ہے یا نہیں جبکہ انہوں نے نکاح ثانی بھی کرلیا ہے؟

الجواب :۔ میاں بیوی کا رشتہ موجب ارث رشتہ ہے، خاوند کی وفات کے بعد وہ ترکہ میں حصہ شرعی کی حقدار ہے، عدت گذارنے کے بعد دوسرا نکاح کرنے سے میراث میں حصہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے آپ کی والدہ کا اپنے مرحوم خاوند کے ترکہ میں حقّہ شرعی کا دعویٰ صحیح ہے جوکہ اس کو دینا چاہیئے۔

لقوله تعالىٰ : وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ (سورۃ النساء آیت ۱۲) ؎۲

؎۱ وفی الهندیة : وباقی العصبات ینفرد بالمیراث ذکورهم دون اخواتهم وهم اربعة ایضاً العم وابن العم وابن الاخ وابن المعتق الخ

الفتاوی الهندیة ج۶ ص۴۵۱

الباب الثالث فی العصبات

؎۲ قال العلامة السجاوندی رحمه الله : اما للزوجات فحالتان الربع للواحدة فصاعدة عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والثمن مع الولد وولد الابن وان سفل۔

(السراجی ص۸،۷ باب معرفة الفروض ومستحقیها)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۶ ص۴۵۰ الباب الثانی فی ذوی الفروض۔

اولاد کی موجودگی میں والدین کا حصۂ شرعی متاثر نہیں ہوتا

سوال:- کیا اولاد کی موجودگی میں والدین کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟ جبکہ والدین کا معقول ذریعہ آمدنی بھی ہے اور اولاد کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں؟

الجواب:- ولدیت کا رشتہ موجب اِرث ہے اولاد کا وجود اس کے لیے مانع نہیں اور نہ والدین کے ذرائع آمدنی سے ان کا حصۂ میراث متاثر ہوتا ہے، اس لیے اولاد کی موجودگی میں بھی والدین کو ۱/۶ حصہ میراث ملے گا۔

لقولہ تعالیٰ: وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ج۔ (سورۃ النساء آیت ۱۱) [1]

حکومت کی طرف سے ملنے والی امدادی رقم میں میراث کا حکم

سوال:- جناب مفتی صاحب! میرا شوہر سیلاب میں ڈوب کر فوت ہو گیا ہے، حکومت نے سیلاب میں مرنے والوں کی بیواؤں کو ۵۰/۵۰ ہزار روپے امداد کے طور پر دیئے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں اور میرے چار معصوم بچے ہیں اور اس امدادی رقم کے علاوہ میری گزران کا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں، اب میرا سسر اس ۵۰ ہزار روپے میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا شرعاً حکومت کی طرف سے ملنے والی اس امدادی رقم میں میرے سسر کا کوئی حصہ ہے یا نہیں؟

الجواب:- صورتِ مسئولہ کے مطابق جو مال حکومت نے مرحوم کی بیوہ کو دیا ہے وہ حکومتی امداد ہے جو مرحوم کی بیوہ کے ساتھ مخصوص ہے اس میں میراث کے احکام جاری نہیں ہوں گے اس لیے کہ یہ مال مرحوم کا ترکہ نہیں ہے جبکہ میراث

---

[1] قال العلامۃ السجاوندیؒ: اما الاب..... وھو السدس وذٰلک مع الابن او ابن الابن وان سفل..... اما للام فاحوال ثلٰث السدس مع الولد او ولد الابن وان اسفل
(السراجی ص ۱۱،۶ باب معرفۃ الفروض ومستحقیھا)
ومثلہٗ فی الھندیۃ ج ۶ ص ۴۴۸ کتاب الفرائض، الباب الثانی فی ذوی الفروض۔

ترکہ میں جاری ہوتی ہے۔

قال العلامة محمد الطوریؒ: تحت قوله (یبدأ من ترکة المیّت) المراد من الترکة ما ترکه المیت خالیا عن تعلق حق الغیر بعینه۔
(البحرالرائق ج ۸ ص۴۸۹ کتاب الفرائض) [1]

باپ کی زندگی میں میراث کا دعوی کرنا

سوال:- ایک شخص اپنی زندگی میں اپنی جملہ جائیداد کو فروخت کرنا چاہتا ہے مگر اس کا ایک بیٹا اُسے جائیداد فروخت کرنے سے روک رہا ہے اور اپنے حصہ کا مطالبہ کرتا ہے، تو کیا بیٹا باپ کی زندگی میں اُس سے اپنے حصۂ میراث کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب:- باپ اپنی مملوکہ جائیداد میں خود مختار ہے وہ اس میں جس طرح چاہے تصرّف کرسکتا ہے، کوئی بیٹا اس کو شرعاً منع نہیں کرسکتا، اور نہ ہی باپ کی زندگی میں اس کی جائیداد میں اپنے حصہ کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشید البخاری رحمہ اللہ: ولو وهب جمیع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو آثم نص عن محمدؒ۔ (خلاصة الفتاوی ج۴ ص۴۰۰ کتاب الهبة، قبیل الفصل الثانی) [2]

---

[1] قال العلامة الدکتور وهبة الزحیلی: الموروث هو الترکة ویسمی أیضاً میراثا وارثا وهو ما یترکه المورث من المال او الحقوق التی یمکن ارثها عنه کحق القصاص وحبس المبیع لاستیفاء الثمن وحبس المرهون لاستیفاء الدین۔ (الفقه الاسلامی وادلتهٗ جلد ۸ ص۲۴۹ الباب السادس المیراث)

[2] قال العلامة قاضی خانؒ: رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع۔ (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندیة ج۳ ص۲۷۹ فصل فی الهبة الولد لولده)
وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج۵ ص۳۹ الباب السادس فی الهبة الصغیر۔

منافع بھی ترکہ میں شامل ہے

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! میرے والد صاحب کسی کے ساتھ کاروبار میں شریک تھے جس میں والد صاحب کے چار لاکھ روپے تھے، مشترکہ کاروبار بڑے اچھے طریقے سے چل رہا تھا کہ اچانک والد صاحب کا انتقال ہوگیا، اب دس سال بعد ہم اس سرمایہ کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں جبکہ اس چار لاکھ روپے کے ساتھ ۲ لاکھ منافع بھی ہو چکا ہے، تو کیا اب ہم تقسیم چار لاکھ کی کریں گے یا منافع کی رقم بھی شامل کرنی ہوگی؟

الجواب:۔ منافع چونکہ شرعاً اصل زر کا تابع ہوتا ہے، اس لیے منافع اور اصل رقم کو ملا کر تقسیم کیا جائے گا، یعنی آپ لوگ کل ۶ لاکھ روپے آپس تقسیم کریں گے۔

قال العلامة محمد الطوریؒ: تحت قوله (یبدأ من ترکة المیت الخ) المراد من الترکة ما ترکه المیت خالیاً من تعلق حق الغیر بعینه الخ

(البحر الرائق ج ۸ ص ۴۸۹ کتاب الفرائض) [1]

قبر کے لیے جگہ کی قیمت میّت کے ترکہ سے دی جائے گی

سوال:۔ اکثر شہری علاقوں میں قبر کے لیے جگہ قیمتاً ملتی ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ قبر کی قیمت کس مال سے ادا کی جائے گی یعنی میت کے ترکہ سے واجب الاداء ہوگی یا ورثاء اپنے مال سے دیں گے؟

الجواب:۔ میّت کے کفن دفن یعنی تجہیز و تکفین پر آنے والے اخراجات میت کے جملہ ترکہ سے ادا کیے جائیں گے۔ لہٰذا جہاں کہیں قبر کی جگہ قیمتاً ملتی ہو تو اس کی قیمت میت کے ترکہ سے ادا کی جائے گی۔

وفی الهندیة: الترکة تتعلق بها حقوق اربعة جهاز المیّت ودفنه والدّین والوصیّة والمیراث فیبدأ اولاً بجهازه وکفنه وما

---

[1] قال العلامة وهبة الزحیلی: الموروث هو الترکة ویسمی ایضاً میراثاً وهو ما یترکه المورث من المال او الحقوق التی یمکن ارثها عنه کحق القصاص وحبس المبیع لاستیفاء الثمن وحبس المرهون لاستیفاء الرهن۔ (الفقه الاسلامی وادلته ج ۸ ص ۲۴۹ الباب السادس المیراث)

یحتاج الیہ فی دفنہ بالمعروف۔ (الفتاویٰ الھندیۃ ج ۶ ص۴۴۷ الباب الاول، کتاب الفرائض) ؎۱

قبر کھودنے والوں کی مزدوری کا حکم

سوال:۔ بعض علاقوں میں قبر کھودنے کی مزدوری لی جاتی ہے، تو کیا قبر کھودنے والوں کی مزدوری میت کے ترکہ سے ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میت کی تجہیز و تکفین پر جتنا بھی خرچہ آئے وہ اس کے ترکہ سے ہی ادا کیا جائے گا، تاہم اگر ورثاء اپنی طرف سے دینا چاہیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔

قال العلامۃ السجاوندیؒ: قال علماءنا رحمھم اللہ تعالیٰ تتعلق بترکۃ المیت حقوق اربعۃ مرتبۃ الاول یبدأ بتکفینہ وتجھیزہ من غیر تبذیر ولا تقتیر الخ

(السراجی ص۲،۳ کتاب الفرائض) ؎۲

شوہر بیوی کے مال میں حصۂ میراث سے محروم نہیں ہوتا

سوال:۔ جناب مفتی صاحب! ہماری بہن کو اسکے شوہر نے شادی کے ایک سال بعد اپنے گھر سے نکال دیا لیکن طلاق نہیں دی، چار پانچ سال کے بعد وہ ہمارے ہاں ہی فوت ہوگئی، اب اس کا شوہر ہماری بہن کے مال میں حصۂ میراث کا مطالبہ کر رہا ہے، تو کیا شرعاً مرحومہ کے مال میں اس کا

؎۱ قال العلامۃ السجاوندیؒ: قال علماءنا رحمھم اللہ تعالیٰ تتعلق بترکۃ المیت حقوق اربعۃ مرتبۃ الاول یبدأ بتکفینہ وتجھیزہ من غیر تبذیر ولا تقتیر ثم تقضی دیونہ من جمیع ما بقی من مالہ الخ۔ (السراجی ص۲،۳)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ ج ۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض الاول فی اصحاب الفرائض۔

؎۲ وفی الھندیۃ: الترکۃ تتعلق بھا حقوق اربعۃ جھاز المیت ودفنہ والدّین والوصیۃ والمیراث فیبدأ اولاً بجھازہ وکفنہ وما یحتاج الیہ فی دفنہ بالمعروف۔

(الفتاویٰ الھندیۃ ج ۶ ص۴۴۷ کتاب الفرائض، الباب الاوّل)

وَمِثْلُہٗ فی البحر الرائق ج ۸ ص۴۸۹ کتاب الفرائض۔

حصہ بنتا ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ میراث کے حصص اضطراری ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں اور بدون موانع شرعی کے ساقط نہیں ہوتے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق جب شوہر نے بیوی کو طلاق نہیں دی ہے تو شوہر ہونے کے ناطے سے وہ بیوی کے ترکہ میں نصف یا ربع کا شرعاً حقدار ہے۔

لقولہٖ تعالیٰ: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ۔ (سورۃ النساء ع ۱۲) ؎

بہن کے مال میں بہن اور بھائیوں کا حصہ

سوال:۔ محترم جناب مفتی صاحب! ہماری بہن کا انتقال ہو گیا ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں صرف شوہر، ماں، ہم چھ بھائی اور ایک بہن زندہ ہیں، کیا مرحومہ کے ترکہ میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ جب کوئی عورت فوت ہو جائے اور اس کی نہ کوئی اولاد ہو اور نہ باپ، تو اس کے مال میں بہن و بھائی سب حصۂ شرعی کے حقدار ہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مرحومہ کا ترکہ اس کی ماں، شوہر، بہن اور بھائیوں میں مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم ہوگا:

مرحومہ ۶ × ۱۳ = ۷۸

ماں	شوہر	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بھائی	بہن
۱۳/۷۸	۳۹/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۴/۷۸	۲/۷۸

وفی الهندية: فالنسبية ثلاثة انواع عصبة بنفسه وهو كل ذكر لا يدخل

؎ قال العلامة السجاوندي رحمه الله: اما للزوج فحالتان النصف عند عدم الولد وولد الابن وان سفل والربع مع الولد وولد الابن وان سفل۔
(السراجي ص۷ باب معرفة الفروض ومستحقيها)
ومثله في البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۶۵۳ كتاب الفرائض، الاول في اصحاب الفرائض۔

فی نسبتہ الی المیت انثیٰ وھم اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۵۱ کتاب الفرائض، الباب الثالث فی العصبات) لہ

ظالم باپ کا بیٹے کے ترکہ میں حصۂ میراث کا حکم

سوال:۔ ایک شخص بہت بڑا ظالم ہے اور اس نے اپنے بیٹے پر بہت ظلم کئے ہیں، اب اس کا بیٹا فوت ہو گیا ہے، تو کیا ایسے ظالم باپ کو بھی بیٹے کی میراث میں حصہ ملے گا؟

الجواب:۔ میراث کے حصص شرعاً مقرر شدہ ہیں ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنا جائز نہیں اور نہ بدون موانع شرعی کے یہ حصص ساقط ہو سکتے ہیں، اس لئے صورتِ مسئولہ کے مطابق باپ اپنے بیٹے کے مال میں حصۂ شرعی کا حقدار ہے، ظلم کی وجہ سے اس کا حق ساقط نہیں ہو سکتا۔

لقولہ تعالیٰ: وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ۔

(سورۃ النساء پ۴ آیت ۱۱) ۲ہ

لہ قال العلامۃ السجاوندیؒ: امّا العصبۃ بنفسہ فکل ذکر لا تدخل فی نسبتہ الی المیت انثیٰ وھو اربعۃ اصناف جزء المیت واصلہ وجزء ابیہ وجزء جدہ۔ (السراجی ص۱۴ باب العصبات)

۲ہ لما فی الھندیۃ: اما الرجال فالاول الاب فلہ ثلاثۃ احوال الفرض المحض وھو السدس مع الابن وابن الابن وان سفل والتعصیب المحض وذلک لا یخلف غیرہ فلہ جمیع المال بالعصوبۃ وکذا اذا اجتمع مع ذی فرض لیس بولد ولا ولد الابن کزوج واُمّ وجدۃ فیأخذ والفرض فرضہ فالباقی للاب بالعصوبۃ الخ۔ (الفتاوی الھندیۃ ج۶ ص۴۴۸ کتاب الفرائض، الباب الاوّل)

وَمِثْلُہٗ فی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ ج۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض، الاوّل فی اصحاب الفرائض۔

نافرمان بیوی کا شوہر کی میراث میں حصہ کا حکم

سوال:۔ ایک شخص کی بیوی نافرمان ہے اور بلاوجہ ہر وقت شوہر سے جھگڑتی رہتی ہے، اور اگر اسی حالت میں اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو کیا اس عورت کو شوہر کی میراث سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

الجواب:۔ میراث میں حصص کا تعین منجانب اللہ مقرر ہے جو کہ بدون موانع شرعی کے کسی بھی صورت میں ساقط نہیں ہوتا، چاہے وارث فرمانبردار ہو یا نافرمان، اس لیے مذکورہ صورت میں بھی نافرمان بیوی کو شوہر کے مال میں چوتھایا آٹھواں حصہ ملے گا۔

لقوله تعالیٰ: وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۲) [1]

حربی ذمی کا وارث نہیں ہو سکتا

سوال:۔ اگر کوئی غیر مسلم پاکستان میں وفات پا جائے اور وہ یہاں کا شہری ہو اور اس کا باپ ہندوستان میں رہتا ہو تو کیا یہ باپ اپنے بیٹے کی میراث میں حصۂ شرعی کا حقدار ہوگا یا نہیں؟

الجواب:۔ اختلافِ دارین (دارالحرب اور دارالاسلام) بھی مانع ارث ہے، اسلئے صورتِ مسئولہ کے مطابق باپ اپنے بیٹے کی میراث میں حصے کا حقدار نہیں ہوگا اور مرنے والے کا جملہ مال دارالاسلام (پاکستان) میں رہنے والے اس کے ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

قال العلامة محمد الطوریؒ: لا خلاف بین اصحابنا ان الکافر الحربي لا یرث الذمي سواء کان الحربي مستامنا فی دارنا او فی الحرب اھل الذمة یرث بعضھم بعضاً۔ (البحر الرائق ج ۸ ص۵۰۱ کتاب الفرائض)

---

[1] لما قال العلامة ابن البزاز الکردری رحمه الله: ونصیب الزوجة الربع مع کل الورثة الا مع الولد او ولد الابن فلها معهم الثمن بکل حال واحدة او اکثر یشترکن فی ذٰلك۔ (البزازیة علیٰ هامش الهندیة ج ۶ ص۴۵۳ کتاب الفرائض، الاول فی اصحاب الفرائض)

وَمِثْلُهٗ فی الهندیة ج ۶ ص۴۵ کتاب الفرائض، الباب الاول۔

بہن کا اپنے بھائی کے ترکہ میں میراث کا حکم

سوال:۔ کیا بہن اپنے بھائی کے ترکہ میں سے میراث کی حقدار ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کن حالات میں؟ اور کیا اپنے باپ کے ترکہ میں میراث کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ عورت اپنے باپ کے ترکہ میں میراث کی حقدار ہوتی ہے مگر اپنے بھائی کے ذاتی مال وجائیداد میں حقدار نہیں ہوتی خصوصاً جب بھائی زندہ ہو اور وفات کی صورت میں شرعی ضابطہ کے مطابق کبھی حقدار ہوگی اور کبھی نہیں۔

وفی الهندية: الخامسة الاخوات لابٍ وأمٍّ للواحدة النّصف وللثنتين فصاعداً الثلثان ومع الاخ لابٍ وأمٍّ للذكر مثل حظ الانثيين ولهن الباقى مع البنات او بنات الابن۔ السادسة الاخوات لابٍ وهنّ كالاخوات لابوين عند عدمهنّ — ولهن السدس مع الاخت لابٍ وأمٍّ تكملة الثلثين ولا يرثن مع الاختين لابٍ وأمٍّ الا ان يكون معهن اخ فيعصبهن — السابعة للاخوات لام للواحدة السدس والثنتين فصاعداً الثلث — ويسقط الاخوة والاخوات بالابن وابن الابن وان سفل وبالاب بالاتفاق وبالجد عند ابى حنيفة رحمه الله۔

(الفتاوى الهندية ج۶ ص۴۵۰ كتاب الفرائض الباب الثانى فى ذوى الفروض)[1]

---

[1] قال العلامة علاء الدين الحصكفى رحمه الله: فيبدأ بذوى الفروض وهم اثنا عشر من النسب ثلاثة من الرجال (هم الاب والجد والاخ لام) وسبعة من النساء (هن البنت وبنت الابن والاخت الشقيقة والاخت لاب والاخت لام والجدة واثنان من النسب وهما الزوجان الخ

{الدر المختار مع رد المحتار ج ۵ ص۵۳۸ كتاب الفرائض}

وَمِثْلُهٗ فى البزازية على هامش الهندية ج۶ ص۵۴۳ كتاب الفرائض، الفصل الاول فى اصحاب الفرائض۔

مطبوعات مؤتمر المصنّفین (۱۶)

۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوّت کے دوران قومی اسمبلی پاکستان میں
ملّتِ اسلامیہ کا وہ بیان استغاثہ جس پر قومی اسمبلی نے
بالاتفاق دستور میں قادیانیوں کو غیر مُسلم قرار دیا
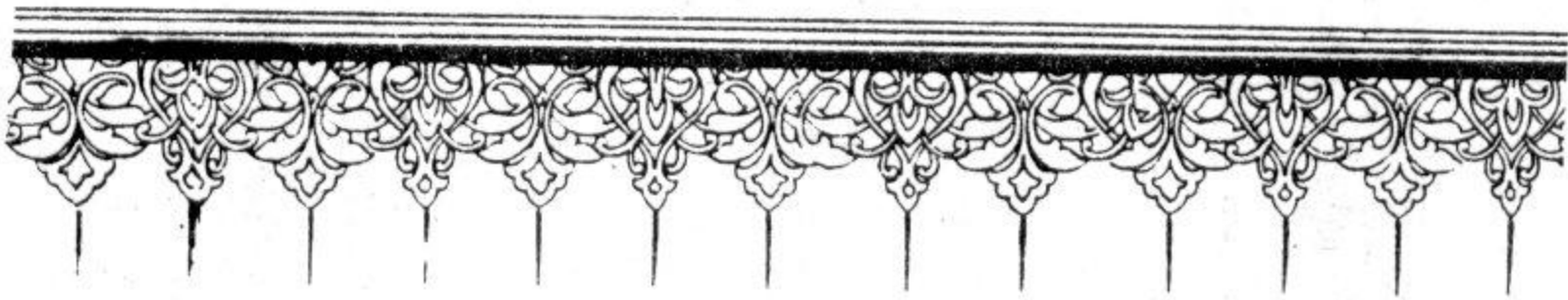
پیشکش

مُؤتَمرُ المُصَنِّفِین

دار العلوم حقّانیہ، اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

مطبوعات مؤتمر المصنفین (۴)

الحاوی

علی

مشکل الطحاوی

رشحات فکر

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی

شیخ الحدیث مولانا عبد الرحمن کاملپوری

مولانا عبد اللطیف، مولانا مفتی سعید احمد، مولانا اسعد اللہ ظلہ

ترتیب و تالیف

قاری سعید الرحمن

مہتمم جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر

مؤتمر المصنفین

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)

پاکستان

سلسلۂ مطبوعات مؤتمر المصنفین (۳۸)

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

ترتیب

مولانا عبدالقیوم حقانی

رفیق "مؤتمر المصنفین" و استاذ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

جناب مدیر "الحق" مولانا سمیع الحق کے سوالنامہ کے جواب میں
مشائخ، مشاہیر علماء، ممتاز سکالرز، دانشوروں اور قومی وملی زعماء کے
علمی ومطالعاتی تاثرات اور مشاہدات پر مبنی وقیع مضامین کا مجموعہ،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
شیخ الحدیث مولانا عبدالحق
مولانا سید محمد یوسف بنوری
مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم
مولانا شمس الحق افغانی
شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد فرید
مولانا ظفر احمد عثمانی
مولانا اطہر علی بنگلادیشی
قاضی زین العابدین میرٹھی
مولانا محمد ابراہیم جان مجددی
مولانا سمیع الحق مدظلہ
مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی
مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی
پروفیسر محمد اشرف پشاور
مولانا لطافت الرحمٰن
مولانا محمد اسحاق سندیلوی
مولانا عبدالقدوس ہاشمی
علامہ مولانا مار تونگ
ڈاکٹر محمد صغیر حسن
ڈاکٹر حمید اللہ پیرس
ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

مؤتمر المصنفین

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، نوشہرہ، سرحد (پاکستان)
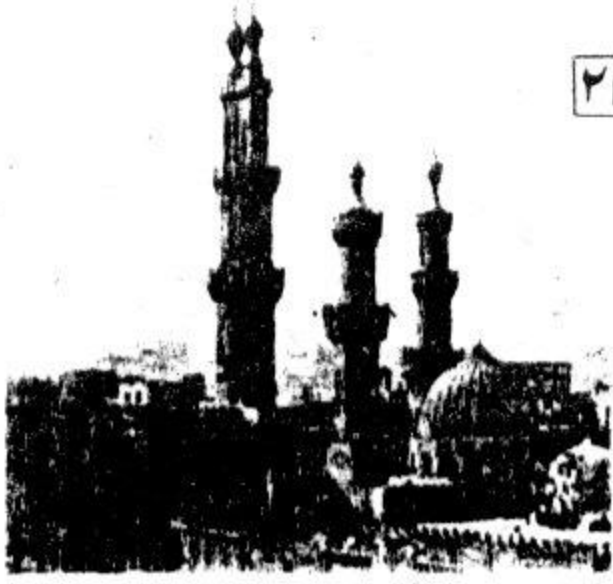
دار العلوم حقانیہ سے جامعۃ الازہر تک

پیش لفظ ـــ حضرۃ مولانا سمیع الحق مدیر الحق

تالیف ـــ **مولانا مفتی غلام الرحمٰن**

- مصر "جامعۃ ازہر" اور حرمین شریفین کا تازہ اور دلچسپ سفرنامہ، مصر کی قدیم وجدید تاریخ، ثقافت ومعاشرت، مادیت ومغربی تہذیب کی یلغار، اور نقد وتبصرہ۔
- جامعۃ ازہر کی اہمیت، تعلیمی ادوار، عروج وارتقاء، مشائخ ازہر اور اکابر علماء کے حالات۔
- اہم تاریخی اور مذہبی یادگاروں کا تذکرہ، سبق آموز واقعات اور دیارِ حبیب میں عاشقانہ حاضری کی محبت بھری روئیداد، سہل وسلیس اور دلچسپ انداز بیان۔

مؤتمر المصنفین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

پشاور ـ پاکستان